Pakistanipoint
Learning Point

سرگزشت 07
خالق ہمزاد دادکھ
ادارہ
ایک صفحہ میں مکمل مختصر مختصر
ایک نادر روزگار کا تعارف

گفت وشنید 08
شہر خیال
قارئین
آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ
کے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیت 16
اودھ کی بیٹی
زریں قمر
اس نے عورتوں کی فوج بنائی
اور انگریزوں کو تگنی کا ناچ نچا دیا

عکس زندگی 39
شوق گزیدہ
ماہ رخ ارباب
مردوں کے معاشرے میں
اس نے بغاوت کا پرچم بلند کیا

روداد عجب 53
روپ بہروپ
سید احتشام
ایک معروف جنرل کی
موت نے سب کو حیران کر دیا

حالات زیست 69
قلم کا مزدور
زین مہدی
زندگی بھر قلم کی مزدوری
کی مگر حاصل کیا ہوا؟

تذکرہ 75
بائسکوپ کی ملکہ
عقیل عباس جعفری
وہ اپنے وقت کی سپر
اسٹار تھی مگر؟

فلم نگری 79
بے مثال
انور فرہاد
پاکستانی فلمی صنعت
کے دو تراشیدہ ہیرے

معلومات 113
خطروں کے کھلاڑی
کشمالہ حسن
زندگی کو داؤ پر لگانے
والوں کا تذکرہ

تحقیق 117
درختوں کی دنیا
رانا محمد شاہد
پیڑ پودوں کے بارے میں
حیران کن معلومات

مہم جوئی 123
مسافر قطب جنوبی
فرزانہ نگہت
برفیلے بیاباں میں زندگی
کی ڈور ٹوٹنے ہی والی تھی کہ!

سفر کہانی 129
سفر پہلا پہلا
ندیم اقبال
الفاظ کی جادو بیانی کا شہکار
ایک الگ انداز کی سفر کہانی

تاریخی وبا 153
عالمی وبا
شیراز خان
بیماریاں جو وبا بن کر موت
کی پیامبر بنتی رہیں

دلچسپ وعجیب 160
شوہر خور
ایم الیاس
ایسے واقعات جو مغرب
میں ہی رونما ہوتے ہیں

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
✿ تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

پراسرار 170
جنتر منتر
ابوالفرح ہمایوں
یورپی ممالک میں ارواح خبیثہ
پر لوگوں کو کس قدر یقین ہے

شہرنامہ 175
اک شہر آبدار
عبدالغفور کھتری
اس شہر بے مثال
کا کمال تذکرہ

معاشرت 178
روسیاہ
عاطر شاہین
ایک [illegible] نوجوان
[illegible]

پہلی سچ بیانی 214
دوہری خوشی
زرینہ شاکر
سوتن کا کانٹا ہٹنے کی
عجیب داستان

دوسری سچ بیانی 226
رونگ نمبر
مظہر مشتاق
ایک فون کال نے
کئی زندگیاں اجاڑ دیں

تیسری سچ بیانی 229
اے پتر.....
سعدیہ خان
وطن پر جان فدا
کرنے والوں کا دکھ

چوتھی سچ بیانی 234
بندھن
سلمان بشیر
دو دوستوں کی لازوال
دوستی کا احوال

پانچویں سچ بیانی 247
بھرم
عالی مان آفاقی
اولاد سے توقعات
وابستہ رکھو مگر......

چھٹی سچ بیانی 251
برادری
محمد احتشام رضا
[illegible]
[illegible]

ساتویں سچ بیانی 255
دیر آید
ایم شیخ
[illegible] محبوب کا
[illegible]

آٹھویں سچ بیانی 265
بڑا آدمی
ہمایوں
اس کم عمر لڑکے نے
اسے جینے کی راہ سجھائی تھی

نویں سچ بیانی 269
انوکھا بیمار
فیصل
اسے ایک عجیب
مرض لاحق تھا

دسویں سچ بیانی 278
تہی دست
عالیہ بٹ
ایک فلمی انداز
کی سچ بیانی

سوغات **
پارچے
قارئین / ادارہ
دنیا بھر سے مختلف موضوعات
پر معلوماتی انکشافاتی پارچے

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 30 ❖ شمارہ 4,5 ❖ جون جولائی 2020ء

ماہنامہ نئے افق کراچی

مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیر : پرویز بلگرامی

نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر

◆◆◆

منیجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

◆◆◆

سرکولیشن منیجر

سید منیر حسین

0333-3285269

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 100 روپے ❖ زرِ سالانہ 1200 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط وکتابت کا پتا ⭘ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام

السلام علیکم!

یہ کیسا دور آیا ہے کہ ہر جانب سے دہلا دینے والی خبریں چلی آرہی ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون لکھتے لکھتے ہاتھ تھک رہے ہیں۔ کس کس کے غم میں روئیں، کس کس پہ آہ و بکا کریں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ سال 2020 سالِ حزن بن گیا ہے۔ کیسی کیسی شمعیں گل ہو رہی ہیں۔ کیسے کیسے آفتاب و ماہ تاب غروب ہو رہے ہیں۔ صرف چند نام، ان ناموں پر غور کریں کہ ہم نے کیسے کیسے گوہر نایاب کھو دیے "سید منور حسن، مفتی محمد نعیم قبلہ، علامہ طالب جوہری، اطہر خان جیدی، سرور جاوید، پروفیسر انور احمد زئی، ڈاکٹر آصف فرخی، طارق عزیز۔" یہ تو بس گنتی کے نام گنوائے ہیں۔ نقصان اس سے بہت زیادہ ہوا ہے۔ لیکن ایک پیغام بھی ہے کہ ہر چیز کو فنا ہو جانا ہے۔ باقی رہے گا تو صرف نام اللہ کا پھر ہم کیوں دنیا کے عیش و آرام کی خاطر، دنیا کی لالچ میں پڑ کر آخرت کو بھول رہے ہیں۔ احکام خداوندی کو بھول رہے ہیں؟ ہماری اصل زندگی یہ نہیں، وہ ہے جس کی خاطر ہم اس دنیا میں آئے ہیں۔ ہمیں آخرت کی فکر کرنی ہے، کہ اسی کی تیاری کے لیے ہمیں اس دنیا میں بھیجا گیا ہے لیکن ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ ہوسِ زر میں مبتلا پائے گئے ہیں۔ دوائیں جو انسانی زندگی بچاتی ہیں چند روپوں کی لالچ میں انہیں مہنگا ہی نہیں، بہت زیادہ مہنگا کر دیا گیا۔ ان انسان نما درندوں نے اندھیر نگری بنا دی ہے۔ جس دوا کی قیمت سو روپے تھی اسے بلیک میں ہزار روپے میں بیچتے پائے گئے۔ ایسے لوگوں کو ہم کیا نام دیں؟ ہم جو تمام امتوں میں منتخب امت ہیں، کیا ایسی حرکتوں کے بعد امتِ محمدؐ کہلانے کے حقدار ہیں؟

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

خالق ہمزاد دا دکھ

میاں عبدالعزیز پاکستانی کا شمار جالندھر کے ان افراد میں ہوتا تھا جن کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا کہ کسی بھی طرح مسلمانوں کو ان کا حق، ان کا حصہ مل جائے۔ وہ جالندھر کے کوئی بہت بڑے سیاسی رہنما بھی نہیں تھے ایک عام سے کارکن تھے، مسلم لیگ کے کارکن۔ ان کی نس نس میں مسلم لیگ بسا ہوا تھا۔ ابھی پاکستان ملے گا بھی یا نہیں کوئی نہیں جانتا تھا پھر بھی وہ اپنے نام کے ساتھ پاکستانی لکھتے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے شاعر اپنے نام کے ساتھ تخلص لکھتا ہے۔ اپنے نام کے ساتھ پاکستانی لکھنا انہوں نے تقریباً 1937 سے شروع کر دیا تھا۔ یعنی کہ قیام پاکستان سے بھی دس سال قبل سے وہ خود کو پاکستانی کہلوانے لگے تھے۔ جالندھر کا ایک ایک شخص گواہ تھا کہ اگر میاں عبدالعزیز سے کوئی مزاقاً بھی کہہ دیتا کہ پاکستان کبھی بن ہی نہیں سکتا۔ انگریز پورا ہندوستان کانگریس کو دے کر جائیں گے تو وہ لڑنے مرنے پر اتر آتے۔ ان کے اس جنون پر کچھ لوگ شاباشی دیتے تو کچھ لوگ مذاق اڑاتے لیکن انہیں کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ دن رات مسلم لیگ کے لیے وقف کر چکے تھے۔ 1936 کے 28 اپریل میں ان کے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوا تھا۔ انہیں اسلامی ہیروز سے بہت زیادہ عقیدت تھی اس لیے انہوں نے اپنے بیٹے کا نام طارق بن زیاد کے نام پر طارق رکھا تھا۔ جب کوئی انہیں چھیڑتا کہ پاکستان نہیں بنے گا تو وہ کہتے ”میرا بیٹا طارق بن زیاد کی طرح پاکستان کے لیے علاقہ فتح کرے گا۔ وہ جاگتی آنکھوں سے جو خواب دیکھا کرتے تھے اس کی تعبیر کا وقت نزدیک آیا تو انہوں نے سامان سمیٹ لیا اور لاہور منتقل ہونے کی تیاری کرنے لگے۔ لیکن جائے پیدائش کو چھوڑنا آسان نہیں ہے۔ وہ خاندان والوں کی منتیں کرتے رہ گئے اور شہر فسادات کی زد میں آ گیا، اور وہ لوگ جو کہتے تھے کہ پاکستان کبھی بن کر نہیں دے گا۔ جو کانگریس کا راگ الاپتے نہیں تھکتے تھے وہ بھی جالندھر سے نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ وہاں سے لاہور تک آنا ایک الگ کہانی ہے۔ جانوں کا نذرانہ دیتے ہوئے وہ لوگ پاکستان کی سرزمین پر پہنچ ہی گئے۔ لاہور آنے کے بعد لوگ لمبی چوڑی اعراضی اپنے اپنے نام کرانے میں لگ گئے لیکن عبدالعزیز کچھ بھی لینے پر تیار نہیں تھے۔ خاندان کے دیگر لوگ کلیم کی جایداد لے رہے تھے ان لوگوں کی وجہ سے انہیں بھی ساہیوال 142/9L میں کچھ زمینیں مل گئیں۔ طارق کی ابتدائی پڑھائی جالندھر میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ اسے وہ کچھ بنتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے، سو اسے ساہیوال کے اسکول میں داخل کرا دیا۔ طارق نے ساہیوال سے ہی میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج ساہیوال میں داخلہ لیا اور اسی کالج سے گریجویشن کیا پھر وہ لاہور چلے آئے۔ لاہور آنے کے بعد طارق نے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اس وقت پاورفل میڈیا کوئی تھا تو وہ ریڈیو تھا۔ انہوں نے ریڈیو ... عملی زندگی کا آغاز کیا۔ آواز میں ایک عجیب سی کشش تھی، انوکھا مردانہ پن تھا جس کی وجہ سے ریڈیو پاکستان لاہور میں انہیں اناؤنسر رکھ لیا گیا تھا۔ 1964 میں جب پی ٹی وی کی براڈکاسٹنگ کی تیاری شروع ہوئی تو انہیں ہی پہلا اناؤنسر ہونے کا شرف ملا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ وجیہ بھی تھے اور آواز بھی اچھی تھی۔ اسی دوران میں انہیں وحید مراد جو اس وقت سپر اسٹار تھے ان کے ساتھ زیبا تھیں جو اس دور کی سب سے مقبول اداکارہ تھیں ان دونوں کے ساتھ شباب کیرانوی نے اپنی فلم انسانیت میں طارق کو بھی کاسٹ کیا۔ اس فلم نے بلاک بسٹر کامیابی سمیٹی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے ”سالگرہ، قسم اس وقت کی، کٹاری، چراغ کہاں روشنی کہاں، ہار گیا انسان“ کے علاوہ اور بھی کئی فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے لیکن جب 1975 میں ان کا کوئیز پروگرام ٹی وی پر شروع ہوا تو اس نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ اسے قلم کتابوں سے بھی خوب دوستی تھی۔ لکھنے لکھانے کا بھی شوق تھا۔ شاعری بھی کرتے تھے اور نثر نگاری بھی۔ فلم اور ٹی وی ... جب وقت ملتا تو دل کو بہلانے کے لیے یہی کچھ کرتے۔ جب فلمیں تقریباً بند ہو گئیں اور صرف ٹی وی پر کوئیز پروگرام رہ گیا تو ... ڈائجسٹ کا انتظام سنبھال لیا۔ اس ڈائجسٹ کا نام تھا ”پندھرویں صدی“ یہ اپنی نوعیت کا الگ ڈائجسٹ تھا۔ انتہائی غریب طبقے کی غربت اور کسمپرسی کو سامنے لانے کی سعی ہوتی۔ یہ واحد ڈائجسٹ تھا جس کے سرورق پر عورت کی تصویر ممنوع ہو گئی تھی (ابتدا میں کچھ شماروں پر تھی لیکن بعد میں بالکل بند کر دیا گیا تھا) اسی زمانے میں ان کا شعری مجموعہ ”ہمزاد دا دکھ“ آیا۔ پنجابی زبان میں ہوتے ہوئے بھی اسے ہر جانب سے پسندیدگی حاصل ہوئی۔ پندرھویں صدی جب بند ہوا تو وہ لاہور منتقل ہو گئے۔ وہیں رہتے ہوئے انہوں نے سیاست کی جانب چھلانگ لگائی۔ سیاست میں ان کی دلچسپی کالج کے دور سے ہی تھی۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کے دیوانے تھے مگر بعد میں مسلم لیگ نواز گروپ میں چلے گئے۔ قومی اسمبلی کی سیٹ بھی حاصل کی۔ 1997 میں سپریم کورٹ حملہ کیس میں بھی ملوث کیے گئے لیکن بعد میں مسلم لیگ نواز کو بھی چھوڑ دیا اور پرویز مشرف کے دورِ حکومت میں مسلم لیگ (کیو) میں آ گئے۔ پی ٹی وی پر جاری ان کے کوئز پروگرام کو دوبارہ شروع کیا گیا تو ان کے نام پر اس پروگرام کا نام رکھ دیا گیا۔ ان کے کالموں کو مجموعہ ”ہزار داستان“ اور اقبالیات پر ”اقبال شناسی“ بھی مقبول رہی۔ لیکن ”فٹ پاتھ سے پارلیمنٹ تک“ نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ 1992 میں انہیں تمغہ حسن کارکردگی سے بھی نوازا گیا۔ ایسی سرگرم زندگی گزارنے والا 17 جون 2020 کو لاہور میں رہتے ہوئے خالق حقیقی سے جاملا۔ اس عظیم شخصیت کو دنیا طارق عزیز کے نام سے جانتی ہے۔

☆☆☆

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

شہرِ خیال

مدیرہ اعلیٰ

☆ اعجاز حسین سٹھار کا تبصرہ نور پور تھل سے ''چند ماہ میں ہی خوف نے تمام صلاحیتیں سلب کر لی ہیں۔ تنہائی، بیکاری اور سماجی فاصلے کی وارننگ نے نیم دیوانہ کر دیا ہے۔ بے اعتبار لمحوں میں من پسند پرچے کا آنا کتنی بڑی خوشی کا پیغام ہے، اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ٹی وی پر خبروں کے مطابق یہ حالات مہینوں بلکہ سال بھر چلیں گے، یہ سن کر حالات قابلِ رحم ہو گئے۔ اللہ ہماری حالت پر رحم کرے اور گناہوں کے حساب سے ہٹ کر رحمت کا نزول کرے (آمین)۔ آفتاب نصیر اشرفی، عبدالحکیم ثمر، روشن نور مگسی، رانا محمد شاہد، قیصر خان، نزاہت افشال، عرفان خلیل اور ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری نے خط میں اور اقبال اورا، چاندنہ جھنگ اور شاہ جہان ڈھلی اعوان، مٹھو ٹوانہ نے فون کال کر کے سرگزشت سے محبت کا اظہار کیا۔ ''یادگار فلمیں'' عنوان اور موضوع کے اعتبار سے دل کے تاروں کو چھو گئی۔ ریاض شاہد کے وطن کے لیے جذبات، عملی اقدام اور کام کا پڑھ کر میں بھی جذباتی ہو گیا، وہ سچا محبِ وطن پاکستانی تھا جس نے اپنے وسائل کے مطابق اپنے شعبہ میں بھرپور کردار ادا کیا۔ دنیاوی طور پر داد سمیٹی، انڈسٹری میں عزت اور مقام پایا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اپنی زندگی میں ہی جنت کا ٹکٹ بھی حاصل کر لیا۔ جن ہنرمندوں نے معاونت کی اور صلاحیت جان کر کردار نبھائے ہیں، اللہ ان کی منزلیں آسان کرے (آمین)۔ کبھی ایسی فلمیں پھر سے بنیں، کھڑکی توڑ رش اور رونقیں بحال ہو جائیں۔ ہائے کبھی یہ مناظر ہماری آنکھیں دیکھ پائیں تو زندگی کتنی آسان اور خوشگوار ہو جائے۔ ''سفر پہلا پہلا'' میں لڑکوں کی صنفِ نازک کو گھورنے اور نوک جھونک کی وجہ سے مزہ دے رہی ہے۔ وگرنہ پھٹیچر گاڑیوں پر پہاڑوں کے آڑے ترچھے، خطرناک اور مسلسل چڑھائی کے سفر کی روداد بھلا کیا مزہ دیتی، کنول، کومل اور کشمیرن کی انٹری نے ایک نشست میں طویل سفرنامہ پڑھنے پر مجبور کر دیا ہے، اس پر غضب ندیم اقبال کا اندازِ تحریر، وہ جس طرح سائیں کی باتیں سپردِ قلم کر رہے ہیں، ہر منظر کو زندہ کر دیتے ہیں اور ملنے ملانے، گفتگو اور سرگوشیوں کو زندہ تصویر بنا دیتے ہیں۔ یہ کمال بھی تحریر کی مقبولیت کا سبب ہے۔ پڑھنے والے کو تجسس، ہیجان اور کھوج آنے والے پرچے کا بے چینی سے انتظار کراتی ہے۔ ہمارے بھائی کو یہ تحیتیں اور کامیابیاں مبارک ہوں۔ ''روسیاہ'' کمال تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ علی پہلے کتنے جھنجٹ میں پھنسا اور خونی رشتوں کی ذمے داریاں سمیٹے چھپتے چھپاتے دن گزار رہا تھا۔ اس نے خفیہ وڈیو کا پھڈا گلے میں ڈال لیا اور اس کی تشہیر کر دی۔ اب وہ حیدر الماس کے کیمپ میں پناہ تلاش کرنے کی تگ و دو میں ہے۔ الماس کس حد تک قابلِ اعتبار ہے یا اپنا مطلب نکال کر خود غرضی پر اتر آئے۔ گھر سے نکالنے، حملہ کرانے کا پلان ڈراما ہو۔ سوچنے کی بات ہے کہ وہ وڈیو بھی لے گیا ہے اور علی کی فیملی پوری کمزوری کے ساتھ اس کی مٹھی میں آ گئی ہے۔ کھیلنے اور پانسا پلٹنے کو علی کے پاس کوئی داؤ یا پتا تک نہیں ہے۔ حیدر الماس کھیل کے ہر پہلو پر حاوی ہو چکا ہے۔ دیکھنا ہے کون داؤ پر ہے، مخلصی کس کے حصہ میں آتی ہے۔ نیک و بد انسانوں کے چہروں سے اگلی اشاعت میں نقاب اترے گا بس قدم ملا کر ساتھ چلنا شرط ہے۔ پہلی سچ بیانی ''قہر'' کے واقعات کی ہولناکی میں شبہ نہیں، عابدہ نے جو بویا واقعی اس سے بڑھ کر عذاب سمیٹے ہیں۔ ہر سطر سبق آموز اور آئینہ کی طرح ہے جس میں ہم اپنے خدوخال کو واضح دیکھ سکتے ہیں لیکن ہر بندہ خاص طور پر جواں نسل خود تجربات سے گزر کر نتائج حاصل کرنا چاہتی ہے، یوں نئی کہانیاں جنم لے رہی ہیں کوئی سمجھنے کو تیار نہیں۔ اگر کنیز زہرہ صاحبہ واقعات کو ترتیب سے پیش کرتیں تو الجھن کم ہوتی البتہ انجام کسی سے ڈھکا چھپا نہیں رہا۔ جو مصلحت سے آنکھیں بند کر کے سبق حاصل نہ کرنا چاہے وہ زندگی بھر نامساعد حالات کی

WaqarAzeem
Pakistanipoint.com

زد پر رہے، سکون غارت ہے اور اولاد کی معذوری زچ کردے تو گلہ کس پر رکھا جائے گا؟ جب سدھرنا اپنے اختیار میں ہو۔ ''شیطان صفت'' میں وجیہہ، والدین اور شوہر کی ہمت و عزم کو سلام پیش کرتا ہوں۔ سب نے مل کر جہاں برے لوگوں کے چہرے سے پردہ ہٹایا بلکہ لڑکیوں کی تباہی و رسوائی کا دروازہ بند کردیا۔ وہ خودکشی کرلیتی تو والدین نے کہاں زندہ رہنا تھا۔ اب مجرم منہ چھپاتے پھرتے ہوں گے اور وہ اپنی جنت میں شوہر اور خوشنما پھولوں کے ساتھ خوشیاں سمیٹ رہی ہے اور دوسری لڑکیوں کے لیے نیا راستہ کھول دیا ہے۔ شکست قبول کرنے اور ہمت ہارنے کی بجائے اپنے وسائل اور حالات میں رہتے ہوئے مزاحمت کرکے من پسند نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ ''پاکھنڈی'' میں سکینہ نے خدا بخش کو عاقبت سنوارنے کا نسخہ سمجھا دیا ہے۔ وہ ساتھ زندگی بچانے کے جتن میں شاداں کو حقیقی مقام بھی دے گا لیکن ہمارے اردگرد، گاؤں اور جاننے والوں میں ہزاروں مرد ایسے ہیں جو بیوی کو پاؤں کی جوتی اور بچوں کو رعایا جانتے ہیں۔ ناانصافی کرتے اور ظلم ڈھاتے ہیں اور گلی محلہ میں سینہ تان کر چلتے ہیں جیسے انہیں شہنشاہیت مل گئی ہے۔ ان کے دل میں اللہ کا خوف اور حقوق بٹھانے کی ضرورت ہے۔ بےبس لوگوں کی دعائیں لینے کے لیے ہم سب کو یہ ڈیوٹی نبھانی ہوگی۔ ''انوکھی خواہش'' میں بشریٰ آنکھوں دیکھے حقائق کی وجہ سے پٹری سے اتر کر اپنے حسن، نسوانیت اور ممتا کا سودا کرنے پر مجبور ہوگئی۔ وہ غریب گھر میں پیدا ہوئی، چودھری کے گھر ہر سہولت ملی تو تجربات و مشاہدات کا موقع ہاتھ نہ آیا۔ دماغ میں ایک خوف بیٹھ گیا جس نے ایسے گھٹیا کام پر مجبور کردیا۔ دعا کیجیے کہ کوئی کسی معاملے میں مجبور نہ ہو ورنہ اپنی عزت، غیرت اور گھریلو زندگی بھی داؤ پر لگانا پڑتی ہے۔ یہاں ابن خیال کے مضبوط کردار کو سراہنا ہوگا جس نے عیاشی اور ڈھیروں رقم تک ٹھکرادی۔ صنوبر کتنی خوش قسمت ہے جسے ایسا شوہر ملا جو کسی قیمت پر بکنے کو تیار نہیں۔ ''ماں'' نے تو رلا دیا ہے لیکن افسوس سے کہوں گا کہ ہمیں رشتے ناطوں کی شان کا ادراک ان کے دور ہونے یا بچھڑنے پر ہوتا ہے، جب والدین زندہ ہوں تو مصروفیات اور ذمے داریاں کتنی کوتاہیوں کا موجب بنتی ہیں۔ کبھی ہمارا لہجہ گستاخی کی حد تک سخت ہوجاتا ہے۔ ان کی زندگی میں خدمت کی جائے، گھر کے ہر معاملہ میں شامل ہوں، ان کی رائے کو اہمیت دیں، میٹھا بول اور نرم رویہ کتنی مشکلات حل کرسکتا ہے اور دعاؤں کے تحفوں سے دامن بھر کر دنیا اور آخرت سنواری جاسکتی ہے۔ تھوڑا وقت نکال کر ان کے تجربات توجہ سے سنیے، زندگی میں انسانوں کو برتنے کا ہنر سیکھیے اور بڑھتی عمر کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل حل کیجیے۔ آخرت میں سرخرو رہنے کا یہ آسان راستہ ہے۔ ''عیار'' واقعی صحیح اور محفوظ راستہ چنا گیا ہے، کاشف اس سلوک کا مستحق تھا اس کے جرائم [illegible] لڑکیوں کی زندگی برباد کرتا اور خواب چھین لیتا۔ وہ جیل سے باہر آئے گا تو جوانی ختم [illegible] تباہ ہوچکا ہوگا۔ [illegible] ٹوٹ چکے ہوں گے تو کیسے کیا خطرہ ہے۔ برائی کا راستہ ایسی کھائی میں جا گرنا ہے کہ لاکھ چیخنے، ہاتھ پاؤں مارنے اور دنیاوی وسائل ہونے کے باوجود تباہی و بربادی مقدر بنتی ہے۔ ''ادھورا خواب'' میں شائستہ کو ٹھوکر لگنے سے پہلے عقل آگئی یا قسمت نے ساتھ دیا، اس کے لیے اسے بیگم شاہنواز کا تہہ دل سے شکرگزار رہنا چاہیے جو اپنا گھر بچانے کی بجائے ناتجربہ کار اور خوابوں میں رہنے والی لڑکی کو بچانا چاہتی تھی، جس کا صلہ اسے آخرت میں ضرور ملے گا اور ایک دن دل پھینک شوہر بھی ٹھوکریں کھا کر، رسوائی سمیٹ کر لٹا پٹا اور شرمندہ گھر لوٹ آئے گا، بھلا بیگم کے لیے اس سے بڑھ [illegible] اور ہمیشہ کی کامیابی کا اور لمحہ کیا ہوگا۔''

[illegible] آفتاب احمد نصیر اشرفی، شاہ فیصل کالونی کراچی سے رقمطراز ہیں۔ ''اپریل کا سرگزشت تین دن لیٹ پہنچانے [illegible] جب ہم نے ہاکر کو سو کے بجائے ڈیڑھ سو دیے تو اس نے ہمیں انتہائی مشکوک نظروں سے دیکھا، ہم نے فوراً وضاحت کی کہ اضافی پچاس روپے کرونا وائرس کی وجہ سے کوئی صدقہ خیرات نہیں بلکہ تمہاری مجاہدانہ سرگرمی کا انعام ہے کہ ان حالات میں تم سرگزشت ہم تک لے آئے، یہ بڑی بات ہے۔ کرونا وائرس سے متعلق آپ کے اداریے اعداد و شمار پڑھ کر کہاں سے کہاں جا پہنچے ہیں۔ اشرف المخلوقات کی اشرافیہ نے اپنی بداعمالی اور بےعملی کی وجہ سے خدا کے قہر کو آواز دی ہے۔ ہمارا ایمان اپنی جگہ کہ ہم امتی ہونے کی وجہ سے خدائی عذاب سے مستثنیٰ ہیں لیکن کڑی آزمائش کا شکار ہم بھی ہوچکے ہیں۔ 2005ء کے زلزلے میں ایک لاکھ جانیں گنوا کر بھی ہم نے اپنا قبلہ درست نہیں کیا تھا۔ امت مسلمہ کے سربراہان کے فیصلے خدا پر عدم توکل کی زندہ مثال ہیں۔ اب ایک مرتبہ پھر ہم مسلمان اضافی اذانوں کے ذریعے اس بات کا اعادہ کررہے ہیں کہ ہم صلاح و فلاح کی طرف پلٹ رہے ہیں۔ کاش ہم ایک مرتبہ اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے کے قابل ہوسکیں ورنہ ہم پر تو وہ اپنے حرم اور مساجد کے دروازے بند کرچکا ہے لہٰذا اب گریہ زاری ہی واحد حل رہ گیا ہے اسے راضی کرنے کا۔ شہر خیال میں ظفر ندیم وہرہ کے خلوص نے انہیں عروج بخشا، مبارکباد، خلوص نامہ تو عبدالحکیم ثمر کا بھی اچھا تھا۔ اعجاز حسین سٹھار کو سلام، سید امتیاز حسین کی ادبی کاوش کو

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ثمر بار ہونا چاہیے، کوئی حل نکالیے۔ نزابت افشاں چاہیں تو قصہ اکبر 1991ء ہم انہیں دے سکتے ہیں لیکن مشورہ ہے کہ اکبرالہ آبادی پر مزید تحقیق کی کیا ضرورت ہے عشقِ سخن کے لیے بہت کچھ بقایا ہے۔ روشن نورنگسی کو خوش آمدید۔ سدرہ بانو ناگوری کو مسز نعمانی بننا مبارک۔ اس ماہ رانا محمد شاہد کا خط محفل کی جان تھا۔ قیصر خان، رزاق بخش نزکی، عرفان خلیل اور ممتاز شیریں کے تبصرے مناسب تھے۔ اچھا ہوتا اگر ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری اپنا دکھ درد شیئر کرلیتیں کچھ بوجھ ہلکا ہو جاتا۔ ویسے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ حالات سے نبرد آزما ہو کر سرخرو ہو چکیں۔ خدا آپ کو خوش و خرم رکھے۔ (آمین) بے باک ادیبہ کی بے باکی سے ہم پڑھنے والے کافی حد تک واقف ہیں۔ خدا معراج رسول صاحب کو درجات کی بلندی سے نوازے، ہم خوش نصیب ہیں کہ ہمیں زویا اعجاز ملیں۔ ''جہاں گرد'' اس ماہ کی سب سے بہترین تحریر تھی جو روحانی سرشاری کا سبب بنی، ابن بطوطہ نے مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کا جو نقشہ کھینچا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ نامور اولیاء کرام و بزرگان دین سے ابن بطوطہ کی ملاقاتوں کی تفصیل پڑھ کر دل بھر آیا اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ ان مصنفین و مترجم حضرات کو بھی سلام جو استفادے کا سبب بنے اور زویا اعجاز کو سلام عقیدت۔ زریں قمر کا ''بے خوف چہرہ'' کتنے لوگوں کے لیے خوف کا سبب بنا یہ وہ خود بھی نہیں جانتا۔ اسٹیفن کنگ کے تصوراتی تجربات عقل کی کسوٹی پر ہرگز پورا نہیں اترتے لیکن فنکشن لکھنے میں وہ کمال مہارت رکھتا ہے۔ ویسے بھی ہمارا ماننا ہے کہ شاعر ہو یا ادیب خدا کی خصوصی نوازش کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ منظر امام ہر بار کچھ نیا لے کر آتے ہیں اس مرتبہ عشاقوں کی ''داستان عشق'' لے کر آئے۔ قلوپطرہ کا اپنے محبوب سے عشق بے وفائی سے آلودہ ہے جبکہ وفا کی خوشبو لیے ہوئے رومیو جیولٹ کا عشق فرضی ہے۔ اس کا موازنہ شیریں فرہاد سے تو درست ہے لیکن ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال حقیقی داستانیں ہیں، اس کے باوجود اچھی کھوج تھیں۔ انور فرہاد کی یادگار فلمیں سب کی سب شاندار تھیں۔ زرقا، یہ امن، فرنگی وغیرہ ہم کو بہت بعد میں اسکول میں بھی دکھائی گئی تھیں۔ ریاض شاہد اور نیلو کے بیٹے اداکار شان کا کہنا درست ہے کہ ان کے والد کو کینسر نے نہیں سنسر بورڈ نے مارا ہے، خلیل قیصر و ریاض شاہد لازم و ملزوم تھے ہم لاہور میں ریاض شاہد روڈ اور مومنی روڈ کے سنگم پر اسلامیہ ہائی اسکول میں آٹھویں تک پڑھ چکے ہیں۔ کشمالہ حسن کے ''جھوٹے'' تعداد میں نہ ہونے کے برابر تھے، اگر وہ ہارون الرشید مامون الرشید کا عہد خلافت کھنگالیں تو نوبت کے بہت سے اور بھی جھوٹے مل جائیں گے۔ شیراز خان کے ''چھوٹے بڑے'' سب کے سب متاثر کن تھے۔ پاکستان میں بھی یہ تعداد درجنوں میں ہوگی کھوج لگائیے تو...... طارق عزیز خان کی ''لمبی چھلانگ'' زیادہ متاثر نہ کرسکی کیونکہ ہمارا ابھی ماننا ہے کہ امریکا کا چاند پر جانا ایک اسٹنٹ کے سوا کچھ نہیں، بحث نہ بھی کی جائے تو چھوٹی سی بات ہے کہ چاند کی تسخیر کے بعد نصف صدی میں تو جدیدیت کے پر اور بھی مضبوط ہو گئے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ روس و امریکا نے دوبارہ وہاں جانے کی زحمت نہیں کی اور رہ گئی یہ بات کہ دس سال بعد لوگوں کو چاند پر آباد کیا جائے گا یہ پڑھتے اور سنتے ہمیں چالیس سال ہو گئے اور یہ بھی کہ کئی امیر لوگوں نے تو وہاں پر جگہ بھی خرید لی ہے۔ ''سفر پہلا پہلا'' میں ندیم اقبال کنول کے ساتھ تیسرے عشق کی تیاری کر رہے ہیں، خدا خیر کرے ہمیں بھی اپنا لڑکپن یاد آ گیا۔ امی بتاتی ہیں کہ پہلے دن اسکول سے واپسی پر ہم نے اپنی کلاس ٹیچر سے بڑا ہو کر شادی کا اعلان کیا تھا اور لڑکپن کے آغاز میں ہم امی کی تازہ بیوہ ہوئی سہیلی سے شادی کے لیے مچل گئے تھے۔ لیکن ندیم اقبال کی طرح دونوں مرتبہ ہمارا مچلنا بے کار گیا تھا لہٰذا ہم بخوبی ان پر گزرنے والی کیفیات سے آگاہی رکھتے ہیں۔ ''روسیاہ'' مین علی حسن کو الماس حیدر کی شکل میں ایک مسیحا مل گیا ہے۔ کافی دھماکے دار صورتِ حال پیدا ہونے والی ہے۔ سرورق کی پہلی سچ بیانی ''قہر'' بہت متاثر کن تھی۔ عابدہ اور شمیم کی بداعمالوں نے انہیں قدرتی انجام سے دوچار کیا۔ دوسری سچ بیانی ماں تھی ماں کی عظمت کی روایتی دلیل اچھی لگی جبکہ دوسری سچ بیانی جو ہمیں اچھی لگی وہ شیطان صفت تھی۔ محکمہ تعلیم میں موجود ایک شیطان صفت نے معصوم وجیہہ کا خواب ریزہ ریزہ کر دیا، ہرچند کہ وہ عدالتی لڑائی جیت کر سرخرو ہو گئی لیکن کتنی ہیں جو مقابلہ کر ہی نہیں سکتیں۔ پارچے سب کے سب پُرمغز تھے۔ آخر میں جناب معراج رسول صاحب کی مغفرت کی دعا کے ساتھ یہ دعا کہ خدا JDP کی انتظامیہ کو کرونا وائرس کی شیطانیوں سے محفوظ رکھے۔'' (آمین)

☆ خوشنود حسن صدیقی نے حیدرآباد سے لکھا ہے ''اسلامی تاریخ کے حوالے سے ایک انتہائی دلچسپ واقعہ ارسال ہے۔ اُمید ہے کہ پسند آئے گا۔ اگر ''سرگزشت'' کی کترنوں کے مزاج سے ہم آہنگ ہو تو جگہ دیجیے۔ (مرسلہ واقعہ اتنا چھوٹا ہے کہ اسے بطور تحریر لگایا نہیں جاسکتا کترنوں کے لحاظ سے بہت بڑا ہے)''

☆ عطاء اللہ شاہ، میاں والی سے لکھتے ہیں۔ ''مارچ 2020ء کا شمارہ سرگزشت زیرِ نظر ہے۔ ٹائٹل کی رنگینی جاذبِ نظر ہے، متبسم چہرہ کسے اچھا نہیں لگتا۔ حسن تصور سے تصویر بنتی ہے اور حسن تدبر سے بہت سے عقدے کھل جاتے ہیں۔ مصور کے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

فن کی داد دیتا ہوں اور سرگزشت کی مجلس ادارت کو سلام پیش کرتا ہوں جو پس پردہ دن رات ایک کیے ہوئے مصروف عمل ہے۔ اداریہ میں آپ نے بجا طور پر وبائی مرض کرونا وائرس کے حوالے سے قارئین کی توجہ اس سنگین مسئلہ کی طرف دلائی ہے۔ ان دنوں اس مرض کی ہلاکت خیزی نے پوری دنیا کو ہلا کے رکھ دیا ہے۔ بظاہر چین سے نمودار ہونے والا وائرس دنیا کے ایک تہائی ملکوں میں پہنچ چکا ہے۔ اس پر قابو پانے کے لیے ہمیں ہر ممکن حکومت سے تعاون کرنا چاہیے اور اپنے عظیم دوست عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے رہنا چاہیے۔ ہماری نیک تمنائیں چینی عوام کے ساتھ ہیں۔ ''قلم کا مبلغ'' کے عنوان سے مختار مسعود کا یک صفحی تعارف نامہ پڑھا۔ آپ نے کوزے میں دریا کو بند کردیا ہے۔ وہ ہمارے مایۂ ناز سول سرونٹ تھے۔ جذبۂ آزادی رکھنے والے دانشور، صحافی اور ادیب تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی فلاح کے لیے اپنی زندگی وقف کررکھی تھی۔ وہ اب ہم میں نہیں لیکن ان کی قومی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ ''شہرخیال'' پر نگاہ ڈالی آپ کی پذیرائی نے مجھے سرگزشت کا باقاعدہ قاری بنا دیا ہے۔ شکریہ! کچھ شماروں میں میرے نام کے ساتھ ''وانڈھی'' چھپا ہے جو درست نہیں۔ ''وانڈھی'' مختصر آبادی یا محلے کو کہتے ہیں۔ وانڈھی آرائیاں والی میری بستی کا نام ہے۔ اسی طرح یہاں گاؤں کے لیے ''وانڈھا'' کا لفظ رائج ہے، میرے نام کے ساتھ ضلع کا نام لکھنا ہی کافی ہے۔ تمام احباب کو سلام۔ میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کیا بات ہوسکتی ہے کہ نامور قلم کارہ محترمہ زویا اعجاز ایک مرتبہ پھر شہرخیال میں موجود ہیں اور ہمیں یاد بھی کیا۔ یہ ان کی عظمت ہے۔ خاکساری اور ملنساری بہت کم لکھنے والوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ''بے اماں'' بھی ان کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے مجھے ''ولائی لامہ'' سے تعارف کرادیا ورنہ میں نے ان کا نام ہی سنا تھا۔ اُمید ہے وہ آئندہ بھی لکھتی رہیں گی۔ فلم نگری میں انور فرہاد نے ''باپ بیٹے'' پر قلم اٹھایا ہے اور شباب کیرانوی اور ان کے دو بیٹوں کی فلمی دنیا کے لیے خدمات پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ ان کے پاس دلچسپ معلومات کا خزانہ ہے ہمارے یہاں فلمی دنیا میں کچھ ''موسیقاروں'' نے جوڑیاں بنالیں اور اپنے تشخص کو اس میں دفن کردیا۔ وہ چاہتے تو دو سے زیادہ کی ٹولیاں بھی بناسکتے تھے، روکنے والا کون تھا۔ خواجہ خورشید انور زندہ ہوتے تو ان سے پوچھتا آپ نے جوڑی کیوں نہیں بنائی؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ شاعروں، کہانی کاروں اور ہدایت کاروں نے جوڑیاں نہیں بنائیں۔ کچھ موسیقار اپنی الگ شان اور پہچان رکھتے تھے۔ ان کا نام ہی کسی فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا ان کے نغمات میں ان کے کردار کی عظمت بھی شامل تھی۔ نئے موسیقاروں کے لیے ان کا طرزِ عمل مشعلِ راہ ہے۔ محترمہ فرزانہ نگہت نے ''حقائق کم ہیں...'' [illegible] ان [illegible] لکھا ہے، پھر ان سے تاریخ برآمد کرنا خاصا کٹھن اور صبر آزما کام ہے، تحقیق کا ذوق رکھنے والے لوگ بہت کم ہوتے ہیں اور ان پر لکھنے والے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ میری گزارش ہے کہ وہ آئندہ بھی لکھتی رہیں۔ تمام بیانیاں میں نے پڑھ لی ہیں تبصرہ کی گنجائش نہیں اختصار ملحوظ خاطر ہے۔ ندیم اقبال حوصلہ رکھیں ان کی تحریر چھپ کر پڑھوں گا۔ اس لیے کہ یہ دلوں کی دھڑکن بڑھا رہی ہے۔ تمام قلم کاروں کو سلام مطالعہ جاری ہے۔'' شکریہ

☆ مسز افتخار کی آمد اسلام آباد سے ''شہرِخیال میں حاضری کی جرأت کر رہی ہوں۔ خوبصورت معلوماتی کہانی ابن بطوطہ کے بارے میں تفصیل سے پڑھ کر لطف آیا۔ مصنفہ کی کاوش کو داد، میں ایک گزارش کرتی چلوں کہ چند سال پہلے اپنے بیٹے کے ساتھ مالدیپ جانے کا اتفاق ہوا۔ ویزا فری ملک ہونے کی وجہ سے جانے میں آسانی رہی۔ کئی جزائر پر مشتمل یہ ارضی قابلِ دید ہے۔ ہمارا قیام ایک ریزارٹ میں تھا۔ پُرلطف سفر رہا ہوٹل کے استقبالیہ کاونٹر پر معلوماتی کتابچے پڑے تھے جس میں محکمہ سیاحت کی طرف سے کافی معلومات تھیں۔ بطورخاص اس جزیرے، اس ملک کا ذکر کہ یہاں کے لوگ ابن بطوطہ کی تبلیغ سے مسلمان ہوئے یہ ایک لمبی داستان ہے جو کہ ایک پُراثر معلوماتی کتابچے سے ہو بہو نقل کر رہی ہوں۔'' جب ابن بطوطہ کا جہاز اس کے ساحل پر لگا تو جس چیز نے اسے حیرت میں مبتلا کیا کہ سارے لوگ ننگ دھڑنگ تھے۔ مرد وزن کی کوئی تفریق نہ تھی۔ حکمران نے پتوں کا تاج سر پر سجایا تھا اور رعایا اسے سجدے کر رہی تھی۔ مہمان کو اشاروں سے خوش آمدید کہا گیا اور سیاح نے اپنی طرف سے حکمراں کو کپڑے، تحائف پیش کیے۔ جتنا عرصہ رہا ان کو لباس پہننا سکھایا۔ نماز کی ادائیگی کے وقت لوگ ان کے آس پاس کھڑے حیرت سے تک رہے ہوتے اور ابن بطوطہ ان کو اشاروں سے ایک اللہ کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتے۔ اپنی فیاضی اچھے اخلاق سے حکمراں کے دوست بن گئے اور ان کو اسلام کی دعوت دی۔ راجا نے ان کے ساتھ ایک شرط رکھی کہ وہ ہمارے جزیرے سے اس بلا کو دور کریں گے جو ہر ماہ چودھویں رات کو سمندر کے راستے آتی ہے اور ہم اس کے قہر سے بچنے کے لیے ایک کنواری جوان لڑکی کی بھینٹ اس کے حوالے کرتے ہیں۔ وہ بلا لڑکی کو ساتھ لے جاتی ہے۔ اگر اس سے ہمارا پیچھا چھوٹ جائے تو ہم تمہارا مذہب قبول کرلیں گے۔ ابن بطوطہ سمندر کے کنارے اپنے گرد کلام الٰہی کا حصار باندھ کر ذکر اذکار

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

میں مصروف ہوگئے اور آیت الکرسی کا با آواز بلند ذکر کرتے رہے۔ یہ سلسلہ کئی روز جاری رہا۔ حتیٰ کہ چودھویں رات آگئی۔ رات کو سمندر انتہائی خوفناک دکھائی دیتا۔ ذکر جاری و ساری تھا آدھی رات کو دور سے فانوس کی طرح دو چمکتی آنکھیں دکھائی دیں، آہستہ آہستہ قریب آتی گئیں۔ سیاہ رنگ کی ایک بڑی کشتی نما مہیب شے ساحل کے قریب آتے آتے رک گئی اور پھر رخ پلٹ کر واپس چلی گئی۔ دراصل وہ تنگ دھڑنگ کالے بھجنگ بحری قذاق تھے جن کے خوف نے بستی والوں کی جان عذاب میں ڈال رکھی تھی۔ اس کے واپس چلے جانے کے بعد ابن بطوطہ نے کہا ''اب یہ بلا کبھی واپس نہیں آئے گی'' اس طرح اس رات ایک بے گناہ معصوم کی جان بھی بچ گئی اور سارے لوگ اسلام لے آئے۔ ابن بطوطہ نے ان کو نماز پڑھنا سکھایا۔ عبادت کرنا سکھائی، آہستہ آہستہ ان کو اسلام کی تعلیم دیتے رہے۔ ان بے لباسوں کو لباس پہننا سکھایا، مردوں کو دھوتی نما تہمند عورتوں کو پورا لباس سرتاپا پہنایا۔ ان کے طفیل یہ جزائر مسلمان ہوئے یہ سیاحتی بروشوران کے ہوٹلوں، ریزارٹ میں مین کاؤنٹر پر موجود رہتے ہیں اور میں نے اسی کی نقل تحریر کی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ یہ خوبصورت جنت آہستہ آہستہ زیر آب ہورہی ہے سمندر کی سطح یہاں بلند ہورہی ہے۔ دیکھیں کارخانہ قدرت میں ان جزیروں کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔''

☆ ندیم اقبال کا خلوص نامہ مشی گن، امریکا سے ''کرونا وائرس نے ہم سب کو بری طرح سے گھیر لیا ہے۔ میں نے مئی کے شمارے کے لیے خط لکھنے کا سوچا پھر حالات ایسے ہوئے کہ شمارہ اس وبا کے باعث دو ماہ تک چھپ نہ سکا پھر حالات بگڑتے چلے گئے۔ اب تک دنیا میں کم و بیش ایک کروڑ افراد اس وائرس کا شکار ہوچکے ہیں، ہلاکتیں ایک ملین کو چھورہی ہیں۔ پاکستان میں بھی اس میں تیزی آتی جارہی ہے۔ اکثر لوگ یہ کہتے بھی پائے گئے کہ یہ مسلمانوں کے خلاف مغرب کی سازش ہے۔ محاورہ سنا تھا کہ خطرہ دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کرلیتا ہے اور سمجھتا ہے خطرہ نہیں ہے۔ یہ وائرس انسانی تاریخ کو بدل کر رکھ دے گا۔ دنیا اس کے بعد کہاں بدلی یہ اب تبدیل ہوگی۔ ترجیحات بدل جائیں گی۔ معاشرہ تبدیل ہوجائے گا۔ طرز زندگی بدلتا ہوا نظر آرہا ہے۔ ملکوں کی سرحدیں مضبوط ہوں گی۔ امیر غریب میں فرق زیادہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ فیشن اور دکھاوا ماضی کی بات بن جائے گی۔ یہ میں صرف قیاس کررہا ہوں۔ ہمارا کردار اس وقت کیا ہونا چاہیے؟ میرے خیال میں ہمارے پاس خود اور اپنے پیاروں کی حفاظت کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ مایوس نہ ہونا بلکہ ان حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔ جاہل لوگوں کے پروپیگنڈے میں ہمیں نہیں آنا۔ اس مشکل وقت میں بڑے صبر سے کام لینا ہے۔ اپنے کردار پر نظر رکھنی ہے اور سچائی کا ساتھ دینا ہے۔ یہ آزمائش ہے اور اللہ ہم سب کو اس آزمائش میں ثابت قدم رکھے۔ ان دو ماہ کے وقفے کے بعد میرے لیے سفرنامہ لکھنا بہت دشوار تھا۔ ایک سطر لکھ کر گھنٹوں بعد میں دوسری سطر لکھ پاتا۔ ان حالات میں رومانس اور مزاح لکھنا ایک دشوار عمل ہے۔ لکھتے ہوئے ضمیر پر ایک بوجھ محسوس ہوتا ہے۔ اگر کمٹمنٹ نہ ہوتی تو نہیں لکھتا مگر ادارے کی مشکلات کا بھی احساس ہے اور قارئین کا بھی احساس دل میں ہے۔ اللہ ہم سب پر رحم کرے اور اس عذاب سے سب کو نجات دے۔ (آمین) آخر میں تمام قارئین کو، شہر خیال کے دوستوں کو سلام، سدرہ بانو نا گوری کو شادی مبارک۔''

☆ ڈاکٹر روبینہ نفیس کی آمد بھکر سے ''سرگزشت کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی پر لاک ڈاؤن کی وجہ سے سرگزشت بہت تاخیر سے ملا۔ شکر ہے مل تو گیا۔ کرونا وائرس نے پوری دنیا میں تباہی مچا رکھی ہے۔ ہر انسان گھر میں قید ہوکر رہ گیا ہے اس پر ستم یہ کہ کھانے پینے کے لیے ترس رہے ہیں۔ بہت سے لوگ تو مانگنے پر مجبور ہوکر رہ گئے۔ ایسے مشکل وقت میں ہم سب کو ایک دوسرے کا خیال اور احساس کرنا چاہیے۔ دنیا جتنی جدید ٹیکنالوجی کی طرف بڑھ رہی... اتنی ہی مشکلات دن بہ دن بڑھتی جارہی ہیں۔ اللہ پاک ہم سب پر اپنی رحمتوں کا سایہ دنیا و آخرت میں قائم رکھے (آمین ثم آمین) پاکستان کے معاشی حالات خراب سے خراب تر ہوتے جارہے، لوگ پہلے ہی لاک ڈاؤن کی وجہ سے بہت پریشان ہیں اور مزید اسپتالوں کے حالات نے پاگل کردیا ہے۔ میری بھابی نسیم کی طبیعت اچانک خراب ہوئی کوٹ ادو کے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ مظفر گڑھ لے کر گئے تو بھائی عثمان بتارہے تھے کہ اسپتال کے حالات اتنے خراب تھے کہ صحت مند انسان بھی پاگل ہوجائے۔ جب بھائی نے دیکھا کہ ہر بیمار کو کرونا وائرس بتارہے ہیں تو یقین مانیے بھائی عثمان بھابی نسیم کو گھر لے آئے۔ رپورٹ کا بھی انتظار نہیں کیا۔ پرائیوٹ چیک اپ اور علاج سے اللہ پاک کا شکر ہے بھابی ٹھیک ہوگئیں۔ اللہ پاک ہم سب کو ہر قسم کی بیماری اور آفت سے بچائے۔ (آمین) شہر خیال میں آئی تو ایسا لگا کہ بہت عرصہ بیت گیا آئے ہوئے، سب ہی اپنی اپنی جگہ اداس اور دکھی لگ رہے تھے۔ نزاہت افشاں، زندگی رہی تو انشاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ آپ سب سے ایک مشورہ بھی لینا ہے، یہ انعام ہر سال 3 شہر خیال کے لوگوں کو ملے گا تو اب آپ بتائیں کہ کس کو اور کس وجہ سے دوں۔ آپ لوگ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں؟ عبدالحکیم

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

صاحب میں تو بہت کوشش کرتی ہوں کہ ہر ماہ باقاعدگی سے شہر خیال میں آؤں۔ بس کبھی کبھی کوشش ناکام ہوجاتی ہے۔ مختلف وجوہات کی بنا پر میں نے گزارش کی تھی کہ شہرخیال کی محفل کو وسیع کیا جائے تاکہ سب لوگ اس محفل کا حصہ بن سکیں (آٹھ صفحے سے زیادہ خطوط کر دیا تو کہانیوں کی تعداد گھٹ جائے گی) سچ بیانیوں میں ''شیطان صفت'' کوثر اسلام کی بہت اچھی کاوش ہے اس طرح کی سچ بیانیاں شائع ہوتی رہنی چاہیے تاکہ کوئی کسی کے ہاتھوں مجبور ہو کر خودکشی نہ کرسکے۔ لوگ سامنے والے کو بلیک میل کر کے خود کو بہت بہادر اور۔۔۔ خود پر فخر محسوس کرتے ہیں، یہ جانے بغیر کہ اللہ پاک کی لاٹھی بے آواز ہے اور جب سمجھ دار والدین ملے۔ جنہوں نے اپنی بیٹی کا ساتھ دیا اور کامیابی اس کا مقدر بنی۔ میری سب والدین سے گزارش ہے کہ خدارا اپنے بچوں کو سمجھیں ان کا ساتھ دیں۔ ہر بار غلطی اپنے بچوں کی نہیں ہوتی۔ صغیر احمد کی طرح ہر بیٹی کا باپ ہو تو وہ دن دور نہیں جب لڑکیاں خودکشی کرنے کا سوچیں گی بھی نہیں۔ شیطان صفت مردوں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گی۔ ''انوکھی خواہش'' سبق آموز سچ بیانی ہے عورت غلط قدم اٹھانے سے پہلے سوچ لے تو کبھی خسارے میں نہ رہے۔ اولاد دینا نہ دینا اللہ پاک کے ہاتھ میں ہے پوری دنیا میں زور لگالے جب تک اللہ پاک کا حکم نہیں ہوگا کچھ نہیں ہوگا۔ گو بہت سی عورتیں اولاد نہ ہونے پر کافی غلط کام کر جاتی ہیں۔ اپنا آپ تک برباد کر لیتی ہیں اور جو نصیب کے لکھے پر راضی ہوتی ہیں انہیں لوگ راضی نہیں رہنے دیتے۔ طعنے دینا اور بار بار یہ احساس دلانا کہ اولاد کے بغیر کوئی زندگی نہیں، یہاں تک کہ بیٹے کی دوسری شادی کے چکروں میں بھی پڑ جاتے ہیں۔ پتا نہیں لوگ سکون سے جینے کیوں نہیں دیتے۔ میری دعا ہے اللہ پاک مجھ سمیت سب بے اولاد کو اولاد جیسی نعمت سے نوازے۔ (آمین) ابھی خبر سنی کہ طارق عزیز صاحب اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ ہمارے پاکستان کا قیمتی سرمایہ ہم سے جدا ہو گیا، اللہ پاک طارق عزیز کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین) اس بار زویا اعجاز کی جہاں گرد، زریں قمر کی بے خوف چہرہ اور ندیم اقبال کا سفر پہلا پہلا نے بہت متاثر کیا۔ ندیم اقبال کے قلم میں جادو ہے، خوب لکھتے ہیں۔ پوری دنیا کو بیماریوں نے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ سب لوگ اپنا بہت خیال رکھیں۔ خوش رہیں اور حوصلہ و ہمت سے ان حالات کا مقابلہ کریں۔ زندگی رہی تو اگلے ماہ پھر سے آپ سب کے درمیان حاضری دوں گی۔''

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

☆ عنایت بٹ کا تبصرہ میرپور آزاد کشمیر سے ''ہر بار کی طرح اس ماہ کا شمارہ بھی دلچسپ تھا بہت انتظار کے بعد یہاں پہنچا۔ لاک ڈاؤن کی وجہ سے دکانیں بند تھیں۔ اب کھلیں تو ہمارا پیارا سرگزشت ہاتھوں میں آیا۔ اس بار کی خصوصی کہانی جہاں گرد تھی۔ کیا خوب لکھا [illegible] چہرہ بھی اچھا تھا لیکن ہم پہلا پہلا کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ندیم اقبال ہمارے لیے ایسی خوبصورت سفر کہانی لکھ رہے ہیں جس کی تعریف نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ انور فرہاد بھی فلمی تاریخ بڑے دلچسپ انداز میں لکھ رہے ہیں۔ قہر نے رولا دیا۔ شیطان صفت بھی اچھی تھی۔ مونا شہزاد کی پاکھنڈی بھی دلچسپ تھی۔ ماں کی بھی تعریف کرنا ضروری ہے۔ رنگ زندگی بھی سلمان بشیر نے خوب لکھی۔ ادھورا خواب بھی اچھی کہانی تھی۔''

☆ انعام الحق نے لاہور سے لکھا ہے ''اس بار سرگزشت نے بہت انتظار کرایا۔ دیر سے آیا لیکن تحریریں لاجواب تھیں۔ پاکھنڈی خوب لکھا۔ قہر بھی پسند آئی۔ شیطان صفت بھی مزیدار تھی۔ میری جنت اور رنگ زندگی بھی اچھی تھی۔ غلط فہمی اور عیار پسند نہیں آئی۔ جہاں گرد اور بے خوف چہرہ قابلِ تعریف ہے۔ داستان عشق خشک انداز میں لکھی گئی ہے۔ روسیاہ بھی اچھی جا رہی ہے۔ یادگار فلمیں بھی پسند آئیں کہ انور فرہاد ماضی کو دلچسپ انداز میں دُہرا رہے ہیں۔ جھوٹے نے آنکھیں کھول دیں۔ اچھی تحقیق تھی چھوٹے بڑے بھی اچھی تھی۔ آخر میں ندیم اقبال کا شکریہ کہ ایسی اچھی داستان محبت سنا رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ میری اپنی پہلی محبت کا احوال لکھ رہے ہیں۔ کچھ ایسا ہی میرے ساتھ ہوا جب میں میٹرک میں تھا۔ پہلی محبت کی بات ہی کچھ اور ہے۔''

☆ محمد شعیب غازی کا مکتوب خاص ملتان سے ''بے باک ادیبہ امرتا پریتم کی طویل سرگزشت کو ایک صفحے میں مکمل کر دینا سرگزشت کا خاصا ہے۔ نہایت دلچسپ روداد تھی۔ ویسے تو ان کی کتاب رسیدی ٹکٹ میں ان کی حالات زندگی پڑھ چکا ہوں پھر بھی ایک صفحہ میں دوبارہ پڑھنے پر مزہ بہت آیا۔ کاش امرتا پریتم کو اس کی محبت، ساحر لدھیانوی مل جاتا۔ گو کہ امروز نے بھی اسے بھرپور محبت دی۔ پنجاب کی پہلی رومانوی شاعرہ کو جتنا پڑھا جائے کم ہے۔ جہاں گرد ابن بطوطہ کی حالات زندگی زویا اعجاز نے خوب لکھی۔ بہت سے نئے زاویے سامنے آئے۔ زرین قمر کا بے خوف چہرہ بہت اچھا نہیں تو بہت بری تحریر بھی نہیں تھی، گزارے لائق تھی۔ داستان بھارتی کی تحریر تھی۔ منظر امام سے اور اچھی تحریر کی اُمید رہتی ہے۔ انور فرہاد نے علی سفیان آفاقی کی کمی بہت حد تک پوری کر دی ہے۔ یادگار فلمیں لکھتے ہوئے ریاض شاہد اور نیلو کی زندگی بھرپور انداز میں پیش نہیں کر سکے ہیں (دراصل یہ تحریر دو حصوں میں تھی۔ دوسرا حصہ

اس ماہ پیش کیا جارہا ہے) ''جھوٹے'' میں جن کرداروں کا ذکر ہوا ہے ان میں سے دو کردار پر مفصل تحریر ساجد امجد کی ماضی کے کسی شمارے میں آچکی ہے۔ اب آتے ہیں اپنی پسندیدہ تحریر ''سفر پہلا پہلا'' کی جانب۔ سائیں کا کردار نہایت عمدہ طریقے سے ابھارا جارہا ہے۔ کنول کا کردار پیش کرنے میں تجسس کو مزید ابھارنا چاہیے۔ یکا یک کشمیرن کی آمد نے کہانی کو ایک نیا رخ دے دیا ہے۔ اب اور زیادہ لطف آئے گا۔ لمبی چھلانگ بور کرگئی۔ روسیاہ اچھی لگی۔ تمام قارئین کو سلام، کافی عرصے بعد خط لکھا ہے۔ شہر خیال کے احباب کو تاہی کو درگزر کریں گے۔''

☆ ناہید سلطانہ بٹ کی آمد ساہیوال سے ''میں نے عرصہ پہلے سرگزشت کا مطالعہ شروع کیا تھا لیکن خط لکھنے کی ہمت نہیں کی۔ ایسے ایسے قابل لوگوں کے درمیان میری جگہ کہاں بن پائے گی پھر بھی اپنی ناقص رائے بھیج رہی ہوں۔ مجھے سرگزشت کی پہلی تحریر ہمیشہ سے اچھی لگتی ہے۔ ہر ہر کسی نہ کسی اہم شخصیت کی حالاتِ زندگی ہوتی ہے۔ اس بار ابن بطوطہ تھے، بے خوف چہرہ بھی پسند آیا، یادگار قسمیں بھی پسند آئیں، سفر پہلا پہلا کا اثر ابھی قائم رہا، کچی عمر کی محبت کا تذکرہ ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔ قہر، شیطان صفت اور پاگھنڈی بہت پسند آئی۔ عیار غلط فہمی، ادھورا خواب بھی اچھی لگی۔''

☆ لاہور سے اقبال محمد آرائیں لکھتے ہیں کہ جہاں گرد میں زویا اعجاز نے ابن بطوطہ کا ایک نیا چہرہ دکھایا۔ ہم تو انہیں صرف سیاح سمجھتے تھے وہ تو مبلغ بھی تھے۔ انہوں نے ایک پورے ملک کو اسلام کی دولت سے مالا مال کیا، ویل ڈن، خوب لکھا۔ بے خوف چہرہ از زریں قمر بھی اچھی تھی۔ داستانِ عشق میں بہت سے عشاق کا تعارف ملا۔ انور فرہاد ماضی کی فلموں پر خوب لکھ رہے ہیں۔ ہماری فلم انڈسٹری بہت کامیاب تھی۔ کیسے کیسے نایاب ہیرے تھے۔ کیسی دلجمعی سے کام کرتے تھے۔ فن کو کس محنت سے سنوار کر سامنے لاتے تھے۔ کشمالہ حسن نے جھوٹے دعوے داروں کا چہرہ عیاں کیا۔ سفر پہلا پہلا کی بات ہی دیگر ہے۔ کھٹے میٹھے تجربے سے مزین پہلی محبت کا احوال دلچسپ ہی نہیں اثر انگیز بھی ہے۔ زبردست بیان، دلچسپ سفر کی دلچسپ کہانی۔ روسیاہ بھی دلچسپی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ ٹائٹل کہانی پہلی سچ بیانی قہر اور پاگھنڈی نے ہلا کر رکھ دیا۔ بہت اچھی بہت دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں ہیں۔ ماں کا تو جواب نہیں، ویلڈن فہمی فردوس، پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ ماں سے ملتی جلتی کہانی پہلے بھی پڑھ چکی ہوں۔ رنگ زندگی بھی دلچسپ سچ بیانی تھی۔

☆ نعمان نثار کا خط کوئٹہ سے ''اس بار اک ڈاؤن نے ہمیں بہت دق کیا، بہت ستایا، بہت انتظار کرایا۔ خدا خدا کر کے دکانیں کھلیں تو سرگزشت کا دیدار ہوا اور انتظار کی کوفت سے رہائی ملی۔ سب سے پہلے اپنے پسندیدہ سلسلے سفر کہانی کی جانب لپکے۔ محبت کی میٹھی میٹھی لو دیتی تحریر نے دل کی دھڑکن بڑھائے رکھی۔ کشمیرن کی آمد نے کہانی میں تجسس بڑھا دیا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ طارق کے ساتھ زندگی کیا کھیل کھیلتی ہے۔ لگتا ہے طارق کا پیار اسے مل جائے گا، کومل تو پکے پھل کی طرح جھولی میں اب گری کہ تب گری۔ روسیاہ بھی دن بدن نکھرتی جارہی ہے۔ مزہ بڑھ رہا ہے۔ رنگ زندگی کو سلمان بشیر نے افسانوی انداز میں لکھا ہے جبکہ سرگزشت سچ بیانی کے انداز کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ قہر بھی اچھی تھی بلکہ بہت اچھی تھی۔ شیطان صفت بھی اچھی کہانی تھی۔ کوثر اسلام کو لکھتے رہنا چاہیے۔ عیار اور غلط فہمی درمیانی درجے کی سچ بیانی تھی۔ ادھورے خواب بھی اچھی کہانی ہے۔''

☆ ناصر خان اچکزئی نے ہنگو سے تبصرہ بھیجا ہے ''سرگزشت ایک ایسا ڈائجسٹ ہے جو فالتو کہانیاں پیش کر کے وقت ضائع نہیں کرتا بلکہ معلومات کا خزانہ ہے یہ ڈائجسٹ اسی وجہ سے مجھے پسند ہے۔ اس کی ہر تحریر اپنی جگہ قیمتی ہوتی ہے۔ ایک صفحے میں پوری حالاتِ زندگی، آگے بڑھیں تو طویل داستانِ زیست پھر چھوٹی بڑی معلوماتی تحریریں اور آگے چل کر دلچسپ سبق آموز سچ بیانیاں۔ واہ۔ کس کس بات کی تعریف کی جائے۔ حالاتِ زندگی کے ساتھ سفرنامے بھی دلچسپ لیکن کئی ماہ سے شکار پر کوئی تحریر نہیں آرہی ہے۔ (ان شاء اللہ اگلے شمارے میں شکار پر تحریر مل جائے گی)''

☆ ارباز خان حسن زئی پشاور سے رقم طراز ہیں ''اس بار اپریل کا شمارہ انتظار کی سولی پر لٹکانے کے بعد ملا۔ انتظار کے ایام کی تکلیف پل بھر میں دور ہوگئی پھر ہم سرگزشت کو ساتھ لے کر کمرے میں بند ہوگئے۔ ایک کے بعد ایک، شام تک تمام تحریریں پڑھ ڈالیں۔ اب فکر ہے کہ باقی کے ایام کیسے گزاروں۔ اس ماہ آپا زویا اعجاز نے ابن بطوطہ پر خوب لکھا۔ معلومات کے دریا بہائے ہیں۔ باجی زریں قمر نے بھی اچھا لکھا۔ منظر امام کی تحریر بھی اچھی لگی پھر پہنچے اپنے پسندیدہ سلسلے سفر پہلا پہلا میں، اب ادھر پشاور کا ذکر نہیں لیکن مری بھی تو اپنا ہے۔ مری کی خوب سیر ہورہی ہے۔ آپا کنول کا ذکر بھی اچھا ہے لیکن آپا کنیز زہرہ بھی خوب کہانی لکھتی ہیں۔ مجھے بہت پسند آئی۔ باقی سب کہانیاں بھی اچھی ہیں۔ شہر خیال کے سب بھائی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

جان اور آپا کو سلام ۔"

☆ نگہت قمر خاص خیلی کا خلوص نامہ فیصل آباد سے "اپریل کا سرگزشت بہت دیر میں ملا۔ پلیز جلد بھیجا کریں۔ (بھیجا تو اپریل سے بھی پہلے تھا لیکن لاک ڈاؤن میں پرچہ پھنس گیا تھا اس وجہ سے دیر میں پہنچا) اس ماہ میں ندیم اقبال نے بہت اچھی تحریر لکھی ہے۔ بہت مزہ آیا لیکن پلیز ندیم اقبال صاحب کنول کی کہانی پوری بیان کریں گے، نسرین کی طرح ادھورا نہ چھوڑیں گے۔ سچ بیانیوں میں قہر اور رنگ زندگی اے ون تھی۔ عیار اچھی تھی لیکن شیطان صفت کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ماں کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ بہت اچھی سچ بیانی تھی۔"

☆ احمد زندانی کا خط لاہور سے "سرگزشت میرا فیورٹ میگزین ہے۔ اس کی ہر تحریر میرے دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ کبھی میں انگلش میں ریڈرز ڈائجسٹ کا فین تھا لیکن جب سے (تقریباً پندرہ سولہ سال سے) سرگزشت پڑھنا شروع کیا تو ریڈرز ڈائجسٹ کو بھول ہی گیا کیونکہ اپنے وطن میں اپنی زبان میں ایسا رسالہ نکل رہا ہے تو ہم غیروں کے رسالے پر پیسے کیوں برباد کریں۔ معلوماتی تحریریں میری کمزوری ہیں اس لیے پسند کرتا ہوں کہ سرگزشت معلومات کا خزانہ ہے۔ اس بار خط لکھنے کی واحد وجہ ہے کہ لاک ڈاؤن کی وجہ سے اپریل کا شمارہ ہی لاہور میں دستیاب ہے شاید بعد کے شمارے شائع نہیں ہوئے۔ میری گزارش ہے کہ کم سے کم دو ماہ تک ڈیڑھ پرچہ شائع کریں یعنی 445 صفحات کا اور قیمت ڈیڑھ سو روپے کر دیں اس طرح جو شمارے تعطل کا شکار ہوئے ہیں ان کا ازالہ ہو جائے۔ اس بار یعنی اپریل کے شمارے میں سوانح عمری ابن بطوطہ اچھی رہی۔ زرین قمر کی تحریر بھی مناسب تھی۔ منظر امام نے کم ... موضوع کو تانے کے انداز میں لکھا۔ انور فرہاد نے یادگار فلمیں میں معلومات کا خزانہ لٹایا ہے۔ شیراز خان کا چھوٹے بڑے بھی الو... تھا لیکن عجلت میں لکھا ہوا محسوس ہوا۔ سفر پہلا پہلا جسے ندیم اقبال تحریر کر رہے ہیں ذہنی عیاشی کے لیے بہترین ہے۔ تھکے ہوئے، الجھے ہوئے ذہن میں تازگی بھر دیتا ہے، بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا جا رہا ہے۔ اب آتے ہیں سچی کہانیوں کی جانب "قہر" بہت پسند آئی، کنیز زہرہ نے خوب تلاش کیا ہے۔ کوثر اسلام کی تحریر کردہ سچ بیانی "شیطان صفت" بھی اچھی تھی۔ مونا شہزاد کی سچ بیانی "پاکھنڈی" بھی زبردست تھی۔ سلمان بشیر کی "رنگ زندگی" بھی اچھی تھی، باقی کی سچ بیانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ اُمید ہے میری تجویز پر غور کریں گے۔"

☆ ساجدہ حیات کراچی سے آئی ہیں لکھتی ہیں "اس بار سرگزشت نے ستانے کی حد کر دی۔ بیٹے کو بار بار بک اسٹال پر ... ہر بار اس کا ایک ہی ... ہوتا ... اسٹال ... نہیں ... یا پھر بک اسٹال پر آیا نہیں ہے۔ خدا خدا کر کے اپریل کا شمارہ پہنچا تو اتنی جلدی ختم ہو گیا کیسے میں نے ہائی اسپیڈ کاری رفتار سے پڑھا ہو۔ ہر بار کی طرح یہ شمارہ بھی دلچسپ تھا۔ ہر تحریر نگینے کی طرح جڑی ہوئی تھی۔ اب اگلے شمارے کا انتظار ہے۔ اُمید ہے وقت پر آجائے گا۔"

☆ شائستہ شاہ کا تجزیہ لاہور سے "سب سے پہلے تو میں ادارے کا شکریہ ادا کروں گی۔ میری پہلی ہی تحریر کو آپ لوگوں نے ... شائع کیا۔ میں نے جو لکھا تھا اس کے نقل سے ملا کر دیکھا تو شرمندگی ہوئی کہ مجھے تو ابھی جملے بنانا بھی نہیں آتا۔ آپ لوگوں نے ... طرح ایک ایک سطر پر محنت کی ہے اس کے لیے میں شکر گزار ہوں۔ آپ لوگوں کا ارسال کردہ منی آرڈر بھی موصول ہو گیا۔ دوبارہ شکریہ۔ عام طور سے خطوط میں کہانیوں پر تبصرے بھی ہوتے ہیں اسی لیے اس شمارے کی کہانیوں پر تبصرے حاضر ہیں۔ کنیز زہرہ کی قہر اور کوثر اسلام کی شیطان صفت لاجواب تھی۔ مونا شہزاد کی پاکھنڈی کا جواب نہیں۔ زوہیب احمد کی انوکھی خواہش بھی اچھی تھی۔ فہمی فردوس کی ماں کا جواب نہیں لیکن اس طرح کی ایک کہانی ایک بڑے رائٹر کی بھی پڑھی ہے۔ خلیل جبار کی عیار بھی مزیدار تھی۔ غلط فہمی میں ناظم بخاری نے ایک اہم مسئلے کو اٹھایا ہے۔ زرینہ بٹ کی میری جنت اور سلمان بشیر کی رنگ زندگی بہت بہت، بہت پسند آئی۔ امید ہے آئندہ شمارہ بھی ایسا ہی دلچسپ ہوگا۔"

☆ ندیم احمد کا تبصرہ حیدر آباد سے "بڑی دیر کی مہربان آتے آتے، بہت انتظار کرایا۔ اپریل کا شمارہ آج ملا۔ مطالعہ جاری ہے تبصرہ اگلے ماہ، ابھی تو بس پہلی داستان زویا اعجاز کی پڑھی۔ اچھی لگی پھر اپنے پسندیدہ سفرنامہ سفر پہلا پہلا جو ختم ہونے کے قریب ہے، بس یہی دو پڑھی ہے۔"

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط:

اشرف محمود (لیہ)۔ ریحان خان (لاہور)۔ غلام فرید (بھکر)۔ انور علی خان (سبی)۔ احمد خان بھٹی (گجرات)۔ ریاض احمد انصاری (لاہور)۔ عطاء اللہ (ملتان)۔ اعتزاز ظفر (ڈیرہ اسماعیل خان)۔ گلزار حسین (کوٹ لالیسن)۔ سلطان احمد (خوشاب)۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

اودھ کی بیٹی

زرین قمر

سمندر پار سے تاجر کے بھیس میں آنے والے رہزنوں نے ایک کے بعد ایک ریاستِ ہند کو ہڑپنا شروع کیا تو برصغیر کے ہر رجواڑے، ہر ریاست میں بے چینی پھیل گئی۔ اس ظلم ناروا پر احتجاج ہوتا کہ اس ریاست کے نواب کو بے جرم و خطا دھوکے سے گرفتار کرلیا گیا ریاست اب کیا کرے لوگ مخمصے میں تھے کہ خبر پہنچی، مرکز ہند کے قریب کی چھائونی میں مٹھی بھر سپاہیوں نے بغاوت کا پرچم بلند کردیاہے۔ جوشِ حب الوطنی میں بغیر ہتھیاروں کے یہ بے ترتیب فوج آگے بڑھ رہی ہے۔ تب ریاست کی ملکہ نے بغاوت کا ساتھ دینے اور اپنی ریاست کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ایک انوکھا فیصلہ کیا۔ عورتوں کو جنگی تربیت دے کر میدانِ کار زار میں اتار دیا۔ ان جنگجو خواتین نے کس طرح انگریزوں کو ناکوں چنے چبوائے یہ بھی تاریخ کا حصہ ہے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

گھنگرو باندھ کر نواب کے دل میں گھر بنا لینے والی بہادر ملکہ کی روداد

کیسے کھیلن جئی ہو ساون ما کجریا
بدریا گھر آئی گوریا
تیرا دیکھ کے مکھڑا گورا
تھورے گھر کا سو سو پھیرا
کسی لمبی کبھی باندھے بگڑیا
بدریا گھر آئی گوریا
کیسے کھیلن جئی ہو ساون ما کجریا
بدریا گھر آئی گوریا

اس نے شعر مکمل ہونے پر ایک ادائے بے نیازی سے بالوں کو جھٹکا اور گھنگروؤں کو چھنچھناتی دائرے میں بیٹھی تمام محلات کے سامنے سے انداز دکھاتی گزرنے لگی۔ اس کے رقص میں خود وارفتگی تھی، چہرے پر خوشیوں کی چمک اور انداز میں کسی لڑاکا سپاہی جیسی اٹھان، ہر کوئی اس کے رقص کی اداؤں پر واہ واہ کررہا تھا۔ یہ نوخیز کلی جو محض گیارہ سال کی تھی پری خانہ میں نئی نئی آئی تھی اور آتے ہی تمام محلات کے دل موہ لیے تھے۔ محلات' اودھ کے فرمانروا واجد علی شاہ بہادر اختر کی منظورِ نظر تھیں جن کے لیے پری خانہ بنایا گیا تھا اور جن کے اخراجات کے لیے 300 سے 1000 تک کی رقم ماہانہ دی جاتی تھی۔

جو اس وقت کے حساب سے بہت بڑی رقم تھی کیونکہ ایک پیسے میں پانچ سیر چاول آجاتے تھے۔ اس تناظر میں حساب کریں تو تین سو روپے بہت بڑی رقم ہوئی۔

پری خانہ کی منتظم داروغہ نجم النسا تھیں جو نہایت ذہین، موقع شناس اور بہادر تھیں۔ وہ پری خانہ کے سارے اندرونی معاملات سنبھالتی تھیں۔

''واہ، وا! واہ، وا کیا کہنے لڑکی میں بلا کی پھرتی ہے۔'' نجم النسا بیگم نے بھی تعریف کی اور رقص کرتی ہوئی نوبہار کلی ان کے سامنے رک گئی۔

کتنے ڈانگر پھانسی چڑھ گئے
کتنے گولی کھا کے مر گئے
کتنے پست ہوئے ہیں
جیلن میں چکریا
بدر سلا گھر آئی گوریا
کیسے کھیلن جئی ہو ساون ما کجریا

بدریا گھر آئی گوریا

اس نے شعر پڑھتے ہوئے رقص کے انداز دکھائے۔ اس شعر پر تمام محلات ہنس پڑیں اور نجم النسا بیگم نے بھنوائی اشاروں سے اس کی بلائیں لے لیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھالیا۔

''تم خوبصورت بھی ہو اور ماہر رقص بھی، بس تھوڑی محنت کی ضرورت ہے، بڑا مقام بناؤ گی۔'' نجم النسا بیگم نے کہا۔ دوسری بیگمات آپس میں باتوں میں مصروف ہوگئی تھیں۔

''بڑا مقام؟'' لڑکی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، محمدی خانم! یہی نام ہے نا تمہارا؟'' نجم النسا نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' محمدی خانم نے سر جھکا کر کہا۔

''بڑا مقام سے میری مراد جان عالم پیا تک تمہاری رسائی سے ہے۔'' انہوں نے وضاحت کی۔

''تم کہاں کی رہنے والی ہو؟'' نجم النسا نے جواب دینے کے ساتھ ساتھ سوال بھی داغ دیا۔

''فیروز آباد کی ہوں۔'' محمدی خانم نے کہا۔

''یہاں کیسے آئیں؟''

''میری والدہ کا انتقال میرے بچپن ہی میں ہوگیا تھا۔ میرے والد فوج میں تھے انہوں نے میری پرورش کی ذمے داری میرے چچا کو سونپ دی جنہوں نے کچھ سالوں میری دیکھ بھال کی اور اب میرے رقص وفنون کے شوق کو دیکھتے ہوئے یہاں تربیت کے لیے بھیج دیا ہے۔

''ہاں، یہ مکان فنی موسیقی کی تعلیم کے لیے بنایا گیا ہے اور اس کی آرائش وزیبائش میں نہایت تکلف سے کام لیا گیا ہے اسی لیے اس خانہ رشک ارم کو پری خانے کا نام دیا گیا ہے، اس کی سجاوٹ تم دیکھ ہی رہی ہو۔'' نجم النسا نے کہا۔

''جی، اس کا سفید سنگِ مرمر کا فرش جو ہر وقت ٹھنڈا رہتا ہے مجھے بہت پسند ہے، یہاں رقص کرتے وقت چکنے فرش پر پاؤں پھسلتے ہیں تو عجیب لطف آتا ہے اور اس پر جگہ جگہ سجے چینی کے گلدستے جن میں رنگ برنگے پھول بہار دکھا رہے ہیں آنکھوں کو تراوٹ بخشتے ہیں۔'' محمدی خانم نے بھی پری خانہ کی تعریف کی۔

''ہوں..... جگہ جگہ لکڑی کی چوکیاں میرے کہنے پر رکھوائی گئی ہیں جن پر محلات براجمان ہیں اور باہر کے دروازے پر میں نے ہی ترکی عورتوں کو پہرہ پر رکھوایا ہے جو بہت بے باک اور بہادر ہیں ان کی وجہ سے کسی کی اندر آنے کی مجال نہیں ہوتی۔'' نجم النسا نے فخریہ انداز میں کہا۔

''اور یہاں سے تعلق رکھنے والے لوگ؟ کیا انہیں بھی روکا جاتا ہے؟'' محمدی خانم نے پوچھا۔

''ارے نہیں، پری خانے کی پریاں اور گانا و رقص سیکھنے والے آجاسکتے ہیں۔''

''میں ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔'' محمدی خانم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''ہاں ہاں پوچھو۔''

''میرے والد ایک فوجی تھے مجھے فن حرب سیکھنے کا بڑا شوق ہے، بھلا کچھ اس کا انتظام بھی ہے؟''

''فن حرب؟'' نجم النسا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''جی۔'' محمدی خانم جھجکتے ہوئے بولی۔

''انتظام تو نہیں لیکن تمہارے لیے کیا جاسکتا ہے۔'' نجم النسا نے ذومعنی انداز میں کہا۔

''کیا مطلب؟''

''میں نے سوچا ہے کہ تمہاری ڈیوٹی مردانے میں لگادوں۔''

''مردانے میں؟''

''ہاں، مردانے میں، تمہیں وہاں رکنے والے مہمانوں کی مہمان داری کرنا ہوگی اس کام میں تمہیں دوسرے لوگوں کی مدد بھی حاصل ہوگی اور وہاں کچھ من چلے ہیں جنہیں تھوڑا بہت ہتھیاروں کے استعمال کا شوق ہے وہ ایک چھوٹے سے حرب خانے میں مشقیں کرتے رہتے ہیں تمہیں ان سے ملوایا جاسکتا ہے۔''

''تو دیر کاہے کی آپ مجھے کسی ذمہ دار سے ملوادیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' نجم النسا نے کہا۔

پھر دوسرے ہی دن نجم النسا نے محمدی خانم کو بشیر الدولہ سے ملوادیا تھا جو حرب خانے کا انچارج تھا۔ وہ اس وقت کچھ سپاہیوں کو تلوار زنی کی مشق کروا رہا تھا۔

''بہت خوب، اب لکھنو کی عورتیں بھی تلوار زنی کریں گی۔'' بشیر الدولہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں، کیا حرج ہے بشیر الدولہ، اگر اسے شوق ہے تو سیکھا دو، دراصل اس کا باپ فوجی تھا جو کسی محاذ پر مارا گیا اسے یہ شوق وارثت میں ملا ہے۔ یہاں رقص کی تربیت لینے

آئی ہے ساتھ ساتھ یہ شوق بھی پورا کرلے گی۔ یہ یہیں پری خانے میں رہے گی اور اس کا کام یہاں آنے والے مرد مہمانوں کی خاطر مدارات کرنا ہوگا۔'' نجم النسا نے تفصیل بتائی۔

''ٹھیک ہے۔'' بشیر الدولہ نے کہا اور ایک ننگی تلوار گیارہ سالہ محمدی خانم کی طرف اچھال دی جسے اس نے کمال سرعت سے لپک کر تلوار کے دستے میں ہاتھ ڈال لیا۔ بشیر الدولہ حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

''کیا کبھی کچھ سیکھا ہے؟''

''تھوڑا سا...... بابا جان نے ہی تلوار پکڑنا سکھایا تھا۔'' محمدی خانم نے جواب دیا اور بشیر الدولہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

پھر کافی عرصے تک محمدی خانم رقص و حرب کی مشترکہ تعلیم لیتی رہی۔ نجم النسا اس کی کارکردگی سے بہت خوش تھی چنانچہ اس نے دستور کے مطابق پری خانے کے لیے اس کا نام سبز پری رکھ دیا اور وہ اسی نام سے پری خانے میں پکاری جانے لگی پھر ایک موقع پر اس کا جوہر کھل کر سامنے آیا جب پری خانے میں ہونے والی ایک تقریب میں اس کا رقص واجد علی شاہ نے دیکھا۔

رقص و سرور کی محفل ا... زور و شور پر تھی ایک کے بعد ایک ... رقاصہ ... ہنر دکھا گئی۔ ان کے بعد سبز پری کی باری آئی ... نجم النسا بیگم نے بڑے خاص تعارف کے ساتھ پیش کیا۔ سبز پری کو گھٹنوں سے نیچے تک لمبی ایک زرق برق فراک پہنائی گئی تھی جس میں گلابی رنگ نمایاں تھا اس کے ساتھ ہرا چوڑی دار پاجامہ تھا، ہرا اور سرخ کامدار ''پٹا سبز پری کی کمر میں بندھا ہوا تھا۔ لباس کی مناسبت سے سونے کا زیور اس کے گلے اور کانوں میں سجا تھا۔ ہلکے سنگھار نے اس کے خداداحسن میں چار چاند لگا دیئے تھے پھر جب طبلے کی تھاپ پر اس کے ''آلتا'' کی سرخی سے بنے بیل بوٹوں سے آراستہ پیروں نے تھرکنا شروع کیا تو واجد علی شاہ کے چہرے پر پسندیدگی کی جھلک ابھر آئی۔ رقص ختم ہونے کے بعد انہوں نے اپنے گلے کی مالا اتار کر سبز پری کی طرف اچھال دی تھی جس پر وہاں موجود کئی محلات کے منہ بن گئے تھے۔ سبز پری نے مالا لے کر واجد علی شاہ کو فرشی سلام کیا تھا اور ولی عہد نے اسے اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''آج ہم تمہیں مہک پری کا خطاب دیتے ہیں۔''

واجد علی شاہ نے کہا۔

''ذرہ نوازی ہے عالی وقار۔'' محمدی خانم نے کہا۔

''نجم النسا۔'' واجد علی شاہ نے داروغہ پری خانے کو مخاطب کیا تو نجم النسا نے ادب سے سر جھکا دیا۔

''آج سے مہک پری کو خاص محلات میں شامل کر دیا جائے۔''

''بہت بہتر عالی وقار۔''

''انہیں خاص ملبوسات، زیورات اور مقام دیا جائے۔'' واجد علی شاہ نے کہا۔

''بجا آوری ہوگی جناب۔''

اسی شام مہک پری کو ایک کمرا خاص عنایت کر دیا گیا اور جواہرات و پشمینہ سے بھری ہوئی کشتیاں، چاندی کے ظروف اور دیگر قیمتی اشیا مہک پری کو پیش کر دیئے گئے۔ اس کے علاوہ ایک کنیز بھی مہک پری کو دی گئی۔ محلات کے تیور بدل گئے اور انہیں مہک پری کی شخصیت کھٹکنے لگی۔

''ہونہہ ہم کتنے عرصے سے عالی وقار کی توجہ کے منتظر ہیں اور اسے دیکھو آنے کے ساتھ ہی......'' ماہ عالم بیگم نے کہا جو اس سے پہلے واجد علی شاہ کی منظور نظر تھی۔

''دو دن کی بات ہے پروا مت کرو۔'' سلطنت محل نے پان کا بیڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا جس کی ماہ عالم سے زیادہ دوستی تھی۔

جوں جوں واجد علی شاہ کی مہربانیاں مہک پری پر بڑھتی گئیں توں توں محلات میں اس کے لیے حسد و نفرت کا جذبہ بڑھنے لگا لیکن مہک پری اس سے بے پروا رقص و تلوار زنی کی مشقیں کرتی رہی۔ تلوار زنی میں اب اس کو اتنی مہارت حاصل ہوگئی تھی کہ وہ مردوں کے ساتھ دونوں ہاتھوں میں تلوار پکڑ کر مقابلہ کرتی تھی۔ وہ کئی مقابلوں میں اپنے مدمقابل سے جیت بھی چکی تھی۔ اس نے تلوار زنی کے ساتھ ساتھ نیزہ بازی، گھڑ سواری، فیل بانی بھی سیکھی تھی۔

اس دوران واجد علی شاہ کے والد امجد علی شاہ جو تخت سلطنت پر جلوہ افروز تھے علالت کا شکار ہوگئے اور کچھ عرصہ بعد دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ اس جانکاہ غم سے واجد علی شاہ کی دنیا اندھیر ہوگئی۔ ان کے ملازمین نے دست الم سے دامن صبر و شکیب پھاڑ ڈالے۔ گلزار لکھنو جو درحقیقت باغ ارم کو شرماتا تھا گلزار خزاں رسیدہ معلوم ہونے لگا۔ تمام کے دل سے طیور راحت رخصت ہوگئی اور تمام آنکھیں اشک بار ہوگئیں۔ یہ 1847ء کا زمانہ تھا۔ اسی اثناء میں واجد علی شاہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کے پاس انگریزی ہرکارہ آیا اور استدعا کی کہ بڑے صاحب نے بھیجا ہے آپ کو یاد فرمایا ہے۔

''لیکن میرے والد حضرت جنت مکاں کا انتقال ہوگیا ہے میں خود سوگ میں ہوں کیسے جاسکتا ہوں۔'' واجد علی شاہ نے کہا۔

''میرا کام آپ کو پیغام پہنچانا تھا باقی آپ کی مرضی جو کہتے ہیں میں وہاں بیان کردوں گا۔''

''ٹھہرو..... میں چلتا ہوں۔'' واجد علی شاہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

جب واجد علی شاہ انگریز سرکار کے دفتر میں حاضر ہوئے تو ان سے پوچھا گیا کہ ان کے والد کے انتقال کے بعد انہیں کس لقب سے پکارا جائے گا۔

''میرے جد امجد (دادا حضور) کا لقب فردوس منزل ہے اسی مناسبت سے میرے والد کا لقب جنت مکانی کہنا مناسب ہوگا۔'' واجد علی شاہ نے کہا۔

اس ملاقات کے بعد جب واجد علی شاہ واپس محل میں آئے اور نماز دوگانہ ادا کی۔ مجتہد العصر وزمان نے ان کے سر پر تاج رکھا اور انہوں نے تخت پر جلوس فرمایا۔ وہاں پر جس قدر اراکین وعمائدین سلطنت موجود تھے انہوں نے نذریں پیش کیں ساتھ ہی سلامی کی توپیں داغی گئیں۔

واجد علی شاہ غم سے نڈھال تھے چنانچہ بارہ دری کے پیچھے والے مکان میں جاکر آرام کیا۔

اس کے اگلے روز واجد علی شاہ نے مصاحبان خاص اور دیگر اشخاص کو تلوار وخلعت سے اور معقول خطاب سے ممتاز فرمایا۔ اس زمانے میں واجد علی شاہ کے استاد امین الدولہ بہادر تھے انہیں اسی عہدے پر رہنے دیا، مرفی الدولہ بہادر کو گھنگھور نامی پلٹن کی افسری دی، اس پلٹن میں چار سو انگریز سوار تھے جن کو ترک سوار کہا جاتا تھا اور یہ پلٹن رسالہ حفاظتی (باڈی گارڈ) کے نام سے بھی موسوم تھی۔ افسر الدولہ بہادر کو توپ خانہ نگر یا اور بانک گنج کی خدمت سونپی گئی، بہادر الدولہ کو بھرمار پلٹن کی کمانداری کی خدمت عطا کی۔ دس لاکھ روپے جنت مکانی کے مقبرے کی تعمیر کے لیے خزانہ عالیہ سے غلام علی خان ابن غلام رضا خان کو دیئے اور انہیں نجیب الدولہ کا خطاب دیا۔ غلام علی خان، سکندری پلٹن کی کمانداری پر بھی مامور تھے ان کی مدد کے لیے بشیر الدولہ بہادر کو حکم دیا۔

واجد علی شاہ خود میں عجیب فطرت تھے۔ پنج وقتہ نمازی، تہجد گزار، مگر بچپن میں تخت سے دور کرنے کے لیے ایک سازش کے تحت انہیں رقص وسرور کی محفل کا دلدادہ بنایا گیا اس کا اثر بھی غالب رہا۔ نت نئے گانے والوں کو سہولتیں فراہم کرنے سے غافل نہیں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ سازندوں اور موسیقی کے فن کے ماہروں کی ہر وقت تلاش جاری رہتی تھی تاکہ پریوں کی تعلیم جاری رہے اور وہ اس فن میں ماہر ہوجائیں چنانچہ تاج پوشی کے موقع پر واجد علی شاہ پری خانے میں نئی آنے والی مہک پری کو بھی نوازنا چاہتے تھے کیونکہ وہ اس کی منظور نظر بن چکی تھی انہوں نے مہک پری کو جگہ خاص میں بلایا اور اس کی شان میں قصیدہ پڑھا۔

واجد علی شاہ، مہک پری کی شان میں اشعار پڑھ رہے تھے اور مہک پری جھک جھک کر ان کی تعظیم بجالا رہی تھی خوشی سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور نجم النساء جو اسے دربار میں لے کر آئی تھی فخر سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''نجم النساء بیگم۔'' واجد علی شاہ نے انہیں مخاطب کیا۔

''عالی وقار۔'' نجم النسا نے باادب کہا۔

''ہم حکم دیتے ہیں کہ آج سے مہک پری کو محل خاص میں منتقل کردیا جائے اور آج سے انہیں بیگم حضرت محل کہہ کر مخاطب کیا جائے انہیں ہم اپنے نکاح میں لیں گے۔ ان کا مقام ہماری دوسری زوجہ کا ہوگا۔''

''بہت بہتر عالی مرتبت۔'' نجم النسا نے باادب کہا۔

کچھ عرصے بعد جب بیگم حضرت محل اُمید سے ہوئیں تو انہیں پردے میں بٹھا دیا گیا اور وقتی طور پر ان کے رقص و حرب کی تعلیم رک گئی۔ اب واجد علی شاہ روز محل میں بیگم حضرت محل سے ملنے آتے اور اس کے ناز نخرے اٹھاتے تھے۔ حضرت محل کو ان کے طرز زندگی پر اعتراض تھا اور وہ اکثر اس بارے میں ان سے بات کرتی تھی لیکن واجد علی شاہ اس کی باتوں کو خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔

ایک دن قاصد نے واجد علی شاہ کو ایک گل تازہ کی آمد کا مژدہ سنایا، جب واجد علی کو پتا چلا کہ خدا نے اسے فرزند سے نوازا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور اسی وقت حضرت محل کو ایک اور خطاب ''افتخار النساء خانم'' کا لقب دے دیا۔ اس موقع پر خوشی کے اظہار میں ایک توپ داغی گئی اور محل میں جشن کا اہتمام کیا گیا۔

محل کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا اور تمام پریاں بھی خوب سجی تھیں۔ ہر طرف پھلجڑیاں اور پٹاخے چل رہے تھے۔ واجد علی شاہ کے دادا اس موقع پر بہت خوش تھے کسی بھی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

بیگم نے ابھی تک ولی عہد دیا نہیں تھا۔ پوتے کی آمد پر خود انہوں نے اس کا نام برجیس قدر رکھا تقاریب کو طعام کے بعد رقص و سرور کی محفل سجی تھی اور اس موقع پر واجد علی شاہ نے برجیس قدر کے لیے ایک نظم کہی۔

عجب نجم طالع نے کی برتری
ہوئی حاملہ جو مہک تھی پری
سنا جس گھڑی مژدہ دل پذیر
کیا سجدۂ شکر ربِ قدیر
بہت اس پری رو کا رتبہ بڑھا
کہ پایا خطاب افتخار النساء
ہوئی پردہ شرم میں جاگزیں
زن خانہ بہتر ہے پردہ نشیں
غرض مدتِ محل آخر ہوئی
خوشی بعد نو ماہ ظاہر ہوئی
وہ طفل خوش اقبال پیدا ہوا
جس پہ خود اقبال شیدا ہوا
ہوا جشن شاہانہ آراستہ
ہوئی فکر دنیا کی برخاستہ
مبارک مبارک ہو ہرسو صدا
کوئی رقص میں کوئی صرف تمنا
[illegible] لے ساماں خانے دیئے
پری پیلروں نے تماشے کیے
خطاب اس کا روشن ہے مانند بدر
یہ مرزا بہادر ہے برجیس قدر

واجد علی شاہ نے مرزائی بیگم کو رمضان علی مرزا برجیس قدر بہادر کی پرورش کی ذمّے داری سونپی اور جب تعلیم کے قابل ہوئے تو مولوی غلام حضرت ان کی تعلیم پر معمور ہوئے 1947ء میں واجد علی شاہ نے تخت نشین ہونے کے بعد حضرت محل کا ماہانہ خرچ جو دو ہزار مقرر کیا تھا وہ برجیس قدر کی پیدائش کے بعد بڑھا دیا۔ برجیس قدر کے لیے ایک اور موقع پر واجد علی شاہ نے لکھا۔

جو وہ تھا شہزادہ ہے رشک بدر
اسے لوگ کہتے ہیں برجس قدر
وہ چودہ برس کا کچھ شک نہیں
کیوں کہ وہ پا پیادہ نہیں
ملاؤں جو حضرت سے لفظ محل
تو نام اس کی ماں کا کھلا برمحل

وہ مہ قبضہ قصداں میں ہے آہ
بنایا ہے اپنا اسے بادشاہ

واجد علی شاہ کے تین بچے اور تھے دو شہزادے پہلی بیوی سے جو ایک کے بعد ایک موت سے ہمکنار ہو گئے اور پھر پہلی بیوی بھی خدا کو پیاری ہو گئیں۔ ایک بیگم سے ایک شہزادی تھی لیکن وہ بھی لقمہ اجل بن گئی۔ چوتھا شہزادہ برجیس قدر تھا جو حضرت محل سے تھا اور جسے تخت نشینی نصیب ہوئی۔

1847ء میں واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے بعد 1848ء میں لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل لکھنؤ آکر واجد علی شاہ کے مہمان ہوئے۔ ان کے لکھنؤ آنے سے قبل ان کے استقبال کے لیے واجد علی شاہ خود کان پور تک ان کے استقبال کے لیے گئے۔ وہ ہاتھی پر سوار تھے اور ان کے ساتھ بہت سے ہاتھی سوار، گھڑ سوار اور پیدل تھے۔ جانوروں سمیت سب کے سب زیورات سے آراستہ تھے، ساتھ میں باوردی نفیریوں والے نفیریاں بجاتے جا رہے تھے۔ ایک شادی کا ساماں تھا۔ لارڈ ہارڈنگ نے ایک جنگل میں باگ (شیر) کا شکار بھی کھیلا تھا جس کا طریقہ یہ تھا کہ شکار کے لیے بھینس کے بچھڑے باندھے جاتے تاکہ شیر انہیں کھانے آئے اور پھر ہاتھیوں والے ہاتھیوں پر بیٹھ کر شیر کو کچھ ایسے ہانکتے اور بچھڑے تک لاتے کہ شیر ان کے نشانے پر آجاتا اور شکاری اس پر حملہ کر دیتے تھے۔ اب بھی یہی ہوا تھا۔

گائے کے دو بچھڑے لا کر جنگل میں ایک گھنے درخت کے نیچے باندھے دیئے گئے تھے اور اس درخت پر ایک مچان بنا کر کچھ ماہر شکاری اس پر بیٹھ گئے تھے جن کے پاس تیر کمان تھے۔ کچھ گھڑ سوار بھی تھے لیکن ان کا کام بس اتنا تھا کہ وہ شکار گاہ کے اطراف دور دور تک دائرے کی شکل میں پہرہ دیں تاکہ شیر دائرے سے باہر نہ نکل سکے۔ ان گھڑ سواروں کے ہاتھوں میں نیزے تھے اور پھر ہاتھیوں پر سوار سپاہی تھے جو ہانکا لگانے والے تھے۔ انگریزوں کے شکار کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ وہ اس کی لاش پر جوتا رکھ کر تصویریں کھنچواتے جو ان کی بہادری کی ممتاز ہوتی تھیں اور انگلستان جانے پر ان تصویروں کو اپنے ڈرائنگ رومز میں سجاتے تاکہ ملنے والوں پر رعب طاری ہوسکے اور ان کے بہادر شکاری ہونے کا ثبوت مل جائے۔

جنگل میں جب شکار کے تمام انتظامات ہو چکے تو ایک ہاتھی پر گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ اور دوسرے پر واجد علی شاہ بیٹھ گئے۔ ہودے سونے چاندی کے پتر سے بنے تھے جو

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

امارت کا ثبوت دے رہے تھے۔ لارڈ کے ہودے کو بھی تخت شاہی کی طرح سجایا گیا تھا ہاتھیوں نے بھی سونے چاندی کے بنے زیورات پہنے تھے، اسی لیے تو انگریز بھارت کو سونے کی چڑیا کہتے تھے، یہ چمک دمک دیکھ کر ان کی آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔

''ہوشیار..... خبردار.....'' ایک گھڑ سوار نے دور سے ہانک لگائی جس کا مطلب تھا کہ علاقے میں کہیں قریب ہی شیر موجود ہے پھر کچھ کچھ وقفوں سے ہوہا ہو..... ہوہا ہو..... کی آوازیں آنے لگیں، گویا فیل بان شیر کی تلاش میں جنگل کے اندر داخل ہو رہے تھے۔

''ادھر علاقے میں کتنا شیر ہے؟'' لارڈ ہارڈنگ نے اپنے فیل بان سے پوچھا۔

''کچھ اندازہ نہیں سرکار لیکن آئے دن قریبی بستیوں میں گھس کر کسی عورت، مرد یا بچے کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ کئی انسانوں کی لاشیں جنگل سے مل چکی ہیں۔''

''اوہ..... یہ تو بہت خطرناک ہے۔'' لارڈ نے کہا۔

''جی سرکار اس سے بھی زیادہ خطرناک یہ ہے کہ وہ گاؤں کی گلیوں میں رات کو چکر لگاتے ہیں، کوئی بھی روکنے والا نہیں، گاؤں ہی میں شکار کر کے اسے کھاتے ہیں اور ہڈیاں چھوڑ جاتے ہیں۔''

''ابھی ہم آگئے ہیں ایک ایک کر کے سب ختم کر دیں گے۔'' لارڈ ہارڈنگ نے کہا۔

''ٹھیک ہے صاحب۔'' فیل بان نے کہا عین اسی وقت شیر کی دھاڑ سنائی دی لارڈ ہارڈنگ نے بندوق لوڈ کر لی تھی اور شکار کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

جنگل کے دوسرے سرے پر واجد علی شاہ اپنے ہاتھی کے ساتھ موجود تھے۔ انہیں شکار کا کوئی شوق نہیں تھا لیکن وہ صرف لارڈ ہارڈنگ کی مہمانی اور خوشنودی کے لیے آگئے تھے ان کے ہاتھی سے آگے تین اور ہاتھی چل رہے تھے۔ شیر کو مختلف جھاڑیوں میں تلاش کیا جا رہا تھا جبکہ کچھ مقامی جن کے جسم پر صرف ایک دھوتی اور سر پر پگڑی بندھی تھی گلے میں تاشہ لٹکائے انہیں زور زور سے پیٹ رہے تھے جس کی وجہ سے ہنگم شور پیدا ہو رہا تھا۔

''ہوہا ہو..... ہوہا ہو.....'' یہ آوازیں اب چاروں طرف سے آنے لگی تھیں۔ شیر تلاش کرنے والوں کا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا تھا اب وہ جنگل کے درمیان ایک چھوٹے سے گھاس کے میدان تک آگئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں لارڈ ہارڈنگ اور واجد علی شاہ کے ہاتھی ایک دوسرے کے سامنے تھے ان کے درمیان سو گز کا فاصلہ تھا ایک درخت کے نیچے بچھڑا بندھا تھا۔ اچانک قریب کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی اور شیر جھاڑیوں سے باہر آگیا۔ وہ شور سے گھبرا گیا تھا اور ادھر اُدھر بھاگ رہا تھا۔ اس کی توجہ بچھڑے کی طرف نہیں تھی بلکہ وہ ہانکا لگانے والے لوگوں کے دائرے سے نکلنے کی جگہ ڈھونڈ رہا تھا۔ کئی سمتوں سے نیزے اور تیر چلائے گئے لیکن شیر کو ایک بھی نہیں لگا پھر اچانک شیر نے ایک ہانکا کرنے والے کو منہ میں دبوچ لیا تھا اور اسے لیے ہوئے جنگل میں دوڑتا چلا گیا۔ ہانکا کرنے والے اس کے پیچھے بھاگے تھے۔

''ارے دیکھو! وہ اس آدمی کو لے گیا۔'' لارڈ ہارڈنگ نے آواز لگائی۔ اس کی بندوق اس کے ہاتھ میں تھی اس نے شیر پر فائر کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

''وہ ابھی اسے پکڑ لائیں گے۔'' واجد علی شاہ نے بھی آواز لگا کر لارڈ کو تسلی دی۔

اب ہانکا کرنے کی آوازیں دور ہوتی جا رہی تھیں پھر وہ کافی دیر بعد واپس آئے تھے اور واجد علی شاہ کے ہاتھی کے قریب رک گئے تھے۔

''وہ نکل گیا سرکار، پتا ہی نہیں چلا کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔'' ایک ہانکا کرنے والے نے کہا۔

''جسے وہ لے گیا ہے اسے جانتے ہو؟'' واجد علی شاہ نے پوچھا۔

''ہاں سرکار، میرا پڑوسی ہے۔ اس کی ایک بیوی اور دو چھوٹے بچے ہیں غریب آدمی ہے۔''

''اگر وہ نہ ملا۔''

''تو اس کے گھر میں قیامت ہو جائے گی، غریب آدمی ہے بے روزگار ہے اس کے بچوں کو فاقوں کی نوبت آجائے گی سرکار۔''

''اچھا یہ اس کے گھر پہنچا دو۔'' واجد علی شاہ نے اپنے قریب بیٹھے منشی صاحب کو اشارہ کیا اور اس نے اشرفیوں کی ایک تھیلی اچھال کر مزدور کو دے دی۔ مزدور تعظیم سے ہاتھ جوڑتا وہاں سے چلا گیا تھا۔

لارڈ ہارڈنگ کا وہ سارا دن بے کار گیا تھا اس لیے اس کا موڈ بے حد خراب تھا۔ واجد علی شاہ نے جنگل میں موجود ''والان'' میں اسے ٹھہرایا۔ اس کے لیے بہترین ضیافت کا بندوبست کروایا اور وعدہ کیا کہ اگلے روز پھر شکار

Waqar Azeem
Pakistanipoint

پڑ جائیں گے، اس بار کامیابی ضرور ہوگی۔

دوسرے روز پھر مقررہ وقت پر سب شکار گاہ پہنچ گئے تھے۔ اس بار انتظامات پہلے سے زیادہ بہترین تھے۔ ہانکا شروع کرایا گیا تھا۔ بچھڑے درخت کے نیچے بیٹھے تھے کہ ہانکے کی آوازیں آنا شروع ہوئیں جو آہستہ آہستہ قریب آتی جارہی تھیں۔ جنگل میں پرندوں کی چہچہاہٹ خاموشی میں بدل گئی تھی صرف ہانکے کی آواز گونج رہی تھی جو دم بدم قریب آتی جارہی تھی کہ پھر درخت کے نیچے بندھے بچھڑوں نے سراسیمگی سے اِدھر اُدھر دوڑنا شروع کردیا، انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ رسیاں تڑا کر بھاگنا چاہتے ہوں۔ اچانک جھاڑیوں کے پیچھے سے شیر نمودار ہوا اور بچھڑوں سے کچھ فاصلے پر آکر رک گیا تھا۔ ہاتھی پر بیٹھے ایک فیل بان نے تیر چلایا تھا جو شیر کے اگلے بازو میں لگا تھا اور شیر اس کی طرف جھپٹا تھا۔ اسی وقت لارڈ ہارڈنگ نے نشانہ لے کر فائر کیا، گولی شیر کے ماتھے سے گھس کر پیچھے کھوپڑی سے نکل گئی تھی شیر نے جست لگائی تھی جو آدھے راستے میں دم توڑ گئی تھی اور وہ نیچے گر گیا تھا۔ ہانکا کرنے والے شیر کی طرف لپکے تھے۔

''رک جاؤ۔'' لارڈ ہارڈنگ نے ہانک لگائی تھی۔

''بس نو... نیچے آرہا ہوں۔ میں اس کی لاش کے ساتھ تصویر بنواؤں گا۔'' لارڈ نے کہا اور ایک ملازم کی مدد سے ہاتھی سے نیچے اترا پھر وہ گرتے ہوئے شیر کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ جھاڑیوں میں سے دوسرا شیر نمودار ہوا اور سیدھا ہارڈنگ پر جھپٹا۔ سارے ہانکا کرنے والے پیچھے بھاگے۔ لارڈ ہارڈنگ نے فائر کیا گولی شیر کے جبڑے پر لگی، وہ لڑکھڑایا لیکن پھر آگے بڑھا۔ اس سے پہلے کہ شیر لارڈ ہارڈنگ تک پہنچے ایک سپاہی نے جو گھوڑے پر سوار تھا اپنی تلوار سے اس پر وار کردیا۔ تلوار کی نوک سیدھی شیر کے دل کے مقام پر لگی تھی اور وہ ڈھیر ہوگیا تھا۔ لارڈ ہارڈنگ بچوں کی طرح قہقہے لگانے لگا تھا جو شاید کل کی ناکامی اور آج کی فتح پر تھے یا اپنی زندگی بچ جانے کی خوشی میں تھے۔

واپسی پر ان کے جلوس کے آگے آگے دو شیر ڈنڈوں پر لٹکے لے جائے جارہے تھے اور ساتھ ہی فتح کے نقارے بجانے والے نقارے بجاتے چل رہے تھے۔ لکھنؤ پہنچنے کے بعد ایک بار پھر ہارڈنگ کی آمد کا جشن منایا گیا تھا۔ رات کو ضیافت کی محفل سجی تھی اور ہارڈنگ کی پسند کے کھانے بنائے گئے تھے۔ آدھی رات کے بعد جب خلقت خدا سو گئی تو لارڈ ہارڈنگ واجد علی شاہ کے کمرۂ خاص میں آیا جہاں پردے کے پیچھے صرف بیگم حضرت محل موجود تھی۔

''واجد علی شاہ!'' لارڈ ہارڈنگ نے سلطان عالم کو مخاطب کیا جو ان کے سامنے ایک تاج والی کرسی پر بیٹھے تھے اس سے پہلے کسی کی اتنی جرأت نہیں تھی کہ بادشاہ وقت کے سامنے یوں بیٹھے۔ اس کے سامنے والی کرسی پر واجد علی شاہ تھے جن پر نیند غالب آتی جارہی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' واجد علی شاہ نے پوچھا۔

''آپ تھک گئے ہیں آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔'' لارڈ ہارڈنگ نے کہا۔

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو، دو دن کے شکار نے ہمیں تھکا دیا ہے واقعی آرام کی ضرورت ہے۔''

''تو آپ آرام کریں...... ہم آپ کو لندن بھجوا دیتے ہیں...... وہاں دل بھر کر آرام کیجیے گا یہاں کا انتظام ہم سنبھال لیں گے۔'' لارڈ ہارڈنگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''معافی چاہتی ہوں لارڈ ہارڈنگ...... آپ ہمارے مہمان ہیں، آپ کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔'' پردے کے پیچھے سے بیگم حضرت محل نے اسے ٹوکا تو وہ چونکا۔

''اوہ...... بیگم صاحب...... رات کے اس پہر، آپ جاگ رہی ہیں؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''جی ہاں، مجھ پر صرف گھر کی نہیں بلکہ سلطنت کی بھی ذمّے داری ہے لارڈ ہارڈنگ، میں جانتی ہوں کہ جب گھر کے دروازے کھلے رہ جائیں تو چوہا بھی شیر ہوجاتا ہے۔ مجھے آپ کے طرزِ گفتگو پر اعتراض ہے۔''

''میں تو آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔'' لارڈ ہارڈنگ نے کہا۔

''ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ ہمارے مددگار ہیں لیکن ہمیں کب تک مدد درکار ہے یہ فیصلہ ہمارا ہوگا۔''

''آپ کو غلط فہمی ہے ملکہ، اب فیصلے کا اختیار آپ کا نہیں۔'' لارڈ ہارڈنگ نے کہا جبکہ واجد علی شاہ بے معنی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''میرا مشورہ ہے لارڈ ہارڈنگ کہ رات بہت ہوگئی ہے اور آپ بھی دو دن کے تھکے ہوئے ہیں آپ کی رہائش کے انتظامات محل کے الگ حصے میں کروادیئے گئے ہیں آپ تشریف لے جائیں آپ سے مزید گفتگو کل ہوگی۔'' بیگم حضرت محل نے تمکنت سے کہا اور لارڈ ہارڈنگ کرسی سے کھڑا ہوگیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اسے حضرت محل کی بات

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

پسند نہ آئی ہو۔

اس کے جاتے ہی حضرت محل نے تالی بجائی تھی اور زرق برق لباس پہنے ایک کنیز عمدہ پری کمرائے خاص میں داخل ہوئی تھی اور تعظیم بجالائی تھی۔ ''کیا حکم ملکہ عالیہ۔''

''میں چاہتی ہوں کہ برجس قدر کے استاد محترم مولوی غلام حضرت کو صبح مجھ سے ملنے کے لیے پیغام بھجوا دو اس کے بعد میں کچھ خاص پریوں سے بھی ملنا چاہوں گی۔ یاسمین پری، سلیمان پری، عزت پری، سلطان پری اور حور پری کو بھی پیغام دے دو۔'' حضرت محل نے کہا اور عمدہ پری واپس چلی گئی۔

بیگم حضرت محل نے جن پریوں کے نام لیے تھے ان کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ وہ ان کی وفادار ہیں۔ اکثر اوقات جب واجد علی شاہ اس سے ناراض ہوتے تھے تو یہ ساری پریاں بیگم حضرت محل کا ہی ساتھ دیتی تھیں۔ اب حضرت محل کے ذہن میں جو پلان بن رہا تھا اس کے لیے یہ پریاں نہایت مناسب تھیں۔ عمدہ پری سے فارغ ہونے کے بعد بیگم حضرت محل واجد علی شاہ کے قریب آئی تھیں جو اپنے بستر پر دراز ہو چکا تھا۔

''آپ نے کتنے آرام سے لارڈ ہارڈنگ کی بات سن لی؟ میں تو تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ آپ اسے کوئی سخت جواب نہیں دیں گے۔'' بیگم حضرت محل نے ناگواری سے کہا۔

''تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟'' واجد علی شاہ نے بے چارگی سے پوچھا۔

''کم از کم آپ کو اس کی پیش کش ٹھکرا دینا چاہیے تھی۔''

''تمہاری طرح؟ تم نے اسے جس طرح جواب دیئے ہیں وہ شدید غصے میں آ گیا ہوگا۔''

''ہمیں اس کے غصے سے کیا؟ وہ غدار ہے وہ یہاں تجارت کرنے آئے تھے اور حاکم بن بیٹھے۔'' بیگم حضرت محل نے غصے سے کہا۔

''تم ان کا مقابلہ کرلو گی؟'' واجد علی شاہ نے مایوس لہجے سے کہا۔

''کوشش تو کرنا چاہیے، جانور بھی اپنے منہ کا نوالہ کسی کو لڑے بغیر نہیں دیتا ہم تو انسان ہیں اور یہ سرزمین ہماری ماں جیسی ہے، ہماری پرکھوں کی ملکیت۔ وہ کون ہوتے ہیں ہماری مدد کرنے والے؟''

''وہ مدد ہی کا تو کہہ رہا تھا، قبضے کا تو نہیں؟''

''آپ کیوں نہیں سمجھتے وہ یہاں تجارت کرنے نہیں قبضہ کرنے آئے ہیں۔'' بیگم حضرت محل نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بات سچ ہے مگر ہماری اپنی بھی کچھ مجبوریاں ہیں ہم ان سے دشمنی نہیں چاہتے۔''

''مجھے آپ کی سوچ پر حیرت ہے آپ دیکھ رہے ہیں پورے ہندوستان میں کیا حال ہو رہا ہے۔ انگریز سپاہی جگہ جگہ تعینات کر دیئے گئے ہیں۔ ایک ایک کر کے وہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر قبضہ کرتے جا رہے ہیں۔ چاہے ہندو علاقہ ہو یا مسلم، ہر جگہ ان کا ایک ہی حال ہے بھلا وہ کس کس کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو کیوں؟''

''اس کا جواب میرے پاس نہیں میں صرف یہ جانتا ہوں کہ انگریزوں کی مخالفت ہمارے لیے ایسی مشکلات پیدا کر دیں گی جس کا ہمارے پاس کوئی حل نہیں ہوگا۔''

''میں یہ سب نہیں جانتی، جس طرح دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کی حکومتوں کو بے اثر کیا جا رہا ہے میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ آپ کو بھی میرا ساتھ دینا ہوگا۔''

''اپنی حد سے آگے مت نکلو، تمہارے پاس ایسا کرنے کا اختیار نہیں ہے۔''

''میں یہ سب نہیں جانتی صرف یہ جانتی ہوں کہ اگر کوئی مجھے تھپڑ مارے گا تو میں بھی پلٹ کر اتنی ہی طاقت سے اسے تھپڑ ماروں گی، میرا یہی قانون ہے۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے جو تمہارا دل چاہے کرو۔'' واجد علی شاہ نے کہا تو بیگم حضرت محل طمطماتی ہوئی وہاں سے چلی گئی وہ واجد علی شاہ سے ناراض ہو گئی تھی۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد نجم النساء پری خانے کی مدوع شدہ پریوں کے ساتھ حضرت محل کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اس کے ساتھ استاد محترم مولوی غلام حضرت بھی تھے۔

''خیریت ہے ملکہ سلطان آپ نے ہمیں کیسے یاد فرمایا؟'' استاد محترم نے بات شروع کی۔ بیگم حضرت محل ایک ادائے بے نیازی سے اپنے کیدارا (بڑی کرسی) سے اٹھی اور چلتی ہوئی ان لوگوں کے قریب پہنچ گئی۔ ''آپ کو ملک کے حالات کا تو اندازہ ہوگا ہی مولوی غلام حضرت؟''

''جی ملکہ میں جانتا ہوں۔''

''آپ کا کیا مشورہ ہے ان حالات میں کیا ہونا چاہیے؟''

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

''ہم انگریز کے خلاف مزاحمت کرنے کی پوزیشن ہیں نہیں ہیں ملکہ۔'' مولوی غلام حضرت نے جواب دیا جبکہ نجم النسا اور ان کے ساتھ آنے والی پریاں حیرت سے ملکہ کو دیکھ رہی تھیں۔ ''آپ جانتے ہیں کہ دوسرے شہروں کی طرح لکھنو میں بھی انگریزی ریذیڈنس مقرر ہے اور وہی یہاں احکامات چلاتا ہے اور اکثر یہاں دورے پر آتا رہتا ہے۔ ہر بار اس کا یہاں آنا کسی نہ کسی وجہ کا غماز ہوتا ہے۔ ہر بار وہ کوئی نیا قہر لے کر آتا ہے۔'' ملکہ نے کہا۔

''جی، انگریز سرکار کا یہی طریقہ واردات ہے اور ہر جگہ یہی کیا جا رہا ہے۔''

''کل لارڈ بہادر یہاں بھی تشریف لائے تھے۔ ہمارے دو پاگھ (شیر) شکار کرنے، اس کے بعد ان کی دعوت بھی کی گئی۔'' بیگم حضرت محل نے اعتراض والے انداز میں کہا۔

''لیکن ہم تو تابع غلام ہیں، اعتراض نہیں کر سکتے ملکہ۔''

''ہوں..... لیکن آنکھیں تو کھلی رکھ سکتے ہیں۔''

''بالکل رکھ سکتے ہیں۔ انگریز 1608ء میں تجارت کے نام پر یہاں آئے تھے۔ اب دو صدیاں گزر چکی ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ یہاں کے چپے چپے پر قبضہ کرتے جا رہے ہیں۔''

''ہمیں مزاحمت کرنا ہوگی، اسی طرح جس طرح دوسری جگہ کی جا رہی ہے۔''

''لیکن ہم کر کیا سکتے ہیں؟''

''کم از کم یہ تو کر سکتے ہیں کہ تخت شاہی اپنی مرضی سے اپنی پسند کے کمرے میں رکھیں یہاں تو ہمارے تخت کو رکھنے کے لیے کمرا بھی وہی منتخب کرتے ہیں۔''

''ارے حضرت محل آپ کا اشارہ پچھلے واقعے کی طرف ہے جب لارڈ صاحب نے سلطان عالم کو مشورہ دیا تھا کہ تخت شاہی بڑے ہال میں رکھا جائے وہ تو محض ایک دوستانہ مشورہ تھا۔''

''نہیں، جو اس وقت کے حالات ہیں ان کے پیش نظر میں ایسا نہیں سمجھتی اب ہم سے ہر وہ عمل کروایا جا رہا ہے جس سے اودھ میں ہمارا اختیار کم ہوتا چلا جائے۔''

''آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟''

''آپ کے ذمے بچوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ میری گزارش ہے انہیں پرکھوں کے کارنامے بتائیں اور ان میں اپنے وطن سے محبت کا جذبہ پیدا کریں۔''

''ٹھیک ہے۔''

''میں آپ کو پھر کبھی زحمت دوں گی اب آپ جا ہیں۔'' بیگم حضرت محل نے کہا اور ان کے جانے کے بعد النسا کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''نجم النسا، کیا یہ ضروری ہے خواتین کو ایک بے کار چیز کی طرح ایک پری خانے بنا سجا دیا جائے جبکہ وہ ہمارے لیے بہت اہم کردار ادا کر ہیں۔'' حضرت محل نے کہا تو نجم النسا چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

''ابھی تک تو تمام پریوں اور محلات کا مقصد رقص و سرور کی تربیت لینا اور محفلیں گرمانا ہی تھا۔''

''میں ایک اور کام آپ کے سپرد کرنا چاہتی ہوں ا مجھے پورا یقین ہے کہ آپ وفاداری سے یہ کام کریں گی۔''

''جو حکم ملکہ عالیہ۔''

''ان سب کو جاسوسی پر لگا دیں، یہ مردانے میں جائیں گی تو اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھیں گی اور وہاں ہونے والی ہر نئی بات جو انگریزوں یا ہماری حکومت کے وزیروں سے متعلق ہو وہ ان سے معلوم کر کے آپ مجھ تک پہنچائیں گی۔''

''میں اس کام کے لیے تیار ہوں ملکہ۔''

''بس فی الحال اتنا ہی، مزید میں پھر بتاؤں گی۔''

چند روز بعد نجم النسا خاصی گھبرائی ہوئی بیگم حضرت محل کے پاس آئی اور علیحدگی میں ملنے کی درخواست کی۔ ملکہ نے انہیں جملہ خاص میں بلوا لیا تھا۔

''کیا بات ہے نجم النسا خیریت؟'' حضرت محل نے پوچھا۔

''بہت اہم اطلاع ملی ہے ملکہ سلطان۔''

''کہو کیا اطلاع ہے؟''

''مہمان خانے میں ایک نیا مہمان آیا ہے، بتا رہا ہے کہ ملک کی بڑی عدالت میں جہاں ایک مقدمہ چل رہا تھا ایک ہندو نے جج پر حملہ کر دیا۔''

''کیا؟ حملہ کر دیا؟'' ملکہ نے حیرت سے دہرایا۔

''جی ملکہ، اس کا کہنا تھا کہ اس ہندو کو فوراً ہی گرفتار کر لیا گیا اس ہندو سے پوچھا گیا کہ اس نے حملہ کیوں کیا تو آپ کو پتا ہے اس ہندو نے کیا جواب دیا۔''

''کیا جواب دیا؟''

''اس نے کہا میں تمہیں بھگانا چاہتا ہوں۔ وہ انگریز

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

جج یہ سن کر بہت حیران ہوا اور اس نے کہا کہ مسلمانوں نے تم پر 800 سال حکومت کی تم نے ان کی حکومت میں تو کوئی حملہ نہیں کیا پھر تم نے مجھ پر کیوں حملہ کیا؟''

''پھر؟ پھر اس نے کیا جواب دیا؟'' ملکہ نے پوچھا۔

''اس نے کہا کہ مسلمانوں نے یہاں 800 سال حکومت کی وہ اپنے وطن چھوڑ کر یہاں آئے اور یہاں ہی رہ گئے ان کی نسلیں گزر گئیں انہوں نے یہاں سے جو کمایا وہ یہاں ہی لگایا اور ہندوستان کو سونے کی چڑیا بنا دیا۔ ہر قوم کے ساتھ انصاف کیا اور ان کے مذہب کا خیال رکھا اور مذہبی آزادی دی۔ ان کے درباروں میں مسلمان اور ہندو برابر تھے لیکن تم لوگوں نے 150 سال حکومت کی اور یہاں کی گنگا کے کنارے سے موتی چوس کر لے گئے اور دریائے ٹیمز میں انہیں جا کر نچوڑ دیا۔ تم یہاں کی ساری دولت لے جا رہے ہو۔''

''اس ہندو کی باتیں سچ ہیں نجم النسا دل کو لگتی ہیں۔ خدا رحم کرے نہ جانے کیا انجام ہوگا۔ انگریز اپنی حدوں سے بہت زیادہ آگے نکل گئے ہیں۔ میں نے سنا ہے اب وہ جگہ جگہ نئی سڑکیں بھی بنوا رہے ہیں، کنویں کھدوا رہے ہیں؟''

''ہاں یہ درست ہے ملکہ، جیسے جیسے وہ ریاستوں پر قبضہ کرتے جا رہے ہیں ویسے ویسے ترقیاں بھی کرتے جا رہے ہیں لیکن اُمید کی کرن ابھی باقی ہے ابھی ان کے خلاف نئی جگہوں پر مزاحمت ہو رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے نجم النسا، رات کو آنا میں تمہارے ساتھ اُودھا دیوی سے ملوں گی۔''

اُودھا دیوی نچلی ذات کی تھی جسے پاسی بھی کہتے ہیں۔ وہ لکھنو کے قریب اُجرلوی نامی گاؤں میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کی شادی مکا پاسی سے ہوئی تھی۔ وہ محمدی خانم کو ایک میلے میں ملی تھی۔ اس وقت محمدی خانم پری خانہ میں نئی نئی آئی تھی۔ دیگر خواتین کے ساتھ وہ میلہ گھومنے آگئی تھی۔ وہیں اس نے اُودھا دیوی کو دیکھا تھا جس نے تین شہدوں کی اکیلے پٹائی کی تھی۔ اس دور میں یہ ایک انوکھی بات تھی اسی لیے اس نے اُودھا دیوی کو دوست بنا لیا تھا۔ مسلمانوں کی نظروں میں نچلی ذات اور برھمن ایک تھے اس لیے اس نے ذات پات کو نظر انداز کر دیا تھا پھر اس کی ایک اور وجہ بھی تھی وہ خود بھی تو فروخت شدہ تھی۔ اس وقت تک صرف ایک رقاصہ تھی اس لیے وہ اودھا دیوی کے قریب آگئی تھی۔ اب جب وہ ملکہ اودھ کی مسند پر آ گئی پھر بھی وہ اسے بھولی نہیں تھی۔ اس وقت اس کے ذہن میں ایک نئی بات آئی تھی۔ کمپنی نے فوج رکھنے کی ممانعت کر رکھی تھی۔ وہ کمپنی کو چیلنج کرنا چاہتی تھی مگر اس طرح کہ کمپنی کو یقین نہ آئے اور فوج بھی تیار ہو جائے اسی سلسلے میں وہ اودھا دیوی سے ملنے کی تیاری کر رہی تھی۔

''میں حاضر ہو جاؤں گی ملکہ، آپ پر میری جان قربان آپ نے عورت ہو کر اتنی ہمت کی ہے اور آپ اس سلطنت کو درست راستے پر لانا چاہتی ہیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔''

''ٹھیک ہے، ابھی اس ذکر کو چھپا کر رکھنا، کسی سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''میں ایسا ہی کروں گی ملکہ۔''

نجم النسا کے جانے کے بعد حضرت محل نے لباس تبدیل کیا تھا۔ واجد علی شاہ سے ابھی تک اس کی ناراضگی چل رہی تھی۔ انہوں نے انگریزوں کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا تھا اور پری خانے کی مصروفیات جوں کی توں تھیں ان کی رقص و سرور کی محفلوں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی اور انگریز کا ذہن کچھ اور سوچ رہا تھا جس کی اطلاع اسے وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی تھی۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتی تھی کہ اس نے بروقت جاسوسی کے لیے لوگوں کو مقرر کر دیا تھا جس سے اسے تازہ صورتِ حال کا علم ہوتا رہتا تھا اور وہ ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے منصوبہ بنا سکتی تھی اس کا ذہن بڑی تیزی سے آنے والے وقت کے لیے تانے بانے بن رہا تھا آج اس کی دعوت واجد علی شاہ کی والدہ محترمہ کے محل میں تھی جہاں دوسرے محلات بھی مدعو تھیں۔ حضرت محل نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس تقریب میں نہیں جائے گی اور واجد علی شاہ کے ساتھ یہیں محل میں کھانا تناول فرمائے گی۔

''ہوشیار..... خبردار..... سلطان عالم تشریف لاتے ہیں۔'' اچانک ایک کنیز نے صدا لگائی۔ حضرت محل نے جلدی سے آئینے میں اپنے سراپے کا جائزہ لیا وہ آج فیروزی اور سنہرے لباس میں ہمیشہ سے زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ اس پر فیروزے جڑے سونے کا سیٹ اس کے حسن کو مزید نکھار رہا تھا۔ اس نے آپ ہی اپنی بلائیں لے لیں، اسی لمحے واجد علی شاہ کمرے میں داخل ہوئے۔

''کیسی ہو جانِ عالم۔'' واجد علی نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کی طرف بڑھے لیکن وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

WaqarAzeem
Pakistanipoint

''کیوں؟ خیریت؟ کیا ابھی تک ناراضگی برقرار ہے؟'' واجد علی شاہ نے پوچھا۔

''آپ نے بھی تو ابھی تک حکومتی انتظامات میں دلچسپی لی اور نہ ہی پری خانے سے دور ہوئے۔''

''اس سے تمہیں کیا فرق پڑتا ہے حضرت محل، تم میرے دل کی ملکہ ہو میرے ولی عہد کی ماں ہو تم سب سے افضل ہو۔'' واجد علی شاہ نے منانے والے انداز میں کہا۔

''ایسی افضلیت کا کیا فائدہ جب میرے کہے کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔'' حضرت محل اداسی سے بولی۔

''تمہیں خوامخواہ غلط فہمی ہے چلو اب روانگی پکڑو والدہ محترمہ انتظار کر رہی ہوں گی۔'' واجد علی شاہ نے کہا۔

''وہاں دوسری بیگمات بھی ہوں گی ممکن ہے رات کو آپ کا وہاں قیام ہو۔''

''کیوں؟ خیریت؟''

''بس ایک چھوٹی سی محفل کا اہتمام کیا گیا ہے۔''

''میں نہیں جاؤں گی۔''

''کیوں؟''

''آپ جانتے ہیں پری خانے میں رہنے والی ساری ہی بیگمات مجھ سے چڑتی ہیں ان کا خیال ہے کہ میں نے ان کے مقام پر ڈاکا مارا ہے۔''

''ایسا سوچنا غلط ہے میں نے تمہیں خود منتخب کیا ہے اور ملکہ کا درجہ دیا ہے۔''

''لیکن وہ ایسا نہیں سمجھتیں۔''

''آپ ان کی پرواہ مت کریں بس میری خاطر چلیں۔'' واجد علی شاہ نے کہا تو حضرت محل نے سوچا کہ اسے بزدلی کا ثبوت نہیں دینا چاہیے اگر وہاں صورتِ حال کچھ بگڑی تو وہ اسی انداز سے نمٹ لے گی پھر کسی خیال سے اس نے روانگی سے پہلے ایک خنجر اپنے لباس کے نیچے چھپا لیا تاکہ وقت ضرورت کام آسکے۔

محفل کے دوران پری خانے کی خاص بیگمات اس پر جملے کستی رہیں۔ وہ کافی دیر تک نظر انداز کرتی رہی بالآخر روانگی کا وقت آگیا۔ وقت رخصت واجد علی شاہ اپنی والدہ کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوئے اور رخصت کی اجازت چاہی۔

''میں بھی واپس چلوں گی۔'' حضرت محل نے موقع دیکھ کر فرمائش کردی۔

''لیکن میں نے آپ کو بتایا تھا کہ رات کو قیام ہوگا۔''

''لیکن میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔'' حضرت محل نے فوراً جواب دیا اور واجد علی شاہ اسے واپس لے جانے کے لیے تیار ہوگئے ان کے ساتھ حضرت محل بھی تانجان (پالکی) میں سوار ہوگئی اور ان کے داہنی جانب بیٹھ گئی یہ بات کئی پریوں سے برداشت نہ ہوئی اور انہوں نے کہاروں کے ڈولی اٹھاتے ہی حضرت محل کو کھینچ کر نیچے گرادیا، کئی عورتوں نے آگے بڑھ کر تانجان کو گھیرے میں لے لیا۔ معشوقہ سلطان چاہتی تھی کہ کوڑے کا تسمہ حضرت محل کے گلے میں ڈال کر انہیں گھسیٹے لیکن اسی وقت حضرت محل نے اپنے لباس میں چھپا ہوا خنجر نکال لیا۔ سب عورتیں یہ دیکھ کر پیچھے ہٹ گئیں۔

''ہٹو ہٹو..... پیچھے ہٹو۔'' کہاروں نے جلدی سے تانجان نیچے رکھ دیا اور عورتوں کو ہٹانے لگے۔

''کیا بات ہے..... کیا مسئلہ ہے۔'' اچانک واجد علی شاہ کی والدہ قیصر بیگم سامنے آئیں اور وہاں موجود عورتوں کو ہٹایا اور حضرت محل کو تانجان میں سوار ہونے میں مدد دی۔

''اسے باقی بیگمات سے الگ رکھا کرو مجھے اندازہ ہو رہا ہے وہ سب اس سے حسد کرتی ہیں اور یہ تمہاری ولی عہد کی ماں ہے تمہیں بہرحال اس کی حفاظت کرنا ہے۔''

اس دن کے بعد سے واجد علی شاہ نے کبھی حضرت محل کو پری خانے جانے کے لیے نہیں کہا اور نہ ہی ایسی صورتِ حال پیدا ہونے دی کہ پھر ایسی حرکت کوئی کرسکے۔ دیگر بیگمات کی نظریں اپنے مفاد پر ٹکی تھیں۔ وہ صرف یہ دیکھ رہی تھیں کہ واجد علی شاہ کی نظریں ان پر رہیں تو یہ محفل یہ عیش و آرام ان کا ہے جبکہ حضرت محل کی نظریں کچھ اور دیکھ رہی تھیں۔ اس کی کوشش تھی کہ واجد علی شاہ مصروفیات چھوڑ کر مملکت کے کاموں میں دلچسپی لیں لیکن اسے کامیابی نہیں ملی۔ واجد علی شاہ کے اندر اتنی ٹوٹ پھوٹ ہوچکی تھی کہ وہ سانس لے رہے ہیں یہی بہت ہے۔ حضرت محل دیکھ رہی تھی کہ ان کے ہاتھ سے تمام اختیارات آہستہ آہستہ کمپنی بہادر لیتے جا رہے تھے۔ نہ وہ کسی کو کسی شعبے میں رکھ سکتے تھے اور نہ نکال سکتے تھے۔ درباری جو تھے جتنے تھے ان کی تعداد کم زیادہ کرنے کا ان کے پاس کوئی اختیار نہ تھا۔ اپنی حفاظت کے لیے بھی وہ کسی کو محل میں بلانے کا اختیار نہیں رکھتے تھے۔ خزانہ تھا مگر خالی تھا۔ اخراجات کے لیے انہیں کمپنی سے رجوع کرنا پڑتا تھا۔ ایسی صورتِ حال ہر ریاست کے حکمران کو درپیش تھی۔ بہادر علی شاہ ظفر نے خود کو ادب و فن میں ڈبو دیا تھا۔ امور

Wadat Azeem
Pakistanipoint.com

سلطنت کا اختیار چھن جانے کے عذاب کو شعر و شاعری میں ڈبو دیا تھا اسی طرح واجد علی شاہ نے بھی اپنے ٹوٹتے بکھرتے وجود کو رقص و موسیقی میں ڈبو دیا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ پنج وقتہ نمازی بھی تھا اور ماہر موسیقی بھی۔ قرآن بھی پڑھتا تھا اور رقص بھی پسند کرتا تھا۔ اس کی جدوجہد اپنی کم مائیگی کا احساس ہی تھا جو اسے دوہری زندگی جینے پر مجبور کر رہا تھا لیکن یہ باتیں حضرت محل کو ناگوار گزر رہی تھیں۔

وعدے کے مطابق وہ رات کے اندھیرے میں سیاہ چادر اوڑھ کر نجم النسا کے ساتھ اودھا دیوی سے ملنے گئی اور اس کی کئی باتوں سے حضرت محل نے اندازہ لگایا کہ وہ مملکت کی بقا کے لیے سنجیدہ ہے۔

''میرا خیال ہے میرے یہاں آنے پر تمہیں حیرت نہیں ہوئی ہوگی۔'' حضرت محل نے اُودھا سے پوچھا۔

''جی ملکہ عالیہ، میں آپ کی آمد کی وجہ سمجھ گئی ہوں۔''

''کیا وجہ سمجھیں ہو؟'' حضرت محل نے اسے آزمانے کے لیے پوچھا۔

''ملکی حالات پر آپ کی تفتیش اور سلطنت کے کاموں میں دلچسپی نے مجھ پر کچھ حقیقت آشکار کردی ہے۔'' اُودھا نے جواب دیا۔

''کیا تمہاری دور اندیش نظریں وہ کچھ دیکھ رہی ہیں جو میں دیکھ رہی ہوں۔''

''جی ملکہ عالیہ۔''

''تو پھر تمہارا کیا مشورہ ہے قومی نقطۂ نظر سے؟''

''ہمیں مستقبل میں آنے والی تبدیلیوں کے لیے خود کو تیار کرنا ہوگا۔''

''بہت خوب، اگر میں تم سے تمہاری وفاداری کا ثبوت مانگوں؟''

''وقت آنے پر میں اپنی جان بھی اس سلطنت پر قربان کردوں گی۔''

''ٹھیک ہے، میرے پاس تمہاری دی گئی اس تسلی پر بھروسا کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے دہلی کے بعد اودھ کی حکومت بھی اہم ہے۔ وہ اس پر نظر رکھے ہیں۔ کوئی ریاست ان کی ہوس سے محفوظ نہیں ہمارا لکھنو تجارت، شعر و ادب کا مرکز ہے۔ ہماری دولت اور بادشاہت ان کی نظروں میں کھٹک رہی ہے۔ ہم ان کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرسکتے۔ ہمارے سلطان عالم ان کی مرضی کے بغیر کوئی حکم جاری نہیں کرسکتے۔ تاریخ گواہ ہے کہ نواب شجاع الدولہ نے انگریزوں کے سامنے جھکنے سے انکار کردیا تھا اور میدانِ جنگ میں ان کا بھرپور مقابلہ کیا تھا۔ بکسر کی جنگ وہ جیت نہ سکے مگر تاریخ میں نام کمالیا۔''

''ہاں، اور ان کے بعد سات حکمران آئے لیکن وہ بھی کبھی جیت نہ سکے۔ ہم ایک کٹھ پتلی حکومت بن کر رہ گئے تھے۔'' اودھا نے کہا۔ ''کیا اب ہم کبھی پھر اپنی حکومت کا وہی عروج دیکھ سکیں گے؟''

''کیوں نہیں، ضرور دیکھیں گے۔'' حضرت محل نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''انگریزوں کو یقین ہوگیا ہے کہ اودھ ان کے ہاتھوں میں ہے اور ان کا یہ یقین ہی خاک میں ملادوں گی۔''

''ہم تنہا ہیں، تقریباً ساری ریاستیں اپنی اپنی جنگ لڑ رہی ہیں اور ہمارے فوجی بھی ستم ظریفی زمانہ کا شکار ہیں۔ ان میں کبوتر بازی، مرغ بازی، شطرنج بازی، پتنگ بازی رچی بسی ہے۔ زیادہ سے زیادہ شراب و کباب یا رقص و سرور کے دلدادہ ہیں۔ ان میں لڑنے کا جذبہ ہی نہیں؟''

''میں اس لیے آپ کے پاس آئی ہوں آپ کو ایک ذمے داری دے رہی ہوں، آپ نجم النسا سے بھی بات کیجیے گا اور میں بھی انہیں ہدایت کروں گی اندر ہی اندر آپ کو عورتوں کی فوج بنانا ہے۔ ان عورتوں کی جن میں بہادری اور اپنے وطن سے محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہو، میں ان کے زور پر یہ فتح حاصل کروں گی۔''

''اتنا بڑا کام چھپ چھپا کر نہیں ہوسکتا ملکہ عالیہ۔'' اودھا نے تشویشی انداز میں کہا۔

''میں جانتی ہوں لیکن شروع میں کوشش کریں کہ خفیہ رہے، جب بات کھل جائے گی تو دیکھا جائے گا۔ مجھے یقین ہے فرنگی عورتوں کی فوج کا سن کر مسکرا دیں گے۔ وہ اسے دل بستگی کا سامان سمجھیں گے۔ عورتوں سے انہیں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوگا۔''

چند روز بعد اودھا تنہائی میں حضرت محل سے ملی تھی وہ بڑی عجلت میں تھی۔ اس نے ایک عجیب خبر ملکہ کو دی تھی جسے سن کر وہ حیران رہ گئی تھی اور اسے اُمید بندھی تھی کہ شاید اب وہ لوگ انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوجائیں گے۔

''بڑی پکی خبر ملی ہے ملکہ، جھانسی میں ایک دریا کے کنارے ایک فقیر کی چھوٹی سی کٹیا میں چند لوگوں نے ایک تنظیم کا آغاز کیا ہے اسے ''روٹی'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں جاتی کے لوگ شامل ہیں۔''

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اُودھا نے رازداری سے بتایا۔

''ان کا مقصد؟'' ملکہ نے پوچھا

''انگریزوں کو ملک سے نکال دینا۔''

''ان کا طریقہ کار کیا ہوگا؟''

''ابھی تو وہ ملک کے سارے شہروں میں اپنے قاصد بھیج رہے ہیں۔ ہر قاصد ایک رومال میں ایک روٹی اور ایک پرچہ باندھ کر لے جاتا ہے اور لوگوں کو دیتا ہے۔ لوگ اکثریت سے اس تنظیم میں شامل ہو رہے ہیں۔''

''لیکن ایسی کونسی چیز ہے جس نے انہیں انگریزوں کے خلاف اکٹھا کر دیا ہے؟''

''ان کا بڑھتا ہوا ظلم۔''

''اب یہ جدوجہد نہیں رکے گی۔'' حضرت محل نے کہا اس کی آنکھوں میں عجیب چمک تھی۔ ''میں نے عورتوں کی فوج کی جو بات کی تھی اس کا کیا ہوا؟''

''اس پر کام شروع ہو گیا ہے۔ ہم نے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں اس کی مشقیں شروع کروا دی ہیں۔''

''بہت خوب، وقت پڑنے پر اس فوج کی کمان میں خود سنبھالوں گی۔'' حضرت محل نے کہا اور اودھا اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ ''ہاں، اس میں کوئی شک نہیں..... میں نے لڑنے کے سارے انداز سیکھے ہوئے ہیں اور اب میں ان مشقوں میں بھی حصہ لیا کروں گی۔''

پھر ایسا ہی ہوا تھا حضرت محل نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے تفکرانہ فیصلوں سے خواتین کی مہارتیں بڑھائی تھیں یہ سب بہت خاموشی سے ہو رہا تھا اور پھر وہ وقت آیا جب جنرل ولیم واجد علی شاہ کے دربار میں پہنچ گیا۔

''سلامتی ہو شاہ معظم آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' جنرل ولیم نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں کیونکہ ابھی تک آپ کی طرف سے اچھی صحت کی ممانعت نہیں کی گئی۔'' واجد علی نے طنزیہ کہا۔

''ہمیں ہمیشہ آپ کی اور آپ کے معاملات کی فکر رہتی ہے محترم شاہ اودھ۔''

''کیا آپ کو ہماری رعایا سے کوئی پریشانی ہے؟ کیا وہ آپ سے شکایت کرنے گئی تھی کہ واجد علی شاہ کو ہٹا کر اودھ کی حکومت خود سنبھال لیں لاٹ صاحب؟''

''ہمیں حیرت ہے کہ شاہِ معظم خود ہی اپنے مسائل بتا رہے ہیں، دراصل آپ کی توجہ ناچ گانے، عورتوں اور دوسرے مشاغل پر ہے جس کی وجہ سے آپ سلطنت کے

کسی بات پر دو لڑکے آپس میں الجھ پڑے۔ گتھم گتھا ہوئے۔ ایک نے دوسرے کو فرش پر پٹخ دیا۔ اسی دوران برآمدے میں سے ہیڈ ماسٹر صاحب کا گزر ہوا۔ اندر آئے۔ حسب معمول مولا بخش (ڈنڈا) ہاتھ میں تھا۔ وہ اسے بگڑوں تگڑوں کا پیر کہتے تھے۔ ان دنوں مار اور پیار دونوں تعلیمی کلچر کا لازمی جزو تھے۔ ہیڈ ماسٹر کی آمد سے سارے بچے کانپنے لگے۔ ہر ایک نے سوچا کہ آج الطاف کی خیر نہیں چونکہ جس لڑکے کے سینے پر وہ سوار تھا وہ ہیڈ ماسٹر کا اپنا نور چشم (بیٹا) تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے دونوں کو کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔ الطاف کو ہتھیلیاں بڑھانے کا حکم دیا۔ دونوں پر ایک ایک زوردار ڈنڈا پڑا، پھر رخ روشن حیات کی طرف پھرا۔ برابر کے دو ڈنڈے پڑے تو سبھی نے دل ہی دل میں ''عدل انوری'' کی داد دی۔ معاملہ مگر یہیں ختم نہیں ہوا۔ حیات کو پھر سے ہاتھ بڑھانے کا حکم ہوا اور دو اور ڈنڈے پڑے پھر ارشاد ہوا ''دو اس لیے کہ بدنظمی کا ارتکاب کیا تھا اور دو اس لیے کہ بیچ پڑے تھے۔'' شاید ان اضافی ڈنڈوں کی برکت تھی کہ ملک محمد حیات پڑھتا ہی گیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم ایس سی کی اور محکمہ جنگلات میں افسری کے اعلیٰ مدارج تک جا پہنچا۔ الطاف اسکول سے اٹھا تو زمانہ کی گرد میں یوں گم ہوا کہ اپنے آبائی گاؤں کی نذر ہو گیا۔ استاد کے دو ڈنڈے اور پڑ جاتے تو کیا خبر اسے بھی چار چاند لگ گئے ہوتے۔

اقتباس: نرالے لوگ۔ از: جیون خان

کاموں پر دھیان نہیں دیتے ہیں۔''

''کیوں ڈھونگ رچاتے ہیں؟ آپ کو تو صرف زیادہ آمدنی چاہیے، اودھ کی دیوان خود سنبھال کر آپ اپنے خزانے بھریں گے لاٹ صاحب! آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم نے ناچ گانے میں پناہ کیوں لی۔''

''آپ کے پاس دو سال کا وقت تھا کہ آپ اپنے معاملات سنبھال لیں۔'' جنرل نے غصے سے کہا۔

''یہ حق کس نے دیا آپ کو کہ آپ ہم سے جواب طلب کریں؟'' واجد علی شاہ نے پوچھا۔

''کمپنی نے اندازہ لگایا ہے کہ اودھ میں سب کچھ

Nazar Azeem
Pakistanipoint.com

ٹھیک نہیں چل رہا، ہم انسانی ہمدردی کی بنیاد پر فیصلہ کرتے ہیں۔ ہمارے کچھ سپاہی مارے گئے ہیں۔''

''مرنے والے کمپنی بہادر کے سپاہی تھے جن کی تنخواہیں آپ ہم سے دلواتے ہیں، زبردستی کی جو رقمیں وصول کی جاتی ہیں وہ صرف آپ کے کہنے پر۔ رعایا ناخوش ہے تو اس کے قصوروار بھی آپ ہیں۔'' نواب نے غصے میں جنرل ولیم کو آئینہ دکھادیا۔

''اب اس پر بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''ہاں فائدہ اس لیے نہیں کہ آپ پوری تیاری کے ساتھ آئے ہیں۔ ہم اگر مقابلے کی بات کریں گے تو آپ لکھنو میں قتل عام کا حکم دے دیں گے۔''

''تو پھر میں کہوں گا کہ ہمیں امن سے رہتے ہوئے فیصلہ کرلینا چاہیے شاہ معظم، مجھے آپ کے پاس بھیجا گیا ہے کہ میں آپ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے پیشکش کروں کہ آپ یہاں سے کلکتہ چلے جائیں جہاں آپ کو دو لاکھ روپے کی پنشن دی جائے گی کیا۔ میں آپ کو منظوری کے لیے معاہدہ پیش کروں شاہ معظم؟'' کرنل نے فارم واجد علی شاہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''معاہدہ؟ معاہدہ تو برابر کی بنیاد پر پیش کیا جاتا ہے جبکہ یہاں ایسا نہیں، آپ کی جو مرضی وہ کردیجیے جب مجھے کوئی اختیار ہی نہیں۔'' واجد علی شاہ نے کہا۔ ''میری کمپنی بہادر سے یہ خواہش ہے کہ ایک بار اپنے فیصلے پر پھر سے غور کرے۔''

سلطنت اودھ کوئی اتنی چھوٹی سلطنت نہ تھی کہ اس کے حکمران نواب واجد علی شاہ کو بہ آسانی گرفتار کرلیا جاتا۔ لیکن مقابل بھی کم شاطر نہ تھا۔ بنگال کے حاکم نواب سراج الدولہ کی فوج میں غدار شامل کیے۔ میر جعفر کو خریدا اور پھر پلاسی کی جنگ میں نواب کو شکست دے دی۔ فرار ہونے والے نواب کو 2 مئی 1757ء کے دن شہید کردیا پھر وہی کھیل سرنگا پٹنم میں ٹیپو سلطان کے ساتھ کھیلا اور 4 مئی 1799ء کے دن ٹیپو سلطان کو جنگ کے دوران شہید کیا۔ ان دو بڑے حکمرانوں کی شکست کے بعد دیگر حکمران گھبرا اٹھے اور انہوں نے انگریزوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ انگریز جو حکم دیتے وہی ہوتا۔ اودھ اور دیگر حکمرانوں کو کہا گیا کہ اپنی فوجیں ختم کردیں۔ آپ کی حفاظت ہم کریں گے تاکہ آپ کی رقم بچی رہے۔ افواج پر جو خرچ آتا ہے اس کا ایک چوتھائی ہمیں دیں۔ تقریباً تمام نوابین، راجے مہاراجے، بشمول بہادر شاہ ظفر نے فوج ختم کردی تھی۔ سلطنت اودھ کے پاس بھی فوج نہ تھی۔ نویں تاج پوشی سے دو دن قبل 11 فروری 1856ء کو ولیم کا حکم ملا کہ آپ کو کلکتہ جاکر فورٹ ولیم میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے بڑوں سے ملاقات کرنی پڑے گی۔ واجد علی شاہ تقریبات چھوڑ کر کلکتہ روانہ ہوگئے.... کیونکہ انکار کی صورت میں لکھنو کی سڑکیں سرخ ہوجاتیں۔ نہتے عوام مارے جاتے انہیں بچانے کے لیے فوج جو نہ تھی اسی وجہ سے نواب نے سر تسلیم خم کردیا تھا کہ رعایا کا نقصان نہ ہو۔

واجد علی شاہ نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ لندن جاکر برطانیہ کی حکومت سے شکایت کریں گے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا لیکن ایسا نہ ہوسکا انگریزوں نے انہیں کلکتہ سے باہر واقع ٹمیا برج قلعے میں نظر بند کردیا۔ اس زمانے میں واجد علی شاہ کی بیگمات میں سے اختر محل کے یہاں سے روزانہ ایک دسترخوان کھانے کا اور پانچ گلوریاں پان کی آتی تھیں۔ واجد علی شاہ نے قید ہونے کے باوجود انہیں تیس ہزار روپے نقد انعام عطا کیے آخری ایام میں انہوں نے یہ اشعار کہے۔

نہ بھیجی کسی نے مجھے کوئی چیز
کسی نے نہ کی دوستی کی تمیز
مگر ہاں اک اختر محل ہے لئیق
وہ زنداں میں میری ہوئی رفیق
رکھے موئے سر اپنے دل کے قریں
یہ سمجھا کہ دل میں ہے وہ مہ جبیں
وہ پہنچاتی ہے مجھ کو خوان طعام
جو آتا ہے ہر روز اے نیک نام

واجد علی شاہ کی گرفتاری کے بعد لکھنو کی مسند شاہی خالی ہوگئی جسے حالات دیکھتے ہوئے خالی چھوڑا نہیں جاسکتا تھا۔ بیگم حضرت محل ان لوگوں سے بہت مختلف تھیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ عورت کا تعلق صرف حرم، مطبخ یا گھر کے کاموں سے ہی ہوتا ہے اس کا ماننا تھا کہ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو انفرادی صلاحیتیں رکھتے ہیں اور ثابت کردیتے ہیں کہ ان میں ایک رہنما بننے کی پوری صلاحیت ہے چنانچہ ملکہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس نے پیروں میں بندھے گھنگرو اتار کر پھینک دیئے اور پوچھنے پر بتایا کہ وہ اب اس فن کو مزید جاری نہیں رکھنا چاہتی کیونکہ اس میں اس کی عزت نہیں ہے۔

وہ بہت سی صلاحیتوں کا مجموعہ تھی، بہت خوبصورت،

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ذہین اور بہادر تھی۔ لکھنو میں اس کی خفیہ سرگرمیاں اسے باہمت ثابت کر چکی تھیں۔ لوگ اسے اپنی نجات کا ذریعہ سمجھنے لگے تھے۔ واجد علی شاہ کی گرفتاری اور بیگموں کے محل چھوڑ جانے کے حکم کے باوجود محل میں رہ جانا اس بات کی دلیل تھی کہ وہ سلطنت چھوڑنا نہیں چاہتی تھی پھر اس نے ایک مدبرانہ فیصلہ کیا۔

''اُودھا، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں تختِ سلطنت کو خالی نہیں چھوڑوں گی۔''

''تو آپ کیا کریں گی ملکہ۔'' اودھا نے پوچھا۔

''میں ولی عہد شہزادہ برجیس قدر کی تاج پوشی کروں گی۔ انہیں ان کے والد کا جانشین بناؤں گی۔'' حضرت محل نے پُرعزم انداز میں کہا۔

''لیکن انگریز اسے پسند نہیں کریں گے وہ مزاحمت ضرور کریں گے۔''

''میں جانتی ہوں، مجھے اس کا اندازہ ہے میں نے عورتوں کی فوج بے مقصد تو نہیں بنائی ہے۔'' ملکہ نے ایک دبدبے سے کہا۔ ''اب وقت آگیا ہے اس فوج کو سامنے لائیں گے۔ اب سب کی فوجی وردی تیار کروائی جائے۔''

''وہ وردی کیسی ہوگی ملکہ؟''

''بالکل مردوں جیسی..... جیسی ہمارے مرد فوجی پہنتے ہیں وہی وردی تاکہ کوئی نہ پہچان سکے۔''

''ٹھیک ہے، سلطنت کے بارے میں آپ کیا کہتی ہیں، کچھ ہی دن جا رہے ہیں کہ لکھنو ریذیڈنسی والے خود حکمرانوں کی طرح اپنا حکم جاری کریں گے۔ تختِ شاہی خالی ہے، ولی عہد مقرر کر کے اس کی تاج پوشی کرنا ہوگی اور حکومت کا اعلان کرنا ہوگا تاکہ عوام و خواص کو خبر ہو جائے۔'' اودھا نے کہا۔

''بالکل یہ کام کرنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔'' حضرت محل نے جواب دیا۔

دوسرے روز قیصر باغ (محل) کے باہر کچھ رعیت کے لوگ جمع ہو گئے تھے یہ وہ لوگ تھے جن کے کاروبار فرنگیوں نے برباد کروا دیے تھے اور ان لوگوں کو بھوکے مرنے کی نوبت آگئی تھی وہ سب ملکہ کے نام کے نعرے لگا رہے تھے اور فریادی انداز میں اسے پکار رہے تھے چند ہی لمحوں بعد بیگم حضرت محل پیلے رنگ کے لباس میں چند درباریوں کے ساتھ محل کی بالکنی میں نمودار ہوئی۔ اس کے چہرے پر ایک تمکنت تھی سر فخریہ انداز میں بلند تھا اور آنکھوں میں اُمید کی شمعیں روشن تھیں۔

''مہربانی کر کے آپ لوگ خاموش ہو جائیے..... خاموش ہو جائیے۔'' حضرت محل کے ایک کارندے نے ہاتھ اٹھا کر لوگوں سے کہا۔ بالکنی کے نیچے نیزہ بردار پہرے دار کھڑے تھے جن کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

''آپ سب کی بات سنی جائے گی..... آپ سب مہربانی کر کے خاموش ہو جائیے۔''

''ہمارا کیا ہوگا ہم تو خالی بیٹھے ہیں۔'' ایک فریادی نے کہا وہ روتا جا رہا تھا۔

''ہمارا سارا سامان فرنگی اب انگلستان بھیج دیتے ہیں، ہمیں بچا کھچا ملتا ہے۔ ہمیں چیز کی لاگت بھی نہیں ملتی۔ ہم کیا کریں ہمارے بچے بھوکے مر رہے ہیں۔'' دوسرے نے کہا۔

''جان عالم نے ہمارے لیے کچھ بھی نہیں کیا اب ہم کیا کریں۔'' تیسرے نے واجد علی شاہ کی شکایت کی۔

''دیکھیں انہوں نے اپنی طرف سے کوشش کی۔'' کارندے نے جواب دیا۔ اسی وقت درباری کی آواز بلند ہوئی۔

''باادب..... باملاحظہ..... ہوشیار..... ملکہ اودھ..... بیگم حضرت محل تشریف لا رہی ہیں۔'' درباری کی آواز کے ساتھ بیگم حضرت محل بالکنی کی سیڑھیاں اترتی نیچے عوام کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی اس کے ساتھ اس کی کنیزیں بھی تھیں۔

''ملکہ، یہ لکھنو اور اس کے آس پاس کی رعایا ہے یہ اپنے حالات کے بارے میں آپ کو بتانے آئے ہیں اور بہت پریشان ہیں۔''

''اب آپ ہی کچھ کرو رانی صاحبہ، ہم کتنی ہی بار اس چوکھٹ کے چکر لگا چکے ہیں۔'' ایک شخص نے روتے ہوئے کہا۔

''انگریز ان لوگوں کے ساتھ یہ زیادتیاں کیوں کر رہے ہیں راجا صاحب۔'' حضرت محل نے وزیر سلطنت سے پوچھا۔

''جس معاہدے پر ہم نے لارڈ بیلے جلی کے ساتھ دستخط کیے تھے وہ اب ختم ہو چکا ہے اب لگان وصول کرنے کا حق انگریز کے پاس چلا گیا ہے بیگم صاحبہ۔''

''لیکن ان لوگوں کی روزی روزگار بند کرنے کا حق

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ان لوگوں کو کس نے دیا ہے؟''

''وہ سب کچھ اپنی مرضی سے کر رہے ہیں۔ انگلستان میں جو ملیں بن رہی ہیں ان کا سارا کچا مال یہیں سے جا رہا ہے اس طرح تو ہندوستان میں قحط پڑ جائے گا۔''

''آپ لوگ فکر مت کریں۔'' ملکہ نے کہا۔

''ملکہ صاحبہ ہم نے جان عالم کو بھی بتایا تھا۔'' اسی شخص نے کہا تو ملکہ نے پلٹ کر راجا کی طرف دیکھا۔

''کیوں راجا صاحب یہ بات سچ ہے تو جان عالم نے اس سلسلے میں کچھ کیا کیوں نہیں تھا۔''

''ملکہ صاحبہ انہوں نے ریذیڈنس سیکرٹری سے بات کی تھی لیکن ان کی اپیل کو نامنظور کر دیا گیا تھا۔''

''پھر آپ شاہی خزانے سے کچھ رقم نکلوا کر ان لوگوں میں بانٹ دیجئے ہم خود سلیمن کرنل سے بات کریں گے۔''

''گستاخی معاف ملکہ عالیہ ریذیڈنس سلیمن سے بات کیے بغیر رقم کہیں خرچ نہیں کی جائے بہتر یہی ہوگا۔''

''خیر ابھی ہم اتنے بھی مجبور نہیں ہوئے کہ اپنی رعایا کی مجبوری نہ سمجھ سکیں ہمارے سارے زیورات نکال کر ان لوگوں میں بٹوا دیے جائیں۔''

''رہنے دیں بیگم صاحبہ..... رہنے دیں..... ہم تو اسی میں خوش ہیں کہ آپ نے کم سے کم ہماری فریاد تو سن لی۔'' سامنے موجود فریادیوں میں سے ایک نے کہا۔

''خدا آپ کو بہت زیادہ دے..... خدا آپ کی عمر دراز کرے..... خدا آپ پر مہربان ہو۔'' مجمع کے لوگوں نے ہاتھ اٹھا اٹھا کر حضرت محل کو دعائیں دیں اور چلے گئے۔ حضرت محل اداس اور شرمندہ کھڑی رہی۔

''ہم بادشاہ، بادشاہت کا حق رکھتے ہوئے بھی بادشاہت کا حق نہیں رکھتے۔'' اس نے اداسی سے کہا۔

''لیکن اس طرح سے ہم کتنے لوگوں کی مدد کریں گے ملکہ صاحبہ؟''

''یہ باتیں بادشاہ اور ان کے وزیروں کے سوچنے کی ہیں راجا صاحب۔ یہ بھی نہ کریں تو کیا کرنے کی اُمید رکھتے ہیں آپ؟'' حضرت محل نے کہا اور چند لمحے خاموش رہی۔ اس نے ساتھ کھڑے وزیر کو آواز دی ''نقی خان'' تو وہ ایک قدم آگے آ گیا۔

''کیا حکم ملکہ عالیہ۔''

''ہم چاہتے ہیں کہ شاہی تخت فرح محل سے قیصر باغ میں اٹھوا لیا جائے۔''

''لیکن اس پر فرنگیوں کو اعتراض ہوگا۔''

''کیوں انہیں کیوں اعتراض ہوگا! کیا اب ہم یہ بھی ان سے پوچھیں گے کہ ہمیں اپنا کون سا سامان کہاں رکھنا ہے۔ آپ کچھ فکر نہ کریں شاہی تخت قیصر باغ میں منگوائیں۔''

''جو حکم ملکہ صاحبہ۔'' نقی خان نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

دو روز بعد قیصر باغ میں تخت شاہی سج گیا تھا اور حضرت محل کے حکم پر شہزادہ برجیس قدر کی تاج پوشی کر دی گئی تھی۔ اس موقع پر شہر کے امراء وزراء سب موجود تھے حضرت محل تخت پر برجیس قدر کے ساتھ موجود تھی اس موقع پر اس نے ایک اہم اعلان کیا تھا۔

''اودھا شہر میں اعلان کروا دیا جائے کہ حضرت محل اپنی رعایا کی حفاظت کرنے کے لیے مانا بن کر کھڑی ہے جو لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں وہ واپس آ جائیں۔ ہم نے ریاست واپس لے لی ہے۔'' حضرت محل نے کہا اور اسی وقت کرنل سلیمن اپنے چند سپاہیوں کے ساتھ دربار میں پہنچ گیا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے کڑک کر پوچھا اور حضرت محل نے قہر آلود نظروں سے اس کی طرف دیکھا ''تم یہ بتاؤ کہ بغیر اجازت دربار میں داخل کیسے ہوئے؟''

''کیا؟..... کیا کہا؟..... کیا تم نہیں جانتیں کہ اب یہاں کے مالک ہم ہیں۔'' سلیمن نے کڑک کر کہا۔

''کوئی سند..... کوئی گواہ..... کوئی معاہدہ؟'' حضرت محل نے پوچھا۔

''جان عالم ہمارے سامنے اپنا تاج پیش کر چکے ہیں۔''

''میں نہیں مانتی..... تم کون ہوتے ہو تاج یا تخت لینے والے؟''

''تم جانتی ہو، ہم سارے ہندوستان کے مالک ہیں۔''

''میں نہیں مانتی جاؤ جا کر اپنی سرکار سے کہہ دو کہ ان کی جارحیت کو حضرت محل نے ماننے سے انکار کر دیا ہے جو بگاڑ سکتے ہیں بگاڑ لیں۔'' حضرت محل کے لہجے میں غصہ بھرا تھا۔ ''میں لکھنؤ کی رانی ہوں تم ایک معمولی ریذیڈنس، تمہیں مجھ سے بات کرنے کا اختیار نہیں، میں اپنے برابر کے عہدہ دار سے بات کروں گی۔''

''آپ یہ بتائیں کہ تخت شاہی فرح محل سے قیصر باغ میں کیوں منگوایا گیا ہے۔''

''تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟ ہمارا تخت شاہی ہے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

تبت
ٹالکم پاؤڈر
اب 5 مسحور کن خوشبوؤں میں دستیاب
Waqar Azeem
Pakistanipoint.com
TIBET
Luxury
Talcum Powder
KOHINOOR CHEMICAL CO. (PVT.) LTD
KARACHI
TIBET
Classic
Talcum Powder
TIBET
TALCUM POWDER
TIBET
Select
Talcum Powder
TIBET
Award
Talcum Powder
تبت ٹالکم پاؤڈر - صبح سے شام مہکے مہکائے

اور ہماری مرضی ہم جہاں بھی رکھیں تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟ اپنی حد سے آگے مت بڑھو..... میں حکم دیتی ہوں یہاں سے چلے جاؤ۔ اب یہاں کا سلطان میرا بیٹا برجیس قدر ہے اور میں یہاں کی رانی ..... جاؤ چلے جاؤ..... یہاں تمہارے لیے کچھ نہیں اب اس طرف دیکھو تو سوچ سمجھ کر دیکھنا۔ تمہارے مقابلے پر حضرت محل ہے جس نے تم جیسوں کے آگے جھکنا نہیں سیکھا۔'' حضرت محفل نے کہا کرنل سلیمن پاؤں پٹختا چلا گیا۔

چند روز بعد بیگم حضرت محل مراٹھا کے فرمانروا نانا صاحب سے ملنے گئی۔ نانا صاحب کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور برطانوی سرکار نے انہیں فرمانروا ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ کان پور کے نزدیک بٹھور میں وقت گزار رہے تھے۔ حضرت محل کا استقبال کرنے نانا صاحب خود باہر تک آئے تھے۔

''آداب!'' حضرت محل نے ہاتھ اٹھا کر پیشانی پر رکھا۔ وہ سیاہ لباس میں ملبوس تھی۔

''کیسی گھڑی ہے کہ میں آپ کا سواگت بھی ٹھیک سے نہیں کر سکتا رانی صاحبہ۔'' نانا نے کہا۔

''میں سمجھتی ہوں کہ آپ کس کیفیت سے گزر رہے ہیں اور مجھے ماتا جی کے دل کی حالت کا بھی اندازہ ہے، انہیں بلا دیجیے میں آپ کے اور ان کے دکھ میں شامل ہونے آئی ہوں۔''

''معافی چاہتا ہوں لیکن ماتا جی تو یاترا پر گئی ہیں۔''

''اوہ، مالک ان کے من کو شانتی دے۔''

''من کی شانتی تو تب ملے گی جب ہم ان فرنگیوں کو ہندوستان سے باہر نکال دیں گے۔''

''میں آپ سے متفق ہوں اودھ آپ کے غم میں برابر کا شریک ہے، ہمیں افسوس اس بات کا ہے کہ فرنگیوں نے آپ کے والد پیشوا صاحب باجی راؤ کے ورثے میں بھی دخل اندازی کی۔''

''جی ہاں، پن دان کے لیے فرنگیوں نے ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی ہمیں برہمنوں کو دان دینے سے روک دیا۔ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا کہ میں اپنے باپ کی آتما کی شانتی کے لیے کچھ بھی دان نہ کر سکا۔ یہ کڑوا سچ ہے بیگم صاحبہ، اس دیش میں اب ہمارا کچھ بھی نہیں رہا، ہماری زمین، جایداد، کھیت، کھلیان سب پر یہ فرنگی قابض ہو گئے ہیں اور جو کچھ بچا ہے اسے بھی یہ مٹا دیں گے یا اس کی شکل اتنی بگاڑ دیں گے کہ ہماری آنے والی نسلیں اس کی شکل بھی نہ پہچان سکیں۔''

''ہمیں بھی اس بات کا احساس ہے، آج انہوں نے آپ کو پیشوا صاحب کی ورثے کی خیرات ادائیگی سے روکا ہے کل وہ ہم پر بھی پابندیاں لگائیں گے۔ ہماری مسجدوں اور تازیہ داری پر پابندی لگائیں گے۔''

''بالکل پابندی لگائیں گے ہم پر کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان الگ الگ قومیں ہیں، وہ ہمیں الگ الگ وار کر کے کمزور کرتے جائیں گے پھر اس کا فائدہ اٹھائیں گے۔''

''اس کے لیے ہمیں مل کر لڑنے کی ضرورت ہے میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اگر ہم مل کر جدوجہد کا آغاز کرتے ہیں تو آپ کی یہ بہن حضرت محل ہر موقع پر آپ کے ساتھ ہوگی۔''

''چلیے ہمیں منظور ہے ویسے فرنگیوں نے ایک نیک کام تو کیا۔'' نانا صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا؟''

''انہوں نے ہمیں آپ جیسی بہادر اور محبت کرنے والی بہن دے دی۔''

''نانا صاحب جیسا بھائی پا کر میں بھی اپنے آپ کو محفوظ پاتی ہوں۔'' حضرت محل نے کہا۔ ''اودھ اور ہمارے دل کے دروازے آپ پر ہمیشہ کھلے رہیں گے بھائی جان۔''

''شکریہ..... آپ لمبے سفر سے آئی ہیں آپ کے رکنے کا انتظام کرواتا ہوں۔''

''ہم یہاں زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتے نانا صاحب۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ فرنگیوں نے برجیس قدر کو بٹھور نہیں آنے دیا اور ہمارا آنا بھی انہیں ناگوار گزرے گا اب اجازت دیجیے خدا آپ سب کو اپنی امان میں رکھے۔'' حضرت محل نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گئیں۔

''ہندوستان کا ہر مسلمان اگر حضرت محل جیسا ہو جائے تو دھرم کے نام پر کبھی خون نہ بہے۔'' نانا صاحب نے زیر لب کہا۔

چند روز بعد انڈیا کا نیا گورنر جنرل ڈل ہوزی اودھ آیا اور اس نے نانا صاحب کو بھی ملنے کے لیے اودھ بلوایا۔ نانا صاحب اس سے ملنے اودھ کی ریذیڈنسی پہنچے تو ڈل ہوزی ریذیڈنسی میں بڑے ہال کمرے میں کرنل ہورڈنگ کے ساتھ کھڑا تھا اور اس کے سامنے میز پر انڈیا کا نقشہ کھلا تھا۔ اس نے

Wahar Azeem
Pakistanipoint

انڈیا کے نقشے میں لکھنو کے گرد دائرہ بنا کر ہورڈنگ کی طرف دیکھا۔

''پورا اودھ آپ کا ہے جنرل ڈل ہوزی۔'' ہورڈنگ نے کہا۔

''نہیں، صرف اودھ نہیں بلکہ پورا انڈیا ہمارا ہے۔'' ڈل ہوزی نے کہا اور اسی وقت ایک ملازم کمرے میں داخل ہوا۔

''میٹھور کے نانا صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے انہیں بھیج دو۔'' لارڈ ہارڈنگ نے کہا۔

''ویلکم یور ایکسی لینسی.....ویلکم نانا صاحب۔'' جیسے ہی نانا صاحب کمرے میں داخل ہوا ڈل ہوزی نے کہا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''میں ڈل ہوزی ہوں۔''

''گورنر جنرل آف ہندوستان۔'' نانا صاحب نے کہا۔

''نہیں.....نہیں.....نہیں.....گورنر جنرل آف یور ہارٹ۔'' جنرل ڈل ہوزی نے طنزیہ کہا۔

''دلوں کو تو آپ نے چھلنی کر دیا ہے مسٹر ڈل ہوزی۔'' نانا صاحب بولے۔

''آپ کو کیا شکوہ ہے نانا صاحب۔''

''آپ باپ اور بیٹے کے درمیان دیوار بن گئے ہیں۔''

''اس لیے نانا صاحب کہ باپ اور بیٹے کے بیچ اتنی جگہ تھی۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تم ان کے سگے بیٹے نہیں بلکہ منہ بولے بیٹے ہو کمپنی کو دھوکا دینے کے لیے آپ کو گود لیا گیا تھا۔''

''یہ سچ نہیں ڈل ہوزی صاحب بلکہ ہمارے ہاں اولاد نہ ہونا ایک بہت بڑی محرومی ہوتی ہے چنانچہ بچے گود لینا یہاں کی ایک رسم ہے۔''

''میں سمجھ سکتا ہوں لیکن یہ دیش ہمارا ابھی ہے۔''

''جس طرح سے ایک آدمی کی دو مائیں نہیں ہو سکتیں اسی طرح ایک آدمی کے دو وطن بھی نہیں ہو سکتے۔''

''نانا صاحب، آپ یقین کر لیں کہ اب ہندوستان ہمارا ہے۔''

''نہیں، ہندوستان نہ آپ کا تھا اور نہ ہے۔''

''آپ کا تو بٹھور بھی نہیں رہا نانا صاحب۔'' کرنل ہارڈنگ نے کہا۔ ''اور آپ کرنل صاحب سے وطن کی بات کرتے ہیں۔'' کرنل ہارڈنگ نے کہا تو نانا صاحب انہیں گھورنے لگے۔

''نانا صاحب آپ یہاں بیٹھیں۔'' ڈل ہوزی نے اپنے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور نانا صاحب ان کے نزدیک بیٹھ گئے۔

''نانا کا تمہیں احساس ہے کہ تم سب کچھ کھو چکے ہو تمہارے پاس نہ پیسا ہے نہ زمین ہے اور نہ کوئی عہدہ ہے۔''

''اسی لیے تو ہم آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

''نانا صاحب اگر آپ درخواست کرنے آئے ہیں تو درخواست ہی کے انداز میں بات کیجیے۔''

''ہم درخواست کرنے نہیں آئے ہیں مسٹر ڈل ہوزی، ہم اپنے حق کی بات کرنے آئے ہیں۔''

''یہ عدالت نہیں ہے نانا صاحب جہاں آپ جرح کریں۔''

''ہم نے تو سنا ہے کہ انگریز اپنے آپ کو بہت انصاف پسند کہتے ہیں۔''

''انصاف کیا گیا ہے، آپ کو یہاں آ کر اپنی بات کہنے کا موقع دیا گیا ہے۔''

''مگر اسے سنا نہیں گیا ہے، ہم سے یہ پوچھا نہیں گیا ہے کہ ہمیں درد کیا ہے؟''

''آپ کو زندگی کا فلسفہ پتا ہے نانا صاحب؟''

''میں آپ سے فلسفہ سیکھنے نہیں آیا ہوں، ہم آپ سے پوچھنے آئے ہیں کہ ہم سے ہماری زمین، جایداد سب کچھ کیوں چھین لیا گیا؟''

''اگر آپ حق سے پوچھ رہے ہیں تو جواب کچھ نہیں اور اگر آپ درخواست کر رہے ہیں تو جواب دیا جا سکتا ہے نانا صاحب، چلیں میں فرض کر لیتا ہوں کہ آپ درخواست کر رہے ہیں تو میرا جواب یہ ہے کہ میں آج اس بند کمرے میں آپ کو تاریخ بھی بتاتا ہوں۔ آپ کا زمین، پیسا اور عہدہ لینا غلط ہے غیر اخلاقی ہے۔ نہ صرف آپ کا بلکہ تمام راجاؤں کا یہ ایک بڑا دھوکا ہے۔ یہ ایک سیاسی جھوٹ ہے۔ ہم جب یہاں آئے تو مسلمان حکمران تھے، تم کہاں سے وطن والے بن گئے اب یہ ہمارا وطن ہے۔''

''اگر یہ بات ہے تو آپ اپنی وفاداریاں نبھائیں اور میں اپنی۔'' نانا صاحب نے کہا۔ ''میں اجازت چاہتا ہوں۔ مجھے اچھی لگی آپ کی ایمانداری، آپ نے مان تو لیا کہ آپ بے ایمانی کر رہے ہیں۔'' نانا صاحب نے کہا اور باہر نکل آیا۔

''سر، جب آپ کو اسے کچھ دینا ہی نہیں تھا تو آپ نے اسے بلوایا ہی کیوں تھا؟'' ہارڈنگ نے پوچھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

''ہم ہندوستان کا ٹمپریچر ناپ رہے تھے اور وہ بہت گرم ہو رہا ہے۔'' جنرل ڈل ہوزی نے کہا۔

واپسی پر نانا صاحب نے بیگم حضرت محل سے ملنے کی کوشش کی لیکن اسے انگریز جنرل نے روک دیا مجبوراً وہ ملاقات کیے بغیر واپس چلا گیا۔

جس وقت لارڈ ڈل ہوزی نے نانا صاحب کو نا اُمید کر کے اودھ سے واپس کیا تھا اسی وقت ریاست اودھ کی واجد علی شاہ کی ساٹھ ہزار فوج کو حضرت محل سے لے لیا تھا، اسے بے اختیار کر دیا تھا۔ جبکہ وہ تو پہلے ہی بے اختیار ریاست تھی۔ فوج کمپنی کی تنخواہ دار تھی اس لیے وہ کمپنی کا حکم مانتی تھی۔

ابھی یہ رسہ کشی چل ہی رہی تھی کہ بیرک پور کلکتہ میں 29 مارچ کے دن پریڈ پر جانے سے قبل منگل پانڈے نامی سپاہی نے بندوق ہاتھ میں لینے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس بندوق میں جو گولی ہے اس کے خول میں سور اور گائے کی چربی ہے۔ افسر نے غصے میں اس کو تماچا مارا تو اس نے افسر پر گولی چلا دی۔ افسر پر گولی چلانے کے بعد اس نے نال اپنے سینے پر رکھ کر پیر سے گھوڑا دبا دیا۔ وہ شدید زخمی ہوا۔ اس بغاوت پر انگریزوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ اسے اسپتال پہنچایا گیا۔ زخم مندمل ہوا تو اسے پھانسی دے دی گئی۔ یہ خبر ہر طرف پھیل گئی کہ منگل پانڈے چربی کی وجہ سے بندوق چلانے پر راضی نہ تھا۔ گائے ہندوؤں کے لیے مقدس اور سور مسلمانوں کے نزدیک حرام۔ انگریز پلٹن میں شامل تمام ہندو اور مسلمانوں نے انگلستان سے بھیجی گئی گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ کلکتہ سے پشاور تک کمپنی کی فوج میں شامل سپاہیوں نے ملازمت چھوڑنے کا عندیہ دے دیا۔ میرٹھ چھاؤنی کا انگریز رسال دار کچھ زیادہ ہی ظالم تھا اس نے فوجیوں پر تشدد کیا تو فوجیوں نے جواب میں بغاوت کر دی اور تمام افسران کو قتل کر دیا پھر یہ سپاہی شتر بے مہار کی طرح چھاؤنی سے نکلے۔ ان کا رخ دہلی کی طرف تھا۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ ہم کمپنی کی حکومت کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ ہمارا بادشاہ بہادر شاہ ظفر ہے۔

اس آواز پر پورا برصغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس موقع پر سب سے پہلے اہیر وال، ریواری ہریانہ کے راجا راؤ تولا رام سنگھ نے ان فوجیوں کے لیے بندوقیں اور کئی لاکھ نقد رقم بہادر شاہ ظفر کو بھیجی۔ جگہ جگہ پر انگریزوں کے خلاف جدوجہد ہونے لگی۔

مشرقی بنگال میں سید میر نثار علی عرف تیتو میر نے 1831ء میں خود ساختہ بانس کا قلعہ بنا کر انگریزوں کو للکارا تھا، بانس کی لاٹھیوں سے بندوق اور توپ کا مقابلہ کیا اور شہید ہوا۔ تیتو میر کی طرح 17 جون 1858ء میں گوالیار کے دینکر راؤ نے بھی انگریزوں کو للکارا تھا جسے انگریزوں نے غداروں کی مدد سے جنگ میں شکست دے کر گرفتار کیا اور بنارس لے جا کر شہید کر دیا۔ گویا چنگاریاں ہر طرف تھیں کہ اینفلڈ رائفل کا قضیہ کھڑا ہو گیا جس پر منگل پانڈے نے افسران پر گولیاں چلائیں، میرٹھ چھاؤنی میں بغاوت ہوئی ادھر دہلی میں بہادر شاہ ظفر کو بادشاہ مان کر انگریزوں کے خلاف جنگ شروع ہو گئی۔ اسی کے ساتھ آرا (بہار) کے راجا کنور سنگھ نے انگریزوں پر حملے شروع کر دیے۔ بریلی میں خان بہادر خان روحیلہ نے بھی بغاوت کا علم بلند کر کے انگریز چھاؤنی پر حملے کی ابتداء کر دی تبھی کان پور سے نانا صاحب نے حضرت محل کو پیغام بھجوایا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ مل کر فرنگیوں کا مقابلہ کیا جائے یہ پیغام نانا صاحب نے تاتیا جی ٹوپے کے ہاتھ بھجوایا۔

''میں تیار ہوں لیکن ان ظالموں نے ہماری فوج پر بھی قبضہ جما لیا ہے۔'' حضرت محل نے کہا۔

''بیگم صاحبہ! انہوں نے نواب صاحب کو یہاں سے نکالا ہے لیکن آپ کے خلاف وہ کچھ نہیں کر سکتے آپ با اختیار ہیں آپ کسی بھی حالت میں اودھ چھوڑ کر نہ جائیں۔'' تاتیا جی نے کہا۔

''میں اودھ کی ملکہ ہوں تاتیا بھائی میں بھلا کہاں جا سکتی ہوں۔''

''نانا صاحب کا کہنا ہے کہ آپ اور جھانسی کی رانی ان کی دو بہنیں ہیں اور نانا صاحب ان کے ساتھ ہیں اب مل کر جدوجہد کرنا ہو گی۔''

''ضرور، میں خود بھی یہی چاہتی ہوں۔'' حضرت محل نے کہا۔

آہستہ آہستہ مختلف ریاستوں کے راجا اور بہادر نوجوان اکٹھے ہوتے گئے۔ اب فیض آباد کے مولوی احمد شاہ، بٹھور کے نانا صاحب، دہلی کے بہادر شاہ ظفر اور اودھ کی حضرت محل کے علاوہ شنکر پور کے جاگیردار دیوی مالا سنگھ، چہلاری کے راجا بلیدر سنگھ، مکن کے جوالا پرشاد اور گونڈہ کے دیوی بخش سب ایک ہو گئے تھے اور فرنگیوں کے خلاف کارروائیاں شروع کر دی تھیں، فیض آباد کے مولوی احمد شاہ شہید ہو گئے لیکن جدوجہد چلتی رہی صورتِ حال یہ ہوتی تھی کہ جس طرح فرنگیوں نے انڈین رعیت کے خلاف جال بچھائے تھے اب یہ تھوڑے سے متحد لوگ بھی ان کی چالیں انہی کو لوٹا رہے تھے۔ ہوتے ہوتے یہ ایک مشترکہ جنگ بن گئی تھی۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

پھر جھانسی کی رانی پر قاتلانہ حملہ ہوا اور پیام آزادی کے اخبار میں اس کے ایڈیٹر عظیم اللہ نے یہ خبر تفصیل سے لگادی جس پر انگریز آپے سے باہر ہوگئے۔ عظیم اللہ بھی پیچھے مسلمان اور آزادی کے متوالے تھے یہاں سے وہ بھی اس تحریک کا حصہ بن گئے اور تحریک آزادی کے چھوٹے سے گروہ کو ان کی آواز کا ترجمان اخبار بھی مل گیا۔ اسی دوران فرنگیوں نے دلی دربار سے بہادر شاہ ظفر سلطان ہند کو گرفتار کرکے ان پر غداری کا مقدمہ چلا دیا۔ جنگ آزادی کے جوانوں نے کئی محاذوں پر الگ الگ لڑنا شروع کردیا۔ حضرت محل نے خواتین کی جو فوج بنائی تھی اور اپنی مردوں کی فوج کو ملا کر فرنگیوں کی لکھنو ریذیڈنس کو گھیر لیا اور حضرت محل کی فوج نے کامیابیاں حاصل کرنا شروع کردیں۔

وہ اپنی فوج کے ساتھ میدان میں اتری تھی اس فوج میں خواتین کی وہ فوج بھی شامل تھی جو اس نے بنائی تھی اور اودھا دیوی اس کی سپہ سالار تھی اس موقع پر اس نے اپنی فوج سے خطاب کیا اس کے سامنے اس کی فوج ہاتھیوں اور گھوڑوں پر سوار موجود تھی نیزہ باز، تلوار باز اور بندوقچی بھی ساتھ تھے وہ خود ایک ہاتھی پر سوار ان کے سامنے کھڑی تھی۔

''جان رکھو! اودھ ہمارا راج ہے اب ہم یہاں انگریزوں کو ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ میں اپنا راستہ دشمنوں کو چیر کر ان کے درمیان سے بنانا چاہتی ہوں، انہوں نے بارود پر چنگاری پھینکی ہے میں اس کے دھماکوں سے دشمن کو للکارنا چاہتی ہوں۔''

''نعرہ تکبیر۔'' ایک فوجی نے زوردار انداز میں کہا۔

''اللہ اکبر۔'' ساری فوج نے جواب دیا۔

''نعرہ رسالت۔''

''یارسول اللہ۔''

''نعرہ حیدری۔''

''یا علی۔''

''آج انجام کی پرواہ مت کرنا دشمنوں کی صفوں میں گھس کر اسے تہس نہس کردو، سیلاب میں سے گزر کر اپنا راستہ بناؤ آج یا پھر کبھی نہیں۔'' حضرت محل نے کہا اور اپنا ہاتھی آگے بڑھانے کا حکم دیا۔

پھر وہ مختلف چھوٹے چھوٹے محاذوں پر لڑتی، فرنگیوں کو پسپا کرتی آگے بڑھتی رہی اور انگریز کی فوج کو قیصر باغ کی طرف دھکیلتی رہی۔ اس نے جنگ آزادی کی پہلی جنگ جیت لی اور انگریزوں کو پیچھے دھکیل دیا۔

دو دن بعد انگریزوں نے ریذیڈنس سے نکل کر پھر حملہ کردیا تھا۔ اس بار ان کی بہت تیاری تھی حضرت محل بھی بڑے حوصلے سے ان کا مقابلہ کررہی تھی۔

جنگ کے دوران ایک موقع پر اس نے اپنی فوج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں اپنی تلوار کی قسم کھاتی ہوں کہ میں اپنی ساری زندگی وطن کی حفاظت میں گزار دوں گی اور دشمن کے ان حملوں کا مقابلہ کرتی رہوں گی جو پورب سے ہوں یا پچھم سے اتر سے ہوں یا دکن سے، اتنا ہی نہیں اگر کسی وقت اندرونی غداروں اور بیرونی حملہ آوروں کی طرف سے آزادی کی طرف کوئی خطرہ بڑھا تو میں نا صرف اپنی جان لڑا دوں گی بلکہ ان سے مقابلہ کرتے ہوئے میں اپنی زندگی کی آخری سانس بھی خرچ کردوں گی اور ان پر فتح پالوں گی۔''

اور ایسا ہی ہوا تھا حضرت محل نے فرنگیوں کو سر جھکانے پر مجبور کردیا تھا برطانوی ریذیڈنسی حضرت محل کے زیر اثر آگئی تھی اس وقت وہاں 1700 فوجی تھے جبکہ حضرت محل نے 6000 فوجیوں کے ساتھ اسے گھیر لیا تھا اس وقت ہنری لارنس فرنگیوں کی سربراہی کررہا تھا اور وہ اس وقت اودھ کا چیف کمشنر تھا وہ اس جنگ کے نتیجے میں چار جولائی کو مارا گیا تھا۔

ریذیڈنسی کے چاروں طرف اونچی اونچی بلڈنگیں تھیں جن پر حضرت محل نے بہترین نشانہ باز فوجی تعینات کئے ہوئے تھے جنہوں نے بہترین نشانے لگائے تھے اس کے علاوہ حضرت محل نے بارودی سرنگیں بھی استعمال کی تھیں جنہوں نے فرنگیوں کا زیادہ نقصان کیا تھا ریذیڈنسی میں کھانا اور پانی ختم ہوچکا تھا اس جنگ میں اعظم گڑھ کے راجا جے لال سنگھ اور فیض آباد کے مولوی احمد اللہ شاہ نے بھی حضرت محل کا ساتھ دیا تھا۔ جبکہ احمد اللہ شاہ اودھ کے مغربی حصوں میں جدوجہد کرتے ہوئے جون 1858ء میں شہید ہوگئے تھے۔

قلعہ بُنڈی سے لڑتے ہوئے حضرت محل تارائی کے جنگلوں میں پہنچ گئی تھی برطانوی اس کے پیچھے تھے جہاں گھمسان کی جنگ ہوئی تھی حضرت محل کی فوج برطانوی فوج پر مسلسل فائر کررہی تھی ان کی زد میں آنے والے فوجی تڑپ تڑپ کر زمین پر گر رہے تھے جن میں سے کچھ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور کچھ شدید زخمی ہورہے تھے حضرت محل کی فوج میں عورتوں کی فوج کی کمانڈر اودھا دیوی ان لڑنے والوں میں پیش پیش تھی اچانک خبر پھیل گئی کہ مردوں کی فوج

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

میں لڑنے والا اودھا دیوی کا شوہر مکہ پاری جنگ میں مارا گیا تب اودھا دیوی نہ روئی نہ واویلا کیا بلکہ اس کے لڑنے کی رفتار میں اور تیزی آگئی وہ فائرنگ کرتے ہوئے ایک درخت پر چڑھ گئی اور برطانوی فوجیوں کو تاک تاک کر نشانہ بنانے لگی۔ ایک برطانوی فوجی نے اسے دیکھ لیا وہ بہت زیادہ لوگوں کو نشانہ بنا رہی تھی کیونکہ وہ اونچائی پر تھی تب برطانوی فوجی نے اپنی پوشیدہ نشانہ گاہ سے اسے نشانہ بنایا اور اودھا دیوی نیچے آگری، گولی اس کے سینے میں لگی تھی اس کے پاس پرانی وضع کے دو پستول تھے ایک اس کے ہاتھ میں تھا جس کی پیٹی میں لوڈ حالت میں لگا تھا اور دوسرا اس کے ہاتھ میں تھا جس سے وہ پیپل کے درخت پر بنے مچان سے نشانہ بنا کر فوجیوں کو مار رہی تھی۔

گھمسان کا رن پڑا تھا۔ بہت سے انگریز فوجی مارے گئے تھے پھر حضرت محل نے طالم باغ میں انگریزوں کی عورتوں اور بچوں کو قید کر دیا وہ ان کے گھر میں گھس کر انہیں مار رہی تھی۔ بہت خوں خرابہ ہوا اس جنگ میں کیپٹن آر آر اینڈرسن کی بیوی بلڈا میری بھی ماری گئی اس موقع پر اسے کئی لوگوں نے سمجھایا کہ انگریزوں کے بیوی بچوں کو چھوڑ دے لیکن اس نے انکار کر دیا۔

''انہوں نے کبھی مسلمانوں یا ہندوؤں کے بچوں اور عورتوں پر رحم کیا؟ تو میں ان پر کیوں رحم کروں میں ان سے ایک ایک ظلم کا بدلہ لوں گی ان کے ساتھ وہی کروں گی جو انہوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا۔''

حضرت محل فرنگیوں کے لیے پریشانی کا ذریعہ بن گئی تھی اگر وہ اسے پیچھے دھکیلتے تو وہ دوبارہ مزید تیاری کے ساتھ آجاتی کبھی چھوٹے گھوڑوں پر لڑتی کبھی ہاتھیوں پر، سلطنت اودھ برطانیہ کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا اور وہ کسی قیمت پر بھی اودھ کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔

یہ جنگ آخری جنگ ثابت ہوئی۔ انگریزوں کی فتح اور حضرت محل کو شکست ہوئی۔ بازی پلٹتے دیکھ کر حضرت محل کو فرار کرا دیا گیا۔ مٹھی بھر جانثار بیگم حضرت محل کو لے کر نیپال چلے گئے۔ جہاں اس نے اپنی زندگی کے باقی سال گزارے۔ ان دنوں اس نے اداس شاعری کی جس میں اپنی اودھ سے دوری کا ذکر بھی ہے۔

اک تمنا تھی کہ آزادی وطن ہو جائے
جس نے جینے نہ دیا چین سے مرنے نہ دیا
ظلم کی آندھیاں بڑھتی رہیں لمحہ لمحہ
پھر بھی پرچم کو آسماں سے اترنے نہ دیا

اس کی زندگی میں دو اہم موقع آئے ایک اس وقت جب اس نے پہلی بار واجد علی شاہ کے سامنے رقص پیش کیا اور اس کا انتخاب دربار کی رقاصاؤں میں ہو گیا اور دوسرا اس وقت جب جان عالم کے ہوتے ہوئے اس نے اپنے بیٹے برجیس قدر کو تخت شاہی پر بٹھایا اور اپنے ملکہ ہونے کا اعلان کیا۔

جلاوطنی کے دوران 1879ء میں برطانیہ کی حکومت کی طرف سے ایک قاصد ان کے پاس پہنچا اور انہیں بتایا کہ برطانوی حکومت نے انہیں معاف کر دیا ہے چنانچہ وہ اپنے ملک واپس آسکتی ہیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور اپنے بیٹے برجیس قدر کو واپس بھیج دیا جنہیں انگریز سرکار آخر وقت تک وظیفہ دیتی رہی لیکن دو سال بعد کسی بدخواہ نے انہیں زہر دے دیا اور وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو گئے۔

حضرت محل کو 1879ء میں ان کے انتقال کے بعد کھٹمنڈو... کی جامع مسجد کے قریب ایک گمنام قبر میں دفن کر دیا گیا۔ 15 اگست 1962ء کو لکھنو پر اس کی حکومت کے اعزاز میں حضرت گنج کے قریب وکٹوریہ پارک کا نام بدل کر ''آرمز آف اودھ رائیل فیملی'' رکھا گیا۔ 10 مئی 1984ء میں انڈیا کی حکومت نے حضرت محل کے اعزاز میں ایک یادگاری ٹکٹ بھی جاری کیا اور انڈیا کی وزارت اقلیت کی طرف سے حضرت محل کے نام سے پہلی اسکالرشپ بھی شروع کی گئی جو اقلیتوں کی کمیٹی کی طرف سے باصلاحیت اور ذہین طالبہ کو دیا جاتا ہے یہ اسکالرشپ مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کی طرف سے دی جاتی ہے۔

جن جگہوں سے استفادہ کیا گیا

1- Wikipedia Hazrat Mahal C1820-/ Apr 1 1879
2- Book-grover & grover by Bhagat Singh
3- Modern india history (Revolt of 1857)
4- Story of Begum Hazrat Mahal in urdu hindi pub on May 2019
5۔ پری خانہ (واجد علی شاہ)
6۔ رئیس احمد جعفری، واجد علی شاہ اور ان کا عہد

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

اس کے قدم بہت تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ ہیجان اور نفرت کی شدت نے جسم میں برق سی بھر دی تھی۔ ناانصافی ..... بے بسی پر مبنی سوچ نے اسے مغلوب کر رکھا تھا اور اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر بھی اثر انداز تھے۔ مین گیٹ سے آگے کچھ طویل قدمچے اس نے اسی انداز میں طے کیے کہ ایک جست میں دو زینے پھلانگے تھے۔ گھٹنوں تک دراز سیاہ عبا کے نیچے نیلی جینز اور پیروں میں موجود جوگرز اس کی رفتار میں معاون تھے۔ یہ ایک مصروف پارک تھا۔ اس کے دائیں بائیں

شوق گزیدہ

مہ رخ ارباب

شوق کی خاطر زندگی کو داؤ پر لگانا آسان نہیں ہے لیکن اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ بارش کی پہلی بوند بنے گی۔ لڑکی ہو کر بھی وہ اپنے حقوق کی خاطر حکومت کے قوانین کو مبارزت دینے پر کمربستہ تھی۔ اس کا جرم بہت معمولی تھا مگر مردوں کے معاشرے میں ایسا جرم ناقابلِ معافی تھا لیکن اس کی چھوٹی سی غلطی ملکی قوانین پر سوالیہ نشان کھڑی کرگئی۔ اس غلطی نے اسے عالمی پیمانے پر مشہور کردیا۔

سے گزرتے لوگ ایک خوبصورت لڑکی کو ہاتھ میں پانی کا کین لیے تیزی سے گزرتے دیکھتے تو پل بھر کو حیران ضرور ہوتے..مگر ملک کے سخت قوانین میں کسی تنہا لڑکی کو چھیڑنا انتہائی نوعیت کی تعزیر کا سبب بن سکتا تھا۔ملک میں آنے والے انقلاب کے بعد وہاں ہر طرح کے جرائم کی بہت کڑی سزائیں نافذ کردی گئی تھیں۔اور انہی سزاؤں کا شاخسانہ تھا جو آج وہ شہر کے مرکزی پارک میں موجود تھی۔وہ پارک جس کا نظارہ عدالت کی کھڑکیوں سے بہ آسانی کیا جاسکتا تھا۔جس کے سامنے ہی پولیس اسٹیشن تھا۔اس کی زندگی کی بربادی کے ذمے دار تمام ادارے یہاں سے اس کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے.....یہ وہی عدالت تھی جہاں کچھ عرصے پہلے اس پر مقدمہ چلا تھا۔اسے ایک معمولی جرم پر جیل بھیج دیا گیا۔جسے جرمانہ لے کر معاف کیا جاسکتا تھا۔اور کس جرم کے لیے؟ جو باقی دنیا کے لیے دراصل جرم تھا ہی نہیں.....

انیس سال کی عمر میں وہ حوالات کی سیر کر چکی تھی...اور اب بھی وہ محض ضمانت پر رہا تھی۔اس کے ذہن میں اپنی قید کے ایام گھومنے لگے۔تھانے میں گزارے وہ چند دن اس کی انیس سالہ زندگی کا بدترین وقت تھا۔اسے اپنے ملکی نظام سے نفرت سی ہونے لگی۔

پارک کے درمیان پہنچ کر اس نے چہار اطراف نگاہ دوڑائی.....آتے جاتے لوگ اس کی جانب متوجہ تھے.....مگر محض ایک دلکش مورت کو دیکھنے کے لیے۔اس کے ذہن میں پکتے لاوے کی تپش ان تک کیسے پہنچ سکتی تھی۔

وہ بے خبر تھے کہ اگلے چند لمحات میں لڑکی کا اٹھایا گیا قدم اسے تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ کے لیے امر کردینے والا ہے۔لڑکی نے چیخ چیخ کر ملکی قانون کو برا بھلا کہا تو لوگ چونک کر اس کے اردگرد جمع ہونے لگے۔

☆☆☆

وہ کسی بگولے کی طرح دوڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ہاتھ میں تھامی ہاکی تیزی سے گیند کو دائیں بائیں سے ہوتے حملوں سے بچا رہی تھی۔اس کی سانس دھونکنی کی مانند چل رہی تھی..مگر مخالف گول پوسٹ جیسے دنیا کے دوسرے سرے پر جا پہنچا تھا۔ تماشائیوں سے بھرا ہوا اسٹیڈیم اس کے نام کے نعرے لگا رہا تھا۔کیمروں کی فلیش لائٹس اس کی توجہ بٹانے میں ناکام تھیں اس کا پورا دھیان گیند پر تھا۔اسے لگا وہ صدیوں سے یونہی دوڑ رہی ہے..اور منزل مخالف گول کی صورت میں مسلسل اس سے دور جا رہی ہے۔پیشانی سے ابلتا پسینا دھار کی صورت میں بہہ کر نظر کو دھندلا رہا تھا اور گول کی حفاظت کرتی گول کیپر اسے کسی دھندلے سے سرخ دھبے کی صورت میں نظر آرہی تھی۔اس نے بنا رفتار کم کیے جائزہ لیا۔تمام حریف کھلاڑی اس کی رفتار سے ہار کر پیچھے رہ چکے تھے۔اگر وہ مزید آگے جانے کے بجائے وہیں سے ہٹ کرتی تو ستر فیصد امکان تھا کہ گول ہوجاتا۔اس نے بنا توقف کیے ہاکی ہوا میں بلند کی جو توس بناتی ہوئی نیچے آئی۔اس کے ساتھ ہی ایک زوردار چیخ اس کے حلق سے بلند ہوئی.....مخالف ٹیم کی کھلاڑی نے گیند جھپٹ لی تھی مگر اس کوشش میں اس کی پنڈلی کو شدید ضرب لگی تھی۔وہ شدت کرب سے زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگی...پھر تماشائیوں سے بھرا ہوا اسٹیڈیم یکلخت ہی اندھیرے میں گھر گیا۔بڑی بڑی اسکرینز ایک جھماکے سے غائب ہوگئیں۔اس کے تصوراتی محل ایک ہی چوٹ سے زمین بوس ہوگئے تھے۔اب وہاں صرف بینچ پر بیٹھے اس کے ساتھی اور مخالف کھلاڑی ہی موجود تھے۔اس کے گرتے ہی ٹیم اس کے گرد جمع ہوکر ریفری کو دہائیاں دینے لگی۔یہ ایک حربہ تھا دوسری ٹیم پر دباؤ ڈالنے کا۔تاکہ ہونے والے نقصان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاسکے۔

خوش قسمتی سے وہ جہاں موجود تھی وہاں سے ریفری نے مخالف کھلاڑی کی دھاندلی کو براہ راست دیکھا تھا۔نتیجتاً انہیں پینلٹی اسٹروک مل گیا تھا۔وہ خوشی کے مارے تکلیف بھول گئی قریب تھا کہ اٹھ کھڑی ہوتی مگر درد کی اداکاری کرتے رہنا ضروری تھا۔

اس موقع پر یہ پینلٹی اسٹروک فیصلہ کن کردار ادا کرسکتا تھا۔

انہوں نے دو گول میچ کے ابتداء ہی میں کرلیے تھے اور اس وقت یوں محسوس ہوا جیسے کھیل مکمل طور پر ان کے ہاتھ میں ہے..مگر تب ہی مخالف ٹیم ایک گول کرنے میں کامیاب رہی،اور اس کے بعد تو جیسے ان میں نئی جان آگئی ہو۔ان کا دفاعی کھیل جارحانہ انداز میں بدل گیا تھا...اور باوجود کافی کوششوں کے ان کی ٹیم مزید کوئی گول کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی تھی۔ایسے میں مخالف کھلاڑی نے جلد بازی میں انہیں شاندار موقع فراہم کردیا تھا۔اب اگر یہ لوگ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتے تو شاید انہیں گھر بھی منہ چھپا کر جانا پڑتا۔ٹیم کی فزیو دوڑتی ہوئی قریب پہنچیں.....

''تم ٹھیک ہو؟ یا باہر جانا چاہو گی؟'' وہ ٹراؤزر کا پائنچہ اوپر کیے بغور اس کی ٹانگ کا جائزہ لے رہی تھیں۔دراصل وہ

WaqarAzeem
Pakistanipoint.com

سائنس تھراپسٹ کی ٹیچر تھیں۔ جنہیں تھوڑی بہت ابتدائی طبی امداد کی تربیت دے دی گئی تھی۔ کالج کے پاس اتنے فنڈز نہیں تھے کہ ایک باقاعدہ فزیوتھراپسٹ رکھ سکتا۔

''میرے خیال سے میں کوشش کرسکتی ہوں۔ اس موقع پر ایک ایک پلیئر اہم ہے۔''

بریرہ نے پنڈلی پر درد کش اسپرے کیا اور چند قدم چل کر جائزہ لیا۔ وہ کھیل سکتی تھی۔

ٹیچر نے کھڑے ہوتے ہوئے بغور اس کا انداز ملاحظہ کیا۔ وہ ایسے کھڑی تھی، جیسے کسی اہم عالمی مقابلے کے فیصلہ کن میچ کا حصہ ہو.....

''سنو میری بچی! یہ صرف ایک کالج کا اندرونی پریکٹس میچ ہے جس کے جیتنے یا ہارنے سے تمہارے مارکس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ لیکن اگر ٹانگ تڑوا بیٹھیں تو دو ماہ بعد ہونے والے امتحانات سے ضرور رہ جاؤ گی اس لیے کھیل کو صرف کھیل سمجھ کر کھیلو۔'' ٹیچر نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور تیزی سے میدان سے باہر نکل گئیں۔ وہ سنجیدہ چہرہ بنائے ان کے باہر نکلنے کی منتظر کھڑی رہی۔ اس سے پہلے وہ یقین کرچکی تھی کہ یہ خفت آمیز گفتگو کسی اور نے نہیں سنی۔

اس نے گول کیپر کا جائزہ لیا۔ چہرہ ہیلمٹ میں پوشیدہ نہ ہوتا تو وہ واضح طور پر اس کا خوفزدہ چہرہ دیکھ لیتی۔ وہ ناتجربہ کار لڑکی تھی اور مخالف ٹیم کے گول کیپر کے زخمی ہوجانے کے بعد عارضی طور پر ٹیم میں شامل کی گئی تھی۔ ایسی صورتِ حال کا نفسیاتی دباؤ برداشت کرنے کی اسے کوئی تربیت نہیں دی گئی تھی۔ بریرہ کو یقین تھا کہ وہ غلطی کرے گی... اور ان کی مشاق کیپٹن اس سے فائدہ اٹھائے گی۔ ہٹ کرنے کے لیے کیپٹن نے خود جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ سعدیہ نامی وہ کپتان ایک ذہین اور تجربہ کار کھلاڑی تھی۔ جو ہاکی دو ہاتھوں میں تھامے ڈی سے کنارے آ کھڑی ہوئی تھی۔ گول کیپر کی ہیلمٹ سے جھانکتی آنکھوں سے خوف کی لہریں باہر تک نمایاں تھیں۔ سعدیہ نے ہاتھ سے دائیں جانب ہٹ کرنے کا اشارہ دیا۔ اور ہاکی لہرا دی۔ گول کیپر نے اس کے ہاتھ کی حرکت کو بلف سمجھتے ہوئے بائیں جانب چھلانگ لگائی تھی، اور تب ہی کیپٹن نے چند سیکنڈ کے وقفے سے دائیں جانب ہی گیند اچھال دی۔ تیز رفتار گیند گول کی مانند گول میں جا گھسی اور ساتھ ہی میچ کا وقت بھی ختم ہوگیا۔

جب سب لڑکیاں جمع ہوکر ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہی تھیں۔ بریرہ ہاکی اٹھائے ڈریسنگ روم کی جانب جارہی تھی۔

اپنی ٹیم میں شامل کچھ لوگوں کا کھیل تمام ٹیم پر اثر انداز ہورہا تھا۔ وہ اپنا سخت ردِعمل چھپا نہیں پارہی تھی۔ بقیہ کلاس فیلوز بھی ایک ایک کرکے پیچھے آنے لگیں تھیں۔

''کمال کردیا آج سب نے! مجھے تو لگا تھا آج مخالفین جیت جائیں گے۔'' یہ اس کی کلاس فیلو سینٹر فارورڈ خالدہ تھی۔

اس نے سر سے اسکارف اتارتے ہوئے ترچھی نظر سے اس کی جانب دیکھا۔

''کیپٹن سے پوچھو ہماری کارکردگی کیسی رہی ہے۔ ایک آسان میچ تھا جسے ہم نے پھنسا دیا۔ صرف اس لیے کہ کچھ لوگ ٹیم کے لیے نہیں، بلکہ صرف اپنے لیے کھیلتے ہیں۔'' اس نے بندھے ہوئے بال کھولتے ہوئے ایک تیز نگاہ برابر میں اپنا اسکارف اتارتی ہوئی لڑکی پر ڈالی جس کی توجہ مکمل طور پر ان ہی دونوں کی جانب تھی۔

''اس کھیل کے بل بوتے پر ہم دوسرے کالجز سے ٹورنامنٹ رکھوائیں گے؟'' اس نے تپے ہوئے لہجے میں کہا۔ خالدہ نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں پلٹ کر دوسری لڑکی کی جانب دیکھا۔ وہ نروس ہوکر وہاں سے ہٹ گئی۔

''تم نے دیکھا تھا نا! جب مخالف ٹیم پہلا گول کرنے جارہی تھی تو یہ اپنے بال ٹھیک کررہی تھی۔ اس کے بعد دو بار گول کا موقع اس نے محض مجھے پاس نہ دے کر ضائع کردیا۔ اس وقت تم اس کے بالکل نزدیک تھیں۔ یہ تمہیں بھی گیند پاس کرسکتی تھی۔ مگر نہیں اگر یہ ایسا کرتی تو اس کی واہ واہ کیسے ہوتی۔ میں کیپٹن کے سامنے یہ بات رکھوں گی کہ ایسے کھلاڑیوں کو باہر نکالنا ضروری ہے۔'' وہ تیز تیز بولتی ہوئی منہ پر پانی کے چھپاکے مار رہی تھی۔

''ریلیکس! دھیرج رکھو..... ہم کون سا انٹرنیشنل لیول پر کھیل رہے ہیں۔ ہمارا تھرڈ ڈائیر ہے۔ کچھ عرصے بعد سب اپنی عملی زندگی میں مصروف ہوجائیں گے۔ ہماری تو خواتین کی قومی ہاکی ٹیم بھی نہیں ہے جو اس میں شامل ہونے کا خواب دیکھیں اس لیے چند دن آرام سے گزار لو۔ کیوں کسی سے دشمنی مول لے رہی ہو۔'' خالدہ اس کی مزاج آشنا تھی۔ مگر وہ بریرہ رفیق ہی کیا جو سیج چلنے کا مطلب جانتی ہو۔

اس نے تولیا منہ پر رگڑا اور ٹیم کی شرٹ اتار کر دوسری صاف شرٹ پہنتے ہوئے ایک سنجیدہ نظر ساتھی کھلاڑی پر ڈالی۔

''ہاکی میرے لیے محض کھیل نہیں ہے خالدہ! اگر ہمارے ملک

WaqarAzeem
Pakistanipoint.com

میں نہ کھیل سکی تو میں کسی ایسے ملک کی جانب سے کھیلوں گی جہاں عورتیں کھیلوں میں اپنا آپ منوا سکتی ہوں۔'' اس نے پسینے سے بھیگی شرٹ اپنی کٹ بیگ میں ٹھونسی اور کاندھے پر لٹکالیا۔ خالدہ نے مسکرا کر دو انگلیوں سے سیلوٹ کا اشارہ کیا اور وہاں لگے ٹی وی کی جانب اشارہ کیا۔ اسکرین پر نظر آتے چہرے کو دیکھ کر اس کی نگاہوں میں روشنی سی بھر گئی۔ وہ ان کی قومی ہاکی ٹیم کا کپتان اصغر تھا۔

تیس سال کا وہ کھلاڑی بریرہ سمیت کتنے ہی لوگوں کے لیے آئیڈیل تھا۔ وہ پیدائشی پولیو کا مریض تھا۔ اس کا ایک پیر قدرتی طور پر ہلکا سا خم کھایا ہوا تھا۔ مگر اپنی بیماری کو محض اپنی قوت ارادی اور محنت کے بل پر شکست دے کر وہ اس وقت دنیا بھر کے بااثر ترین لوگوں کی صف میں شامل تھا۔ بریرہ سمیت کتنے ہی لوگ اس کی شخصیت سے توانائیاں لیتے تھے۔ اس سے ایک بار ملنا اور اس سے ہاکی پر آٹوگراف لینا بریرہ کی زندگی کی بڑی خواہشوں میں سے ایک تھا۔ اس نے بیگ کاندھے پر لٹکایا اور اسے ٹھیک سے سننے کے لیے ٹی وی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

وہاں اور بھی لڑکیاں موجود تھیں۔ مگر ان میں سے کوئی بھی قاچار کی ایسی مداح نہیں تھی کہ اپنی زندگی کا ڈھانچا ہی اس کے بتائے گئے راستے پر چل کر تبدیل کر لیتی۔

''اس مقام تک پہنچنا اور اس جیسا بننا میرا نصب العین ہے.....'' اس نے خود کلامی کرتے ہوئے خود کو یاد دلایا۔

اب ٹی وی پر خبریں چل رہی تھیں۔ اس نے بیگ سنبھالا اور باہر کے راستے پر قدم بڑھائے۔

باہر نکلتے ہوئے اس کی نظر اسی لڑکی پر پڑی جس کی حرکات نے اسے مشتعل کر رکھا تھا۔ وہ ابھی تک اسکارف سے الجھ رہی تھی۔

ان کے ملک میں اسکارف لباس کا لازمی حصہ تھا اور اسے کھیل کے دوران بھی پہنے رہنا ضروری تھا۔

''اب انسان ہاکی سنبھالے یا یہ لمبے لمبے اسکارف۔'' لڑکی نے نیلا اسکارف بینچ پر پٹخا۔

وہ نہ جانے کس سے مخاطب تھی۔ تمام لڑکیاں اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔ بریرہ ان کے نزدیک پہنچی۔ منہ اس کے کان کے نزدیک کیا۔ ''کھیل میں کپڑے نہیں بلکہ نااہلی اور بری نیت آڑے آتی ہے۔'' اس سے پہلے کہ لڑکی اس کی بات سمجھ کر ردِعمل دیتی وہ ڈریسنگ روم سے باہر نکل چکی تھی۔

☆☆☆

الارم کی مدھر آواز بتدریج تیز ہوتے ہوتے اب صور پھونکنے کی آواز سے مشابہہ ہو چکی تھی۔ مگر نوعمری کی غافل نیند سے زیادہ، رات دیر تک، جاگ کر اپنی پسندیدہ ہاکی ٹیم کے لیے سوشل میڈیا پر چلائی جانے والی مہم کی مصروفیات تھیں، جو یہ سمع خراش آواز بھی اسے خواب خرگوش سے جگانے میں ناکام تھی۔

''بریرہ رفیق! کیا تم چاہتی ہو کہ میں یخ پانی تمہارے اوپر ڈال دوں؟ اگر نہیں تو فوراً اٹھ کر دروازہ کھول دو' اور دس منٹ کے اندر ناشتے کے لیے باہر آؤ۔'' یہ اس کی بڑی بہن نائمہ تھی۔ وہ اس کے ہاکی کے لیے جنون سے واقف تھی... اور اب تو اس کی پسندیدہ ٹیم اس کے اپنے شہر میں عالمی مقابلوں کا حصہ بننے والی تھی۔ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس میں جوش و خروش نہ دکھاتی۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس کے ملکی قوانین کے لحاظ سے وہ بس سوشل میڈیا تک ہی شوق کا اظہار کر سکتی ہے، اور کبھی اپنے پسندیدہ کھلاڑیوں کو براہ راست کھیلتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ نائمہ کے لیے یہ ایک تکلیف دہ بات تھی۔ مگر ایک محب وطن شہری کی حیثیت سے اسے اپنے ملک کے ہر قاعدے سے پیار تھا۔ کافی عرصے تک بادشاہت کے شکنجے میں رہنے کے بعد جب مسلسل جدوجہد آزادی کو عملی شکل ملی تو جیسا کہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے کہ ایک انتہا کو جھٹلانے کے لیے انسان دوسری انتہا کو چھو لیتا ہے۔ طویل شہنشاہ ہی دور نے معاشرے میں رشوت ستانی، اخلاق باختگی اور ناانصافی کی جڑوں کو یوں پیوست کر دیا تھا کہ انقلاب کے ثمرات کو عوام تک پہنچانے کے لیے حکومت کو کچھ نئے سخت قوانین وضع کرنے کی ضرورت تھی۔ جو اس وقت تو بہت عمدہ محسوس ہوئے۔ مگر آہستہ آہستہ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ وہ اپنی افادیت کھونے لگے تھے۔ جیسے کہ فرد کے انتہائی ذاتی معاملات میں ریاست کی مداخلت.....

نائمہ خود ایک ملازمت پیشہ خاتون تھی اور طلاق کے بعد ہر ویک اینڈ اپنی بہن اور بیوہ ماں کے ساتھ گزارنا اس کا معمول تھا۔

اپنے سابقہ شوہر سے اکلوتے بیٹے کی حوالگی کے لیے طویل قانونی جنگ لڑنے اور ناکام رہنے کے بعد اس نے اپنی مامتا کا مرکز چھوٹی بہن کو بنا لیا تھا۔

اس وقت بھی اس کا دروازہ بجانے کے بعد وہ سیدھی کچن میں جا گھسی۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"کیا کر رہی ہے وہ؟ ابھی تک آئی کیوں نہیں؟" اس کی والدہ نے ناگواری سے پوچھا۔ وہ سویٹر بننے کی سلائیاں ہاتھ میں لیے بریرہ کے لیے مفلر بن رہی تھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کے نت نئے فیشن کی دلدادہ لڑکی کبھی وہ مفلر استعمال نہیں کرے گی۔

"وہ سو رہی تھی۔ آپ اسے سمجھاتی کیوں نہیں۔ یہ کھیلوں کے پیچھے دیوانگی لڑکیوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اسے چاہیے تعلیم پر توجہ دے...... شادی کرے اور ہ..."

"اور میری طرح تھوڑے عرصے بعد اپنے بچے کے لیے روتی رہے۔ بلاہ، بلاہ، بلاہ"

ناعمہ کی بات اچک کر اپنے انداز میں مکمل کرتی وہ ڈائننگ روم میں داخل ہوئی تو ناعمہ اور مسز رفیق نے ایک ساتھ اس کی جانب دیکھا۔ اور دونوں کے منہ سے چیخ بلند ہوئی تھی۔ وہ کچھ اس انداز میں برآمد ہوئی تھی کہ پیر کے ناخن سے سر کے بالوں تک مکمل طور پر نیلے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔

"یا خدا ناعمہ! اسے کیا ہوا ہے؟" مسز رفیق کی لرزتی ہوئی آواز ابھری تو ناعمہ نے سوالیہ انداز میں بریرہ کی جانب دیکھا۔ اس سوال کا جواب تو وہی دے سکتی تھی۔ اس نے کمرے میں موجود حاضرین کا تحیر ملاحظہ کیا اور اسے یاد آگیا کہ وہ رات میں اپنے چہرے سے بنا رنگ اتارے سو گئی تھی... اور وہ رنگ محض پانی سے صاف ہونے والا نہیں تھا۔

"میری کلاس فیلو ٹیم کی سپورٹ کے لیے کل ہم سب دوستوں کی تصویر بنانے لگی تھی۔ بس اسی کے لیے گیٹ اپ بنایا تھا۔ چہرہ صاف کرنا بھول گئی۔" وہ نیلے چہرے کے درمیان سفید ڈھیلے گھماتے ہوئے بولی۔ تو کمزور اعصاب کی مالک مسز رفیق نے اس منظر کی تاب نہ لاتے ہوئے جلدی سے نظر ہٹالی۔

"بریرہ اگر تم نہیں چاہتیں کہ تمہاری ماں کا کمزور دل اس قسم کے مناظر کی شدت سے رک جائے تو براہ کرم ایسے بہروپ بنا کر منظر عام پر نہ آیا کرو۔" وہ اونی مفلر کو مضبوطی سے ہاتھ میں تھامے، گردن کو بریرہ کی بالکل متضاد سمت میں گھماتے ہوئے بولیں۔

ٹیبل پر پلیٹیں سیٹ کرتی ناعمہ نے منہ پر ہاتھ رکھ کر کھلکھلاہٹ روکی۔

اس نے ماں اور بہن کی شرارت کو محسوس کیا اور کمال بے نیازی سے انہیں نظر انداز کرتی ٹیبل پر پیالے میں رکھے بادام ایک ایک کرکے ٹونگنے لگی۔

اسے معلوم تھا والدہ اس کی لاابالی سرگرمیوں سے ناخوش رہتی ہیں... اور ایسا اس وقت سے تھا جب سے عمار ان کا بھانجا اپنی چھٹیوں میں ان کے گھر آیا تھا۔ وہ ایک خوش اطوار اور ذمے دار نوجوان تھا۔ مسز رفیق کے خیال میں ایک انتہائی صابر نوجوان ہی ان کی لڑکی کے ساتھ گزارہ کرسکتا تھا، اور عمار ان تمام خصوصیات پر پورا اترتا تھا۔

عمار کا خیال آیا تو اسے یاد آگیا کہ اس نے اسے فون کر کے اپنی قومی ہاکی ٹیم کی مخصوص شرٹ منگوانی تھی۔ پچھلے ہاکی ورلڈ کپ کی شرٹیں بہت آسانی سے دستیاب تھیں۔ مگر اسے نئی جاری کی گئی شرٹ چاہیے تھی... اور یہ کام عمار سے بہتر کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ تیزی سے کرسی سے اٹھی تو کرسی الٹتے الٹتے بچی۔

"یا مالک!" مسز رفیق نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔ ان کے بڑبڑانے کی آواز اسے کمرے میں اس وقت بھی سنائی دیتی رہی جب وہ کال ملا رہی تھی۔

☆☆☆

"مرد وزن کا آزادانہ اختلاط معاشرے میں ان تمام برائیوں کا بیج دوبارہ سے بو دے گا جن سے ہم بمشکل ابھر پائے ہیں۔ عورت ایک نازک مخلوق ہے اور جب یہ معاشی جدوجہد کے لیے باہر نکلتی ہے تو براہ راست بھیڑیا نما انسانوں کی زد پر آجاتی ہے اس لیے بہتر تو یہی ہے کہ خواتین اپنا وقت گھر کے اندر مفید سرگرمیوں میں صرف کریں۔"

عمرانی علوم کی ٹیچر نے لیکچر کا خاتمہ ہر روز کی طرح مخصوص بیان پر کیا تھا۔ بریرہ نے کرسی کے ہتھے پر رکھی ڈائری پر ہاتھ مضبوطی سے جما رکھا تھا۔ اس سے زیادہ مضبوطی سے اس کے جبڑے ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ اس کا یہ چہرہ شدید قسم کے ضبط و برداشت کو ظاہر کر رہا تھا۔ عمرانی علوم کے ہر پیریڈ میں اس کی صورت کچھ اسی قسم کے تاثرات کی مظہر ہوتی تھی۔ میرون اسکارف میں لپٹا سرخ و سفید چہرہ اس وقت شدت ضبط سے گلابی مائل ہو رہا تھا۔

"کنٹرول یور سیلف مائی ڈیئر! کنٹرول۔" اس کی دائیں جانب بیٹھی نادیہ نے بنا اس کی جانب دیکھے، اس کا ڈائری پر رکھا ہاتھ تھپکا۔ وہ اس کی گہری سہیلی تھی۔

لیکچرار کی زبان سے نکلتے الفاظ وہی بیان تھا جو مختلف حکومت نواز دانشور کسی بھی غیر انسانی سانحے کے جواب میں میڈیا پر آکر حکومتی صفائی میں دہرایا کرتے تھے، اور نوجوان نسل جواب مختلف ذرائع رسل و رسائل کے تحت جدید دنیا سے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

مسلسل رابطے میں تھی۔ باقی دنیا اور اپنے ملک کے قوانین کا یہ تضاد انہیں ذہنی الجھنوں کا شکار کررہا تھا۔ ان کا قانون کی پاسداری کا حامی ذہن اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھا کہ اگر ہر کمزور اپنی حفاظت کا خود ذمے دار ہے... اور اپنی حفاظت کا واحد حل یہی ہے کہ گھر میں چھپ کر رہا جائے تو آخر قانون اور قانون کے نفاذ کے ذمے دار ادارے کس مرض کی دوا ہیں، اور ایسا کیوں ہے کہ قانون امیر اور غریب کے لیے یکساں نہیں ہے۔

نادیہ برکاتی کی بات نے اس کے بھڑکتے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی بجائے اور ہوا دی... مگر اس سے پہلے کہ وہ آپے سے باہر ہوکر لیکچرار سے الجھ پڑتی۔ پیریڈ ختم ہونے کی بیل بجی اور تمام لڑکیاں اٹھ کھڑی ہوئیں یہ آخری پیریڈ تھا۔

نادیہ اسی کے محلے میں رہتی تھی۔ وہ واپسی کا تمام راستہ اسی موضوع پر گفتگو کرتی رہیں۔

''تم اپنے آپ پر قابو رکھا کرو۔ تم جانتی ہو لیکچرار صاحبہ کی پہنچ بہت اوپر تک ہے..... کچھ افواہیں تو یہ کہتی ہیں کہ ان کا کام ہی ہر قسم کے باغیانہ خیالات رکھنے والی طالبات کے بارے میں رپورٹ کرنا ہے... اور وہ دانستہ اس قسم کے موضوعات کو چھیڑتی ہیں۔''

''کیا بکواس ہے؟ ہم کیا دوسری جنگ عظیم کے دور میں رہ رہے ہیں؟ جو نازی ہمیں گھروں سے اٹھا کر لے جائیں۔ اس قسم کی افواہوں پر تم کیوں کان دھرتی ہو؟'' وہ بھڑک کر نادیہ سے الجھ پڑی..... نادیہ کو غصہ آنے لگا تھا۔

''تمہاری مرضی جو دل چاہے کرو..... ویسے سوچنے کی بات ہے اگر لیکچرار صاحبہ نے خود بھی اپنی سوچ پر عمل کیا ہوتا تو آج گھر میں بیٹھی ہوتیں۔ یعنی ان کی باتیں صرف لفاظی ہے۔ ہمیں سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔''

اس نے گھٹنوں تک طویل کوٹ کی جیب سے نمک لگی مونگ پھلی کا پیکٹ نکالا اور بریرہ کی جانب بڑھایا۔ اس نے چند دانے ہتھیلی پر الٹ کر ٹونگنا شروع کردیے۔

''آج ہاکی ورلڈ کپ کا پہلا میچ ہے۔'' اس نے سامنے مرکزی سڑک پر لگا بڑا سا ہورڈنگ دیکھا تو تبصرہ کیا۔

''ہاں ہماری ٹیم کا میچ پرسوں ہے۔'' اس کی آنکھیں چمکیں۔ اس موضوع پر وہ بے تکان کئی گھنٹے بول سکتی تھی۔ وہ ایک پُرسکون دوپہر تھی۔ مارچ کی خوشگوار ہوائیں دور رویہ سڑک کے کنارے لگے درختوں پر کھلتے نئے شگوفوں سے چھو کر آتیں اور جسم و جاں میں تراوٹ سی بھر دیتیں۔ خوبصورت موسم نے اس کے مزاج پر اچھا اثر ڈالا اور اب وہ خیالوں ہی خیالوں میں شاید اپنے پسندیدہ کھلاڑیوں سے آٹوگراف لے رہی تھی۔ جب فون کی میسج ٹون نے اس کے خیالات کی رو کو منقطع کیا۔

''اوہ خدایا!'' وہ اسکرین دیکھ کر بیساختہ چیخی اور پھر تیزی سے اپنے سوشل ویب سائٹ اکاؤنٹ پر کچھ دیکھنے لگی۔

''یہ دیکھو! یہ ہے ان کے قوانین کی وقعت..... یہ بس انہی کو دباتے ہیں جو ان کے ساتھ شرافت سے چلتا ہے۔'' اس کے قدموں اور تنفس دونوں ہی کی رفتار دوگنی ہوچکی تھی۔ نہ جانے ایسا کیا تھا موبائل میں۔

''مجھے دکھاؤ۔'' نادیہ نے فون جھپٹا اور پھر ہنسی کا فوارہ تھا جو اس کے ہونٹوں سے بہہ نکلا۔

''یہ سیکنڈ ایئر کی شگوفہ ہے نا؟ اسے پہچاننا واقعی مشکل ہے۔ یہ ویسے ہی مردانہ نقوش رکھتی ہے..... اس حلیے میں تو چھوٹا سا مرد محسوس ہورہی ہے۔ حیرت ہے اتنے سے چہرے پر اتنی بڑی مونچھوں نے بھی گارڈز کو مشکوک نہیں کیا۔''

وہ ایک لڑکی کی تصویر تھی۔ چوٹی شرٹ، جینز اور بڑے سے اوور کوٹ پر مردانہ وگ اور مونچھیں لگائے اپنی ہی طرح کے حلیے میں ملبوس دوستوں کے ساتھ ایک اسٹیڈیم میں براجمان تھی۔ پیچھے چلتے کھیل کی تصویر سے واضح ہورہا تھا کہ وہ آج کا دو غیر ملکی ٹیموں کے درمیان ہوا میچ تھا۔ جہاں کسی تیسری ٹیم کے شائق کی موجودگی صرف اسی صورت میں ممکن تھی جب وہ ہاکی کا انتہائی شوقین ہوتا... مگر بریرہ اچھی طرح اس بات سے واقف تھی کہ یہ صرف ایڈونچر پسند لڑکیوں کی قانون سے آنکھ مچولی کھیلنے کا شوق تھا۔ جس طرح کچھ نوجوان ٹریفک سگنل توڑ کر خود کو بہادر محسوس کرتے ہیں۔ اگر بریرہ اسے پہچانتی نہ ہوتی تو بطور لڑکی اسے شناخت کرنا واقعی دشوار تھا۔

''براوو۔'' نادیہ نے یک لفظی تبصرہ کرتے ہوئے فون بریرہ کو واپس کیا۔

''کیا براوو۔ اس میں کیا دشوار ہے۔ مونچھیں لگا کر اسٹیڈیم پہنچ جانا۔ بہادری تو یہ ہے کہ اصل روپ میں جائی۔'' بریرہ نے ناک سے مکھی اڑائی۔

''اوہ کم آن! تم اب صرف جیلس ہورہی ہو، کہ اس کی جگہ تم کیوں نہیں ہو۔ میں جانتی ہوں تم اسٹیڈیم جانے کے لیے مری جارہی ہو، مگر اتنی باہمت نہیں ہو۔''

''مجھے چیلنج مت کرو۔ تمہیں معلوم ہے ہاکی میرا جنون

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ہے میں میچ ضرور دیکھوں گی..... وہ بھی اسٹیڈیم میں جا کر۔''

شدت جذبات سے اس کے جبڑے ابھر آئے تھے۔ ہاتھ میں تھامی کتابوں پر گرفت مضبوط ہوگئی۔ آخری جملہ اس نے دل ہی دل میں کہا تھا ورنہ نادیہ کی ناصحانہ گفتگو اسے مزید طیش دلاتی۔ شدید جذبات واحساسات رکھنے والے کے ساتھ یہی مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ قریب ترین شخص کو بھی اپنی کیفیت سمجھا نہیں سکتا۔ ہر کوئی انہیں اپنے تجربات کے مطابق سمجھتا ہے۔

اس کی ہاکی اور اپنی ٹیم کے لیے محبت وہ کسی کو سمجھا نہیں سکتی تھی۔ باقی لوگوں کے لیے تو یہ سمجھنا ہی مشکل تھا کہ ایک لڑکی ہوتے ہوئے وہ لڑکوں کے کھیلوں میں اس قدر دلچسپی کیوں لیتی ہے۔

اس وقت بھی یہی ہوا۔ نادیہ نے ہنستے ہوئے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''میں بھی دیکھوں گی نا..... ہم دونوں تمہیں ٹی وی پر دیکھیں گے۔ حالانکہ مجھے یہ سب بالکل پسند نہیں مگر تمہاری خاطر۔''

وہ خاموش رہی ذہن میں کچھ اور ہی حساب کتاب چل رہے تھے۔

☆☆☆

''کیا ہو رہا ہے لٹل پرنس؟ کل کا کیا پروگرام ہے؟ میں ڈنر پر آجاؤں؟ کل میچ ہے اور چھٹی بھی ہے۔ ٹی وی پر میچ دیکھیں گے۔ ہاں تمہیں وہ شرٹ مل گئی؟'' وہ عمار تھا جو اسی شہر میں رہائش پذیر تھا اور ہر ویک اینڈ پر خالہ کے گھر حاضری لگانا ضروری سمجھتا تھا۔

''ہاں بالکل مل گئی، اور تم آنا چاہتے ہو مگر ایسا ہے کہ میں تو نادیہ کے گھر پر ہوں گی۔ وہاں سب دوست مل کر میچ دیکھیں گے۔'' اس نے جلدی جلدی بہانہ گھڑا تھا۔ عمار اگر سمجھ بھی گیا تو خاموش رہا۔ وہ سمجھ دار لڑکا تھا اور اس کی ایسی اوٹ پٹانگ حرکتوں کا عادی تھا۔

''ٹھیک ہے تم اپنی دوستوں کے پاس چلی جانا۔ میں تو کھانا وہیں کھاؤں گا۔'' اس نے حتمی فیصلہ سناتے ہوئے فون بند کر دیا۔

اگر وہ آجاتا تو اس کے منصوبے میں رخنہ پڑ جاتا۔ ماں کو بیوقوف بنانا آسان تھا مگر وہ بال کی کھال ضرور نکالتا۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

اس نے کل پہننے والا تمام سامان نکال کر باہر رکھا اور نادیہ کو کال ملانے لگی۔ اب اسے معاملات میں شریک کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

بستر پر لیٹ کر دوسرے دن کے تمام کاموں کو ذہن میں دہرانے لگی۔ سب کچھ ٹھیک سے ہو جاتا تو اس کی زندگی کی ایک بہت بڑی خواہش پایۂ تکمیل کو پہنچتی۔

مسز رفیق کو تمام رات اس کے کمرے کی جلتی روشنی پریشان کرتی رہی۔ واضح تھا وہ سو نہیں پا رہی ہے مگر اس وقت وہ حیران رہ گئیں جب صبح سویرے ایسے اِدھر اُدھر پھرتے ہوئے دیکھا۔ وہ پُراسرار انداز میں متحرک تھی۔

''کیا بات ہے تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔ تم اتنی صبح کیسے جاگ گئیں؟'' آخر کار انہوں نے پوچھ ہی لیا۔

وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ ہاتھ میں فریج سے نکالے لوازمات کی پلیٹ تھی۔

''میں آج نادیہ کے گھر جاؤں گی..... ہم میچ وہیں دیکھیں گے.....'' اس نے پلیٹ میں رکھے توس کو گھورتے ہوئے جواب دیا، اور تیزی سے کمرے میں جا گھسی۔ اسے معلوم تھا اگلا سوال عمار کے آنے سے قبل اس کی واپسی کے متعلق ہوگا..... اور زیادہ جھوٹ، پول کھلنے کا زیادہ خطرہ۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ الماری کھول کر کھڑی ہو گئی۔ تمام لوازمات سامنے ہی رکھے تھے۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک اسکارف نکالا۔ وہ کافی خوبصورت تھا.. مگر اسے پہننا آج کے دن میں ممکن نہیں تھا۔ پھول دار سرخ کپڑے کی بجائے سیاہ رنگ کا سادہ اونی اسکارف بہتر رہتا۔ مارچ کے معتدل موسم میں یہ کچھ عجیب محسوس ہوتا مگر گلے میں اسکارف لپیٹنا جدید فیشن تھا۔ شاید ہی کوئی اس بھدے سے مردانہ رنگ کی جانب متوجہ ہوتا۔

اس نے گھڑی دیکھی، میچ شروع ہونے میں ابھی ایک گھنٹا باقی تھا... اور اس کی تیاری ہنوز نامکمل تھی۔ ہاتھ مزید تیزی سے چلنے لگے۔

بڑا سا اوور کوٹ جس پر بڑے حروف میں اس کی پسندیدہ ٹیم کا لوگو بنا ہوا تھا، نیلے، گھونگریالے، مصنوعی ریشے سے بنی وگ پہن کر وہ شیشے کے سامنے کھڑی ہوئی تو ایک پل کو خود کو بھی نہیں پہچان سکی۔

ایک شوخ مسکراہٹ نے خوبصورت لبوں کا احاطہ کر لیا۔

سیاہ رومال گلے میں لپیٹے آنکھوں پر بڑا سا دھوپ کا چشمہ لگائے۔ وہ ایک نوعمر نوجوان محسوس ہو رہی تھی۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اپنی وضع قطع دیکھ کر اسے خود پر ہنسی آنے لگی، پھر کچھ خیال آیا تو افسردگی نے آگھیرا۔ وہ جو کروں جیسا حلیہ اسے اپنی پسندیدہ ٹیم کا فٹبال میچ دیکھنے کے لیے مجبوراً اپنانا پڑا تھا۔ کیونکہ اس کے ملک میں عورتوں کے لیے تفریح کے وہ ذرائع میسر نہیں تھے جو مردوں کو تھے۔ اس کے ملک کے کچھ سمجھدار لوگوں کے خیالات سولہویں صدی کے ان فلسفیوں جیسے تھے جو عورت کو تمام برائیوں کی جڑ سمجھتے تھے۔ اس نے سر جھٹک کر ناگوار سوچوں کو ذہن سے جھاڑا اور باہر نکل گئی۔

وہ پُرسکون سا دن تھا۔ مارچ میں گرمی کی شدت دن میں کافی بڑھ جاتی تھی مگر آج کے دن موسم معتدل تھا۔ لوگوں کے لیے یہ ایک خاص دن محسوس ہو رہا تھا۔ آج ان کی پسندیدہ ٹیم آج ان کے شہر میں کھیلنے والی تھی۔ اپنے ہر دلعزیز کھلاڑیوں کو براہِ راست دیکھ پانا ایک ایسا دل خوش کن خیال تھا کہ ہر دوسرے فرد کی زبان پر اسے یہی ذکر سنائی دیا۔ وہ مسکرانے لگی۔

اس کی حکومت عورتوں کو اسٹیڈیم سے دور رکھنا چاہتی ہے جبکہ اس سے پہلے کئی خواتین بھیس بدل کر اسٹیڈیم پہنچ کر، حکومت کے قوانین کا مذاق اڑا چکی تھیں۔

اس نے تصور میں اپنی مردانہ حلیے میں اسٹیڈیم میں موجودگی کی تصاویر سوشل میڈیا پر وائرل ہوتے دیکھیں..... اور دھوپ کی عینک کے پیچھے چھپی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں مسکرانے لگیں۔

اس نے پڑوس کے ایک نوجوان کو عین اسی حلیے میں گھر سے نکلتے دیکھا۔ جو اس نے خود اپنایا تھا۔

وہ بھی اسی کی مانند قومی ہاکی ٹیم کا جنون کی حد تک مداح تھا۔

وہ تیز تیز چلتی ہوئی نوجوان کے نزدیک پہنچ گئی۔ اب بظاہر یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ اسی کے ہمراہ ہو۔ جبکہ وہ شخص خود اس کے وجود سے بے خبر تھا۔

وہ بخیر و عافیت بنا مشکوک ہوئے اپنی کالونی سے دوسرے بلاک میں جا پہنچی۔ یہاں سے اس کی کالج کی دوستوں کو اس کے ساتھ نکلنا تھا۔ یہ ایک خطرناک جوا تھا۔ ان کا یہ ایڈونچر کا شوق ان کو سخت مشکلات کا شکار کر سکتا تھا۔ اس بات سے بے خبر وہ اپنی حرکت کو مذاق سمجھ رہی تھیں۔ ملک میں قوانین کی پاسداری پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔ اس کی ساتھی لڑکیاں میچ دیکھنے سے زیادہ ٹیم کے آٹوگراف لینے کے شوق میں اس کے ساتھ جا رہی تھیں۔

اسٹیڈیم کے باہر ایک طویل لائن لگی تھی جنہیں ٹکٹ چیک کر کے اندر بھیجا جا رہا تھا۔

لائن دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ ویسے ویسے اس کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔

گارڈ بہت باریک بین تھے۔ مگر اس کا بہروپ بھی بہت عمدہ تھا۔ کوئی اسے نہیں پہچان سکتا تھا اگر وہ خاموش رہتی۔

وہ واک تھرو گیٹ سے گزری۔ آگے گارڈ موجود تھے۔ جو میٹل ڈیٹیکٹر کو جسم پر پھیر کر مفصل تلاشی لے رہے تھے۔ یہ آخری رکاوٹ تھی۔ اس کے بعد وہ اندر ہوتی۔

''یہاں رک جایئے۔'' گارڈ کی کڑک دار آواز ابھری تو وہ چپ چاپ رک گئی۔ اسے آواز بدلنے میں مہارت حاصل نہیں تھی۔ بہتر تھا کم بات کی جاتی۔

بیٹھ سے ہوتا ہوا میٹل ڈیٹیکٹر پیروں کے پاس پہنچا اور یونہی اوپر کی جانب سفر کرتا سر تک پہنچا۔

''آگے بڑھیے۔'' گارڈ اسے کہتا ہوا دوسرے فرد، کی جانب متوجہ ہوا۔ اس کی دوستیں پہلے ہی آگے، جا چکی تھیں۔ وہ خوشی سے اچھل پھل ہوتی سانسوں کے ساتھ آگے بڑھی۔ اندرونی دروازہ محض چند قدم دور تھا جب اس کے پیچھے آتے نوجوان کا زوردار دھماکا اور وہ چیخ اٹھی۔ گارڈز کو مردانہ شور کے بیچ نسوانی چیخ واضح سنائی دی تھی۔

''یہ لڑکی ہے..... یہ لڑکی ہے۔'' وہ فوراً اس کی جانب متوجہ ہو کر یوں چلانے لگے جیسے کوئی خودکش حملہ آور پکڑا گیا ہو۔ اور اگلے ہی پل نیلی وگ کے نیچے چھپائے سیاہ بال اس کے کندھوں پر لہرا رہے تھے۔ گارڈ ٹوپی نما وگ ہاتھ میں لیے اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا، اور وہ مچل مچل کر ان کے قابو سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی حالت اس پرندے کی سی تھی جس کے پر عین پرواز سے چند لمحے قبل قینچ کر دیے گئے ہوں۔

''مجھے اندر جانے دو۔ تم لوگوں کی توجہ صرف لڑکیوں کو پکڑنے پر ہے۔ اور اتنی دیر میں کوئی خودکش اندر چلا جائے گا۔'' وہ گارڈ کو لاتیں مارنے کی کوشش کرتی ہوئی چلائی۔

''اسے اندر جانے دو گارڈ، ہم اس کی گارنٹی لیتے ہیں۔ یہ کوئی شرارت نہیں کرے گی۔'' اس کے آس پاس کھڑے لوگ اس جدوجہد کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے..... اور اس کی حمایت بھی کر رہے تھے۔ ایک بزرگ کو اس کی حالت دیکھ کر رحم آیا تو گارڈ سے سفارش کرنے لگے۔

''کیا فرق پڑتا ہے اگر یہ میچ لائیو دیکھ لے گی۔ ایسی

Warda Azeem
Pakistanipoint.com

بہت سی عورتیں ہمارے گھروں میں بھی ہیں۔ اور یقین کرو وہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچاتیں۔ اسے اندر جانے دو۔ کوئی تمہارا نام نہیں لے گا۔ کیوں بھائیو!'' اس بزرگ نے دائیں بائیں کھڑے لوگوں سے تائید چاہی۔ تو اس کی حمایت میں کئی آوازیں ابھریں۔ وہ دم سادھے کھڑی اس معاملے کے کسی کروٹ بیٹھنے کی منتظر تھی۔

''یہ بات صرف اتنی نہیں ہے کہ اسے بیچ دیکھنا ہے۔ یہ لوگ اپنی تصاویر انٹرنیٹ پر ڈال دیتے ہیں... اور پھر ہم لوگوں سے جواب دہی کی جاتی ہے۔'' اس کی زوردار ٹھوکروں اور لوگوں کے ردِعمل سے جھلائے ہوئے گارڈ نے اسے کالر سے پکڑ کر لائن سے باہر نکالا اور اس کے اسباب سمیت دوسرے گارڈ کے حوالے کر دیا۔ جہاں سے پولیس اسٹیشن تک وہ مسلسل احتجاج اور شور کرتی رہی۔ اس کا یہ رویہ پولیس والوں کو تھانے پہنچنے تک اس حد تک مشتعل کر چکا تھا کہ جس معاملے کو وہ محض وارننگ دے کر رفع دفع کر سکتے تھے، وہ اس پر بے حجاب گھومنے جیسی دفع لگانے پر منتج ہوا اور اس جرم کی انتہائی سزا چھ ماہ ہو سکتی تھی۔

اس کے وہ تین دن حوالات میں گزرے تھے۔ وہ چھٹی کا دن تھا اور عدالتیں بند تھیں۔ جب تک اس کے وکیل نے وہاں پہنچ کر ضمانت کروائی اس کا تمام جوش و خروش ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ پولیس اسٹیشن کے آسیب زدہ ماحول نے اس کے اعصاب کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

اس پر سپاہیوں کا معاندانہ رویہ، ایک انیس سالہ طالبہ کے اعصاب کے لیے برداشت سے باہر تھا۔ بھوک پیاس، کم خوابی اور اعصابی تناؤ، جب اسے آفیسر کے کمرے میں لایا گیا تو وکیل کے ساتھ براجمان عمار اور ناعمہ کو اسے دیکھ کر صدمے سے زیادہ شاک پہنچا تھا۔ وہ ناقابلِ شناخت محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے کسی نے نچوڑ کر اس کے اندر سے زندگی کی رونق نکال لی ہو... اور اب وہ کبھی خوش نہیں ہو پائے گی۔

وہ خاموشی سے چلتی ہوئی سر جھکائے ایک کرسی پر جا بیٹھی۔

ابھی تک اس کے جسم پر وہی نیلی شرٹ موجود تھی۔

عمار نے افسوس بھری ایک نگاہ اس پر ڈالی اور سامنے بیٹھے آفیسر کو دیکھا۔ ''آفیسر! کیا تھا جو آپ اسے وارننگ دے کر جانے دیتے؟ آپ جانتے ہیں یہ حوالات میں گزارے تین دن اس کے لیے ہمیشہ مسائل پیدا کریں گے.....''

کاغذ پر قلم چلاتے چلاتے آفیسر نے ہاتھ روک کر عمار کی جانب دیکھا۔ ''ہم ضرور اسے جانے دیتے..... اگر اس نے ہمارے سپاہیوں کو مارنے کی کوشش نہ کی ہوتی۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ قانون کی پاسداری کیا ہوتی ہے۔''

اس نے دوبارہ کاغذ پر قلم گھسیٹنا شروع کر دیا۔

جب تک قانونی کارروائی ہوتی رہی۔ خاموشی بریہ کے وجود کا احاطہ کیے رہی۔ اس کمبھیر چپ سے اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ خامشی سے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ ناعمہ کو اندازہ تھا کہ آگے اس کی بہن کی زندگی کتنی مشکل ہونے والی ہے۔ کسی کو آنے والی مشکلات اتنا پریشان نہیں کرتیں جتنا اس کے بعد آس پاس کے لوگوں کا رویہ جہاں اس معاملے میں اس کی حمایت کرنے والے موجود تھے وہاں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جو عورتوں کی خودسری کو قابلِ گردن زدنی جانتے تھے۔ باہر نکلنے اور گاڑی میں بیٹھنے تک وہ مستقل اسے سنبھال رہی تھی۔ باہر وہی چہل پہل تھی جو اس خوبصورت شہر کے معمولاتِ زندگی کا خاصا تھی... مگر بریہ کے لیے زندگی آج کے بعد مختلف ہونی تھی۔ معاملات کی خرابی کی خبر ناعمہ کو بریہ کی ان دوستوں نے دی تھی جو اس کے ساتھ اسٹیڈیم گئیں اور بحفاظت اندر پہنچنے میں کامیاب رہی تھیں۔ اس کے بعد وہ واقعہ بار بار ٹی وی پر چلتا رہا اور نیا پھر میں ان کے ملک کے قوانین کی دھجیاں اڑاتا رہا... مگر اس سے بریہ کے لیے صورتِ حال نہیں بدل سکتی تھی۔ خاندان بھر اس ذلت سے واقف ہو چکا تھا۔ بار بار بجتی فون کی گھنٹیوں سے بیزار ہو کر اس نے فون کا تار ہی نکال دیا تھا۔ تمام موبائل فون سائلنٹ پر رکھ کر عمار کو کال کر دی۔ ایک وہی تھا جو اس مسئلے پر بنا سوال جواب اور نصیحتیں کیے ان کی مدد کر سکتا تھا۔ ان دو دنوں میں وہ مستقل بریہ کی رہائی کے لیے دوڑ بھاگ کرتا رہا تھا۔ وہ کامیاب ہو جاتا اگر اپنی رہائی کی راہ میں بریہ کا اپنا غصیل رویہ ہی رکاوٹ نہ بن گیا ہوتا۔ پولیس نے پوری کوشش کی تھی کہ اسے اس قسم کی قانون شکنی کرنے والوں کے لیے ایک مثال بنا دے۔ وہ ایک باغی لڑکی کے روپ میں سامنے آئی تھی... اور ایسے لوگوں کی حوصلہ شکنی کرنا ضروری تھا۔

ایک چھوٹا سا ایڈونچر بریہ کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ثابت ہونے والا تھا۔

☆☆☆

اس نے کندھے سیدھے کیے، گردن اونچی کی اور خود کو بااعتماد ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہوئی کلاس روم کی جانب بڑھ

WaqarAzeem
Pakistanipoint.com

گئی۔اس سے پہلے وہ کلاسز شروع ہونے سے قبل کا وقت گراؤنڈ میں دوستوں کے ساتھ گزارا کرتی تھی، مگر اس وقت کی باعتماد اسٹوڈنٹ اور موجودہ خوفزدہ بریرہ میں کافی فرق آچکا تھا۔

آس پاس کھڑی لڑکیوں کے ہمدردی بھرے جملے بھی اس کے اندر عجیب سی نفرت انگیز کیفیت پیدا کررہے تھے۔وہ اسے دیکھتیں اور سرگوشیوں میں کھسر پھسر کرنے لگتیں۔اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔وہ سمجھ رہی تھی کہ لڑکیاں اس کے تین دن حوالات میں گزرے ایام پر باتیں کررہی ہیں جو اسے تضحیک محسوس ہوئے۔

آج وہ پورے ایک ہفتے بعد کالج آئی تھی، اور پہلا ہی دن صبر آزما ثابت ہورہا تھا۔جرأت مند لوگوں کے لیے اگر کوئی چیز ناقابلِ برداشت ہوتی ہے، تو وہ لوگوں کا ترس آمیز رویہ ہے۔

وہ بنا کسی کو جواب دیے آگے بڑھ گئی۔

اسے نادیہ کی تلاش تھی۔اس تمام عرصے میں وہ نادیہ کی جانب سے رابطے کی منتظر ہی رہی تھی۔

اور وہ اسے کچھ دور چند دوستوں کے ساتھ کھڑی نظر آگئی۔اس نے مسکرا کر ان کی جانب قدم بڑھایا...مگر تب ہی ان چند لڑکیوں کے گروپ میں جیسے کھلبلی سی مچ گئی۔وہ یوں تیزی سے تتر بتر ہوئیں جیسے ان کے درمیان کوئی سانپ گھس گیا ہو۔وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔کتابیں اس کے ہاتھوں میں بھنچنے لگیں جسم کا تمام خون جیسے رگوں میں جم گیا ہو۔اس کے آس پاس موجود لڑکیوں نے یہ تمام صورتِ حال دیکھی تھی۔کسی کی نگاہوں میں ترحم تھا تو کسی کے چہرے پر تمسخر۔نادیہ کے پیچھے جانے کا اسے خیال تک نہ آیا تھا کیونکہ وہ دیکھ چکی تھی، انہوں نے بریرہ کا رخ اپنی جانب دیکھ کر ہی وہاں سے ہٹنے کا فیصلہ کیا تھا۔

بے جان ہوتے ہاتھوں سے کتابیں سنبھالتے ہوئے اس نے کلاس روم کا رخ کیا۔موسم بہار کا مہربان سورج یکدم ہی آگ برسانے لگا تھا۔اسے چکر آنے لگے تو وہیں نصب بینچ پر بیٹھ کر بے جان نگاہوں سے سامنے سے گزرتے لوگوں کے قدموں کو گھورنے لگی۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟'' ایک مہربان آواز قریب سے ابھری تھی۔اس نے دھندلائی نگاہوں سے دیکھا۔وہ لڑکی کالج میں نئی تھی۔شاید اسی لیے رویوں میں بھی باقیوں سے الگ تھی۔

''تمہارا چہرہ سفید پڑ رہا ہے، پانی؟'' اس نے تھرماس لہرایا۔

''ہاں تھوڑا سا.....شکریہ.....''

''یہ بوتل تم رکھ سکتی ہو.....میں اور لے لوں گی۔'' اس نے کمال مہربانی سے کہتے ہوئے کتابیں اٹھالیں۔

پھر اٹھتے اٹھتے کچھ خیال آیا تو اس کے کان کے پاس جھکی۔

''ایک بات کہوں؟ تم نے بہت اچھا کیا.....بے شک طریقہ کچھ الگ تھا۔شاید اور کوئی طریقہ تھا ہی نہیں۔دنیا بھر میں تمہاری واہ وا ہورہی ہے۔ظالمانہ قوانین کوئی بھی پسند نہیں کرتا.....لوگوں نے انٹرنیشنل ہاکی فیڈریشن سے مطالبہ کیا ہے کہ ان قوانین کے خاتمے تک تمام غیر ملکی میچز کے لیے اس ملک کی ٹیم کو نااہل قرار دیں.....''

بریرہ کی آنکھیں دھیرے دھیرے پھیلتی چلی گئیں۔

''تم سچ کہہ رہی ہو؟'' وہ بے یقین تھی۔اس کی بے یقینی سمجھ میں آنے والی تھی۔اپنی گرفتاری کے دن سے وہ سوشل میڈیا سے دور رہی تھی؛ اور گھر میں نیوز چینلز بالکل بند تھے۔ہوتے بھی تو وہ حوتی بیانات کی تشہیر کرتے۔

''ہاں بالکل! ان لوگوں کی بات مت سنو۔یہ سب خوفزدہ لوگ ہیں، اور یہ دیکھو'' اس نے اپنا سیل فون نکالا۔

''ہمارے ہاکی کے کپتان، اصغر قاچار نے تمہارے بارے میں کیا کہا ہے.....بریرہ رفیق تمہارا یہ قدم تمہارے قوم کی خواتین کے حقوق کے لیے بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوگا۔''

اس نے اسکرین اس کے سامنے لہرائی۔

''واقعی؟'' وہ بے یقین تھی۔تھوڑی دیر پہلے وہ کالج آنے پر پچھتا رہی تھی..اور اب اسے یہ اپنی زندگی کا بہترین فیصلہ محسوس ہورہا تھا۔اسے جو خوشخبری ملی تھی اس کے بعد وہ کوئی بھی حوصلہ شکن، مایوس کن رویہ برداشت کرسکتی تھی۔

اس نے مسکرا کر کتابیں ہمیٹس، اپنی محسن لڑکی کو دیکھا۔وہ اسی کی جانب متوجہ تھی۔اس کا دل چاہا لڑکی کو گلے لگالے۔وہ ایک انجان لڑکی کسی نیکی کے فرشتے کی مانند اس کی زندگی میں آئی تھی۔اس نے داہنا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا۔''میں بریرہ رفیق ہوں۔''

''میں نوروز صالح.....اور تمہارے نام سے تو اس وقت آدھی دنیا واقف ہوچکی ہے۔'' اس نے مسکرا کر کہا تو وہ ہنستی ہوئی کلاس کی جانب بڑھ گئی۔ایک برے واقعے سے زندگی ختم نہیں ہوجاتی۔اس نے خود کو تسلی دی.....اور چلتے چلتے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ایک پودے پر کھلتی کلی اچک کر کتاب میں رکھ لی۔ ملنے والی خوشخبری کی پرہنگام آہٹوں میں وہ اپنی جانب بڑھتی بدنصیبی کی خاموش چاپ سے لاعلم رہ گئی تھی۔ اسے بالکل یاد نہیں رہا تھا کہ یہ آزادی محض ضمانت کی رہین منت ہے۔

☆☆☆

وہ تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ سانسیں سینے میں سمانے سے انکاری تھیں، مگر وہ دوڑے جارہی تھی۔ اندھیرے میں سنسناتی ہوائیں اور برسات کی تیز بوچھاڑ جسم پر برچھیوں کی مانند چبھ رہی تھی... مگر اس چاردیواری سے نکلنا ضروری تھا۔ تیزی سے پیچھے آتے قدموں کی آواز اسے رفتار کم کرنے سے روک رہی تھی۔ اسی فرار میں اس کی بقا تھی۔ گھنے درختوں کے درمیان راستہ بناتے ہوئے وہ دیوار اچانک ہی اس کے سامنے آئی تھی۔ کم وبیش چھ فٹ کی دیوار، اس نے جسم کی پوری قوت سے چھلانگ لگائی اور قریب تھا کہ باہر نکل جاتی... مگر اچانک ہی اس سنگلاخ دیوار کا قد بڑھنے لگا تھا۔ بڑھتے بڑھتے چشم زدن میں ہی اس کا دوسرا سرا آسمان میں اوجھل ہوگیا۔ وہ کسی بادل کی طرح اڑتی ہوئی دیوار سے ٹکرائی تھی مگر حیرت انگیز طور پر بظاہر سنگلاخ نظر آتی وہ دیوار کسی روئی کے گالے کی طرح نرم تھی۔ وہ کسی مقناطیس کی طرح اس کے وجود کو اپنے ساتھ چپکائے ہوئے تھی، مگر یہ اس کے لیے جیسے بالکل نارمل تھا۔ کہیں لاشعور خبردار کررہا تھا کہ اسے جلد سے جلد دیوار سے دور ہٹ جانا چاہیے مگر دیوار کی کشش کے خلاف مزاحمت کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ آہستہ آہستہ اسپنج نما دیوار اسے اپنے اندر جذب کرنے لگی، پیر، ٹانگیں، گردن اور پھر چہرہ، اس کا دم گھٹنے لگا۔ ہیبتناک چیخوں سے پورا جنگل گونج اٹھا.....

''بریرہ! بریرہ!! اٹھو! اٹھ جاؤ'' دور سے آواز ابھری اور کسی نے ہاتھ تھام کر اسے دیوار سے دور کھینچ لیا۔

اب وہ اپنے روشن کمرے میں تھی۔ اس نے نظر دوڑائی۔ لحاف بہت مضبوطی سے اس کے جسم کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ ناک بند ہوجانے کے سبب ہی گھٹن محسوس ہوئی تھی۔

اس کی والدہ بستر پر بیٹھی پُرتشویش نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''تمہاری کھڑکی کھلی رہ گئی تھی۔ رات بھر ٹھنڈی ہوا اندر آتی رہی۔ موسم یہاں خوشگوار سہی مگر شمال میں ابھی بھی برف باری جاری ہے۔ تمہیں دھیان رکھنا چاہیے میری بچی۔ اٹھو تیار ہو جاؤ، آج تمہارے خالہ اور خالو آرہے ہیں۔ وہ عمار سے تمہارے رشتے کی بات فائنل کرنا چاہتے ہیں۔ کتنا آ... سے جڑ جانے والا تھا تمہارا رشتہ۔ اب وہی سب بہت مش... ہوگیا ہے۔ ضرار صاحب کو بہت مشکل سے راضی کیا ہے اور عالیہ نے۔''

''مسز رفیق کے الگ ہی مسائل تھے۔ ان کے بہ... ایک بڑے حکومتی عہدیدار تھے... مگر ان رشتے داروں فہرست میں شامل تھے جن کے نزدیک تعلقات کی واحد کس دولت اور اختیارات ہوا کرتے ہیں۔''

وہ بالوں کو دونوں ہاتھوں سے کانوں کے پیچھے اڑ... ہوئی بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس قسم کے خواب اب روزا... معمول بن چکے تھے۔ جہاں کبھی وہ سیاہیوں سے تو کبھی لوگو کی زہریلی زبانوں سے بچنے کی کوشش کررہی ہوتی تھی۔ ا... اپنی نفسیاتی حالت کو خود ہی سہارا دینا تھا۔ اس نے ہاتھ ر... کے آئینے میں جھانکا، سیاہ گھور آنکھوں کی چمک کچھ مدھم ہو... تھی۔ سفید چہرے کی گلابیاں برقرار تھیں مگر آنکھوں کے ... بنتے سیاہ حلقے ہر وقت کی ذہنی کشمکش کی غمازی کررہے تھے۔

اس نے چہرے پر جھلکتی ماضی کے واقعات کی گرد کو بغو... دیکھا اور منہ پر تیزی سے پانی کے چھپاکے مارنے لگی۔

تیار ہوکر باہر پہنچنے تک ناعمہ کافی ساری چیزیں اکٹ... ہی تیار کرچکی تھی اسے دیکھ کر اس نے تیزی سے ایک طرف رکھی پلیٹ اٹھا کر اسے تھمادی..... ''یہ لو سلاد بناؤ۔''

اس نے کچن شیلف پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑائی..... و... کسی مصروف ریسٹورنٹ کے کچن کا منظر پیش کررہا تھا۔

''تم نے اتنا کچھ تو بنالیا..... آخر وہ لوگ کتنا کھائیں گے۔'' اس نے کٹے ہوئے کھیرے کی قاش اٹھائی۔

ناعمہ نے اسے گھورا ''اب تم شادی شدہ ہونے والی ہو۔ زبان قابو میں رکھنا سیکھو۔''

بریرہ نے ایک پل کو ہاتھ روک کر ناعمہ کی جانب دیکھا۔

اس کے دونوں ہاتھ اور زبان ایک ساتھ چل رہے تھے..... برق رفتاری سے کبھی ایک طرف تو کبھی دوسری طرف جاتے ہوئے اس کے ہاتھ تیزی سے سامان سمیٹ رہے تھے۔

''ناعمہ! ایک بات بتاؤ..... تم اتنی پُرسکون کیسے رہ لیتی ہو؟''

اس نے اچانک پوچھا تو انڈوں سے بھرا ڈونگا اور چمچ سائڈ پر رکھ کر وہ اس کے پاس ٹیبل پر آبیٹھی۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

''تمہیں کیا لگتا ہے؟ میں کیسی بہن اور بیٹی ہوں؟ اپنے فرائض ادا کرنے کے معاملے میں؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''تم ایک بہت ذمے دار بہن ہو اور بیٹی بھی۔'' اس کے لہجے میں ناعمہ کے لیے واضح طور پر محبت جھلک رہی تھی۔

''تم نے ٹھیک اندازہ لگایا۔ آفس میں بھی سب کا میرے متعلق یہی خیال ہے۔ اب جب میں اپنے تمام فرائض بخوبی انجام دیتی ہوں؟ اور اس کے باوجود کوئی مجھ سے ناگواری کا اظہار کرتا ہے تو میں اس کی پرواہ نہیں کرتی۔ بے وجہ لوگوں کے رویوں کو دردسر بنانا پریشانیوں کی ایک بڑی وجہ ہے۔'' اس نے کندھے اچکائے۔ ''دراصل لوگ اتنے برے نہیں ہوتے ہماری توقعات ان سے زیادہ ہوتی ہیں۔ اور تم ہاتھ تیز چلاؤ کام بہت زیادہ ہے......'' وہ تیزی سے کہتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ بلاشبہ وہ ایک اچھی منتظم تھی۔

مہمانوں کے پہنچنے تک تمام تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ عمار کے والد جرار واضح طور پر اس رشتے سے ناخوش تھے۔ اس کا اندازہ ان کی مسلسل خاموشی سے بخوبی ہو رہا تھا۔ عمار اپنے والد کی سنجیدگی کو ڈھانپنے کے لیے مسلسل لطائف سنا رہا تھا۔ مگر کشیدگی ماحول پر حاوی ہونے لگی تھی۔ ایک شخص کا رویہ سب کو متاثر کر رہا تھا۔

فون کی بیل بجی تو وہ فون اٹھا کر بالکونی میں نکل گیا مگر اس کی گفتگو کا ایک ایک لفظ کمرے میں سنائی دے رہا تھا۔

''کیا بات کر رہے ہو؟ یہ معمولی سا کیس ہے۔ ایک پیشی میں ختم ہو جائے گا...... ہاں ٹھیک ہے...... حکومت مدعی بن رہی ہے...... کیونکہ حکومت کے پاس اب حل کرنے کو کوئی مسئلہ جو نہیں بچا، تو ایک معمولی سے انیس سالہ لڑکی کے خلاف حجاب کیس کو وہ دوبارہ اٹھا رہی ہے...... مجھے تم یہ مت بتاؤ کہ کوئی تم لوگوں پر کیس ختم نہ کرنے کے لیے دباؤ ڈال رہا ہے...... مجھے بس اس شخص کا نام بتاؤ......'' ان تک اس کی یکطرفہ گفتگو پہنچ رہی تھی۔ مگر معاملہ سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ کوئی شخص اپنے اثرورسوخ کا فائدہ اٹھا کر بریرہ کی ضمانت کو منسوخ کروا کر اسے سزا دلوانا چاہتا تھا۔ کوئی اس کیس کا فائدہ اٹھا کر اپنا ذاتی مفاد پورا کرنا چاہ رہا تھا۔ کمرے میں موجود افراد مختلف کیفیات کے زیرِاثر ساکت بیٹھے تھے۔

عمار خاموشی سے دوسری جانب سے آتے جوابات سنتا رہا... اور پھر ایک جھٹکے سے فون بند کر کے وہ کسی بگولے کی مانند کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس کا رخ اپنے باپ کی جانب تھا۔

''آپ اپنی خواہش اور ضد میں اتنا گر سکتے ہیں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ محض اس رشتے کو جوڑنے سے بچنے کی خاطر آپ ایک لڑکی کو جیل بھجوانے کو تیار ہیں۔ مجھے شرم آتی ہے آپ کا بیٹا کہلوانے پر۔''

مسز رفیق کے لبوں سے یہ سن کر بے ساختہ ایک چیخ برآمد ہوئی تھی۔ یہ انکشاف جان لیوا تھا۔ بریرہ تیزی سے اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ ناعمہ اس کے پیچھے لپکی......

عالیہ بیگم منہ پر ہاتھ رکھے بس ٹکر ٹکر سب کو دیکھ رہی تھیں۔ جرار صاحب نے خاموشی سے سب کا ردِعمل ملاحظہ کیا اور کھنکار کر گلا صاف کیا۔ انہیں اس ردِعمل کی توقع تھی۔ مگر علم نہیں تھا کہ یہ بات اس جگہ کھل جائے گی۔

''اگر تم سینیٹر کی بیٹی سے شادی کے لیے راضی ہو جاؤ تو یہ تمام قصہ یہیں ختم ہو سکتا ہے......''

''آپ جانتے ہیں۔ جو کام آپ کبھی نہیں کر سکتے، وہ ہے مجھے جذباتی طور پر بلیک میل کرنا...... آپ اسے پھنسانے کی اپنی کوشش جاری رکھیں...... میں اسے بچانے کی اپنی کوشش کرتا رہوں گا۔'' اس کے لہجے میں برف کی سی ٹھنڈک تھی۔ مسز عالیہ نے متوحش ہو کر اسے دیکھا مگر دو انا پرست باپ بیٹے کی جنگ میں وہ بھی ثالث کا فرض نہیں نبھا پائی تھیں۔

وہ خوبصورت دن ایک انتہائی ناگوار صورتِ حال پر اختتام پذیر ہوا تھا۔ اگلے دن کا سورج اپنے دامن میں کیا نیا لے کر آئے گا۔ اس بات سے بے نیاز اپنے بستر پر چھپ کر روتے ہوئے وہ ایک فیصلہ کر چکی تھی اسے جہنم نما جیل نہیں جانا تھا یہ تو طے تھا۔

☆☆☆

موسم خوشگوار تھا جس کی بنا پر پارک میں معمول سے زیادہ لوگ موجود تھے۔ جھولوں میں جھولتے بینچوں پر بیٹھے مگر وہ ان سب سے بے نیاز تیز رفتاری سے ان کے درمیان راستہ بناتی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

لوگ ٹکرانے پر ایک بار مڑ کر اس کی جانب ضرور دیکھتے پھر ایک طرف ہو کر اسے راستہ دے دیتے۔ اس کا انداز لوگوں کو متوجہ کرنے والا تھا۔ خاص طور پر چہرے پر چمکتا غصہ اور نفرت۔ آتے جاتے لوگ اس کی جانب متوجہ تھے مگر محض ایک دلکش وجود کو دیکھنے کے لیے۔ اس کے ذہن میں پکتے لاوے کی تپش ان تک کیسے پہنچ سکتی تھی۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ اگلے چند لمحات میں لڑکی کا اٹھایا گیا قدم اسے کھیلوں کی تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ کے لیے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

کراچی	03002680248	گجرات	03016215229	منڈی بہاؤالدین	03460827027
لاہور	03004009578	وزیرآباد	03456892591	سیالکوٹ	0524568440
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	میرپور AK	03460397119
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654	اٹک سٹی	057210003
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	دیپالپور	03004059957
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	لیہ	03002373988
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	0300694678	قصبہ ڈنگہ	03083360600
فیصل آباد	03006698022	مظفرآباد	03469616224	عارف والا	03008758799
راولپنڈی	03335205014	بورے والہ	03347193958	لورالائی	03023844266
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	جلالپور پیروالا	03338303131
رحیم یار خان	03009672096	ڈیرہ غازی خان	03336481953	ہری پور	03321905703
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	چکوال	03348761952
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	وہوا	03346383400
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	حافظ آباد	03006885976
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	کوہاٹ	03325465062
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	ایبٹ آباد	0992335847
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	پتوکی	03454678832
منڈی بہاؤالدین	0331-7619788	مغل آباد	0301-7681279	مانسہرہ	0333-5021421
ڈسکہ	0300-9463975	سمبڑیال	0333-8604306	کوٹ رادھا کشن	03004992290

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی فون: 35895313
E-mail:jdpgroup@hotmail.com

امر کر دینے والا ہے۔ وہ پُرشور انداز میں ظالمانہ قوانین کے خلاف احتجاج کر رہی تھی۔ یہ ایک عجیب بات تھی۔ لوگ چونک کر اس کے اردگرد رکنے لگے تھے۔ وہ اس باغی لڑکی کو ٹھیک سے سننا چاہتے تھے تاکہ اس کی گرفتاری سے پہلے کے تمام واقعات کے گواہ بن سکیں۔

مگر اس وقت وہ بدحواس سے ہو گئے جب اس نے ہاتھ میں تھاما کین خود پر انڈیلنا شروع کر دیا۔ وہ کوئی بدبودار سیال تھا اور ان پر اچانک یہ انکشاف ہوا تھا کہ پلاسٹک کے کین میں پانی نہیں بلکہ پیٹرول ہے۔ وہ دیوانہ وار حکومت اور قانون کو کوستے ہوئے خود پر آتش گیر مائع چھڑک رہی تھی... اور اس کے گرد موجود بھیڑ تیزی سے پیچھے ہٹتی جا رہی تھی۔ کسی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ بظاہر کسی تماشے کی طرح نظر آتا۔ منظر کچھ ہی پل میں ایک بھیانک واقعے کا گواہ بننے والا تھا۔ کسی انہونی کا احساس لوگوں میں خوف کا احساس بن کر پھیلا تھا۔ کسی الہام کی طرح کا خیال کہ وہ جو کچھ کر رہی ہے وہ کوئی ڈراما نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ بھیڑ تیزی سے چھٹی تھی۔ نتیجتاً جب وہ خود کو لائٹر کی مدد سے شعلوں کی نذر کر رہی تھی تو اس کے گرد کھڑے تماشائی دہشت زدہ ہو کر دور ہٹ چکے تھے۔ اس سفید سنگ مرمر کی مورت کو جلنے اور خاک ہوتے دیکھنے کے علاوہ وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

جب تک اسے اسپتال پہنچایا گیا وہ ستر فیصد تک جھلس چکی تھی۔ یہ اس حادثے کے قریب ایک ہفتے بعد کی بات تھی۔ اس اندوہناک سانحے نے ملک بھر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ تیزی سے بڑے بڑے فیصلے کیے گئے تھے۔ جس کے نتیجے میں آج فائنل ہاکی میچ کے دوران ملک کے سب سے بڑے اسٹیڈیم میں جیسے پورے ملک کی عوام امڈ آئی تھی۔ دنیا بھر کے نامہ نگار اس تاریخ ساز دن کی کوریج کے لیے وہاں موجود تھے... اور کھیل سے زیادہ تماشائی ان کی توجہ کا مرکز تھے۔ نیلے رنگ کی شرٹوں میں ملبوس۔ نیلے رنگ کے اسکارف اور کوٹ پہنے ہوئے اپنے چہرے نیلے رنگ سے رنگے ہوئے۔ ہاتھوں میں ایک مخصوص چہرے پر مشتمل بینر تھامے۔ مرد و زن پر مشتمل یہ ہجوم اپنی ٹیم سے زیادہ ایک ایسے انسان کو خراج تحسین پیش کرنے اکٹھا ہوا تھا جس نے یہاں تک پہنچنے کی چاہ میں اذیتوں کا پل صراط عبور کیا تھا۔ جہاں تک وہ بہت آرام سے پہنچ آئے تھے۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے کسی کو اپنی جان پر کھیلنا پڑا تھا۔

وہ ایک ہفتے تک موت و زیست کی کشمش میں مبتلا رہی تھی۔ ان سات دنوں میں اس کے لیے کروڑوں پیغامات دنیا بھر سے آ چکے تھے۔

دنیا بھر میں ایک ہاکی فین کی خودسوزی کی خبر نے بے چینی کی لہر دوڑا دی تھی۔ ترقی یافتہ اور آزاد ممالک کے لیے یہ ایک حیرت انگیز اور افسوس ناک خبر تھی کہ دنیا کے کسی ملک میں کھیل دیکھنے پر بھی صنفی امتیاز برتا جاتا ہے اور سزائیں دی جاتی ہیں۔ اس کے حق میں دعاؤں کے ساتھ ساتھ مظاہرے بھی جاری تھے۔ مگر اسپتال کے ایک بیڈ پر، پٹیوں میں لپٹی وہ ان سب کو سننے سے قاصر تھی۔ ملک کے طول و عرض میں مظاہرے شروع ہو چکے تھے لہٰذا۔ شدید عوامی دباؤ سے مجبور ہو کر حکومت کو یہ امتیازی قانون فوری طور پر منسوخ کرنا پڑا تھا... اور اس طرح ملکی تاریخ میں پہلی بار خواتین نے میچ اپنی فیملی کے ساتھ بیٹھ کر دیکھا تھا۔ ان کے پاس مجروح لڑکی کی تصاویر سے مزین پلے کارڈز تھے۔ جس میں وہ نیلی شرٹ میں تو کہیں سفید پٹیوں میں لپٹی اسپتال کے بیڈ پر موجود تھی۔ اس کی پسندیدہ ٹیم کے کپتان نے بطور خاص اس کے لیے ٹویٹ کر کے شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا تھا۔ مگر وہ جسے پڑھنے سے قاصر تھی..... اس نے لکھا تھا۔

"بریرہ رفیق۔ اگر آج اس میدان میں کھیل جاری ہے۔ اور تم ہار ملک ایک نئے دور میں داخل ہو رہا ہے... تو اس کے پیچھے تمام تر کوشش تمہاری ہے۔ افسوس مگر ہم تمہیں اس اسٹیڈیم میں نہیں دیکھ پائیں گے۔"

کیونکہ جس وقت اسٹیڈیم میں لوگ اس کے نام کے نعرے لگا رہے تھے۔ اس وقت اس کے جسد خاکی کو وارڈ سے مردہ خانے میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ باہر بینچ پر بیٹھی روتی ہوئی مسز رفیق اور اندر بریرہ کے اسٹریچر کے ساتھ چلتی ہوئی نائمہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ اس کی پسندیدہ بلو ٹیم نے میچ چار صفر کے شاندار اسکور سے جیت لیا تھا۔

ان سے کئی میل دور ٹی وی پر میچ دیکھتے عمار نے ریموٹ ایک جانب رکھ دیا۔ وہ بریرہ کی اس حرکت سے ازحد مایوس ہوا تھا۔ جرار مالک اس کے والد نے کیس کھلوانے کے نام پر محض ایک بلف کیا تھا۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی جلد باز نکلی۔ ایک غلط کام کر کے وہ دنیا کو کیا سبق دے گئی.....

اس نے تنفر سے سوچا اور ریموٹ دور اچھال دیا..... اس کے خیال میں وہ بزدل نکلی تھی۔ سب کے خیالات اس کے متعلق مختلف تھے۔

++

WaqarAzeem
Pakistanipoint.com

روپ بہروپ

سید احتشام

وہ ایک ظالم وجابر فوجی افسر تھا۔ اس کا نام سن کر ہی ماتحت کانپ اٹھتے تھے۔ اس نے جنگِ عظیم میں بھی بہادری دکھائی۔ کئی تمغے حاصل کیے لیکن جب اسے موت نے پچھاڑا تب اس کی حقیقت کھلی اور پورا یورپ حیران رہ گیا۔

ایک فوجی افسر کی انوکھی اور ناقابلِ یقین روداد

جولائی میں گرمی اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ 1865ء کے جولائی میں تو کچھ زیادہ ہی گرمی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سڑکیں گرم توا ہیں، بس روٹی ڈالنے کی دیر۔ لوگ گرمی سے بلبلا ہی رہے تھے کہ لوگوں کو پیچش کے مرض نے گھیرنا شروع کردیا۔ دھیرے دھیرے یہ مرض وبا کی صورت اختیار کرگیا، ہر گلی محلے سے میتیں نکلنے لگیں انہی میتوں میں سے ایک میت برٹش آرمی کے ملٹری جیمس مرٹڈا اسٹوارٹ بیری کی تھی۔ اس وبائی ماحول میں بھی اس کی

موت نے اخبارات کی دنیا میں ایک طوفان کھڑا کر دیا ہر کوئی حیران و پریشان ہوا تھا۔

اس طوفان کی وجہ کیا تھی اس بارے میں کچھ بتانے سے بیشتر ملٹری سرجن بیری کے ماضی پر روشنی ڈالی جائے۔

کیپ ٹاؤن جنوبی افریقا کے دلفریب اور سحر انگیز قدرتی مناظر جہاں دامن دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں وہاں اس کے مضافات میں خلیج کے ساحل پر واقع جزیرہ ''کیمپس بے'' کا وسیع و عریض سبزہ زار ساحل تک بانہیں پھیلائے آنے والوں کو بہ زبان خاموشی خوش آمدید کہتا ہوا لگتا ہے۔ نیلگوں خلیج کی مضطرب لہریں ریگ ساحل کا منہ چومتی اور چٹانوں سے ٹکرا کر فضا میں موتی بکھیرتی' لاکھوں سیاحوں کو نہ صرف دعوت نظارہ دیتی ہیں بلکہ تفریح کا سامان بھی فراہم کرتی ہیں۔ خلیج کے شمال سے جنوب تک دو ہزار دو سو فٹ بلند سنگلاخ پہاڑوں کا ایک سلسلہ پھیلا ہوا ہے جو ''کیمپس بے'' کی دلکشی میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ ان پہاڑوں کی چوٹیاں تقریباً یکساں بلندی کی حامل ہیں اور بظاہر ایک دوسرے سے جڑی ہوئی لگتی ہیں۔ یہ چوٹیاں تعداد میں بارہ ہیں اور اسی اعتبار سے ''بارہ بنی'' کہلاتی ہیں۔ ان جڑے ہوئے پہاڑوں سے الگ تھلگ' پیلے پہاڑ کی چوٹی ''لائنس ہیڈ'' کے نام سے مشہور ہے کیونکہ بادی النظر میں ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی ببر شیر پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا پورے شہر کی نگرانی کر رہا ہو۔ یہ پہاڑ عمومی نہیں' ڈھلانی ہیں۔ پہاڑوں پر پہنچنے کے کئی راستے ہیں۔ ان ناہموار سنگلاخ اور دشوار گزار ڈھلانوں پر پیدل چل کر چار گھنٹے میں چوٹیوں پر پہنچا جا سکتا ہے جس کے لیے غیر ملکی مرد و زن سیاح اپنی سہولت کے مطابق کوئی راستہ اختیار کرتے ہیں۔ یہاں فضائی سیر کے لیے کیبل کار کی سہولت بھی موجود ہے لیکن کچھ لوگ تفریح کے لیے پیدل ہی چوٹی پر پہنچتے ہیں وہیں پکنک مناتے ہیں اور پورے شہر کے روح پرور نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

ان خاموش خاموش سے پُراسرار پہاڑوں کی دلکش اور دلفریبی اپنی جگہ' ان کی شہرت کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ ان پہاڑوں پر اکثر ایک روح بھٹکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے جسم پر وکٹورین عہد کی فوجی وردی ہوتی ہے۔ یہ منظر بہت سے لوگوں نے بارہا دیکھا ہے۔ نہ صرف دیکھا بلکہ اسے چیختے ہوئے بھی سنا ہے۔ اس کی چیخ میں ایک تحکم ہوتا ہے۔ مقامی افراد کے علم میں ہے کہ یہ وکٹورین عہد کے فوجی جنرل اور تاریخ ساز ملٹری سرجن' ڈاکٹر جیمز بیری کی روح ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ''کیمپس بے'' کے ولٹیوران راؤنڈ ہاؤس' میں بھی کئی موقعوں پر ڈاکٹر جیمز بیری کا سایہ دیکھا گیا ہے۔ یہ ایک مشہور ریستوران ہے جو فرانسیسی کھانوں کے لیے بے حد مقبول ہے۔ اٹھارویں صدی میں جنوبی افریقا کے گورنر لارڈ سمرسیٹ کی شکارگاہ تھا۔

یہاں چیتے اور تیندوے پائے جاتے تھے اور ڈاکٹر جیمز بیری اکثر گورنر کی دعوت پر راؤنڈ ہاؤس میں قیام کیا کرتا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ راؤنڈ ہاؤس اور اس کے اطراف میں بھی اس کی روح کو دیکھا گیا ہے۔ لوگ اس کی چیخ سن کر بھاگ اٹھتے ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کیپ ٹاؤن کی مائیں، بچوں کو یہ کہہ کر ڈراتی ہیں کہ زیادہ دیر تک گھر سے باہر رہو گے تو ڈاکٹر جیمز بیری کا بھوت تمہیں پکڑ لے گا۔

☆☆☆

اٹھارویں صدی میں آئرلینڈ کا دوسرا سب سے بڑا شہر کورک 'دریائے لی' کے کنارے واقع ہونے کے سبب نہایت اہم تجارتی مرکز ہوا کرتا تھا۔ اس کی گودی میں بڑی گہما گہمی رہتی تھی۔ مال بردار بحری جہازوں اور بادبانی کشتیوں کی آمدورفت کا سلسلہ خوب تھا۔ یہاں امپورٹ کی جانے والی اشیاء اتاری اور ایکسپورٹ کی جانے والی اشیاء لادی جاتیں۔ ہمہ وقت جہازوں کے سائرن کی' فضا پر چکر لگاتے ہوئے آبی پرندوں کی چہچہاہٹ اور گھاٹ سے لہروں کے ٹکرانے کی شروپ شروپ متواتر سنائی دیتی تھیں۔ اسے برٹش امپائر کی ایک عظیم بندرگاہ کی حیثیت حاصل تھی۔

اسی شہر میں جیمز بیری 1789ء میں پیدا ہوا تھا۔ لڑکپن میں وہ صبح کے وقت گھاٹ پر آجاتا اور دریا پر چھائی ہوئی دھند میں قریب آتی یا دور جاتی ہوئی بادبانی ... کشتیوں کا نظارہ کیا کرتا۔ وہ اڑتے ہوئے آبی پرندوں کو دیکھتا ان کی چہچہاہٹ سنتا اور لہروں کی آوازوں سے بھی لطف اندوز ہوتا جو اسے قدرت کی رعنائیوں سے جڑے رہنے کا احساس دلاتی تھیں۔

اس کا گھر گھاٹ کے قریب ہی ایک چوڑی سڑک پر واقع تھا۔ یہ ایک بارونق سڑک تھی۔ لوگوں کی آمدورفت' بگھیوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آوازیں' ان میں جتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپیں اس چہل پہل کا ایک حصہ تھیں۔ یہاں کاروباری سرگرمیاں عروج پر رہتی تھیں' لہٰذا بہت گہما گہمی ہوا کرتی تھی۔ بیشتر تاجروں کا تعلق جہاز رانی کے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کاروبار سے تھا۔ لوہار کی دکانیں' سرائے' کشتیوں کے مستول' بادبانی' پتوار' نیز دیگر ساز وسامان تیار کرنے کی دکانوں کی ایک طویل قطار تھی۔ اسی قطار میں جیمز بیری کے باپ جیریمیا بکلی کی کریانہ کی دکان تھی جس پر اس کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ یہ ننھے جیمز بیری کا گھر تھا اور یہی اس کی دنیا تھی۔ اس کے والدین بھی اسی شہر میں پیدا ہوئے تھے۔

ننھے جیمز بیری کا باپ جیریمیا بکلی ایک محنتی اور ایماندار شخص تھا۔ وہ گھر جس میں اس نے کریانہ کی دکان کھول رکھی تھی' اس کا ذاتی نہیں بلکہ اس کے سسرالیوں کا تھا' لہٰذا اسے کرایہ نہیں ادا کرنا پڑتا تھا اور یہ ایک بچت تھی لیکن اس نے اپنا ذاتی کاروبار جمانے کے لیے لوگوں سے کئی سو پاؤنڈ قرض لے رکھے تھے جس کی ادائیگی میں کئی سال لگتے۔

وہ کورک کے سوداگروں کی برادری میں دھیرے دھیرے اپنی جگہ بنانے اور کاروبار میں استحکام پیدا کرنے کے لیے کوشاں تھا۔ کریانہ اسٹور چلانے کے علاوہ وہ شہر کے ''وزن گھر'' میں ایک انسپکٹر کے عہدے پر بھی فائز تھا۔ یہ ایک سرکاری عہدہ تھا اور اسی لیے اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

اسی زمانے میں ''وزن گھر'' کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ اس کی عمارت چوک پر واقع تھی۔ کورک سے برآمد کی جانے والی تمام اشیاء پہلے وزن گھر لائی جاتیں۔ سارے سوداگر اپنا مال تجارت لے کر سیدھے وزن گھر پہنچتے تھے۔ وہاں ان کے مال کی کوالٹی پرکھی جاتی اور پھر وزن کرنے کے بعد انہیں برانڈ کیا جاتا۔ ان مراحل سے گزرنے کے بعد یہ اشیاء گھاٹ یا بندرگاہ بھیج دی جاتیں جہاں انہیں مال بردار جہازوں اور بادبانی کشتیوں پر لاد کر بیرونِ ملک روانہ کردیا جاتا۔ سوداگروں کو اپنا مال تجارت ان مراحل سے گزارنے کے لیے ایک مخصوص رقم ادا کرنی پڑتی تھی جو وزن گھر کی آمدنی تھی۔ کورک سے برآمد کی جانے والی اشیاء میں مکھن اور نمکین گوشت شامل تھے۔ ان کی بیرون ممالک بہت مانگ تھی۔ مکھن کی کوالٹی کو پرکھنے اور برانڈ کرنے پر تین انسپکٹر مامور تھے۔ ان میں ایک جیریمیا بکلی تھا۔ اس کی سالانہ تنخواہ 40 پاؤنڈ تھی جو اس زمانے کے اعتبار سے ایک خطیر رقم تھی۔ لہٰذا اس گھرانے کو مالی آسودگی حاصل تھی اور جیریمیا ایک اچھے مستقبل کے خواب دیکھ سکتا تھا۔

1782 میں جیریمیا بکلی کی شادی کورک کے بیری گھرانے کی ایک لڑکی میری این بیری سے ہوئی تھی۔

جیریمیا کے خاندان کا پس منظر قابلِ ذکر نہ تھا جب کہ بیری گھرانے کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس گھرانے کے چھوٹے موٹے کئی کاروبار تھے۔ میری این چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور سب سے چھوٹی تھی۔ اسی وجہ سے اپنے باپ کی لاڈلی تھی۔ سب سے بڑا بھائی جان فوت ہوچکا تھا۔ باقی تین بھائی ویڈمنڈ' پیٹرک' اور جیمز بیری' میری این کے سن بلوغت کو پہنچنے سے بہت پہلے ہی اپنی زندگی سنوارنے کے لیے گھر سے رخصت ہوگئے تھے۔ ویڈمنڈ اور پیٹرک لاابالی' آوارہ اور ناکارہ تھے جبکہ جیمز بیری کو لڑکپن سے مصوری کا شوق تھا۔ کم عمری میں بھی اس کی مصوری لوگوں کو چونکنے پر مجبور کردیتی تھی۔ وہ خداداد صلاحیتوں کا مالک تھا (ننھے جیمز بیری نے بڑے ہوکر اسی مصور ماموں جیمز بیری کا نام اختیار کیا تھا۔ آگے چل کر اس راز پر سے پردہ اٹھایا جائے گا کہ اس کی کیا وجہ تھی) مصور جیمز بیری اپنی قسمت آزمانے کے لیے لندن جا بسا تھا۔ اس کا شمار اعلیٰ پائے کے مصوروں میں ہوتا تھا اور وہ رائل اکیڈمی آف آرٹس میں پروفیسر کے عہدے پر فائز تھا۔

میری این کو اپنے والدین کی طرف سے ترکے میں سو پاؤنڈ ملے تھے اور وہ مکان بھی جس میں وہ شوہر کے ساتھ رہتی تھی لیکن وہ اسے فروخت نہیں کرسکتی تھی کیونکہ اس زمانے میں کوئی عورت جایداد کی مالک نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کا مختار نامہ مصور جیمز بیری کے پاس تھا اور اسے فروخت کرنے کے لیے مصور جیمز بیری کے دستخط ضروری تھے۔ میری این کے دو بچے تھے۔ جان بکلی اور جیمز بیری (یہ اس کا اصل نام نہیں تھا) جیمز بیری اور میری این نے اپنے دونوں بچوں کی پرورش اسی طرح کی تھی جس طرح شریف گھرانے کیا کرتے تھے اور یہ اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ یہ بچے بڑے ہوکر کچھ کریں گے اور ان کے دن پھر جائیں گے۔ بڑا بیٹا جان بکلی زیادہ ذہین نہیں تھا لیکن وہ قانون کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس سے چھوٹا بھائی جیمز بیری بلا کا ذہین اور تیز طرار تھا لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ بڑا ہوکر کیا بنے گا۔

☆☆☆

تباہی دھیرے دھیرے جیریمیا بکلی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسے اور میری این کو اس بات کا کوئی اندازہ نہ تھا کہ حالات کیا رخ اختیار کرنے والے ہیں۔ اس کا آغاز سیاست سے ہوا۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے آئرلینڈ میں قوم پرستوں اور تاج برطانیہ کے حامیوں کے درمیان انتشار اور

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

بے چینی کی کیفیت پائی جاتی تھی اور اندر ہی اندر لاوا پک رہا تھا۔ یہ لاوا 1782ء میں پھٹ پڑا۔ متحدہ آئرش نے برٹش امپائر کے خلاف مصلح بغاوت شروع کردی۔ اس کا آغاز آئر لینڈ کے دارالحکومت ڈبلن سے ہوا اور یہ آگ دوسرے شہروں تک پھیلتی چلی گئی۔ دونوں طرف سے قتل عام شروع ہوگیا۔ یہ صورتِ حال جیریمیا بکلی جیسے عام گھرانوں کے لیے بے حد دہشت ناک تھی۔ 1782ء میں نپولین بونا پارٹ نے آئرش باغیوں کی مدد کرنے کے لیے اپنی فوج آئرلینڈ میں داخل کردی۔ ایک ہزار فرانسیسی فوجیوں کا دستہ لڑتا بھڑتا ہوا ڈبلن کی طرف بڑھنے لگا لیکن یہ بغاوت زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہ سکی۔ ستمبر کے اواخر تک برٹش امپائر کے فوجی دستوں نے فرانسیسی فوج اور آئرش باغیوں کو شکست دے دی۔ یہ جنگ کورک تک نہیں پہنچ پائی تھی تاہم اس شہر نے اس جنگ میں اپنا کردار ضرور ادا کیا تھا۔ وہ یوں کہ رائل ملیشیا نے ڈبلن میں اپنے گھڑسوار دستوں اور بھاری توپوں کی مدد سے آئرش باغیوں کو کچل ڈالا تھا۔ اگرچہ بغاوت ختم ہوگئی تھی لیکن دلوں میں سلگتی ہوئی چنگاری ہنوز باقی تھی۔ قومیتوں کے درمیان جو بغض وعناد نے جنم لیا تھا اس میں شدت آگئی تھی۔ جیریمیا جیسے کیتھولک اس سے قطع نظر کہ وہ قوم پرستوں کے حامی تھے یا نہیں پہلے سے بھی زیادہ شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے اور ان کی زندگی انتہائی غیر محفوظ ہوگئی تھی۔

1800 میں برطانیہ عظمیٰ نے اس بغاوت کے نتیجے میں آئرلینڈ پر اپنی گرفت اور بھی مضبوط کرلی۔ اسے باضابطہ یونائیٹڈ کنگڈم (یوکے) میں ضم کرلیا۔ 1792ء میں برطانیہ عظمیٰ نے کورک کے وزن گھر کو اپنی تحویل میں لے لیا اور برطانوی حامیوں کو اس کا انچارج مقرر کردیا گیا۔ جیریمیا بکلی کی بھی ملازمت ختم ہوگئی۔ بھاری قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے جیریمیا کے لیے سالانہ 40 پاؤنڈ کی تنخواہ سے محرومی ایک زبردست جھٹکا تھی۔ زندگی کی ڈانواڈول ناؤ ادھار کی لہروں پر چلنے لگی۔ جیریمیا کو اپنے بڑے بیٹے جان بکلی سے بہت محبت تھی اور وہ اس سے بڑی اُمیدیں وابستہ کیے ہوئے تھا۔ اب ان کے مستقبل کا سارا دارومدار جان پہ تھا مگر وہ قابل بھروسا نہیں تھا، ان حالات میں وہ تعلیم اور ملازمت کے حصول کے لیے ڈبلن چلا گیا۔

میری این کے بھائیوں میں ایڈمنڈ سب سے گھٹیا اور بدکردار تھا۔ اس میں کوئی صلاحیت نہیں تھی۔ وہ اور پیٹرک دونوں ہی ایڈونچر کے شوق میں گھر سے نکلے تھے۔ پیٹرک نے رائل نیوی میں ملازمت کرلی تھی لیکن کچھ عرصے کے بعد ملازمت چھوڑ کر کہیں نکل گیا تھا اور کسی مشرقی ملک میں فوت ہوا تھا۔ ویڈمنڈ نے بھی بحریہ میں کوئی چھوٹی موٹی نوکری حاصل کرلی تھی اور کسی بھی بھائی کا اپنی بہن سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ جیریمیا کے حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے۔ قرض خواہ اسے تنگ کرنے لگے تھے اور وہ مختلف حیلے بہانے سے انہیں ٹال رہا تھا لیکن وہ کب تک ایسا کرسکتا تھا۔ اس کے پاس کچھ جایدادیں تھیں اور اسٹور کا سامان تھا۔ اس نے قرض خواہوں کو رام کرنے کی آخری کوشش کرتے ہوئے انہیں یہ پیشکش کی کہ وہ اپنی جایدادیں اور دکان کا سامان فروخت کرکے ان کا سارا قرض چکادے گا لیکن قرض خواہوں نے اس کی پیشکش ٹھکرادی۔ وہ مزید انتظار نہیں کرسکتے تھے۔ انہیں نقد رقم چاہیے تھی لیکن جیریمیا کے پاس نقد رقم نہیں تھی۔ جب قرض خواہوں کے تقاضوں میں شدت آگئی تو جیریمیا ایک دن کسی کو کچھ بتائے بغیر 'کوک' سے فرار ہوگیا۔ گھر والوں کو اس بات کا کوئی علم نہیں تھا کہ وہ کہاں گیا۔ وہ گھر والوں کو بے سہارا چھوڑ کر فرار ہوگیا تھا لیکن کچھ عرصے بعد اس کے قرض خواہوں نے کسی طرح اس کا پتا چلا لیا اور اسے ڈبلن میں جا پکڑا۔ جیریمیا کی حالت نہایت خستہ تھی لیکن قرض خواہوں نے اسے وہیں گرفتار کروادیا اور وہ جیل چلا گیا۔ اس کے گھر والوں کو اس واقعہ کا کوئی علم نہیں تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ زندہ بھی تھا یا نہیں۔

☆☆☆

پریشانیوں نے گھر میں مستقل ڈیرہ ڈال دیا تھا اور فاقوں کی نوبت آگئی تھی۔ میری این کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کس سے مدد طلب کرے۔ وہ ملازمت کرنے کے قابل نہیں تھی اور اس کا چھوٹا بیٹا بھی گھر کا بوجھ اٹھانے کا اہل نہ تھا، وہ زیرِ تعلیم تھا۔ میری این کو اپنے بڑے بیٹے جان بکلی سے کوئی اُمید نہیں تھی کہ وہ انہیں اس منجدھار سے نکالنے کے لیے کچھ کرے گا۔ اب صرف ایک شخص تھا جس سے وہ مدد کی طالب ہوسکتی تھی اور جو اسے ان کڑے حالات میں سہارا دے سکتا تھا اور وہ تھا اس کا بڑا بھائی' نامور مصور جیمز بیری، میری این کو اس سے بچھڑے ہوئے پینتیس سال ہوگئے تھے اور اس دوران ان کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ وہ بہت چھوٹی تھی جب اس

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

نے اپنے جوان بھائی کو آخری بار اس وقت دیکھا تھا جب وہ گھر سے رخصت ہوا تھا۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ وہ رائل اکیڈیمی آف آرٹس میں پروفیسر تھا۔ اس نے اس کے گھر کا پتا معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی چنانچہ اس نے 11 اپریل 1804 کو اپنے چھوٹے بیٹے سے اس کے نام ایک خط لکھوایا جو اس وقت 14 یا 15 سال کا تھا۔ اس خط میں اس نے اپنی زبوں حالی کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس سے التجا کی کہ وہ اس کڑے وقت میں اپنی بدنصیب بہن کا ہاتھ دے۔ اس نے اس سے براہِ راست مالی مدد کا تقاضا نہیں کیا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اتنا نامی گرامی مصور دولت میں کھیل رہا ہوگا۔ وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ اس کا بھائی مکان کی پاور آف اٹارنی پر اپنے دستخط کردے تاکہ وہ اس مکان کو فروخت کرسکے اور اس کے حالات سدھر جائیں۔ اس خط پر نوجوان جیمز بیری نے اپنے اصل نام سے دستخط کیے تھے۔ یہ خط رائل اکیڈمی آف آرٹس لندن کے پتے پر روانہ کردیا گیا۔

تین ماہ گزر گئے، مصور جیمز بیری کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ اسی دوران ان کا مکان ضبط کرکے سربمہر کردیا گیا۔ دکان بھی ختم ہوگئی لیکن مکان کو فروخت نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ اس میں قانونی پیچیدگیاں تھیں۔ اس کے مالکانہ حقوق مصور جیمز بیری کے پاس تھے۔ اس بے سروسامانی کے عالم میں میری این نے کوپر پین روز سے رابطہ قائم کیا جس سے بیری گھرانے کے دیرینہ مراسم تھے۔ وہ مصور جیمز بیری کا بچپن کا دوست اور بے حد امیر و کبیر شخص تھا۔ اس نے مصور جیمز بیری کو پورے یورپ کا دورہ کروایا تھا۔ وہ محتاجوں، مسکینوں اور بے گھر لوگوں کو اپنے ہاں پناہ دیتا تھا اور ہر طرح سے ان کا خیال رکھتا تھا۔ اس نے انہیں اپنے گھر میں پناہ دے دی۔ اس کے گھر والے بے حد خوش اخلاق اور خوش مزاج تھے۔ ان لوگوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہاں قیام کے دوران میری این نے جیمز بیری کو دوسرا خط لکھوایا۔ اس مرتبہ اس کا لہجہ بہت تلخ تھا۔ اس نے خط میں جیمز بیری کو خودغرض، ظالم اور انسانیت سے عاری قرار دیتے ہوئے خوب لتاڑا۔ لیکن اس خط کا بھی کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ ہاں، اسی دوران اسے ایک خط ضرور موصول ہوا۔ یہ اس کے بڑے بیٹے جان بکلی نے لکھا تھا۔ میری این جان بکلی سے اس قدر ناراض اور دل برداشتہ تھی کہ اس نے اپنے اس ناخلف اور ناہنجار بیٹے کے خط کا جواب نہیں دیا۔ جان بکلی نے اپنے خط میں التجا سے مالی مدد کی درخواست کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اثار بننے میں ناکام رہا ہے۔ اس کے سارے خواب بکھر گ ہیں۔ اس نے فوج میں شمولیت اختیار کرلی تھی اور اس کے مالی حالات بہت برے ہیں۔

میری این کے چھوٹے بیٹے جیمز بیری سے رہا نہ گیا اس نے جان بکلی کو خط لکھا اور اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ ا نے لکھا کہ وہ کیسا مرد ہے جو اپنی زندگی سنوارنے کا بھی اہ نہیں۔ اس کے آگے اس نے ایک جملے کا اضافہ کیا۔ یہ ایک تاریخی جملہ تھا۔ دوسو سال گزرنے کے بعد جب نوجوا جیمز بیری کے تحریر کردہ خطوط منظرعام پر آئے تو ایک گہر راز پر سے پردہ اٹھا۔ ان خطوط میں آخر ایسا کیا تھا ک پورے برطانیہ عظمیٰ میں سنسنی پھیل گئی۔ یہ آگے بیان ک جائے گا۔

یہ خطوط 1804ء میں تحریر کیے گئے تھے۔ اس کے د سال کے بعد جب سردی رخصت ہورہی تھی اور موسم بہار ک آمد آمد تھی تو 22 فروری 1806ء کو تمام اخبارات میں یہ خ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی کہ نامور آئرش مصور جیمز بیر ایک مختصر سی علالت کے بعد فوت ہوگیا۔

☆☆☆

مصور جیمز بیری کی وفات کے تین سال بع 1809ء میں اس کے نوجوان بھانجے نے جیمز میرانڈا بیری کے نام سے یونیورسٹی آف ایڈنبرا میں میڈیکل کی تعلیم کے حصول کے لیے داخلہ لے لیا۔ اگرچہ وہ اس وقت بیس سال کا تھا لیکن اپنے مختصر سے قد و قامت اور منحنی جسم کے باعث وہ بارہ سال کا لگتا تھا۔ داخلے کے وقت یونیورسٹی کے سینیٹ نے بظاہر نابالغ نظر آنے والے اس لڑکے کو امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دینے سے صاف انکار کردیا تھا لیکن آنجہانی مصور جیمز بیری کے ایک گہرے دوست، آئرلینڈ کے ایک بہت ہی بااثر نواب کی سفارش پر اسے داخلہ دے دیا گیا۔

یہ خوبرو نوجوان بلا کا ذہین اور سخت محنتی تھا۔ نہایت کم سخن اور کم آمیز واقع ہوا تھا۔ کسی بھی طالب علم سے راہ و رسم نہیں بڑھاتا تھا۔ سارے طلبا بھی اس سے دور رہنے پر مجبور تھے، ایک وجہ تو یہ تھی کہ جیمز بیری ایک نوعمر لڑکا لگتا تھا اور تمام طلبا کا یہ خیال تھا کہ اس نابالغ اور کم سن لڑکے کو یونیورسٹی میں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ دوسرے یہ کہ اس نوعمر کے تعلقات نہایت بااثر شخصیات سے تھے۔ اس لیے بھی طلبا اس سے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کتراتے تھے۔ ایک اور وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جیمز بیری کو شراب سے سخت نفرت تھی جب کہ بیشتر طلبا اس سے شغل کرتے تھے، لہٰذا جیمز بیری ان سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا، دوستی کرنا تو دور کی بات تھی۔ اس کا بیشتر وقت لائبریری میں گزرتا تھا اور ساری توجہ اپنی تعلیم پر مرکوز رہتی تھی۔ 1812 میں اس نے اپنی ذہانت اور شب و روز کی محنت سے ڈاکٹر آف میڈیسن کی ڈگری حاصل کرلی۔ اس کے بعد 1813 میں رائل کالج آف سرجن آف انگلینڈ سے شاندار نمبروں سے سرجری کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت وہ چوبیس سال کا تھا لیکن اب بھی داڑھی اور مونچھوں سے بے نیاز تھا، قد بھی اتنا ہی تھا۔

6 جولائی 1813ء کو جیمز بیری نے آرمی میں شمولیت اختیار کرلی اور اسے برٹش آرمی میں اسپتال اسسٹنٹ کی حیثیت سے کمیشن مل گیا۔ اس کی پہلی تقرری چیلسی اور پھر پلے مس کے رائل ملٹری اسپتال میں ہوئی۔ 7 دسمبر 1815ء کو اسے اسسٹنٹ سرجن کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ یہ عہدہ لیفٹیننٹ کے مساوی تھا۔ اس ملٹری ٹریننگ کے بعد 1816ء میں اس کی پوسٹنگ کیپ ٹاؤن، جنوبی افریقا ہوگئی۔ وہاں اپنی تقرری کے دوران اس نے جنوبی افریقا کے گورنر لارڈ چارلس سمرسیٹ کی بیماریٹی کا نہایت تندہی سے علاج کیا۔ اس کے نتیجے میں گورنر سمرسیٹ سے اس کے خوش گوار تعلقات قائم ہوگئے اور وہ گورنر کا ذاتی معالج بھی بن گیا۔ اس کی اہلیت، خوش اخلاقی اور فرض شناسی نے گورنر کے دل میں گھر کرلیا۔ 1822 میں گورنر نے اس کی کارکردگی کے پیش نظر اسے کالونی کا میڈیکل انسپکٹر مقرر کردیا۔ یہ جیمز بیری کے کیریئر کی ایک غیر معمولی چھلانگ تھی۔ اس عہدے کی وجہ سے اس کی ذمے داریوں میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ میڈیکل انسپکٹر کی حیثیت سے وہ نہایت اہم تبدیلیاں لے کر آیا اور اس نے انقلابی اصلاحات متعارف کرائیں۔ سب سے پہلے اس نے صحت و صفائی اور آب رسانی کے نظام پر توجہ دی۔ اس زمانے میں سپلائی ہونے والا پانی آلودہ اور مضر صحت ہوتا تھا جس سے طرح طرح کی بیماریاں پھیلتی تھیں۔ اس نے فوری اس نظام کو بدل دیا اور صاف پانی کی فراہمی کو ممکن بنایا جس سے لوگوں کو صاف پانی میسر آنے لگا اور صحت و صفائی میں انقلابی تبدیلی رونما ہوئی۔ اس کے علاوہ اس نے فوجی اسپتالوں پر خصوصی توجہ دی۔ مریض فوجیوں کے علاج معالج اور ان کی غذا میں بہتری پیدا کی، نیز ادویات کی پابندی سے فراہمی کو ممکن بنایا۔ اسے معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں سے بے حد لگاؤ تھا۔ اس نے قیدیوں، ناداروں، جذام کے مریضوں، نیز ذہنی مریضوں کے حالات بہتر بنانے کے لیے انقلابی اقدامات کیے۔ جذامیوں کی بستی میں صحت و صفائی کا نظام متعارف کرایا۔ اس زمانے میں حفظان صحت کے اصولوں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ پہلا ڈاکٹر تھا جس نے عوام میں اس کا شعور بیدار کیا اور جراثیم سے آگاہی کی مہم چلائی۔

1819 میں اس نے سیزیرین آپریشن کیا جس میں زچہ و بچہ دونوں زندہ اور سلامت رہے۔ یہ برٹش امپائر میں ہونے والا پہلا کامیاب سیزیرین آپریشن تھا۔ اس سے پہلے چند سیزیرین آپریشن کیے گئے تھے لیکن کوئی بھی آپریشن کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکا تھا۔ اس آپریشن کی کامیابی پر اسے ایک تاریخ ساز سرجن قرار دیا گیا۔ بچے کے والدین اس کے بے حد احسان مند تھے۔ انہوں نے خوش ہوکر بچے کا نام جیمز بیری لنک رکھ دیا۔ وہ بچہ جوان ہوا، اس نے شادی کی، اس کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا، اس نے بیٹے کا نام بھی جیمز بیری لنک رکھا۔ وہ بچہ بڑا ہوکر جج اور پھر جنوبی افریقا کا وزیراعظم بنا۔

☆☆☆

جیمز بیری ایک باکمال ڈاکٹر اور غیر معمولی سرجن تھا وہ امراض نسواں کا ماہر تھا اور کیپ ٹاؤن میں اس کے مقابلے کا کوئی ڈاکٹر نہیں تھا۔ انگلستان میں بھی دو چار ہی اس کے پائے کے ڈاکٹر تھے۔ اس کی قابلیت، اہلیت اور صلاحیت میں کوئی کلام نہیں لیکن وہ نہایت غصہ ور، تند خو اور منہ پھٹ واقع ہوا تھا۔ میڈیکل کے معاملات پر وہ معاشی حکام کو سخت تنقید کا نشانہ بناتا اور ان کی سرزنش کرتا تھا۔ اس کے غصے کی وجہ سے فوجی افسران بھی اس سے گھبراتے تھے کیونکہ وہ کسی کو بھی نہیں بخشتا تھا۔ وہ اتائیوں اور غیر لائسنس یافتہ دواساز کمپنیوں کا کھلا دشمن تھا اور انہیں کسی بھی قسم کی رعایت دینے کا روادار نہ تھا۔ اس کے دوست تو بہت کم تھے لیکن اس نے اپنی اصول پسندی، فرض شناسی اور سخت گیری کے سبب بہت سے دشمن بنالیے تھے لیکن کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اسے کسی قسم کا نقصان پہنچا سکتا، کیونکہ اس کی پشت پر بااثر شخصیات تھیں جن سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ پورے کیپ ٹاؤن میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی،

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اگر کبھی اعلیٰ حکام کسی معاملے پر اس سے جواب طلب کرتے تو وہ ان کا خط پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا۔ وہ کسی کی غفلت یا لاپروائی کو ہرگز برداشت نہیں کرتا تھا اور سخت طیش میں آجاتا تھا اور نتیجے کی بھی پروا نہیں کرتا تھا۔ بعض فوجی افسران اس کی باریک اور تیکھی آواز کی نقل اتارتے تھے۔ ایک موقع پر اس نے ایک فوجی کیپٹن جوزف کو اپنی آواز کی نقل اتارتے ہوئے سن لیا اور فوراً ریوالور نکال کر اس پر فائر کردیا۔ خوش قسمتی سے گولی کیپٹن کے سر میں لگنے کے بجائے اس کی اونچی آہنی ٹوپی میں لگی اور آرپار ہوگئی۔ اس کی جان تو بچ گئی لیکن وہ سزا سے نہ بچ سکا۔ اس کا کورٹ مارشل ہوگیا اور اسے ایک دور دراز جزیرے پر بھیج دیا گیا جب کہ جیمز بیری کا کچھ نہیں بگڑا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ بعد میں کیپٹن جوزف سے اس کی گہری دوستی ہوگئی جو مرتے دم تک قائم رہی۔

وہ جتنا بدمزاج اور تندخو تھا' مریضوں سے اس کا رویہ اتنا ہی نرم اور مشفقانہ تھا۔ وہ ان سے مسکرا کر بات کرتا' ان کی شکایات سنتا اور ہر طرح سے ان کا خیال رکھتا۔ مریض اس کے اخلاق کے گرویدہ تھے۔ اس کی شخصیت کا یہ پہلو لوگوں کو حیران کردیتا تھا۔ مریضوں کا کہنا تھا کہ انہوں نے اتنا شفیق اور مہربان شخص نہیں دیکھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ فوجیوں اور عام انسانوں کے حالات سدھارنے کے لیے ساری عمر اعلیٰ حکام سے جنگ لڑتا رہا۔ اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ اکثر مکمل فوجی وردی میں نہایت شان سے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتا تھا۔ اس کے سر پر جرنلی ہیٹ ہوتا، کمر میں ایک طرف ہولسٹر میں ریوالور اور دوسری طرف نیام میں ایک بڑی سی تلوار ہوتی تھی جس کے استعمال سے وہ خوب واقف تھا، ایسے موقع پر اس کا ذاتی سیاہ فام ملازم جان بلیک ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر جیمز بیری نے کیپ ٹاؤن میں تقریباً تیرہ سال گزارے اور وہاں کے معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ وہ انتہائی معزز فزیشن اور سرجن تصور کیا جاتا تھا۔ اس کے مریضوں میں ہر طبقے کے لوگ شامل تھے اور وہ انتہائی شفقت سے ان کے علاج پر بھرپور توجہ دیتا تھا۔ مریض خواتین اس کے طریقہ علاج سے بہت خوش اور مطمئن تھیں، وہ ان کے لیے رحمت کا فرشتہ تھا۔ اسے گرم خطوں کی ادویات سے علاج کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ اس نے ویکسین انسٹی ٹیوٹ کے ایک رکن اور جذامیوں کے انسٹی ٹیوٹ کے انسپکٹر ہونے کی حیثیت سے 1822 میں چیچک کا ویکسین متعارف کرایا۔ اس کے بیس سال کے بعد یہ ویکسین انگلینڈ میں متعارف ہوئی۔ وہ باقاعدگی سے آرمی میڈیکل اسپتالوں' جیل خانوں' غلاموں اور ذہنی مریضوں کے دارالامان اور جذامیوں کی بستی کے دورے کرتا۔ وہاں صحت و صفائی اور غذائی معاملات کو چیک کرتا' انتظامیہ کو انہیں مقوی غذا فراہم کرنے کے احکامات جاری کرتا، ان کے امراض کے بارے میں مشاورت کرتا، قیدیوں اور فوجیوں کی فیملی کے بارے میں گہری تشویش کا اظہار کرتا اور ان کے حالات بہتر بنانے پر اپنی توانائی صرف کرتا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی، اس کی سوچ اپنے وقت سے سیکڑوں سال آگے تھی، اس زمانے میں فوجیوں کو بہت کم عزت کے قابل سمجھا جاتا تھا۔ اسپتالوں میں زخمی فوجیوں کے غذا کی کوئی پروا نہیں کی جاتی تھی۔ انہیں غیر صحت مند غذا فراہم کی جاتی تھی اور صرف کھچڑی یا دال دلیا پر ٹرخایا جاتا تھا۔ ان کے سر پر ہر وقت سخت نظم و ضبط کی ننگی تلوار لٹکتی رہتی تھی۔ جن شادی شدہ فوجیوں کی بیویاں تیمارداری کی غرض سے ان کے ساتھ رہتی تھیں ان سے فاحشاؤں کے مساوی سلوک کیا جاتا تھا۔ عام طور پر اسپتالوں میں کتے' بلیاں اور بطخیں آزادی سے مٹرگشت کرتے نظر آتے تھے۔ یہ مناظر دیکھ کر ڈاکٹر جیمز بیری کی آنکھیں خوف سے پھیل کر بڑی ہوجاتیں اور وہ آگ بگولہ ہوجاتا۔ وہ اکثر و بیشتر جعلی ادویات فروخت کرنے والی دکانوں پر چھاپے مارتا اور ان کی شامت آجاتی، ایک بھگدڑ سی مچ جاتی اور پکڑ دھکڑ شروع ہوجاتی۔ مشہور تھا کہ اگر وہ اسپتالوں میں جعلی دوا کی کوئی بوتل دیکھ لیتا تو دیوار پر دے مارتا، اس کے چھاپوں کے موقعوں پر انتظامیہ کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے، اس نے میڈیکل کے شعبے میں وہ اصلاحات متعارف کرائیں جنہیں آج ہم ہیلتھ پروموشن کہتے ہیں۔

1827 میں ڈاکٹر جیمز بیری کو آرمی سرجن کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ 1828 میں اسے موریشس بھیج دیا گیا۔ 1829ء میں اس نے ایک بہت بڑی حماقت کی جس کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑا۔ وہ چھٹی منظور کرائے بغیر موریشس سے واپس انگلینڈ چلا گیا۔ واپس آنے پر جب اس سے جواب طلب کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ وہ ہیئر کٹ کروانے گیا تھا۔ اعلیٰ حکام نے اس کا یہ جواب غیر تسلی بخش

اور ناقابل قبول پایا جس کے نتیجے میں اس کے خلاف تادیبی کارروائی عمل میں لائی گئی اور اس کا عہدہ گھٹا کر اسے اسٹاف سرجن کی حیثیت سے جمائیکا اور اس کے کچھ عرصے بعد 1836ء میں سینٹ ہیلنا کے جزیرے پر بھیج دیا گیا جو ریوڈی جنیرو سے ڈھائی ہزار میل کی دوری پر واقع تھا۔ سینٹ ہیلنا میں ڈاکٹر جیمز بیری کا اپنے ایک ساتھی آرمی سرجن سے زبردست جھگڑا ہوگیا۔ اس کے نتیجے میں جیمز بیری کو گرفتار کرلیا گیا اور اس کا کورٹ مارشل ہوگیا لیکن اس واقع کی تحقیقات کے بعد وہ بے گناہ پایا گیا اور اسے باعزت بری کردیا گیا۔

1840ء میں آرمی سرجن ڈاکٹر جیمز بیری کی ویسٹ انڈیز کے مختلف جزائر میں پوسٹنگ کی گئی، وہاں اس نے ساری توجہ میڈیسن' انتظام وانصرام اور افواج کے حالات بہترین بنانے پر مرکوز کردی۔ اس کی بہترین کارکردگی کو سراہتے ہوئے' اسے پرنسپل میڈیکل آفیسر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ 1845ء میں وہ زرد بخار کا شکار ہوگیا جو یرقان سے ملتا جلتا تھا۔ وہ طبی بنیادوں پر چھٹی لے کر انگلینڈ چلا گیا۔ 1846ء میں اس کی تقرری مالٹا ہوگئی۔ 1850ء میں مالٹا میں ہیضے کی وبا پھیل گئی۔ اس پر قابو پانے کے لیے اس نے دن رات ایک کردی۔

اگلے سال 1851ء میں اسے یونان کے جزیرہ ''کورفو'' بھیج دیا گیا اور 16 مئی کو اسے ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف ہاسپٹلز کے عہدے پر ترقی دے دی گئی یہ عہدہ لیفٹیننٹ کرنل کے مساوی تھا۔ وہ کورفو میں اس عہدے پر اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران... چھٹی لے کر کچھ دنوں کے لیے کریمیا پہنچ گیا جہاں اس وقت ترکی اور روس کے درمیان ہونے والی مشہور زمانہ کریمیا کی جنگ جاری تھی۔ غالباً وہ جنگ کے دوران زخمی فوجیوں کی طرف سے ذہنی طور پر بے حد پریشان تھا جو ''اسکیوٹاری اسپتال'' میں زیر علاج تھے۔ اس نے وہاں اپنی پوسٹنگ کے لیے درخواست بھی دی تھی لیکن اس کی درخواست مسترد کردی گئی تھی، تاہم اس کی تشویش برقرار تھی۔ وہ اسپتال میں زیر علاج زخمی فوجیوں کے حالات سے واقف ہونا چاہتا تھا۔ یہ اس کا غیر سرکاری اور ذاتی نوعیت کا دورہ تھا لیکن وہ حسب معمول اپنے گھوڑے پر سوار' پورے لاؤ لشکر کے ساتھ' اسکیوٹاری اسپتال' پہنچ گیا جو زخمی فوجیوں سے بھرا ہوا تھا اور جہاں اس وقت مشہور زمانہ ''لیمپ والی'' فلورنس نائٹ انگیل اسپتال کے انچارج کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہی تھی اور دن رات زخمی فوجیوں کی تیمارداری کرنے کے ساتھ ہی اسپتال کے حالات میں بہتری لانے کے لیے سخت جتن کررہی تھی۔ جس وقت ڈپٹی انسپکٹر جنرل ڈاکٹر جیمز بیری وہاں پہنچا' اس وقت فلورنس نائٹ انگیل ادھر سے گزر رہی تھی۔ دونوں کا آمنا سامنا ہوگیا۔ لاؤ لشکر کے ساتھ اپنے گھوڑے پر سوار جیمز بیری نے اسے وہیں روک لیا اور اپنی سخت گیر طبیعت کے عین مطابق محض اس بات پر اس سے سختی سے باز پرس کرنے لگا کہ وہ اپنی کیپ کے بغیر دھوپ میں کیوں گھوم رہی تھی جو اس کے یونیفارم کا ایک حصہ تھی۔ بیچاری فلورنس نائٹ انگیل خاموشی سے سر جھکائے اس کی ڈانٹ سنتی رہی۔ یہ فلورنس نائٹ انگیل کی زندگی کا واحد واقعہ تھا جو ایک سرپھرے اعلیٰ فوجی افسر اور سرجن نے سب کے سامنے اسے ذلیل کیا جو بے حد معزز' مقبول اور قابل احترام تھی۔

☆☆☆

1857ء میں جیمز بیری کی تقرری کینیڈا میں ہوئی اور اسے 'انسپکٹر جنرل آف ہاسپٹلز' کے عہدے پر ترقی دے دی گئی جو بریگیڈیئر جنرل کے مساوی تھا۔ یہ برٹش امپائر میں دوسرا سب سے بڑا عہدہ تھا جس پر اس سے پہلے یا... اس کے بعد کوئی بھی سرجن فائز نہ ہوسکا۔ اب وہ برطانیہ عظمیٰ کے تمام زیرنگیں ممالک کے ملٹری اسپتالوں کا واحد سربراہ بن گیا۔ اپنی اس حیثیت میں رہ کر وہ قیدیوں' جذامیوں' فوجیوں اور ان کی فیملی کے لیے بہتر غذا' صحت وصفائی اور علاج معالجے کے لیے کوشاں رہا۔

وہ برطانیہ عظمیٰ کے جن ممالک میں گیا وہاں سب کے لیے صحت وصفائی اور غذائی اصلاحات متعارف کیے۔ کئی موقعوں پر حکومت کے نمائندوں سے اس کا سخت جھگڑا بھی ہوا لیکن وہ اپنے جدید نظریات پر اڑا رہا۔ وہ غریبوں اور محتاجوں کا ہمدرد اور غم گسار تھا اور ان کے حالات بہتر بنانے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار رہتا تھا۔ جب کہ حکومت کے نمائندے اس کے جدید نظریات اور اصلاحات کو پاگل پن سے تعبیر کرتے تھے' لہٰذا انہوں نے اسے سنکی مشہور کردیا تھا لیکن اسے ان باتوں کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ ہیڈ کوارٹر سے وسیع تر اصلاحات کے احکامات جاری کرتا رہا جن میں نکاسی آب اور سیوریج سسٹم کے فروغ کے لیے عملی اقدامات بھی شامل تھے۔ وہ یہ دیکھ کر حواس باختہ ہوجاتا کہ

Wadar Azeem
Pakistanipoint.com

شادی شدہ فوجیوں کو جداگانہ رہائش کی سہولت میسر نہیں تھی۔ ایک ہی ہال میں بیس یا اس سے زیادہ شادی شدہ فوجی اپنی بیویوں کے ساتھ رہا کرتے تھے جن کے درمیان صرف ایک باریک سا پردہ ہوتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ انسانیت نہیں حیوانیت ہے۔ اس نے آرمی کی طرف سے ہر سطح پر مخالفت کے باوجود شادی شدہ فوجی کے لیے الگ کوارٹر کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا۔ وہ شراب سے سخت نفرت کرتا تھا جب کہ برٹش آرمی اور نیوی میں بے تحاشا شراب پی جاتی تھی۔ بہت سے فوجی رات میں شراب پی کر سوتے اور مدہوشی کے عالم میں ہائیڈروتھرمیا کا شکار ہو کر صبح مردہ پائے جاتے۔ ایسی حادثاتی اموات کی شرح بہت زیادہ تھی لیکن شراب نوشی فوجی زندگی کا ایک اہم جز تھی۔ جیمز بیری نے مختلف رینک کے فوجیوں پر شراب پینے پر مکمل پابندی عائد کر دی جس کے بعد اموات کی شرح میں خاطر خواہ کمی واقع ہو گئی۔

☆☆☆

1859ء میں بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ اس کی صحت تیزی سے جواب دینے لگی اور دن بہ دن ابتری کی طرف مائل ہونے لگی۔ اسی دوران وہ نمونیا کا شکار ہو گیا اور اسے انگلینڈ روانہ کر دیا گیا۔ اسی سال جولائی میں اس کی تنخواہ نصف کر دی گئی اسے ملازمت سے ریٹائر کر دیا گیا۔ اس نے اس جبری ریٹائرمنٹ پر سخت احتجاج کیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اب بھی اپنی خدمات انجام دینے کے قابل تھا لیکن اس کی ایک نہیں سنی گئی۔ اعلیٰ حکام دیکھ رہے تھے کہ اس کی صحت بے حد خراب ہو چکی تھی اور وہ اپنی ملازمت جاری رکھنے کے قابل نہیں تھا۔ اب وہ تھا، اس کا وفادار ملازم جان بلیک تھا، ایک کتا تھا جو اسے بے حد عزیز تھا اور تنہائی تھی۔ اسی دشتِ تنہائی میں چھ سال بیت گئے۔

1865ء میں جولائی کے مہینے میں لندن شدید گرمی کی لپیٹ میں آ گیا اور پیچش کی وبا پھیل گئی۔ ڈاکٹر جیمز بیری اس مرض کا شکار ہو گیا۔ اس کے دوست ملٹری سرجن میکلن نے اس کا علاج کیا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا اور 25 جولائی 1865ء کو 76 سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ سرجن میکلن نے اس کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کر دیا۔

☆☆☆

موت سے پہلے ڈاکٹر جیمز بیری نے ایک عجیب و غریب وصیت کی تھی۔ وہ وصیت یہ تھی کہ اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم نہ کیا جائے۔ وہ جن کپڑوں میں ہے اس میں اسے بستر کی چادر میں لپیٹ کر دفن کر دیا جائے۔ اس کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے، اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم نہیں کیا گیا لیکن مذہبی رسومات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا لہٰذا اس کی میت کو غسل دینے اور تیار کرنے کے لیے ایک غسالہ کی خدمات حاصل کی گئیں جو گھروں میں ملازمہ کی حیثیت سے کام کرتی تھی اور مردوں کو غسل بھی دیتی تھی۔ یہاں یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ ایک مرد کی میت کو غسل دینے کے لیے کسی غسالہ کی خدمات کیوں حاصل کی گئیں۔ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ ڈاکٹر جیمز بیری کا کوئی بھی رشتے دار نہیں تھا۔ کسی نے بھی اس کے کسی رشتے دار کو نہیں دیکھا تھا اور کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کا کوئی رشتہ دار زندہ تھا بھی یا نہیں۔ اگر تھا تو کون تھا اور کہاں تھا جسے میت کو غسل دینے کے لیے طلب کیا جاتا۔ چونکہ کوئی رشتے دار ہی میت کو غسل دے سکتا تھا، لہٰذا اس کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً ایک غسالہ کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔

اس غسالہ کا نام صوفیہ بشپ تھا۔ جب وہ وہاں پہنچی تو ایک کمرے میں مرد آہن، نامی گرامی آرمی سرجن ڈاکٹر جیمز بیری کی میت پڑی تھی اور کوئی تیسرا شخص وہاں موجود نہ تھا۔ اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ صوفیہ بشپ نے ایک بڑے سے برتن میں پانی نیم گرم کیا اور اسفنج اور صابن اٹھا کر میت کو غسل دینے ہی لگی تھی کہ رک گئی۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک ناقابل یقین منظر تھا۔ صوفیہ بشپ کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں اور اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے غور سے ڈاکٹر جیمز بیری کے چہرے کی طرف دیکھا۔ یہ ایک بوڑھے شخص کا چہرہ تھا اور یہ اسی کی لاش تھی۔ وہ اسے برسوں سے جانتی تھی۔ ڈاکٹر جیمز بیری اس کے لیے اجنبی نہیں تھا پھر بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس کے جھریوں والے چہرے کو دیکھتی رہی پھر اس کی نظریں لاش کے چہرے پر سے ہٹ کر اس کے جسم پر پھیلنے لگیں۔ اس کا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا اور حواس بکھر رہے تھے۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے حواس کو مجتمع کیا اور خاموشی سے اپنا کام انجام دینے لگی۔ وہ یقیناً آہنی اعصاب کی مالک تھی۔ بالآخر اس نے لاش کو کفن پہنا کر تیار کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد فوجی آئے اور لاش کو لے جا کر پورے اعزاز کے ساتھ کنسال گرین قبرستان میں دفنا دیا جو نامور ہستیوں کے لیے مخصوص تھا۔

☆☆☆

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

صوفیہ بشپ دو ہفتے تک شش و پنج میں مبتلا رہی۔ اس کے دل و دماغ کے درمیان ایک جنگ جاری تھی پھر وہ ایک فیصلہ کر کے ملٹری سرجن میجر جان میکنن کے دفتر پہنچ گئی اور اس سے ملنے پر اصرار کرنے لگی۔ تھوڑا انتظار کرنے کے بعد اسے جان میکنن سے ملنے کی اجازت دے دی گئی۔

''سر' کیا آپ ہی وہ سرجن ہیں جس نے ڈاکٹر جیمز بیری کا علاج کیا تھا؟'' اس نے استفسار کیا۔

''ہاں۔'' جان میکنن نے جواب دیا۔

''سر' کیا آپ نے علاج کے دوران ڈاکٹر جیمز بیری کا جسمانی معائنہ کیا تھا؟'' اس نے دوسرا سوال کیا۔

''اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔'' ملٹری سرجن نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''پھر تو آپ اچھے ڈاکٹر ہیں کہ اس کا جسمانی معائنہ کیے بغیر ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کر دیا۔'' صوفیہ بشپ کے لہجے میں گہرے طنز کی کاٹ تھی۔

ملٹری سرجن کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ ''جیسا کہ میں نے کہا ہے، اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔'' وہ بولا۔

''سر' بات دراصل یہ ہے کہ سرجن جیمز بیری کے مالک مکان نے میری خدمات کا معاوضہ ادا نہیں کیا۔ مجھے میرا معاوضہ چاہیے اور بخشش بھی۔'' اس نے مطالبہ کیا۔

''یہ میرا کام نہیں ہے۔ میں ایک معالج ہوں۔'' سرجن میکنن نے جواب دیا۔

''اچھا' تو آپ سن لیں۔ اگر مجھے معاوضہ ادا نہیں کیا گیا تو میں ایک ایسا راز فاش کر دوں گی کہ بھونچال آ جائے گا۔'' صوفیہ کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

ملٹری سرجن اسے غور سے دیکھنے لگا۔ ''کیسا راز؟''

''یہی کہ نامی گرامی سرجن ڈاکٹر جیمز بیری' جسے دنیا مرد سمجھتی تھی' مرد نہیں تھا بلکہ وہ ایک عورت تھی۔۔۔ مکمل عورت۔'' صوفیہ نے دھماکا کر دیا۔

ملٹری سرجن ہکا بکا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ ''تم ہوش میں تو ہو؟'' وہ بگڑ کر بولا۔

''سر' میں اپنے پورے ہوش و حواس میں ہوں اور پوری ذمے داری سے یہ بات کہہ رہی ہوں۔'' صوفیہ گہری سنجیدگی سے گویا ہوئی۔ ''میں نے ہی اس کی میت کو غسل دیا تھا اور آپ یہ بھی سن لیجیے کہ نہ صرف یہ کہ وہ ایک عورت تھی بلکہ ایک بچے کی ماں بھی تھی جسے اس نے کم سنی میں جنم دیا تھا۔'' اس نے دوسرا دھماکا کیا۔

ملٹری سرجن ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگا۔ ''تم اس نتیجے پر کیسے پہنچیں؟'' بالآخر اس نے سوال کیا۔

صوفیہ بشپ نے اپنے پیڑو کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کے پیڑو پر برتھ مارکس تھے۔'' وہ بولی۔ ''میں ایک شادی شدہ عورت ہوں اور نو بچوں کی ماں ہوں۔ مجھے تو معلوم ہونا ہی چاہیے۔''

''میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔'' ملٹری سرجن نے کہا۔ ''میں پہلے بھی کئی موقعوں پر اس کا علاج کر چکا تھا۔ ویسٹ انڈیز میں اور یہاں بھی۔ مجھے تو کبھی اس بات کا شبہ نہیں ہوا۔ بہر حال، وہ مرد تھا یا عورت یا کچھ اور، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔''

''تو آپ مجھے معاوضہ ادا نہیں کریں گے؟''

''میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔'' سرجن میکنن نے ٹکا سا جواب دیا۔ اس کے خیال میں وہ عورت اسے بلیک میل کر کے اس سے رقم اینٹھنا چاہتی تھی۔

صوفیہ بشپ مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے نکل کر سیدھے پریس پہنچ گئی اور اس نے سارا راز فاش کر دیا۔

☆☆☆

اگلے دن تمام اخبارات کی سرخیاں چیخ رہی تھیں۔ ''مشہور و معروف ملٹری سرجن ڈاکٹر جیمز بیری، انسپکٹر جنرل آف ہاسپٹلز، عورت تھی۔''

یہ سنسنی خیز خبر انگلینڈ سے لے کر کیپ ٹاؤن اور کینیڈا سمیت برٹش امپائر کے ان تمام ممالک میں جہاں جہاں سرجن ڈاکٹر جیمز بیری تعینات تھا، جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ جس نے بھی یہ خبر پڑھی یا سنی، بھونچکا رہ گیا۔ کسی کو بھی اس تہلکہ خیز انکشاف پر یقین نہیں آیا۔ میڈیکل کے شعبے سمیت برٹش آرمی میں کھلبلی مچ گئی۔ عوامی حلقوں میں شدید غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ان کے ایک قومی ہیرو کو عورت ظاہر کر کے اس کی کردار کشی کی جا رہی تھی جو نہ صرف ایک غیر معمولی سرجن اور باکمال ڈاکٹر بلکہ جدید اصلاحات کا بانی تھا، جس نے میڈیکل اور سماجی شعبوں میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ بعض حلقوں کی طرف سے اس معاملے کو عدالت میں لے جانے کی دھمکی دی گئی جب کہ دوسری طرف بالخصوص کیپ ٹاؤن میں بہت سے دعوے دار پیدا ہو گئے جن کا دعویٰ تھا کہ وہ تو شروع ہی سے جانتے تھے کہ سرجن جیمز بیری لڑکی تھی۔ اس سے تنازع کا ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ برٹش آرمی نے اس ہنگامے پر قابو پانے کے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

لیے سرجن جیمز بیری کی قبر کشائی کرکے لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے اور حقیقت جاننے کے بجائے کسی اسکینڈل سے بچنے کے لیے، گھبرا کر اس کے تمام ریکارڈ کو سو سال کے لیے سربہ مہر کر دیا۔

☆☆☆

برٹش آرمی اسٹیبلشمینٹ نے غالباً یہ سوچا ہوگا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا اور لوگ اس واقعہ کو رفتہ رفتہ بھول جائیں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس شکوک و شبہات میں اضافہ ہو گیا۔ عوام و خواص کے ذہنوں میں طرح طرح کے سوالات سر اٹھانے لگے تھے۔ ڈاکٹر جیمز بیری کی موت واقع ہونے تک اس کی ذاتی زندگی پر ایک دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔ وکٹورین عہد کی متعدد ہستیوں سے لے کر ایک عام آدمی تک کسی کو بھی اس کے کیریئر کے ماسوا کچھ بھی معلوم نہیں تھا کیونکہ اس نے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ اپنے کیریئر کے آغاز سے لے کر ملازمت سے سبکدوش ہونے تک اس کی زندگی انگلینڈ سے باہر مختلف دور دراز ملکوں میں خدمات انجام دینے میں بسر ہوئی تھی۔ البتہ کیپ ٹاؤن کے لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ ایک تاریخ ساز سرجن تھا جس نے پورے برطانیہ عظمیٰ میں پہلا کامیاب سیزیرین آپریشن کیا تھا اور ایک بے مثال ڈاکٹر تھا۔ اس نے پوری دنیا میں صحت و صفائی اور حفظانِ صحت کے اصولوں کو پہلی بار کیپ ٹاؤن میں متعارف کرایا تھا جس کا اس زمانے میں کہیں کوئی تصور بھی نہ تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اپنے عادات و خصائل کے اعتبار سے وہ بہت دلچسپ اور باتونی لیکن غریبوں، غلاموں اور ناداروں کا انتہائی ہمدرد تھا۔ وہ نہایت غصہ ور تھا لیکن کبھی کوئی مریض اس کے غصے کا شکار نہیں ہوا۔ وہ سب کے ساتھ انتہائی شفقت سے پیش آتا تھا۔

اس کی موت کی خبر پا کر فلورنس نائٹ انگیل نے تحریر کیا۔ ''......وہ اپنے گھوڑے پر سوار تھا اور پورا لاؤ لشکر اس کے ساتھ تھا۔ اعلیٰ فوجی افسران سے لے کر ادنیٰ سپاہی تک...... نہ جانے کون کون لوگ تھے...اور وہ سب کے سامنے مجھے ذلیل کر رہا تھا۔ اب جب کہ وہ فوت ہو گیا ہے تو سنتی ہوں کہ وہ عورت تھا۔ پھر بھی میں یہی کہوں گی کہ مجھے اپنی پوری زندگی میں ایسے خونخوار، سخت گیر، بدمزاج اور بدتمیز شخص سے کبھی واسطہ نہیں پڑا......''

کیا آپ
لبوب مقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کرکے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6520061

0301-6690383

فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

اگر ڈاکٹر جیمز بیری‘ حقیقت میں ایک عورت تھی جیسا کہ صوفیہ بشپ کا دعویٰ تھا اور جسے کوئی بھی جھٹلانے کی جرأت نہیں کر پایا تھا تو بلاشبہ وہ دنیا کی پہلی لیڈی ڈاکٹر‘ پہلی سرجن‘ پہلی کمشینڈ فوجی افسر اور پہلی طبی اور معاشرتی اصلاح کار تھی۔ برطانیہ عظمیٰ کے زیر نگیں ان تمام ممالک اور خود انگلینڈ کی رعایا میں اس عجیب و غریب‘ غیر معمولی اور انوکھی شخصیت کے بارے میں حقائق جاننے کی جستجو پیدا ہوئی کہ اگر وہ عورت تھی، تو آخر تھی کون؟ اس کا اصلی نام کیا تھا؟ وہ کہاں کی رہنے والی تھی؟ اس کے ماں باپ کون تھے؟ اس کا خاندانی پس منظر کیا تھا؟ پھر یہ کہ اس نے اپنے تعلیمی کیریئر کے آغاز سے لے کر اپنی موت تک کا طویل عرصہ جو 56 سال پر محیط تھا، ایک مرد کے بہروپ میں کیسے گزار دیا اور کسی کو اس کے لڑکی یا عورت ہونے پر شبہ نہیں ہوا۔ یہ ایک ناقابل یقین بات تھی اور اپنی نوعیت کا منفرد واقعہ تھا۔ ایک ایسی لڑکی‘ جو نہ صرف یہ کہ فوجی افسر بلکہ سرجن اور ڈاکٹر تھی اور اپنی قابلیت‘ اہلیت اور کارکردگی کی بنیاد پر انسپکٹر جنرل آف ہاسپٹلز جیسے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز ہوئی جو بریگیڈیئر جنرل کے مساوی تھا جہاں تک کوئی بھی ملٹری سرجن یا ڈاکٹر نہیں پہنچ سکا تھا۔ وہ برطانیہ عظمیٰ کے زیر نگیں تمام ممالک میں واقع ملٹری اسپتالوں کی سربراہ تھی۔

اسرار کے گہرے دھند میں لپٹی ہوئی یہ حیرت انگیز‘ غیر معمولی اور انوکھی شخصیت جو ایک حقیقت ایک افسانہ کے گرداب میں پھنس کر رہ گئی تھی، موخر اخبارات و جرائد کے ممتاز صحافیوں‘ دانش وروں‘ ماہر علم الابدان اور محققین کا پسندیدہ ترین موضوع بن گئی۔ انہوں نے اس کی زندگی کے واقعات اور شخصیت کے مخفی گوشوں کو بے نقاب کر کے حقائق منظر عام پر لانے کے لیے اپنے قلم کے خوب جوہر دکھائے اور دفتر کے دفتر سیاہ کر دیے۔ بعض ماہر علم الابدان یہ ثابت کرنے پر تل گئے کہ ڈاکٹر جیمز بیری نہ تو مرد تھا اور نہ ہی عورت بلکہ اس کا تعلق تیسری جنس سے تھا جب کہ کچھ محققین اپنی تحقیق میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ اسے برطانیہ عظمیٰ کے بادشاہ جارج سوئم کی ناجائز اولاد تک قرار دے دیا۔ ناول نگار حضرات بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ وہ ڈاکٹر جیمز بیری کی دلچسپ اور انوکھی شخصیت کو اپنے ناولوں میں پیش کرنے لگے حتیٰ کہ شہرۂ آفاق ادیب اور ناول نگار چارلس ڈکنس نے بھی اپنے ایک ناول ’اے مسٹری اسٹل‘ (ہنوز ایک راز) میں اس پُراسرار شخصیت کو موضوع بنایا۔ بحث و مباحثہ‘ اور قیاس آرائیوں کا یہ سلسلہ پورے 85 سال تک چلتا رہا لیکن کوئی بھی کسی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ صوفیہ بشپ نے یہ چونکا دینے والا انکشاف بھی کیا تھا کہ ڈاکٹر جیمز بیری ایک بچے کی ماں بھی تھی لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود یہ معما حل نہ ہو سکا کہ یہ واقعہ کب اور کیسے پیش آیا تھا، بچے کا باپ کون تھا اور وہ بچہ کہاں تھا۔

☆☆☆

بالآخر 85 سال کے بعد یعنی سو سال پورے ہونے سے پندرہ سال پہلے 1950ء میں مصنفہ‘ تاریخ داں اور سوانح نگار ’ازوبیل رے‘ نے کسی نہ کسی طرح ڈاکٹر جیمز بیری کے سر بہ مہر ریکارڈ تک رسائی حاصل کر لی۔ یہ ایک نہایت اہم اور تاریخی پیش رفت تھی لیکن چونکہ یہ آرمی ریکارڈ تھا‘ لہٰذا اس سے صرف ڈاکٹر جیمز بیری کے تعلیمی اور فوجی کیریئر پر روشنی پڑتی تھی۔ اس کی ذاتی زندگی یا خاندانی پس منظر کا کہیں بھی ذکر نہ تھا تاہم یہ ایک بے حد اہم ریکارڈ تھا اور اس سے حقائق تک پہنچا جا سکتا تھا لیکن اس کے لیے تمام معاملات کی مکمل چھان بین کرنے اور کڑی سے کڑی ملانے کی ضرورت تھی۔ صرف اسی صورت میں ایک مکمل تصویر سامنے آ سکتی تھی۔

☆☆☆

مزید پچاس سال گزر گئے۔ اس عرصے کے دوران اس واقع کی بازگشت سنائی دیتی رہی لیکن معما حل نہ ہو سکا۔ بالآخر ایک معروف انگریز سرجن مائیکل نے ریٹائرمنٹ کے بعد 2001ء میں جیمز بیری کی شخصیت پر سے پردہ اٹھانے اور اس معمے کو حل کرنے کی ٹھان لی۔ سرجن مائیکل خود کیپ ٹاؤن میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے انگلینڈ میں میڈیکل کی تعلیم حاصل کی تھی اور پھر کیپ ٹاؤن میں ایک بڑے اسپتال میں خدمات انجام دینے لگا تھا۔ بعدازاں وہ ترکی اور سعودی عرب میں بھی خدمات انجام دیتا رہا تھا۔ کیپ ٹاؤن کا رہائشی ہونے کے باعث اسے سرجن جیمز بیری کی پُراسرار شخصیت سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ کیپ ٹاؤن میں جیمز بیری کی انقلابی میڈیکل اور سماجی اصلاحات سے بخوبی واقف تھا لیکن ڈاکٹر جیمز بیری کی جنس کی شناخت کرنے کے ساتھ ہی اس کی زندگی کے مخفی گوشوں کو منظر عام پر لانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کے لیے بہت سی معلومات اکٹھی کرنے کی ضرورت تھی جو سب سے مشکل کام تھا اور پھر ان کی روشنی میں اس گتھی کو سلجھانے کے لیے تمام تر ثبوت کے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ساتھ حقائق کو پیش کرنا تھا۔ سرجن مائیکل کو ان تمام مراحل سے گزرنے کے لیے باقاعدہ جاسوسی کے فرائض انجام دینے پڑے اور اس کام میں پورے سترہ سال لگ گئے۔

اس نے کیپ ٹاؤن اور پھر انگلینڈ میں جاسوسی کر کے تمام ضروری معلومات حاصل کرلیں اور 2017ء میں سرجن ڈاکٹر جیمز بیری کے بارے میں سارے حقائق پر سے پردہ اٹھانے میں کامیاب ہوگیا۔

☆☆☆

اس پورے میں سے وہ چند خطوط انتہائی اہمیت کے حامل ثابت ہوئے جو سرجن جیمز بیری نے نوجوانی میں مورخہ 11 اپریل 1804ء کو اپنے سگے ماموں مصور جیمز بیری کو رائل اکیڈمی آف آرٹس لندن کے پتے پر اور اسی دوران اپنے بڑے بھائی جان بکلی کو اس کے خط کے جواب میں لکھے تھے۔ اس وقت اس کی عمر چودہ یا پندرہ سال رہی ہوگی۔ ان خطوط کے لفافوں پر ڈاکخانے کی مہر اور تاریخ واضح تھی۔ یہ ایک غیر معمولی کامیابی تھی کیونکہ ان خطوط پر ڈاکٹر جیمز بیری کی جنس کی شناخت ممکن ہوسکی اور یہ ایسے ثبوت تھے جنہیں رد کرنا کسی کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔ ان خطوط کی تحریروں کے اصلی یا نقلی ہونے کے لیے تحریر کے ماہرین کی خدمات بھی حاصل کی گئیں جنھوں نے جیمز بیری کی دیگر تحریروں سے موازنہ کرنے اور پرکھنے کے عمل سے گزرنے کے بعد انہیں اصلی قرار دے دیا اور پھر ان خطوط اور ان کے لفافوں کے عکس پرنٹ شائع کردیے گئے۔

اپنے مصور ماموں کو تحریر کیے جانے والے خط میں ڈاکٹر جیمز بیری نے اپنا اصلی نام لکھا تھا اور اپنے بڑے بھائی جان بکلی کے نام ڈبلن پوسٹ کیے جانے والے خط میں بھی اصلی نام ہی استعمال کیا تھا اور وہ نام تھا...... مارگریٹ این بکلی۔

☆☆☆

مصور جیمز بیری کے نام لکھے جانے والے خط کے متن کے دو حصے تھے۔ پہلے حصے میں یہ خط ''میرے پیارے بھائی'' کے القاب سے شروع ہوتا تھا جس میں گھریلو پریشانیوں کا ذکر تھا جب کہ دوسرے حصے میں ماموں کو ''جناب'' کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا اور لکھا تھا ''...... چونکہ امی کے ہاتھوں میں رعشہ ہے اور وہ خط نہیں لکھ سکتیں لٰہذا ان کی طرف سے میں یہ خط لکھ رہی ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ ہمارے حال پر توجہ دیں...... فقط...... آپ کی بھانجی

Waqar Azeem Pakistanipoint

بدلتے راستے

محبت اور چالبازی کے درمیان عبرت اثر معرکہ آرائی کا احوال آخری صفحات پر طاہر جاوید مغل کے قلم سے

آوارہ گردی

گمشدہ تاریخی گوشوں پر ایک گہری نظر ابتدائی صفحات پر زویا اعجاز کے قلم کا جادو

شہ زور

عشق و محبت کے سحر انگیز جذبوں کی جنوں خیزی، لطیف رشتوں اور کثیف سازشوں کے جال اسما قادری کے قلم کا کمال

ساشا

کبھی پرخطر جزیروں، کبھی بغاوتوں کے جنگل میں بھٹکتے مسافر کی داستان عمر عبداللہ کے قلم کا شاہکار

ان کے علاوہ

تنویر ریاض، منظر امام، آصفہ ضیا احمد، ڈاکٹر شیر شاہ سید، فہمی فردوس، شاہ زین رضوان اور شاکر لطیف کی خوب صورت تحریریں

مارگریٹ این بکلی.....''

بڑے بھائی جان بکلی کے نام لکھے جانے والے خط میں مارگریٹ نے اسے خوب لتاڑا تھا اور لکھا تھا.....''اگر میں لڑکی نہ ہوتی تو فوجی ہوتی۔''

ان خطوط کی عکس تحریر شائع ہونے پر ایک بار پھر زبردست سنسنی پھیل گئی اور بھونچال سا آ گیا۔ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ ڈاکٹر جیمز بیری درحقیقت مارگریٹ این بکلی کا بہروپ تھا۔ ڈاکٹر جیمز بیری کی اصلیت آشکار ہونے پر ان تمام نام نہاد محققین اور ماہرین کے دعوؤں پر اوس پڑ گئی اور ان کے منہ لٹک گئے جو اپنے قلم کی جادوگری سے ڈاکٹر جیمز بیری کو تیسری جنس قرار دینے پر تلے ہوئے تھے لیکن اب بھی بہت سے رازوں پر سے پردہ اٹھنا باقی تھا۔

☆☆☆

غسالہ صوفیہ بشپ نے یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ ڈاکٹر جیمز بیری ایک بچے کی ماں بھی تھی جس پر ایک طوفان کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی جو تفصیل منظر عام پر آئی اس نے لوگوں کے ہوش اڑا دیے۔ تحقیق کے مطابق' جب مارگریٹ تیرہ سال کی تھی' ان ہی دنوں اس کا لفنگا ماموں ریڈمنڈ' ایک طویل عرصے کے بعد گھر لوٹا تھا۔ اس نے بحری ملازمت چھوڑ دی تھی اور بالکل قلاش تھا۔ وہ اپنی بہن میری این بکلی اور بہنوئی جیر یمیا بکلی سے رقم اینٹھنا چاہتا تھا۔ ان دنوں ان لوگوں کے مالی حالات بے حد خستہ تھے پھر بھی میری اور جیر یمیا نے اسے تھوڑی بہت رقم دے دی۔ ریڈمنڈ کا قیام اسی گھر میں تھا۔ اس نے قیام کے دوران اپنی تیرہ سالہ بھانجی کا دامن عصمت تار تار کر دیا۔ اس کے نتیجے میں مارگریٹ حاملہ ہو گئی۔ یہ راز فاش ہونے پر میری این بکلی اور جیر یمیا نے ریڈمنڈ کو دھکے مار کر نہ صرف گھر سے بلکہ کورک سے نکال باہر کیا۔ بدکردار اور بے ضمیر ریڈمنڈ نے ان کے منہ پر ایسی کالک مل دی تھی جو سات سمندر کے پانی سے بھی نہیں دھل سکتی تھی۔ اس واقعے کے کچھ ہی عرصے کے بعد دونوں ماں بیٹی کورک سے غائب ہو گئیں اور جب لوٹیں تو میری این بکلی کی گود میں ایک نومولود بچی تھی۔

یہ دیکھ کر لوگوں کی آنکھوں میں حیرت کے سائے لرزنے لگے اور چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ میری این بکلی نے مارگریٹ کے بعد تیرہ سال تک کسی بچے کو جنم نہیں دیا تھا اور یہ ایک خاصا طویل وقفہ تھا۔ عام طور سے ایسا نہیں ہوتا لیکن اس وقت کے قانون نے سب کے منہ بند کر دیے جو یہ کہتا تھا کہ بچہ اسی کا ہے جو اس کا دعویٰ کرتا ہے۔ میری این نے اس کا نام جولیانا رکھا اور اس کی پرورش کرنے لگی۔ اس سے صوفیہ بشپ کا یہ دعویٰ بھی سچ ثابت ہو گیا کہ ڈاکٹر جیمز بیری نے کم سنی میں ایک بچے کو جنم دیا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر جیمز بیری کی ذاتی زندگی کے بارے میں ہونے والی تحقیقات کے نتیجے میں مزید جو باتیں آشکار ہوئیں' ان کے مطابق' میری این اور جیر یمیاج کی یہ بیٹی نہایت ذہین اور محنتی تھی لیکن والدین کو اس سے زیادہ امیدیں وابستہ نہیں تھیں کیونکہ لڑکیوں کے لیے مواقع بے حد محدود تھے۔ اس زمانے میں لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کی مجاز نہیں تھیں۔ وہ صرف گھروں میں پرائیویٹ تعلیم ہی حاصل کر سکتی تھیں۔ لیکن ڈاکٹر' وکیل' انجینئر وغیرہ کی پیشہ وارانہ تعلیم کے حصول کے لیے کالجوں میں داخلہ نہیں لے سکتی تھیں۔ ان حالات میں مارگریٹ کے والدین اسے صرف گھر ہی پر تعلیم دے سکتے تھے۔ وہ مارگریٹ کو ٹیوٹر بنانا چاہتے تھے جو کسی لڑکی کے لیے ایک معزز پیشہ تصور کیا جاتا تھا لیکن تاریخ گواہ ہے کہ نہ صرف ایسے دور میں بلکہ گزشتہ کئی صدیوں کے دوران بھی ایک سے بڑھ کر ایک خاتون ناول نگاروں نے جنم لیا جن کے شاہکار ناولوں نے پوری دنیا میں دھوم مچا دی۔ ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ آج ان کا شمار کلاسیکی ناولوں میں ہوتا ہے۔ ان تحریروں نے نہ صرف یورپ اور امریکا کے معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کیے بلکہ ان میں سے بیشتر پر فلمیں بھی بن چکی ہیں۔ ان ہی میں حسین و جمیل امریکی مصنف ہیریئٹ بیچر اسٹوے سیاہ فاموں کے حق میں اور غلامی کے خلاف تحریر کردہ شہرۂ آفاق ناول ''انکل ٹامس کیبن' کو ایک نمایاں حیثیت اور مقام حاصل ہے جس نے پورے امریکا میں آگ لگا دی تھی اور زبردست خانہ جنگی شروع ہو گئی تھی۔ اسی دوران ابراہم لنکن نے ہیریئٹ سے اپنی پہلی ملاقات کے دوران کہا تھا۔ ''اچھا' تو یہ تم ہی ہو جس نے یہ جنگ چھیڑی ہے۔'' اسی خانہ جنگی کے نتیجے میں سیاہ فاموں کو ہمیشہ کے لیے غلامی سے نجات مل گئی تھی۔

وکٹورین عہد میں امرا اور رؤسا اپنے بچوں کو تعلیم دینے کے لیے کسی پرائیویٹ ٹیوٹر کو مستقل بنیادوں پر اپنے گھر میں ملازم رکھتے تھے۔ ان کے گھروں میں گورنس بھی ہوا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کرتی تھی لیکن ٹیوٹر کا کام صرف بچوں کو پڑھانا جب کہ بچوں کی تربیت کرنا' انہیں نہلانا دھلانا' ان کے کپڑے بدلنا' وقت پر کھانا کھلانا' طور طریقے سکھانا' سلانا اور جگانا غرض یہ ہے کہ ہر طرح سے ان کا خیال رکھنا ان کے فرائض میں شامل ہوتا تھا لیکن مارگریٹ کے معاملے میں قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

☆☆☆

1806ء میں مصور جیمز بیری کے انتقال کے بعد اس کے ترکے کی تقسیم کا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس کے وکیل نے اس کے رشتہ داروں کو ڈھونڈ کر بذریعہ نوٹس انہیں لندن طلب کر لیا۔ وہ تھے مصور کا بھائی ریڈمنڈ اور بہن میری این۔ چنانچہ میری این اور مارگریٹ لندن پہنچ گئے، ریڈمنڈ بھی کہیں سے بھاگا بھاگا آ گیا۔ ضروری قانونی کارروائیوں کے بعد مصور کا ترکہ ان دونوں میں مساوی تقسیم کر دیا گیا ساتھ ہی مارگریٹ کی تعلیم کے لیے ایک رقم مخصوص کر دی گئی۔ اس سے ان کے دن پھر گئے اور خوش حالی آ گئی۔ ترکے کی تقسیم کے اہم موقع پر مصور جیمز بیری کے گھر پر اس کے تین جگری دوست موجود تھے۔ وہیں میری این کا ان سے تعارف ہوا۔ ان میں سے ایک تو آئرلینڈ کا ایک نامی گرامی نواب تھا، دوسرا ایک نامور انقلابی سیاست داں اور تیسرا مصور جیمز بیری کا وکیل، یہ تینوں نہایت بااثر اور طاقت ور لوگ تھے۔

اس ملاقات یا میٹنگ کے دوران میری این نے ان کے سامنے اپنا ایک مسئلہ بیان کیا جس کا تعلق اس کی بیٹی مارگریٹ سے تھا جو اس وقت سترہ سال کی تھی۔ میری این اس کی تعلیم اور اس کے مستقبل کی طرف سے خاصی پریشان اور فکرمند تھی۔ ان تینوں بااثر شخصیات نے میری این کی باتیں نہایت ہمدردی سے سنیں اور پھر ان کے درمیان ایک خفیہ اور انوکھا منصوبہ تشکیل پایا۔ منصوبہ یہ تھا کہ مارگریٹ کو میڈیکل کی تعلیم کے حصول کے لیے کسی کالج میں داخل کیا جائے لیکن چونکہ کسی لڑکی کو میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخلہ نہیں مل سکتا تھا، لہٰذا یہ طے پایا کہ وہ لڑکے کا روپ دھارے۔ صرف اسی صورت میں یہ ممکن تھا۔ داخلے کے لیے انہوں نے یونیورسٹی آف ایڈنبرا کو منتخب کیا چنانچہ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے' مارگریٹ نے اپنی اصلی شناخت کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا اور لڑکے کا روپ دھار کر ایک نئی شخصیت کو جنم دیا۔ اس کے اس بہروپ سے اس کی ماں کے علاوہ صرف یہ تین شخصیتیں ہی واقف تھیں۔ مارگریٹ نے اپنا نام جیمز میرانڈا بیری اختیار کر کے یونیورسٹی آف ایڈنبرا میں داخلہ لے لیا۔

سرخ چمکیلے بالوں' تیکھے نقوش' بڑی بڑی بولتی آنکھوں اور مخملیں جیسی جلد کا حامل جیمز میرانڈا بیری اس وقت بیس سال کا تھا لیکن اپنے چھوٹے سے قد اور نحیف جسم کی وجہ سے بارہ سال کا لڑکا لگتا تھا۔ یونیورسٹی کے سینیٹ نے نابالغ نظر آنے والے اس لڑکے کو امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر آئرلینڈ کے نواب نے مداخلت کی اور اس کی سفارش پر جیمز بیری کو داخلہ مل گیا۔ مارگریٹ نے اپنے اس بہروپ کو مرتے دم تک اس کامیابی سے برقرار رکھا کہ تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس کا چہرہ داڑھی اور مونچھوں سے ہمیشہ بے نیاز رہا۔ اس کی وجہ اس کے ہارمونز میں گڑبڑ بتائی گئی۔ اس کی باریک اور تیکھی آواز کے باوجود کبھی کسی کو اس کے اس بہروپ پر شک نہیں گزرا۔ یہ ایک ناقابل یقین بات تھی لیکن حقیقت تھی جس پر آج بھی دنیا حیران ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر جیمز بیری کا ماضی کھنگالنے پر کئی دلچسپ باتیں آشکار ہوئیں۔ کیپ ٹاؤن میں اس حسین نوجوان ڈاکٹر پر اشرافیہ کی کئی لڑکیاں عاشق ہو گئی تھیں جن میں گورنر سمیت کی وہ بیٹی بھی شامل تھی جس کا اس نے بڑی شفقت اور تندہی سے علاج کیا تھا اور اسے موت کے منہ سے نکال لیا تھا۔ اس غریب کو کیا پتا تھا کہ وہ ڈاکٹر کوئی لڑکا نہیں، ایک لڑکی تھی۔ ایک مرتبہ وہ بیمار پڑ گیا تھا تو وہ لڑکی اسے سیر کرانے باہر بھی لے گئی تھی۔ اس قربت کے باوجود ڈاکٹر جیمز بیری اپنا بہروپ برقرار رکھنے میں کامیاب رہا۔ بصورت دیگر نہ صرف اس کا پورا کیریئر تباہ ہو جاتا بلکہ اسے جیل بھی جانا پڑتا اور برٹش امپائر کے لیے ایک بہت بڑی مصیبت کھڑی ہو جاتی جس کے نتیجے میں بڑی بڑی ہستیاں لپیٹ میں آ جاتیں اور آرمی اسٹیبلشمنٹ کے لیے اس سے نمٹنا مشکل ہو جاتا۔

کیپ ٹاؤن میں یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں تھی کہ ڈاکٹر جیمز بیری اپنا قد بڑھانے کے لیے فوجی بوٹس میں تین انچ کی اضافی ایڑھی لگواتا تھا۔ اس کا ذاتی ملازم جان بلیک روزانہ اسے کچھ تو لیے فراہم کرتا تھا جنہیں وہ جسم پر لپیٹ کر اوپر سے فوجی وردی پہنتا تھا تاکہ فربہ اندام نظر آئے۔ یہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

دیکھ کر مقامی ہنستے تھے اور انہوں نے اس کا نام ''کاپوک ڈاکٹر'' یعنی ''پیڑ والا ڈاکٹر'' رکھ دیا تھا۔ وہ کبھی کسی کے سامنے لباس تبدیل نہیں کرتا تھا بلکہ ایسے موقعوں پر اگر کوئی وہاں موجود ہوتا تو اسے باہر نکال دیتا تھا۔ اس کے لیے روزانہ مرد کا روپ دھارنا یقیناً کسی عذاب سے کم نہیں رہا ہوگا لیکن اسے ہر روز اس عذاب سے گزرنا پڑتا تھا اور مرتے دم تک اس عذاب سے گزرتا رہا یا گزرتی رہی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ایک لڑکی ہوتے ہوئے، مرد کا روپ دھارنا اس کا شوق نہیں تھا، یہ اس کی مجبوری تھی جو ہمیشہ کے لیے اس کے گلے پڑ گئی تھی اور اس کا سبب اس زمانے کا وہ اندھا قانون تھا جس کی رُو سے کوئی لڑکی اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرسکتی تھی لیکن وقت نے ثابت کردیا کہ ذہانت، اہلیت اور صلاحیت پر کوئی بند نہیں باندھا جاسکتا۔ یہ خود اپنا راستہ نکال لیتی ہے۔

☆☆☆

انسپکٹر جنرل آف ہاسپٹلز سرجن ڈاکٹر جیمز بیری کا فلورنس نائٹ انگیل پر گرجنا اور برسنا بلاسبب نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے کیپ ٹاؤن اور کینیڈا سمیت دیگر غیر یورپین ممالک میں برسوں پہلے جو اصلاحات متعارف کرائیں تھیں، ان اصلاحات کو فلورنس نائٹ انگیل اپنا کر اور ان پر عمل پیرا ہوکر اس کا کریڈٹ لے رہی تھی اور دنیا بھر سے داد وصول کررہی تھی لیکن یہ حقیقت اس کی نگاہ سے پوشیدہ تھی کہ اس کی وہ انقلابی اصلاحات تب تک یورپین ممالک یا امریکا نہیں پہنچی تھیں۔ اس بات کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر جیمز بیری نے پہلی بار 1822ء میں کیپ ٹاؤن میں چیچک کی ویکسین متعارف کرائی تھی۔ فلورنس نائٹ انگیل 1820ء میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ ویکسین بیس سال کے بعد انگلینڈ میں متعارف ہوئی جب فلورنس نائٹ انگیل صرف دو سال کی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی اصلاحات کا ڈاکٹر جیمز بیری کی اصلاحات سے کوئی تعلق تھا۔ اس طرح پہلی لیڈی ڈاکٹر الزبتھ بلیک ویل نے امریکا میں صحت وصفائی سے متعلق جو اصلاحات متعارف کرائی تھیں ان کا ڈاکٹر جیمز بیری کی اصلاحات سے کوئی واسطہ نہیں تھا جو وہ برسوں پہلے جنوبی افریقا اور دیگر ممالک میں متعارف کراچکا تھا۔ فلورنس نائٹ انگیل اور الزبتھ بلیک ویل ہم عمر تھیں اور ان میں گہری دوستی تھی۔ ان کا مشن ایک ہی تھا اور ان کے خیالات میں مکمل ہم آہنگی تھی لیکن چونکہ مارگریٹ این بکلی المعروف سرجن جیمز بیری تمام عمر یورپ سے باہر مختلف دور دراز ملکوں میں خدمات انجام دیتی رہی تھی، لہٰذا یہ دونوں اس سے یا اس کی اصلاحات سے قطعی واقف نہیں تھیں۔

کہا جاتا ہے کہ دو عظیم ہستیاں ایک طرح سے سوچتی ہیں لیکن تین نابغۂ روزگار ہستیاں، تین مختلف ملکوں میں رہتے ہوئے ایک طرح سے سوچتی تھیں۔ تینوں کا تعلق برطانیہ سے تھا، تینوں عورتیں تھیں اور ان کی زندگی کا مقصد ایک ہی تھا۔ انسانیت کی خدمت' مارگریٹ این بکلی' ایک دبنگ اور خونخوار اعلیٰ آفیسر کے روپ میں اپنے عہدے اور کیریئر کی پروا کیے بغیر ہمیشہ فوجیوں' زخمیوں' غریبوں' محتاجوں' کوڑھیوں' غلاموں' فاحشاؤں اور قیدیوں کے حقوق کے لیے آرمی اسٹیبلشمینٹ سے لڑتی اور اپنی اصلاحات کو عملی جامعہ پہنانے کے احکامات صادر کرتی رہی۔ ایک مرتبہ فنانس کے وزیر نے اس کی تنخواہ روکنے کے احکامات جاری کردیے لیکن آئرلینڈ کے نواب کی بروقت مداخلت پر اسے اپنے احکامات واپس لینے پڑے۔ جب یہ خبر ڈاکٹر جیمز بیری تک پہنچی تو اس نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا ''اچھا ہوا کہ مسٹر فنانس نے احکامات واپس لے لیے ورنہ یقین جانو میں اپنی تلوار سے اس کے دونوں کان کاٹ دیتا تب وہ کتنا خوبصورت لگتا۔''

وکٹورین عہد کی ان تین عورتوں نے زمانے سے ٹکر لی اور وقت کی کلائی مروڑ دی۔ ان کی عظیم جدوجہد اور انقلابی اصلاحات نے تاریخ رقم کردی اور دنیا کو ہمیشہ کے لیے بدل ڈالا۔ یہ تاریخ کا المیہ ہے کہ مارگریٹ این بکلی' دنیا کی پہلی لیڈی ڈاکٹر' پہلی سرجن' پہلی فوجی آفیسر اور اصلاحات کی پہل کار ہوتے ہوئے بھی' ایک عورت کی حیثیت سے ان اعزازات سے محروم رہی کیونکہ اس نے مرتے دم تک ایک مرد ڈاکٹر جیمز بیری کا بہروپ اختیار کیے رکھا اور ایک مرد ہی کی حیثیت سے فوت ہوئی۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنا یہ راز سینے میں دبائے اپنی قبر میں لے جائے اور دنیا اسے ایک مرد کی حیثیت سے یاد رکھے، لہٰذا وہ آج بھی ملٹری ڈاکٹر سرجن جیمز بیری' انسپکٹر جنرل آف ہسپٹلز کی حیثیت سے یاد کی جاتی ہے۔ اسے اپنے اس بہروپ کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔

++

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

ڈیرہ غازی خان کبھی ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ جہاں تعلیم کی اہمیت کو تسلیم کیا جاتا تھا اس لیے انہیں بھی
وہیں 1920ء میں فقیر محمد نے جنم لیا۔ علاقے میں اس گھرانے نزدیکی اسکول میں بٹھا دیا گیا۔ اس اسکول میں اساتذہ اور
.... کو خاصی اہمیت حاصل تھی۔ عام طور پر وہاں لکھنے پڑھنے طلباء میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی اس لیے تعصب بھی
کا اتنا رواج نہ تھا لیکن فقیر محمد کا تعلق ایسے گھرانے سے تھا پروان چڑھ رہا تھا مگر فقیر محمد نے حوصلہ نہ ہارا اور آگے ہی

قلم کا مزدور

زین مہدی

اس نے زندگی کے پیچ وخم کو سمجھانے کے لیے قلم کا سہارا لیا۔ قلم سے روٹی کمائی لیکن اس کے سارے خواب ادھورے رہے۔ تعلیم کے موضوع پر فلم بنانے کی کوشش کی۔ فلم بنی اور اس فلم پر صدرِ پاکستان نے ایوارڈ بھی دیا۔ لیکن صدحیف کے بیٹے کے کالج کی فیس دینے کے لیے اسے وہ ایوارڈ بیچنا پڑا۔

ایک قلم کار کی زندگی کا عکس، دوسروں کے لیے جینے والے کی زندگی کا عکس

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

آگے بڑھتے ہوئے 1941ء میں میٹرک پاس کرلیا۔

گورنمنٹ ہائی اسکول ڈیرہ غازی خان سے میٹرک پاس کرنے کے بعد فقیر محمد نے کلکٹر آفس میں نوکری کے لیے درخواست دے دی۔

یہ وہ دور تھا جب نوکری اہلیت کے حامل افراد کی تلاش میں رہتی تھی۔ ادھر کوئی اہل نظر آیا، ادھر نوکری اسے مل گئی۔ یہی کچھ فقیر محمد کے ساتھ ہوا۔ درخواست دیتے ہی انہیں نوکری مل گئی۔ وہ انگریز ڈپٹی کلکٹر کے دفتر میں انگلش سیکشن میں بطور ٹائپنگ کلرک تعینات کیے گئے، بیٹے کی نوکری لگتے ہی ہرماں کے دل میں جلد سے جلد بہو کو گھر... لانے کا ارمان انگڑائیاں لینے لگتا ہے۔ یہی حال فقیر محمد کی والدہ کا تھا۔ لڑکی دیکھی بھالی تھی۔ فقیر محمد کی نوکری لگتے ہی انہوں نے اسی سال بیٹے کو سہرا بندھوادیا۔

اب فقیر محمد کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ وہ کلرکی سے مطمئن نہیں تھے۔ کچھ اور آگے بڑھنے کا خواب لے کر وہ 1942ء میں ریاست خیر پور چلے آئے۔ خیر پور میرس میں ان کے والد محمد شفیع ایگزیکٹو انجینئر تھے۔ کچھ دن انہوں نے اپنے والد کے ساتھ گزارے پھر کراچی آ گئے۔

کراچی اس وقت بھی سندھ کا مرکز تسلیم کیا جاتا تھا اور صوبے کا سب سے بڑا شہر تھا۔ گو کہ اس وقت یہ شہر ناور سے نمائش تک محدود تھا پھر بھی اسے خصوصی اہمیت کا حامل قرار دیا جاتا تھا۔ ان دنوں فقیر محمد کی ایک پھوپی گاڑی کھاتا (پاکستان چوک) میں رہتی تھیں۔ وہ سیدھے ان کے پاس آئے، کچھ دن ان کے پاس رہے پھر انہوں نے میکلوڈ روڈ (آئی آئی چندریگر روڈ) پر اس جگہ جہاں آج کل روزنامہ ''جنگ'' کی عمارت ہے، اس کے نزدیک ایک کمرا کرائے پر لے لیا۔ ان کی بیگم کے بھائی محمد افضل خان بھی کراچی آچکے تھے انہی کے مشورے پر فقیر محمد نے امپورٹ ایکسپورٹ کا لائسنس بنوایا پھر محمد افضل خان اور ایک دوست محسن علی انجار والا کے ساتھ مل کر انہوں نے درآمد کا کاروبار شروع کردیا۔

کاروبار عروج پر تھا کہ شراکت داروں میں کچھ اختلاف پیدا ہوگیا۔ اختلافات کے پیدا ہونے میں کچھ محمد افضل خان کی نادانی کا دخل تھا تو کچھ فقیر محمد کی ناتجربے کاری کا۔ نتیجہ تجارت کی بیل منڈھے نہ چڑھی اور شراکت کا کاروبار ٹھپ ہوگیا۔

کاروبار بند ہونے کے بعد فقیر محمد نے نوکری کے لیے درخواست دے دی۔ درخواست دینے کے چھٹے روز مارچ 1943ء میں انہیں سینٹرل ٹیلی گراف آفس میں ٹیلی گرافیسٹ کی نوکری مل گئی۔ بورڈ اور ٹیلی پرنٹر میں مہارت تھی اس لیے انہیں دفتر میں خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ اس دوران میں ان کے چھوٹے بھائی رفیق بھی ان کے پاس آگئے۔

رفیق آئے تھے کالج میں ایڈمیشن کے لیے مگر انہوں نے خالی وقت کا مصرف نکال لیا۔ صبح کوڈی جے کالج میں پڑھتے اور شام میں ٹیلی گرافیسٹ کی ڈیوٹی دینے پوسٹ آفس پہنچ جاتے۔

اسی دوران میں فقیر محمد کا تبادلہ کوئٹہ ہوگیا نئے شہر میں پوسٹنگ ہوئی تھی وہ تیاری میں جٹ گئے۔ مکمل تیاری کے ساتھ کوئٹہ پہنچے مگر وہاں پہنچتے ہی ان کی جان نکل گئی۔ سردی نے مزاج پوچھنا شروع کردیا برف باری اور سردی نے انہیں اتنا تنگ کیا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کراچی بھاگ آئے۔

اس وقت تک پاکستان بن چکا تھا۔ نئے ملک کی تعمیر کے لیے ہر فرد اپنے انداز میں کام کررہا تھا انہوں نے بچپن کے شوق کو آزمانے کی ٹھانی اور صحافت کو بطور پیشہ اپنالیا اسی دوران میں حیدرآباد دکن سے آنے والے سہام مرزا لکھنوی کے حسین اعظمی، دہلی کے خواجہ بقاءاللہ وغیرہ سے دوستی ہوچکی تھی۔ ان کے علاوہ بھی حلقہ احباب میں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی جو لکھنے لکھانے سے شوق رکھتے تھے۔

کسی نے سچ کہا ہے، دوستوں کا اثر زیادہ ہوتا ہے، اہل قلم کی صحبت میں رہ کر وہ بھی باقاعدگی سے لکھنے لگے' نگار شات کا تانتا سا بندھ گیا۔ انہوں نے اپنا قلمی نام دانش رکھ لیا تھا۔ ڈیرہ غازی خاں کے رہنے والے تھے اس لیے ''دیروی'' کا لاحقہ لگالیا۔ اسی نام سے مختلف پرچوں میں لکھتے تھے۔ روزنامہ ''امروز'' کراچی کے بند ہوجانے سے حسین اعظمی بے روزگار تھے۔ ادھر دانش دیروی بھی کچھ کر دکھانے کی جستجو میں تھے۔ دونوں نے کافی دماغ سوزی کے بعد یہ طے کیا کہ پبلشنگ کا کاروبار کیا جائے۔ فوراً اشاعتی ادارے کا نام بھی منتخب کرلیا گیا۔ کاروبار شراکت میں شروع کرنا تھا اس لیے سوسائٹی کا نام دینا زیادہ مناسب خیال کیا گیا اور ''کتاب سوسائٹی'' کے نام سے ادارہ بن گیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کس قسم کی کتابیں چھاپنی چاہئیں۔ حلقہ احباب میں جو لوگ اشاعتی ادارے چلا رہے تھے، ان سے بھی مشورہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کیا گیا۔ خورشید اعجاز صحافت سے وابستہ تھے، سہام مرزا ایک ہفت روزہ نکال رہے تھے اور بقاء اللہ "کردار"، ان تینوں سے بھی مشورہ کیا گیا۔ اس دور میں الہ آباد (بھارت) کے عباس حسینی کا اشاعتی ادارہ "نکہت پبلیکشن" "سب سے زیادہ کامیاب ادارہ تسلیم کیا جا رہا تھا۔ رومانی کہانیوں کی سیریز "رومانی دنیا" عوامی حلقوں میں مقبولیت کی معراج پر تھی۔ اسی طرح کی سیریز پاکستان سے نکالنے کا لائحہ عمل طے ہوا مگر طے یہ پایا کہ رومانی اور جاسوسی... کہانیوں کی بجائے ایسی تحریریں سامنے لائی جائیں جنھیں پسند بھی کیا جاتا ہو اور نکہت والوں سے ٹکراؤ بھی نہ ہو۔ اس سلسلے میں پھر سے مشورے کیے جانے لگے۔ بالآخر قرعہ فال مزاحیہ ادب کے نام نکلا اور مزاح لکھنے والوں سے رابطہ کیا جانے لگا۔ بہت سی تحریریں۔ جمع کر لی گئیں۔ دانش دیروی اور حسین اعظمی نے اپنی جمع پونجی داؤ پر لگا کر پہلے ابراہیم جلیس کی "ذرا ایک منٹ" اور اس کے بعد اس دور کے ممتاز مزاح نگاروں کی منتخب تحریروں کا مجموعہ "تلخ و شیریں" منظر عام پر لے آئے۔

کتابیں چھاپ لینا آسان ہے مگر دکانداروں سے نمٹنا آسان نہیں۔ تمام رقم ڈوب گئی۔ کچھ دکانداروں نے رقم لوٹائی تو سہی مگر قسطوں میں جبکہ زیادہ تر دکاندار ڈکار لیے بغیر ہضم کر گئے۔

اس دھوکا دہی کو دانش دیروی نے سانحہ عظیم کا نام دیا اور ادارہ بند کرنے کا اعلان کر دیا۔

اتنی بھاگ دوڑ اور جانفشانی کے بعد جو ادارہ بنا تھا وہ ریت کا قلعہ ثابت ہوا اور وہ دونوں پھر سے نوکری کی تلاش میں جٹ گئے۔

حسین اعظمی ان دنوں ایک شاعر دوست تابش دہلوی کے گھر میں مقیم تھے۔ انہی کی تلاش سے حسین اعظمی کی شادی ہوگئی اور وہ اب سنجیدگی سے کچھ کرنے کے بارے میں سوچنے لگے۔ دانش دیروی ایک دوسرے دوست خواجہ بقاء اللہ کے ساتھ ان کے فلمی اخبار "کردار" سے وابستہ ہو گئے۔ اس اخبار میں انہوں نے "فقیرا خان لکیرا" کے نام سے ایک طنزیہ کالم لکھنا شروع کیا جسے کافی پذیرائی ملی لیکن وہ "کردار" میں بھی زیادہ دن تک نہ رہ سکے۔ اسی دوران میں حسین اعظمی کو روسی سفارت خانے میں ٹرانسلیٹر کی نوکری مل گئی۔

نوکری پکی تھی۔ کام بھی زیادہ تھا۔ انہوں نے اپنی

ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ

اگست 2020ء کے
شمارے کی ایک جھلک

اولین صفحات
دہشت گردوں کو سائبان کی تلاش رہتی ہے... ایسے ہی سائبانی دہشت گردوں کی خوفناک کارروائیاں

انا گیر
سنہری ریت کے سرابوں میں بھٹکتے خوابوں کے سوداگر کی دل فگار داستان
امجد جاوید
کے زورِ قلم کا امتحان

الاؤ
[illegible] عناصر مجرموں کا کھیل زندہ انسانوں کے سینے دہکتے الاؤ کی صورت موت تیار کی جا رہی تھی
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
کے قلم سے نیا سنسنی خیز سلسلہ

سرورق کے رنگ
زندگی کے محاذ پر ہر روز ایک نیا معرکہ منتظر ہوتا ہے...... بھول جانے والوں کی واپسی کا احوال... نجمہ مودی کے قلم سے

اردگرد کا ماحول اپنا رنگ ضرور دکھاتا ہے رنگین و سنگین ماحول کے رنگ میں ڈوبنے والوں کا قصہ...... غلام قادر کے تیکھے انداز

چینی نکتہ چینی
آپ کے تبصرے... مشورے ... محبتیں... شکایتیں... اور نئی دلچسپ باتیں ... کتھائیں

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

مدد کے لیے دانش دیروی کو بھی بلا لیا۔اب وہ جو کچھ بھی ترجمہ کرتے اس میں دانش دیروی کے مشورے بھی شامل ہوتے۔

دونوں کی جوڑی خاصی کامیاب تھی۔دونوں ایک ساتھ روسی سفارت خانے جاتے اور ساتھ آتے تھے۔

پاکستان میں ہمیشہ ہی سے روسیوں کو ناپسندیدہ سمجھا گیا ہے۔اس وجہ سے روسی سفارت خانے کی نگرانی ہمہ وقت ہوتی رہتی تھی۔ان دونوں کو بھی مشتبہ افراد کی فہرست میں شامل کرلیا گیا۔صبح ہوتے ہی ان کے گھروں کے سامنے محکمہ خفیہ کے اہلکار آکر کھڑے ہوجاتے تھے۔اس نگرانی سے دانش دیروی اکتانے لگے تھے۔انہوں نے حسین اعظمی سے کہا کہ اب مجھ سے خوف کے سائے میں کام نہیں ہوتا۔ان کے ذہنی دباؤ کو حسین اعظمی سمجھ رہے تھے۔اس لیے انہوں نے مشورہ دیا کہ اس تعاقب کو خوف کی بجائے ایڈونچر کا نام دو اسے انجوئے کرو۔

مگر روز روز کے تعاقب سے دانش دیروی بہت زیادہ خوفزدہ ہوگئے تھے۔انہوں نے حسین اعظمی سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں اب ان کمیونسٹوں کا کام نہیں کروں گا۔

''کیوں بھئی تم تو ترقی پسند ہو۔پکے کمیونسٹ ہو پھر یہ تمہیں کیا سوجھی؟ ارے ہم مزدور، کسان، قلمکار، غریب! سب ان سرمایہ داروں کی چکی میں پس رہے ہیں۔ان کے ظلم کو ختم کرنے کے لیے ان مائی باپ سرمایہ داروں کے سرپرست اعلیٰ امریکا کے خلاف کمربستہ دنیا کی سب سے بڑی قوت روس کے لیے کام نہیں کرو گے۔''

''ہاں!''

''یعنی تم غریبوں مزدوروں کو بے سہارا چھوڑ دینا چاہتے ہو۔ان دبے کچلے لوگوں کے لیے آواز نہیں اٹھاؤ گے؟''

''آواز تو اٹھاؤں گا مگر روسیوں کے اشارے پر نہیں، کل رات میں نے خوب غور کیا اور تب میری سمجھ میں ایک نئی بات آئی۔جانتے ہو یہ کمیونسٹ بننے کے شوق میں کہیں ہم مذہب کے باغی نہ بن جائیں۔'' کہہ کر دانش دیروی، حسین اعظمی کو سوچ میں غرق چھوڑ کر سامنے سے گزرتی ٹرام میں چڑھ گئے۔

دانش دیروی نے روسی سفارت خانے کا کام کرنے سے انکار تو کردیا تھا لیکن اب سوال یہ تھا کہ نئی نوکری کہاں ملے گی۔

اتفاق کی بات ہے اسی دن انہیں ''کردار'' سے پھر آفر مل گئی اور وہ دوسرے پرچوں کے لیے بھی لکھنے لگے۔

اسی دوران میں انہوں نے ایک قدم اور آگے بڑھانے کی سوچی۔انہوں نے فلم لائن جوائن کرنے کی ٹھان لی تھی ان دنوں وہ گاڑی کھاتا میں کیفے سعد کے اوپر منتقل ہوچکے تھے۔وہیں یہ پلان بنا اس پلان کو تمام دوستوں نے سراہا جس میں موسیقار لعل محمد، لہری، احمد رشدی، اے ایچ صدیق اقبال اختر اور حمایت علی شاعر کے علاوہ دوسرے ادب نواز وفنکار بھی شامل تھے۔ترقی پسندوں کی تعداد زیادہ تھی اس لیے فلم کا سبجیکٹ بھی جہد مسلسل منتخب ہوا۔پاکستان میں تعلیم کی زبوں حالی کو مرکز بنا کر فلم بننے لگی۔ہدایت کاری کے لیے اقبال اختر کو چنا گیا۔میوزک لعل محمد کے ذمے آئی۔پہلی یار احمد رشدی کو گانا گانے کا موقع دیا گیا (یہی ان کی پہلی فلم تھی) ٹائٹل سانگ کی بجائے حمایت علی شاعر نے تحت اللفظ میں نظم ریکارڈ کرائی۔

فلم بنی، نمائش ہوئی اور تب سب کو احساس ہوا کہ یہ فلم وقت سے پہلے بنالی گئی ہے۔عام ناظرین کی سمجھ سے باہر کی فلم بنی تھی اس وجہ سے باکس آفس پر ناکام قرار پائی مگر خواص نے بہت زیادہ پسند کیا اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدر پاکستان نے نہ صرف یہ فلم دیکھی بلکہ اسے پسند بھی کیا اور جب سول وفوجی ایوارڈ تقسیم کرنے کا وقت آیا تو ''اور بھی غم ہے'' کو صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

اب دانش دیروی ایسٹرن اسٹوڈیو کے عام کلائنٹ نہیں رہے، اسٹاف میں شامل ہوچکے تھے کیونکہ سعید ہارون انہیں اپنا دست راست سمجھتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اسٹوڈیو کی تمام ذمے داری انہیں سونپ دی تھی۔

''ایسٹرن اسٹوڈیو میں آنے کے بعد وہ پوری طرح فلمی دنیا کے ہو کے رہ گئے۔چھوٹی، بہن، لاڈلا، نادان، جین بانڈ 008، جہاں تم وہاں ہم، میرے لعل، انصاف، بیس دن، مسٹر ایکس، نیلا پربت، پھر صبح ہوگی، چراغ جلتا رہا، کنواری بیوہ'' وغیرہ۔تقریباً 25 سے زائد فلمیں پیش کیں۔کسی کو پروڈیوس کیا، کسی کے لیے اسکرین پلے لکھا تو کسی کے ڈائیلاگ!

ایسٹرن اسٹوڈیو کے ہر دلعزیز اسٹاف ممبر تو تھے ہی غضب کے جملے باز بھی تھے۔ایسے ذومعنی فقرے بولتے کہ سننے والا ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہوجاتا۔ایسٹرن اسٹوڈیو

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

میں بننے والی ہر فلم کی زبان تصحیح کرنا بھی ان کی ذمے داری میں شامل ہو چکا تھا۔ نخشب کی فلم ''میخانہ'' کا سین فلمایا جا رہا تھا۔ اس میں ایک ڈائیلاگ تھا ''یہ لڑکی خاندانی ہے یا بازار کی، اس کا علم کیسے ہے۔'' اتفاقاً کیمرا مین ایم اے خسرو نے دانش دیروی کو آواز دے کر بلا لیا۔ انہوں نے فائنل ریہرسل میں ہی کہہ دیا۔ ''بھئی نخشب! اس ڈائیلاگ کو یوں کر دیتے تو زیادہ مزہ آتا کہ لڑکی خاندان والی ہے یا پاندان والی۔ کوٹھی سے آئی ہے یا کوٹھے سے۔'' نخشب نے فوراً اس ڈئیلاگ کو شامل کر لیا۔

اسٹوڈیو میں کوئی نیا اسٹاف ممبر آتا، اس کا انٹرویو ٹیسٹ دانش دیروی لیتے۔ ساوک مستری پاکستان آئے تو انہیں اپائنٹ کرنے کے لیے ٹیسٹ، کیمرا مین ایم اے خسرو اور دانش دیروی ہی نے لیا۔ ان کی بات کو رد کرنا سعید ہارون نے گویا سیکھا ہی نہیں تھا۔ جو کچھ دانش دیروی کہتے، اسے فوراً مان لیتے کیونکہ جانتے تھے کہ یہ اپنے نہیں، میرے مفاد کے لیے کام کر رہے ہیں صرف ایک بار انہوں نے سعید ہارون سے ایک نجی کام کے لیے کہا تھا۔ اپنے چھوٹے بھائی نثار شفیع کو اسٹوڈیو میں ملازمت دلانے کی استدعا کی تھی۔

1960ء سے 1967 تک وہ ایسٹرن اسٹوڈیو میں رہے۔ ایسٹرن اسٹوڈیو سے ہٹنے کے بعد کچھ دنوں کے لیے ڈھاکا چلے گئے۔ وہاں ایف ڈی سی میں رہے مگر دل نہ لگا تو واپس کراچی آگئے۔

بقاء اللہ کے ساتھ ''کردار''۔ الیاس رشیدی کے ساتھ ''نگار''۔ محمود مبصر کے ساتھ ''معمار نو'' جیسے مشہور اخبارات میں کام کرنے کے بعد بھی وہ مطمئن نہ رہ سکے۔ پیسوں کی تنگی رہی۔

اسی دوران میں وہ اپنی بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ انہی دنوں اکلوتے بیٹے ممتاز دانش نے داؤد انجینئرنگ کالج میں ایڈمشین لینے کی فرمائش کر دی۔ سدا سے ہر مصیبت کا ہنس کر مقابلہ کرنے والے شخص کے لیے یہ فرمائش بہت بڑا امتحان ثابت ہوئی۔ وہ پریشان ہو اٹھے۔ صبح اٹھتے اور پیسوں کے انتظام کی کوشش میں لگ جاتے۔ باپ کی پریشانی بیٹے سے چھپی نہ رہ سکی اور ممتاز نے ایک دن چپکے سے پی ٹی وی کے لیے اپلائی کر دیا مگر دانش دیروی اسی فکر میں غلطاں رہے کہ اس مسئلے سے کیسے نمٹا جائے۔ ممتاز کی فیس جمع کرانا ضروری تھی۔ کہیں سے پیسے ملنے کی

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 12,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 11,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس، فون نمبر 0301-2454188
سرکولیشن منیجر ...... سید منیر حسین 0333-3285269
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35804200-35804300

Azeem
Pakistanipoint.com

اُمید نہیں تھی۔ وہ دفتر میں بیٹھے اسی بات پر غور کرتے رہے۔ حالانکہ ممتاز نے والد کی پریشانی بھانپ لی تھی انہیں ذہنی دباؤ سے نکالنے کے لیے کئی بار کہہ چکے تھے۔ ''بابا! آپ فکر نہ کریں میں نے پی ٹی وی کے لیے اپلائی کیا ہے۔ ضروری تو نہیں کہ داؤد انجینئرنگ کالج ہی میں داخلہ لیا جائے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ میں نوکری کرلوں۔''

''تمہیں انجینئرنگ کی ڈگری لینے کا جنون ہے پھر تم کیسے کہہ رہے ہو کہ مجھے داخلہ نہیں لینا ہے۔'' وہ اسے یہ کہہ کر خاموش کردیتے۔

کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے ایک بہت بڑا فیصلہ کرلیا۔ تعلیم کے موضوع پر فلم بنا کر جو صدارتی ایوارڈ حاصل کیا تھا۔ وہ سونے کا میڈل انہوں نے بیٹے کو تعلیم دلانے کے لیے بیچ دیا۔ اتنا بڑا المیہ رونما ہوگیا پھر بھی دانش دیروی کے چہرے پر شکن نہ آئی۔ وہ دل ہی دل میں یہ سوچتے ہوئے گھر پہنچے کہ جب میں ممتاز کے ہاتھ پر رقم رکھوں گا تو وہ خوش ہوجائے گا مگر جب گھر پہنچے تو ایک نئی خبر منتظر تھی۔ ممتاز نے پاکستان ٹیلی وژن کی نوکری حاصل کرلی تھی اور دوپہر میں ہی ماں کی دعائیں لے کر اسلام آباد چلے گئے تھے۔

وقت کب کسی کے روکے سے رکا ہے۔ ممتاز پی ٹی وی کی نوکری کے ساتھ بی ٹیک کی تیاری کرتے رہے اور ادھر دانش دیروی زندگی کی سختیوں سے پنجہ آزمائی۔ کئی روزناموں ہفت روزہ اور ماہناموں سے ہوتے ہوئے وہ ''دوشیزہ'' میں آگئے۔

اسی دوران میں دانش دیروی کے چھوٹے بھائی کرنل رفیق ایس ایم نے انہیں سعودی عرب بلایا اور وہ طوعاً و کرہاً چلے گئے تین سال فلم سے رشتہ تو ٹوٹ کر کسی نہ کسی طرح گزارا پھر لوگوں نے لاکھ سمجھایا مگر انہوں نے دوسرا معاہدہ نہیں کیا اور واپس پاکستان آگئے۔

پاکستان پہنچتے ہی طارق عزیز (نیلام گھر والے) کے ساتھ۔ ''پندرھویں صدی'' کی ادارت سنبھالنے لگے۔ زندگی اسی انداز سے گزرنے لگی۔ ہمت اب تک جواں تھی بلکہ ادارے سے باہر کے پرچوں کو بھی مدد دیتے۔ ''نئے رخ'' اور ''نئے افق'' کے لیے بھی انگلش کہانیوں کے ترجمے کرتے۔ ایک ایک مہینے میں ڈائجسٹ کے ستر سے اسّی صفحے تک کا میٹر دیتے۔ اسی دوران میں ''پندرھویں صدی'' کو بند کرنے کا فیصلہ ہوگیا۔ وہ دوشیزہ میں دوبارہ آگئے۔ وقت گزرتا رہا۔ اسی دوران میں وہ ادارہ بحران میں آگیا تو دانش دیروی کے دیرینہ دوست حسین اعظمی جو کمیونسٹوں کا ساتھ چھوڑ کر پکے مذہبی بن چکے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ بہار کالونی میں مجیب الرحمٰن نامی ایک صاحب رہتے ہیں۔ اسکول کے مالک ہیں۔ 86ء میں ''جواں فکر'' کے نام سے پرچہ نکالا تھا۔ اس کے لیے ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔ دانش دیروی، حسین اعظمی کے ساتھ بہار کالونی میں جا کر مجیب الرحمٰن سے ملے۔ انہوں نے ایک نظر دیکھ کر کہا ''محترم! میرا پرچہ نوجوانوں کے لیے ہے۔''

دراصل وہ کسی نوجوان ایڈیٹر کی تلاش میں تھے۔ اس جواب پر دانش دیروی نے برجستہ جواب دیا۔ ''تو محترم ہم بھی کبھی جوان تھے۔ جوانی کے تجربے سے مالا مال ہیں آزمائش شرط ہے۔''

بس اس ایک جملے نے مجیب صاحب کو مرعوب کر لیا اور وہ ماہنامہ ''جواں فکر'' کا کام کرنے لگے۔ پورا پرچہ گھر بیٹھ کر تیار کرتے۔ اسی دوران میں انہوں نے مجیب صاحب کو مشورہ دیا کہ آپ کا اسکول ہے اس لیے آپ بچوں کے لیے بھی پرچہ نکالیں اور ''اسکول ڈائجسٹ'' کی ابتدا ہوگئی۔ دونوں پرچے وہ اکیلے ہی کرتے رہے۔ اسی دوران میں انہوں نے ''شانتی'' نامی ایک اور چھوٹے ڈائجسٹ کی ادارت سنبھال لی۔

ادھر ان کا پرانا ادارہ جو بحران کے گرداب میں پھنسا ہوا تھا ابھر آیا۔ جو لوگ چلے گئے تھے، انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر بلایا گیا۔ دانش دیروی بھی واپس آگئے۔ پھر سے وہی دن لوٹ آئے تھے۔ وہی ہنسی مذاق، وہی پرانا ماحول، وہی دانش دیروی کی چھیڑ چھاڑ۔ جملہ بازی میں واقعی ان کا جواب نہیں تھا۔ الفاظ کے الٹ پھیر سے جملے کا مفہوم ہی بدل دیتے تھے اور سننے والے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوجاتے۔ آخری دن یعنی 25 جنوری کو وہ کام سے چار بجے ہی فارغ ہوگئے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ان کے بھائی کرنل رفیق ایس ایم بھی آگئے تھے پھر جو محفل جمی تو بس ہنسی ہی ہنسی تھی پانچ بجے نیچے اترے۔ انہوں نے اپنی ہنڈا 50 نکالی اور کک لگانے لگے۔ دو تین کک جب مس ہوئیں تو انہوں نے گیئر پر سے ہاتھ ہٹا کر کہا۔ ''یہ بڑھیا اب ریٹائر ہوگئی ہے۔ اسے طلاق دینا ہی پڑے گی۔''

کسے خبر تھی کہ یہ جملہ سچ ہوجائے گا۔ یہی ان کی آخری سواری ہے پھر وہ اس پر سوار نہیں ہو پائیں گے۔

اگلے دن ان کے گھر سے خبر آگئی کہ وہ اب نہیں رہے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

بائسکوپ کی ملکہ

عقیل عباس جعفری

نہایت کم عمری میں اس نے پردہ سیمیں پر فن کی نمائش کرکے سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ چہرے کے خدوخال اور اظہار فن کے انداز نے فلم بینوں پر جنون طاری کردیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اوج پر پہنچی اور کئی دہائی تک فلمی صنعت پر راج کیا۔ مقابل میں بھی ایک سے بڑھ کر ایک اداکارائیں تھیں پھر بھی اس کا پرچم سب سے بلند تھا، لوگ کہنے پر مجبور تھے کہ ایسی فنکارائیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔

پاکستان کی نامور اداکارہ کا مختصر سا زندگی نامہ

شام کا سایہ گہرا ہوتا جارہا تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے تو جو گھر پہنچ کر دن بھر کی تھکن اتارنے کے لیے کچھ مشغل کی تیاری کرنا چاہتے تھے۔ 1930 میں تھکن خواہ ذہنی ہو یا جسمانی اسے اتارنے کے لیے ایک دو ہی شغل ہوا کرتے تھے۔ وقت گزارنے کے لیے چاند کی روشنی میں یا تو کوئی جسمانی زور آزمائی کے کھیل کھیلتے یا پھر محفل جما کر چوسر پچیسی یا گنجفہ کھیلتے لیکن یہ کھیل بھی امرا کے تھے یا پھر دو چار جماعت پاس کر لینے والوں

کے۔ عام افراد ماہیا سن کر ذہن کی تسکین کر لیتے تھے۔ جہاں بھی ماہیا کی محفل جمتی لوگوں کے ٹھٹ لگ جاتے۔ گانے والے کے گرد حلقہ بنا کر سامعین بیٹھ جاتے یا بیٹھنے والوں کے پیچھے دائرے کی صورت کھڑے ہو جاتے۔ اس وقت بھی بوڑھے برگد تلے محمد علی بیٹھا ماہیا کی تان لگا رہا تھا۔ لوگ اس کی بلند آواز کا لطف لے رہے تھے۔ تعریف کر کے اس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ محمد علی کی آواز میں ایسا درد تھا کہ لوگوں کے قدم خود بخود رک رہے تھے۔ اچھی خاصی بھیڑ جمع ہو چکی تھی۔

اس بھیڑ میں شاید ہی کسی کو معلوم ہو کہ یہ ماہیا نہیں دل کا درد ہے۔ دل ٹوٹنے کا بین ہے جو زبان محمد علی سے سنائی دے رہا ہے۔

محمد علی ایک معمولی کوچوان تھا۔ گھوڑا گاڑی چلایا کرتا تھا۔ جوانی اس پر ٹوٹ کر برسی تھی۔ جوانی کی پکار بھی اپنا مطالبہ دہراتی تھی۔ یہ جوانی ہی کی پکار تھی کہ اسے بالو کا حسن دیوانہ بنائے دے رہا تھا۔ بالو کسی سلطنت کی شہزادی نہیں تھی بلکہ ایک عام سی لڑکی تھی۔ اس کا نام اقبال بانو تھا مگر لوگ اسے بالو کے نام سے پہچانتے تھے۔ کہیں میلہ ٹھیلا لگتا یا ایسے ہی ڈرامے اسٹیج ہوا کرتے تو بالو کی ڈھنڈیا مچ جاتی۔ وہ ضلع و ضلع سے باہر بھی ڈرامے میں کام کرنے جاتی تھی۔ بس یوں سمجھ لیں کہ وہ دور و نزدیک کی سپر اسٹار تھی۔ اس کی اداکاری دیکھنے لوگ ٹوٹ پڑتے کیونکہ اس وقت کی یہ ایک تفریح تھی۔ سب سے مہنگی تفریح تھی۔ رقم خرچ کر کے لوگ ڈرامے دیکھنے جاتے تھے۔ ڈرامے میں کام کرنے والے فن کاروں کی کچھ لوگ دل سے قدر کرتے تھے۔ ایسے ہی لوگوں میں محمد علی بھی تھا۔ وہ لوگوں کو اپنے تانگے پر بٹھا کر اِدھر سے اُدھر لے جایا کرتا تھا۔ ڈراما دیکھنے کے شوقینوں کو بھی اس مقام پر لے جایا کرتا تھا جہاں اسٹیج بنا ہوتا۔ وہ خود بھی ڈراما دیکھنے کا رسیا تھا لیکن وہ اب ڈراما دیکھنے نہیں جاتا تھا، وہ بالو کو دیکھنے جاتا تھا۔ وہ اس کے دل و دماغ پر چھا چکی تھی۔ اس کے بغیر اسے اپنی زندگی سونی سونی سی لگنے لگی تھی۔ بالو بھی اسے پسند کرنے لگی تھی۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب آتے دیکھ کر ظالم سماج کی طرح بالو کے ابا درمیان میں کود پڑے۔ انہیں ایسا لگا تھا کہ محمد علی بالو کو چھین لے گا۔ اس وقت تک بالو ہی اس گھر کا سہارا تھی اسی کی آمدنی سے گھر چل رہا تھا۔ وہ اسٹیج پر اداکاری کرتی تھی تو گھر میں دو پیسے آتے تھے۔ اگر وہ محمد علی کی ہو جائے گی تو یہ آمدنی رک جائے گی۔ اسی خیال سے بالو کے ابا نے بالو پر سختی کی تھی۔ اسے محمد علی سے ملنے سے روک دیا تھا۔ اس کی ہر بات پر نظر رکھی جانے لگی تھی۔

ان دونوں کا ملنا جینا بند ہوا تو وہ دونوں ہی بے چین ہو گئے۔ محمد علی نے اس پابندی پر احتجاج کا ایک نیا طریقہ اختیار کر لیا۔ وہ بالو کے راستے میں کھڑا ہو جاتا اور دل کی گہرائی سے ماہیا گاتا۔ یہ دراصل ماہیا نہیں اس کے دل کا درد تھا جو مسلسل ماہیا کا سہارا لے کر بالو کو اپنی محبت کا اظہار کر رہا تھا۔ بالو کی ابھی چڑھتی جوانی تھی۔ آنکھوں میں خوابوں کی اجارہ داری تھی، چاہے جانے کی للک تھی۔ ایسی بالی عمر میں پہلی دستک کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ محمد علی نے دستک دے دی تھی۔ بالو کی آنکھوں میں خواب اترنے لگے تھے۔

بالو کی عمر ابھی تھوڑی تھی مگر وہ پورے گھر کی پرورش کر رہی تھی۔ وہ اسٹیج ڈراموں میں اداکاری کے جوہر دکھاتی تھی۔ علاقے بھر میں اس کا بڑا نام تھا۔ نوٹ اس پر برستے تھے۔ ایسی سونے کی چڑیا پر گھر والے تیز نظر رکھتے ہیں۔ اس کے ابا کی نظروں سے بھی محمد علی کی حرکتیں چھپی نہ رہیں۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ چڑیا اڑنے والی ہے۔ اس نے بیٹی پر پابندی لگا دی کہ وہ محمد علی سے نہ ملے۔ محمد علی کو بھی دھمکی دی گئی کہ وہ بالو سے ملے گا تو انجام اچھا نہیں ہوگا۔ محمد علی سچا عاشق تھا، وہ ایسی دھمکی میں کیسے آجاتا۔ بالو سے ملنے کی کوشش کرتا رہا۔ بالو پر باپ کا اثر تھا۔ اس نے دل پر پتھر رکھ کر محمد علی کو منع کر دیا کہ وہ اس سے نہ ملے۔ محمد علی کو سمجھتے دیر نہ لگی کہ یہ الفاظ بالو کے نہیں ہیں اس کے باپ کے ہیں جو بالو کی زبان سے ادا ہو رہے ہیں۔ علاقے کے لوگوں کا بھی دباؤ تھا کہ وہ بالو سے نہ ملے اس لیے اس نے ایک نیا راستہ ڈھونڈ لیا۔ وہ اس جگہ پہنچ جاتا جہاں بالو کا ڈراما اسٹیج ہونے والا ہوتا۔ وہ راستے میں کھڑے ہو کر ماہیا گانے لگتا۔ آواز اچھی تھی لوگ ماہیا سننے کے لیے جمع ہو جاتے۔

بالو تک وہ اپنا پیغام پہنچا رہا تھا اور اسے کوئی روکنے ٹوکنے والا بھی نہیں تھا کیونکہ سب جانتے تھے کہ اگر روکا گیا تو لوگ اسی کا ساتھ دیں گے کہ وہ تو ماہیا گا رہا ہے۔ ماہیا گانا جرم بھی نہیں ہے۔

وہ اس طرح ماہیا کا سہارا لے کر اپنے دل کی آواز بالو تک پہنچاتا رہا تھا۔ اسے اس کا پاگل پن کہیں یا عشق کی زور آوری کہ لوگوں نے محمد علی کو ماہیا کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔ اس کی اس حرکت سے بالو کے گھر والے بھی پریشان ہو اٹھے تھے پھر بالو بھی سرکشی دکھانے لگی تھی۔ اسے محمد علی کا عشق طعنے دینے لگا تھا کہ وہ تو دنیا سے ٹکرا رہا ہے اور تم ساتھ دینے پر آمادہ نہیں ہو۔ بس اس نے بھی زبان کھول لی تھی۔ ادھر محمد علی کی سعی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ادھر بالو کی زبان درازی۔ بحالتِ مجبوری بالو کے والد نے سپر رکھ دیا۔ اس طرح وہ دونوں ایک ہو گئے۔ شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ صبیحہ اسی شادی کی یادگار ہیں۔

صبیحہ ایک روایت کے مطابق 16 اکتوبر 1935 اور دوسری روایت کے مطابق 16 اکتوبر 1936 کو گجرات میں پیدا ہوئیں۔ والدین نے ان کا نام مختار بیگم رکھا مگر جب وہ چھ سال کی ہوئیں تو حالات سے غمزدہ اور بیمار اقبال بیگم عرف بالو عین جوانی میں انتقال کر گئیں۔ انتقال سے قبل وہ دو فلموں میں آچکی تھیں۔ ''ہیر سیال'' اور ''سسی پنو'' دونوں فلموں نے بہت اچھی نہ صحیح مگر بہت برا بزنس نہیں کیا تھا۔

محمد علی ماہیا پہلے تو اپنی بیگم کی کمائی پر گزارہ کرتے رہے، پھر جب مختار بیگم 13، 14 برس کی ہوئیں تو وہ انھیں اسٹیج یا فلم کی ہیروئن بنانے کے لیے لاہور کے رائل پارک کے چکر لگانے لگے۔

مشکل یہ تھی کہ مختار بیگم کا قد چھوٹا تھا اور محمد علی انھیں جس فلم ساز کے پاس لے کر جاتے وہ ان کے چھوٹے قد کی وجہ سے انھیں کام دینے سے انکار کر دیتے۔ ایسے میں سلطان کھوسٹ اور نفیس خلیلی نے مختار بیگم میں چھپی فنکارانہ صلاحیت کو پہچانا۔

سلطان کھوسٹ (عرفان کھوسٹ کے والد اور سرمد کھوسٹ کے دادا) نے مختار بیگم کو اداکاری کی تربیت دی اور نفیس خلیلی نے انھیں اپنے ایک ڈرامے 'بت شکن' میں کاسٹ کر لیا۔

اس ڈرامے کے لیے نفیس خلیلی ہی نے مختار بیگم کو صبیحہ کا نام دیا۔ یہ ڈراما سنہ 1949 میں ریجنٹ سینما میں اسٹیج ہوا۔ اس کے دیکھنے والوں میں سعادت حسن منٹو کے بھانجے مسعود پرویز بھی شامل تھے جو ان دنوں سنتوش کمار اور رفیق غزنوی کی بیٹی شاہینہ کے ساتھ ایک فلم 'بیلی' بنانے کی تیاری کر رہے تھے۔

مسعود پرویز کو اس فلم کے لیے ایک سائیڈ ہیروئن کی ضرورت تھی چنانچہ انھوں نے 'بت شکن' کی صبیحہ کو اپنی فلم میں چانس دینے کا فیصلہ کیا۔

بیلی چار فروری 1950 کو نمائش پذیر ہوئی۔ فلم فلاپ ہو گئی، شاہینہ بھی اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود کامیاب نہ ہو سکیں۔ 'بیلی' کی فلم بندی کے دوران ہی ہدایت کار شکور قادری نے اپنی فلم 'ہماری بستی' شروع کی، اس فلم کے ہیرو بھی سنتوش کمار تھے اور ہیروئن کا کردار نجمہ نے ادا کیا تھا۔

شکور قادری نے اس فلم میں صبیحہ کو بھی ثانوی کردار دیا مگر 'بیلی' کی طرح 'ہماری بستی' بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ صبیحہ کی

☆ صبیحہ اور سنتوش کی مشترکہ پہلی فلم ''بیلی'' 1950 ... آخری فلم ''گرہستی'' 1971ء میں ریلیز ہوئی۔

☆ صبیحہ سنتوش کی مشترکہ فلموں کی تعداد 47 ہے ... میں 30 فلموں میں بطور ہیرو ہیروئن آئے تھے۔

☆ 1950ء میں ریلیز ہونے والی دس فلموں میں سے ... فلموں میں ہیرو سنتوش تھے جن میں دو کی ہیروئن صبیحہ تھیں۔

☆ 1952ء میں سات فلمیں ریلیز ہوئیں ..... صبیحہ ... سنتوش کسی فلم میں جوڑی کی صورت میں نہیں تھے لیکن ... 1953ء میں ریلیز ہونے والی دس فلموں میں سے آ... میں یہ دونوں تھے۔ جن میں 6 میں سنتوش چار میں صبیحہ تھیں۔

☆ 1954ء میں کل سات فلمیں ریلیز ہوئیں جن میں ... دو میں سنتوش اور تین میں صبیحہ تھیں۔

☆ 1954ء میں پہلی بار کسی فلم پر فحاشی کے الزام میں ... پابندی لگائی گئی اس فلم کے ہیرو سنتوش اور ہیروئن شمی تھی۔

☆ 1954ء کا سال صبیحہ کی کامیابی کا سال تھا ان کی د... فلموں نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ ان دونوں فلموں ... میں ہیرو سدھیر تھے فلم ''سسی'' تھی یہ پہلی پاکستانی گولڈن ... جوبلی فلم تھی۔ اسی سال گمنام بھی ریلیز ہوئی تھی جو ایک ... یادگار فلم تھی اس فلم میں صبیحہ نے پگلی کی اداکاری کی تھی۔

☆☆☆

معروف اداکارہ صبیحہ خانم جو ایک خوش گلو فنکارہ بھی تھیں ... انھوں اپنی آواز میں جذبۂ حب الوطنی کے سُر بھی بکھیرے۔

1971 کی جنگ میں انھوں نے اداکار علاؤ الدین کے ساتھ پہلا قومی نغمہ ''تیری زمیں پہ آیا اغیار دیکھ کر، اے وطن ہم تیرے گنہگار چلے آئے'' گایا جسے قتیل شفائی نے تحریر کیا تھا۔ اس کے بعد صبیحہ خانم نے مسرور انور کا تحریر کردہ نغمہ ''سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے'' پاکستان ٹیلی ویژن لاہور مرکز پر ریکارڈ کروایا۔ تاہم صبیحہ خانم کو قومی نغموں میں شہرت اس وقت ملی جب انھوں نے خلیل احمد کی طرز پر ''جگ جگ جیے میرا پیارا وطن'' پی ٹی وی لاہور پر ریکارڈ کروایا۔ یہی نغمہ بعد میں ناہید اختر کی آواز میں مقبول ہوا۔

1981 میں صبیحہ خانم کا پہلا آڈیو البم ریلیز ہوا تو اس میں فوجی جوانوں کے نام خواجہ پرویز کا تحریر کردہ قومی نغمہ ''میرے ڈھول سپاہی، وطن دی شان ودھائی'' بھی شامل تھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

دونوں ابتدائی فلمیں ناکامی سے دوچار ہوئیں مگر ناظرین پر صبیحہ کی معصوم اور خوبصورت اداکاری کا نقش چھوڑ گئیں۔

’ہماری بستی‘ کی نمائش کے فقط تین ہفتے بعد انور کمال پاشا کی فلم ’دو آنسو‘ نمائش پذیر ہوئی۔ اس فلم میں بھی صبیحہ نے سنتوش کمار کے مقابلے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ یہ فلم کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

یہ پاکستان کی پہلی فلم تھی جس نے سلور جوبلی (25 ہفتوں تک سینما میں لگے رہنے) منانے کا اعزاز حاصل کیا۔ اس کے بعد صبیحہ کی چند فلمیں ناکام بھی ہوئیں مگر صبیحہ ناکام نہیں ہوئیں۔

ان کی اگلی کامیاب ہونے والی فلم ’غلام‘ تھی۔ اس فلم کے ہدایتکار بھی انور کمال پاشا تھے اور اس میں بھی صبیحہ کے مقابل سنتوش کمار نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ اسی زمانے میں صبیحہ نے سنتوش کمار کے علاوہ چند دوسرے اداکاروں کے مقابل بھی کام کیا۔

ان کی اگلی سپرہٹ فلموں میں ’گمنام‘ اور ’سسی‘ شامل تھیں جن کے ہیرو سدھیر تھے۔ سسی پاکستان کی پہلی فلم تھی جس نے گولڈن جوبلی (50 ہفتوں تک سینما میں لگے رہنے) منانے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔

پاکستان کی پہلی سلور جوبلی اور پہلی گولڈن جوبلی فلموں میں مرکزی کردار ادا کرنے کے بعد صبیحہ نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

اس کے بعد تو تواتر کے ساتھ ان کی یادگار فلمیں ریلیز ہوتی چلی گئیں۔ جن میں رات کی بات، دلا بھٹی، حمیدہ، سرفروش، حاتم، داتا، آس پاس، عشق لیلیٰ، وعدہ، سات لاکھ، شیخ چلی، دربار، مکھڑا، تاجی، ایاز، موسیقار، دامن اور سوال کے نام سرفہرست ہیں۔

اس کے بعد صبیحہ نے کریکٹر ایکٹر کردار ادا کرنے شروع کیے اور بیشمار بڑی بڑی فلموں میں اپنی اداکاری کی دھاک بٹھا دی۔ ان فلموں میں شکوہ، کنیز، دیور بھابی، انجمن، پاک دامن اور ’اک گناہ اور سہی‘ وغیرہ شامل تھیں۔

صبیحہ کی اداکاری کا سلسلہ کئی دہائیوں تک جاری رہا۔ اعداد و شمار کے مطابق صبیحہ نے مجموعی طور پر 202 فلموں میں کام کیا۔ جن میں اردو فلموں کی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔

صبیحہ خانم کا ذکر ہو اور ان کی ازدواجی زندگی کا ذکر نہ ہو یہ ناممکن ہے۔ قارئین کے لیے شاید یہ بات حیرت انگیز ہو کہ فلمی دنیا میں کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کے بعد صبیحہ جس اداکار کے دام عشق میں گرفتار ہوئیں وہ سنتوش کمار نہیں بلکہ ان کے چھوٹے بھائی درپن تھے۔

درپن بھی صبیحہ سے شادی کرنے میں سنجیدہ تھے مگر اس شادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خود سنتوش کمار بن گئے۔ سنتوش کمار کا مؤقف تھا کہ وہ ایک شریف اور سنجیدہ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والی کوئی لڑکی اس گھرانے کی بہو نہیں بن سکتی۔

درپن اور صبیحہ نے بادل نخواستہ اس فیصلے کو قبول کیا مگر قدرت کا فیصلہ کچھ اور تھا اور چشمِ فلک نے دیکھا کہ وہ سنتوش کمار جو صبیحہ کی شادی اپنے چھوٹے بھائی سے کرنے پر تیار نہ تھے خود ان کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔

سنتوش کمار پہلے سے شادی شدہ تھے مگر انھوں نے صبیحہ سے شادی کرنے کے سلسلے میں کسی رکاوٹ کو درمیان میں نہیں آنے دیا اور یکم اکتوبر 1958 کو ان کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

صبیحہ اور سنتوش کمار نے شادی کے بعد بھی الگ الگ اور ایک ساتھ فلموں میں کام کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان دونوں نے 47 فلموں میں ایک ساتھ کام کیا۔ جن میں 30 کے قریب فلموں میں وہ روایتی جوڑی یا مرکزی کرداروں میں تھے۔ جبکہ دیگر فلموں میں وہ ینگ ٹو اولڈ جیسے معاون کرداروں میں نظر آئے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

11 جون 1982 کو سنتوش کمار دنیا سے رخصت ہو گئے جس کے بعد بھی فلم اور ٹیلی ویژن پر صبیحہ کی اداکاری کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کے مشہور ٹی وی ڈراموں میں ’احساس‘ اور ’دشت‘ کے نام شامل ہیں۔

انھوں نے پاکستان ٹیلی ویژن پر اپنی گائیکی کا جادو بھی جگایا، ان کے دو ملی نغمے ’جگ جگ جیوے میرا پیارا وطن‘ اور ’سوہنی دھرتی اللہ رکھے‘ بے حد مقبول ہوئے۔

صبیحہ خانم نے اپنی شاندار کارکردگی پر پانچ نگار ایوارڈ بھی حاصل کیے۔ انھیں نگار ایوارڈ سات لاکھ، شکوہ، دیور بھابی میں بہترین اداکارہ، سنگدل میں بہترین معاون اداکارہ اور اک گناہ اور سہی میں خصوصی اداکاری کے شعبے میں دیے گئے تھے۔

صبیحہ خانم نور جہاں کے بعد فلمی صنعت کی پہلی اداکارہ تھیں جنھیں صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی سے نوازا گیا تھا۔

صبیحہ خانم زندگی کے آخری ایام میں اپنے بچوں کے پاس امریکا منتقل ہو گئی تھیں جہاں 13 جون 2020 کو ان کا انتقال ہو گیا۔

++

فلم نگری

بے مثال

انور فرہاد

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ پاکستانی فلمی صنعت کو عروج بخشنے میں ہنرمندوں، اداکاروں نے انتھک محنت کی، وسائل نہ ہوتے ہوئے بھی بہتر سے بہتر کام کردکھایا فلم بینوں کو احساس نہ ہونے دیا کہ انتہائی کم سرمایہ سے ایسی لازوال فلمیں بنی ہیں۔ دنیا گواہ ہے کہ دیگر ممالک میں سو فلمیں بنتی ہیں تو اس میں دس بہترین فلمیں کہلاتی ہیں جبکہ ہمارے ہاں دس فلمیں بنیں تو اس میں آٹھ بہترین قرار پائیں۔ کئی ایسی فلمیں بھی پیش کی گئیں جو لازوال کہلائیں کیونکہ ہنرمندوں میں، اداکاروں میں کچھ کردکھانے کا جذبہ تھا۔

ایک بے مثال ہنرمند اور ایک بے مثال اداکارہ کا تذکرہ

اللہ میرے پڑھنے والوں کو سلامت رکھے اور انہیں زیادہ سے زیادہ پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے خاص کر وہ لوگ جو میری تحریر شوق سے پڑھتے ہیں، وقتاً فوقتاً مجھے مشورے بھی دیتے ہیں اور اپنی فرمائش کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ان کی فرمائش پر میں نے فلموں کی تفصیلی روداد لکھی تو کچھ نئے دوستوں نے ''زرقا'' کی کہانی سے متاثر ہو کر نیلو کے بارے میں لکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ''زرقا'' بہت بڑی فلم تھی اور حقیقی معنوں میں نیلو کی سب سے بڑی اور اہم

فلم تھی۔ زرقا کے بارے میں لکھتے ہوئے میں نے نیلو پر مختصراً لکھا تھا لیکن دوستوں کا اصرار کہ نیلو پر تفصیل سے لکھیں۔

تو پھر آیئے، آج کی تحریر کی ابتدا نیلو سے ہی کرتا ہوں۔ نیلو بیگم جنہیں آج کے بہت سے تماشائی سپر اسٹار شان کی والدہ ماجدہ کی حیثیت سے جانتے پہچانتے ہیں وہ خود بھی ایک طویل عرصے تک لالی ووڈ کی سپر پرفارمر رہی ہیں۔ انہوں نے ہماری فلمی صنعت میں بطور ہیروئن 25 سال مکمل کرنے والی پہلی اداکارہ کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ وہ ایک ورسٹائل فنکارہ تھیں۔ ہر نوعیت کے کردار انتہائی خوش اسلوبی سے انجام دیتی تھیں۔ ان کی متعدد فلموں نے فقید المثال کامیابی حاصل کی۔ ''زرقا'' کی طرح ان کی پنجابی فلم ''خطرناک'' نے بھی ڈائمنڈ جوبلی کا اعزاز حاصل کیا۔ انہوں نے اپنے کیریئر میں ڈیڑھ سو سے زیادہ فلموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ ایک بڑی اداکارہ کی حیثیت سے بھرپور زندگی گزاری۔

دوستو! یہ سب کچھ انہیں ایک دن میں حاصل نہیں ہوا۔ وہ جو ایک مصرعہ ہے نا ''رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ گھس جانے کے بعد'' تو اس اداکارہ کو بھی اپنے آپ کو منوانے اور اس مقام کو پانے کے لیے بڑی سخت جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ بہت محنت اور مشقت کرنی پڑی تھی۔ نیلو نے بالکل ابتدائی اسٹیج سے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ یعنی ایکسٹرا کی حیثیت سے فلمی دنیا میں قدم رکھا تھا۔ بہت ہی چھوٹے چھوٹے کرداروں میں انہیں پیش کیا جاتا تھا متذکر مگر انہیں سیکھنے اور آگے بڑھنے کا شوق تھا لگن تھی اس لیے انہی مختصر سے مختصر کرداروں میں وہ اپنا کام اچھے انداز میں کر کے متاثر کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ نیت صاف ہو تو منزل آسان ہو جاتی ہے۔ نیک نیتی سے کی گئی کوشش رائیگاں نہیں گئی اور ایک دن ایکسٹرا اداکارہ ہیروئن بن گئی۔

☆☆☆

اب میں اس اداکارہ کی کہانی ابتداء سے سناتا ہوں۔ بقول شاعر ''میں ابتدا سے کہتا ہوں تا انتہا سنو''

نیلو بیگم 29 جون 1940ء کو سرگودھا (پنجاب) کے قصبے بھیرہ کے ایک مسیحی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد الیگزینڈر فرنانڈیس نے اپنی بیٹی کے لیے سینتھا الیگزینڈر کا نام منتخب کیا۔ جسے بعد میں پنجاب کے ماحول کے مطابق پروین الیگزینڈر کا نام دیا گیا۔ 50 کی دہائی میں ان کا خاندان لاہور منتقل ہو گیا۔ لاہور آنے کے بعد جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے پروین الیگزینڈر کو بھی فلموں اور فلم والوں سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس نے اپنی کمسنی کے دور سے ہی نگار خانوں میں آنا جانا اور فلم والوں سے ملنا ملانا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجے میں اسے بطور ایکسٹرا گرل کے فلموں میں انتہائی قلیل معاوضے کے عوض کام ملنے لگا۔

سینئر صحافی یٰسین گورچہ کا کہنا ہے ..... ''نیلو سے میری ملاقات فلم ''التجا'' کے سیٹ پر ہوئی۔ میں نے اسے کہا ..... اتنا اچھا تمہارا فیس ہے اس کے باوجود تم ایکسٹرا کے طور پر کام کر رہی ہو؟''

اس نے بڑی بے چارگی کے ساتھ جواب دیا۔ ''پھر میں اور کیا کروں..... بطور اداکارہ کوئی کاسٹ بھی تو کرے.....''

گورچہ صاحب کہتے ہیں۔ ''پھر جب ہم نے فلم ''پیامبر'' شروع کی تو اس میں نیلو اور ایاز کو مرکزی کرداروں میں کاسٹ کیا مگر یہ فلم نصف سے زیادہ نہیں بن سکی، نامکمل ہی رہی۔''

یٰسین گورچہ صاحب کا کہنا ہے کہ ''ہم نے ساقی کو بھی فلم ''پیامبر'' میں ایک اہم رول دیا تھا۔ وہ بھی فلم ''التجا'' میں ایکسٹرا کے طور پر کام کر رہے تھے۔''

محترم یٰسین گورچہ صاحب کی معلومات کے تناظر میں ہم فلم ''التجا'' ہی کو نیلو بیگم کی پہلی فلم تصور کر لیتے ہیں جو اکتوبر 1955ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ ''التجا'' کے مرکزی کردار ایس گل اور راگنی نے ادا کیے تھے۔ جنہیں راگنی آہو چشم کے نام سے پکارا جاتا تھا کیونکہ ان کی آنکھیں پریوں جیسی تھیں۔ اس فلم کے ڈائریکٹر چوہدری گل تھے۔ جن کا پورا نام عزیز گل تھا۔ جبکہ اس فلم کے ہیرو ایس گل کا اصل نام سید فضل شاہ تھا۔ ایس گل ''التجا'' کے فلمساز اور موسیقار بھی تھے لیکن موسیقی کے شعبے میں اپنا نام گل حیدر استعمال کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نامور موسیقار ماسٹر غلام حیدر کے شاگرد تھے چنانچہ انہوں نے اپنے نام کے ساتھ اپنے استاد کا نام ملا کر ''گل حیدر'' کر دیا تھا اور اسی نام سے ''التجا'' کی موسیقی بھی دی تھی۔ تذکرہ فلم ''التجا'' میں اداکارہ ساقی اور اداکارہ نیلو نے مختصر کردار ادا کیے تھے۔ اسی سن پچپن میں ان دونوں ایکسٹرا نوعیت کے کردار کرنے والے پرفارمر نے ہالی ووڈ کی فلم ''بھوانی جنکشن'' میں بھی کام کیا تھا۔ اوہو..... چونکیے نہیں کہ یہ ایکسٹرا اداکار و اداکارہ..... اور ہالی ووڈ کی انگریزی فلم..... یہ کیا معما ہے.....؟ قصہ دراصل

WaqarAzeem Pakistanipoint.com

ہے کہ اس فلم کا ایک حصہ پاکستان میں بھی مکمل کیا گیا تھا۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن میں اس کی عکس بندی ہوئی تھی جس میں ہالی ووڈ کے اداکاروں کے ساتھ پاکستانی آرٹسٹوں نے بھی حصہ لیا تھا۔

اتنی باتوں سے اگر ہمارے کچھ دوستوں کی تشفی نہیں ہو ئی ہے تو اس کی تفصیل بتانی پڑے گی۔ ''بھوانی جنکشن'' کی کہانی ہندوستان سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ ''بھوانی جنکشن'' ہندوستان کا ایک ریلوے اسٹیشن ہے، جہاں ریل کی پٹڑی کے آگے لیٹ کر انگریزوں کو اس احتجاج کے ذریعہ ان کی جدو جہد سے روکا گیا تھا۔ ''بھوانی جنکشن'' کے پروڈیوسر نے اس فلم کی شوٹنگ بھوانی جنکشن کے مقام پر کرنے کی اجازت انڈین حکومت سے مانگی تھی لیکن بھارتی حکومت نے نہ صرف اس فلم کے اسکرپٹ پر اعتراض کیا بلکہ اپنے ملک میں شوٹنگ کرنے پر ٹیکس عائد کرنے کا عندیہ بھی دیا اس لیے ''بھوانی جنکشن'' کے پروڈیوسر نے ''بھوانی جنکشن'' کے متبادل کے طور پر لاہور ریلوے اسٹیشن کا انتخاب کیا۔ اس سلسلے میں حکومت پاکستان نے فلم کے پروڈیوسر کو شوٹنگ کی اجازت دینے کے ساتھ ساتھ ممکنہ تعاون کا انتظام بھی کیا۔ ''بھوانی جنکشن'' کے فلمساز پانڈر ایس برمن اور ہدایت کار جارج اسکور تھے جبکہ ایوا گارڈنر، اسٹیورٹ گریگور جیسے ٹاپ کے اسٹارز نے مرکزی رول کیے تھے۔ پاکستان میں ''بھوانی جنکشن'' کے پروڈکشن منیجر کے طور پر اے ایچ رانا کا انتخاب کیا گیا تھا۔ انہی کے توسط سے نیلو ''بھوانی جنکشن'' میں کاسٹ کی گئیں۔ ان دنوں نیلو کی عمر تقریباً 15 سال ہوگی۔ ''بھوانی جنکشن'' کی شوٹنگ کے دوران لاہور کے بے شمار افراد نے فلم کے لیے پرفارم کیا۔ جن میں تین ایسی شخصیات شامل تھیں جنہوں نے بعد میں پاکستان فلم انڈسٹری میں مقبولیت حاصل کی اور یہ تھے اداکارہ نیلو، اداکار ساقی اور اداکار اسد جعفری۔ یہ سب مختصر کردار میں تھے۔ نیلو اس فلم میں ایک پورٹر کے رول میں دکھائی گئی تھی۔ ساقی ایک مزدور لیڈر کے روپ میں پیش ہوئے تھے اور اسد جعفری ایک مجمع میں نظر آئے تھے۔ یہ فلم 1956ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

اسی سال نیلو پاکستانی فلموں میں بھی بطور ایکسٹرا کام کرنے لگیں۔ ان کی پہلی پنجابی فلم ''دلا بھٹی'' 13 جنوری 1956ء کو منظر عام پر آئی۔ ہدایت کار ایس ایم یوسف کی اس سپر ہٹ فلم میں نیلو صبیحہ خانم کی سہیلیوں کے

زندگی نامہ

خاندانی نام: سنیتھا الیگزینڈر جو پنجاب کے ماحول کے مطابق بعدازاں پروین الیگزینڈر ہوگیا۔

والد: الیگزینڈر فرنانڈس

پیدائش: 21 جون 1940ء

مقام: سرگودھا (پنجاب) کے قصبے بھیرہ

تعلق: مسیحی گھرانے سے تھا

فلمی کیریئر کا آغاز: بطور ایکسٹرا اداکارہ فلموں میں کام کرنا شروع کیا۔

پہلی فلم جس میں بطور ہیروئن کاسٹ ہوئیں

''پیامبر'' تھی ان کے ہیرو ایاز تھے مگر یہ فلم نصف سے زیادہ نہ بن سکی۔

بطور ایکسٹرا قابل ذکر فلمیں

دلا بھٹی، ماہی، منڈا، صابرہ، یکے والی، پھولے خان، سہتی، سردار، پاسبان، باپ کا گناہ، آنکھ کا نشہ اور سات لاکھ۔

''سات لاکھ'' ہی وہ فلم تھی جس کے ایک گیت ''آئے موسم رنگیلے سہانے'' سے انہیں پہچان ملی۔

ہیروئن شپ کا آغاز

امین ملک کی پنجابی فلم ''کچیاں کلیاں'' اور اردو فلم ''نئی لڑکی'' ان فلموں میں اسلم پرویز ہیرو تھے۔ یہ فلمیں 1958ء میں ریلیز ہوئی تھیں۔

سائیڈ رول کی فلمیں

ہیروئن کے کرداروں کے ساتھ سائیڈ رول کے کردار بھی کرتی رہیں۔ ان میں نیا درد، آخری نشان، شیخ چلی، زہر عشق، دربار، جٹی، رخسانہ، جان بہار، یار بیلی۔

بطور ہیروئن کامیاب ترین فلم

ناگن نے زبردست کامیابی حاصل کرکے اس کی مقبولیت اور شہرت میں بہت اضافہ کیا۔ اس کے ہیرو رتن کمار تھے، یہ جوڑی بہت پسند کی گئی اور ایک ساتھ دونوں کی کئی فلمیں منظر عام پر آئیں۔ اس جوڑی کی آخری فلم ''بارات'' تھی۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

جھرمٹ میں نظر آئیں۔ ان پر ایک کورس گیت فلمایا گیا تھا۔
باری ملک کی سپر ہٹ فلم ''ماہی منڈا'' میں بھی نیلو نے ثانوی رول کیا تھا۔ لالہ سدھیر اور مسرت نذیر نے ایم۔ جے رانا کی زیر ہدایت بننے والی فلم کے کلیدی کردار ادا کیے تھے۔ اسی سال اداکار و فلمساز نذیر کی سوشل فلم ''صابرہ'' میں بھی بطور ثانوی اداکارہ نیلو شامل تھیں۔

1957ء میں نیلو کی فلموں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ عکاس جعفر شاہ بخاری کی پہلی پروڈکشن ''انجام'' تاخیر سے مکمل ہوئی۔ مارچ 1957ء میں ریلیز ہونے والی اس فلم میں نیلو کے ساتھ نیا چہرہ لکھا گیا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے اسی سال ماہ فروری میں ریلیز ہونے والی شہرت یافتہ فلم ''یکے والی'' میں نیلو نے اچھا خاصا کردار ادا کیا تھا اور اس کی پرفارمنس پسند بھی کی گئی تھی۔ ''یکے والی'' کے ٹائٹل رول میں مرکزی ہیروئن مسرت نذیر کے مقابل لالہ سدھیر نے ہیرو کا رول کیا تھا اس سال نیلو کی فنی پرفارمنس سے آراستہ دیگر فلموں میں ہدایت کار اجمل کی فلم ''چھوٹے خان''، ایم جے رانا کی فلم ''ہستی''، جعفر ملک کی فلم ''باپ کا گناہ''، ایس ایم ڈار کی فلم ''سردار''، غلام حیدر شاہ کی فلم ''پاسبان''، سبطین فضلی کی فلم ''آنکھ کا نشہ'' کے علاوہ جعفر ملک کی معرکتہ آرا فلم ''سات لاکھ'' شامل ہے۔ جس میں نیلو پر یہ مشہور زمانہ گیت فلمایا گیا۔

آئے موسم رنگیلے سہانے
جیا نا ہی مانے
تو چھٹی لے کے آجا بالما

زبیدہ خانم کے گائے ہوئے اس شاہکار نغمہ سے نیلو کو صحیح معنوں میں پہچان ملی۔ یاد رہے کہ فلم ''سات لاکھ'' کے ایک اور گیت

یارو مجھے معاف کرو
میں نشے میں ہوں

سے لیجنڈ اسٹار آغا طالش کی مقبولیت کا آغاز ہوا تھا۔
اس فلم کی کاسٹ میں سنتوش کمار، صبیحہ خانم، نیر سلطانہ، نیلو، نذر، آصف جاہ، آشا پوسلے، طالش اور ہمالیہ والا شامل تھے۔ سیف الدین سیف کی اس سپر ہٹ میوزیکل فلم کی موسیقی رشید عطرے نے مرتب کی تھی۔
اسی دور میں شہاب کیرانوی نے اس شرط پر نیلو کو اپنی فلم ''ٹھنڈی سڑک'' میں کاسٹ کرنا چاہا کہ وہ فلم کی تکمیل تک کسی اور پروڈیوسر کی فلم میں کام نہیں کرے گی مگر نیلو کو یہ شرط پسند نہیں آئی یوں وہ ''ٹھنڈی سڑک'' میں شامل نہیں کی گئی اور پھر نیلو نے ایک طویل عرصے تک شہاب کیرانوی کی بنائی ہوئی کسی فلم میں اداکاری نہیں کی۔ یہ نیلو کی فن سے دلی لگن کا نتیجہ تھا کہ 1958ء میں ہی اس کی ہیروئن شپ کا آغاز ہوگیا۔ اس سال ہدایت کار امین ملک نے پنجابی فلم ''کچیاں کلیاں'' اور اردو فلم ''نئی لڑکی'' میں نیلو کو اسلم پرویز جیسے مقبول ترین اداکار کے مقابل مرکزی ہیروئن کے کردار میں پیش کیا۔ جبکہ ہدایت کار محمد علی کی فلم ''ممتاز'' میں نیلو کے ساتھ ماضی کے ہیرو ایاز تھے جو قبل ازیں شمیم آرا کی پہلی فلم ''کنواری بیوہ'' میں ہیرو کا کردار کر چکے تھے۔ تاہم یہ فلمیں کامیاب نہ ہوسکیں لیکن نیلو دل برداشتہ نہیں ہوئیں کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ اپنی محنت سے آخر کار منزل مقصود پالیں گی۔ ہیروئن کے کردار ملنے کے باوجود وہ سائیڈ رول بھی کرتی رہیں جن میں فلمساز و ہدایت کار عطا اللہ شاہ ہاشمی کی فلم ''نیا دور'' میں ان کے مقابلے میں یوسف خان تھے۔ ہدایت کار اشفاق ملک کی کامیاب فلم ''آخری نشان'' میں نیلو نے کامیڈین نذر کی سنگت میں حصہ لیا۔ 1958ء میں نیلو کی کردار نگاری سے آراستہ دیگر فلموں میں آصف جاہ کی فلم ''شیخ چلی''، مسعود پرویز کی فلم ''زہر عشق''، ریاض احمد راجو کی فلم ''دربار''، ایم جے رانا کی پنجابی فلم ''جٹی''، فضل دین کی فلم ''رخسانہ'' اور شوکت حسین رضوی کی فلم ''جانِ بہار'' شامل ہیں۔ فلم ''جانِ بہار'' میں نور جہاں کے گائے ہوئے اس گیت پر نیلو کے کلاسیکل رقص کو سراہا گیا۔

اب تو جی بھر کے خنجر چلائیں گے ہم
اپنے عشاق کو آزمائیں گے ہم

اسی طرح ہدایت کار ایم جے رانا کی فلم ''جٹی'' میں نیلو نے یہ طربیہ گیت بھی خوبصورتی سے پکچرائز کرایا۔

تکنا بھی چنگا نئیں

1959ء میں نیلو کی ریلیز ہونے والی پہلی فلم ''یار بیلی'' تھی۔ فلمساز باری ملک نے اپنی اس پنجابی فلم کے لیے خلیل قیصر کو پہلی بار ڈائریکشن کا چانس دیا تھا۔ اس فلم کی کاسٹ میں لالہ سدھیر، مسرت نذیر، نیلو، الیاس کشمیری، ظریف اور نذر نمایاں تھے۔ یار بیلی عید الفطر 10 اپریل 1959ء کو منظر عام پر آئی اور اسی کے ساتھ پیش ہونے والی ہدایت کار آغا حسینی کی اردو فلم ''سولہ آنے'' میں نیلو نے اعجاز اور مسرت نذیر کی رفاقت میں کام کیا اس فلم میں زبیدہ خانم کا گایا ہوا یہ گیت امر سنگیت کا حصہ بن گیا۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

روتے ہیں چھم چھم نین
اجڑ گیا چین
میں نے دیکھ لیا تیرا پیار

اسی سال عیدالاضحیٰ نیلو کی کامیابی کی نوید لے کر آئی۔ فلمز حیات کے روح رواں فلمساز و زیر علی نے اپنے چھوٹے بھائی رتن کمار کو ہیرو اسٹیبلش کرانے کے لیے فلم ''ناگن'' بنائی جس کی ہدایات کے لیے انہوں نے خلیل قیصر کا انتخاب کیا تھا۔ خلیل قیصر کو نوعمر ہیرو رتن کمار کے لیے نیلو ہی سب سے زیادہ موزوں لگی تھیں کیونکہ اس وقت کی سبھی ہیروئین رتن کمار سے زیادہ بڑی لگتی تھیں۔ قبل ازیں ''یار بیلی'' میں بھی خلیل قیصر نیلو کی صلاحیتوں کو آزما چکے تھے۔ انہوں نے اس حسین اور باصلاحیت اداکارہ کی صلاحیتوں کو مزید پالش کر کے اسے ''ناگن'' کے مرکزی کردار میں اس طرح ڈھال دیا کہ اب تک اس موضوع پر بننے والی پاک و ہند میں سبھی فلموں میں کارکردگی کے لحاظ سے نیلو کا نام سرفہرست نظر آتا رہے۔ ''ناگن'' میں نیلو اور رتن کمار کی جوڑی بے حد پسند کی گئی اور باکس آفس پر سپرہٹ ثابت ہوئی۔ اس فلم کی کامیابی میں موسیقار صفدر حسین کی ترتیب دی ہوئی دھن دھنوں سے آراستہ یہ گیت بھی معاون ثابت ہوئے۔

☆ سیاں جی کو ڈھونڈنے چلی
پھری میں گلی گلی جوگن بن کے
(آواز ناہید نیازی)

☆ امبوا کی ڈالیوں سے جھولا جھلا جا
اب کے ساون سجن گھر آجا
(آواز اقبال بانو)

☆ موہے کیسا جو بنوا کا چور ملا رے۔
(آواز زبیدہ خانم)

''ناگن'' کی کاسٹ میں نیلو اور رتن کمار کے علاوہ حسنہ، یوسف خان، ریکھا، ساقی، زینت، زمرد، نذر، مایا دیوی، بیگم پروین اور رتن کمار کے والد عباس اجمیری شامل تھے۔ ساقی نے ایک سپیرے کے کردار میں بہترین پرفارمنس دی تھی۔ جبکہ کومل نامی ناگن کے روپ میں نیلو اپنی کارکردگی سے پوری فلم پر چھائی رہی۔ نیلو کی رقص کی مہارت بھی اس کی پرفارمنس کو دلآویز بنانے میں کارگر ثابت ہوئی۔

اس موقع پر میرے نوجوان دوستوں کو یہ بتانا ضروری ہے کہ رتن کمار کو رتن کمار کیوں کہا جاتا تھا؟ جبکہ ان کے والد اپنے حقیقی نام عباس اجمیری اور بھائی وزیر علی کے نام سے پہچانے جاتے تھے اور خود ان کا نام سید نذر علی تھا۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ یہ پورا خاندان انڈیا میں رہتا تھا اور وہاں عباس اجمیری صاحب بولی ووڈ کی فلموں میں اداکاری کیا کرتے تھے۔ نذر علی نے انڈین فلموں سے ہی بطور چائلڈ اسٹار اپنے فنی کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ وہاں کی فلموں میں چونکہ اشوک کمار، دلیپ کمار اور کشور کمار وغیرہ نے بڑی عزت، شہرت اور دولت کمائی اس لیے سید نذر علی کے بڑوں نے بھی غالباً یہی سوچ کر نذر علی کو رتن کمار کے نام سے متعارف کرایا۔ عزت اور ذلت دینے والی ذات اللہ رب العزت کی ہے۔ اس بچے میں بے پناہ اداکارانہ صلاحیتیں تھیں جس کے سہارے وہ جلد ہی مقبول چائلڈ اسٹار بن گیا۔ اس نے متعدد فلموں میں بہت کامیاب اداکاری کی۔ جب یہ خاندان پاکستان آیا تو یہاں کی فلموں میں بھی رتن کمار ہی کے نام سے چائلڈ اسٹار کے طور پر کام کرنا شروع کر دیا پھر وہ وقت بھی آیا جب وہ بچہ نہیں رہا جوان ہو گیا اور اس کے بڑوں نے اسے ہیرو کے طور پر پیش کرنے کے لیے ''ناگن'' جیسی فلم بنائی۔

بات نیلو کی ہو رہی تھی اسی لیے عرض ہے کہ فلمساز و اداکار نذیر نے جب اپنی فلم ''شمع'' شروع کی تو نیلو کو درپن کے مقابل مرکزی کردار کے لیے منتخب کیا۔ نیلی آنکھوں والے خوبرو درپن کے ساتھ نیلو کی یہ پہلی فلم تھی۔ اگرچہ اس فلم میں نذیر صاحب کی بیگم سورن لتا نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا تھا مگر درپن اور نیلو کی رومانوی جوڑی کو تماشائیوں نے پسند کیا اور ان کی اس فلم کو کامیابی سے ہمکنار بھی کرایا۔ اس فلم کے لیے سلیم رضا کی آواز میں گایا ہوا یہ گیت آج بھی شوق سے سنا جاتا ہے۔

اے نازنیں تجھ سا حسیں
ہم نے کہیں دیکھا نہیں اے مہ جبیں

''شمع'' میں نیلو اور درپن کی جوڑی کی پسندیدگی کو دیکھتے ہوئے درپن پروڈکشن کی اوّلین فلم ''ساتھی'' میں بھی نیلو کو درپن کے ساتھ پیش کیا گیا۔ اس فلم میں بھی اس رومانوی جوڑی کو پسندیدگی کی سند حاصل ہوئی اور ''ساتھی'' نے بھی شاندار کامیابی حاصل کی، یہ بات قابل ذکر ہے کہ متذکرہ فلم ''ساتھی'' میں شہنشاہِ رومانس وحید مراد نے پہلی بار ایک مختصر کردار کے ذریعے سینما اسکرین پر انٹری دی تھی۔

1959ء میں نیلو نے دو فلموں میں بطور ہیروئن

WaqarAzeem
pakistanipoint.com

اداکاری کے جوہر دکھائے۔ ان میں ایک پنجابی فلم ''شیرا'' تھی جس میں ان کے مقابل حبیب ہیرو تھے جبکہ دوسری اردو فلم ''سچے موتی'' تھی جس میں اعجاز نے ان کے مقابل ہیرو کا رول ادا کیا تھا۔ ''شیرا'' کے ہدایت کار ایم جے رانا تھے اور ''سچے موتی'' کو شیخ اقبال نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ دونوں فلموں نے اوسط درجے کا بزنس کیا تھا۔

اسی برس نیلو کی سائیڈ رول کی فلموں میں ہدایت کار ایچ ریاض کی فلم ''للکار'' نجم نقوی کی فلم ''نغمہ دل'' حسن طارق کی پہلی فلم ''نیند'' اور خواجہ خورشید انور اور سعود پرویز کی نغمہ بار فلم ''کوئل'' شامل تھیں۔ ''نیند'' اور ''کوئل'' دونوں میں نور جہاں ہیروئن تھیں۔ فلم ''کوئل'' میں نیلو نے زبیدہ خانم کے گائے ہوئے ان گانوں کی دلفریب پکچرائزیشن سے داد حاصل کی تھی۔

☆ دل جلانہ دل والے آنکھیں اٹھالے
نظریں ملالے، نظریں ملا کے مجھے اپنا بنالے

☆ مستی میں جھوم جھوم لے
ساغر کو چوم چوم لے

دوستو! 1957ء میں ریلیز ہونے والی شاہکار فلم ''سات لاکھ'' کا ذکر کر چکا ہوں اس فلم میں حسن طارق ہدایت کار جعفر ملک کے چیف اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ اس فلم کے مقبول گیت ''آئے موسم رنگیلے سہانے'' پر نیلو کی دل موہ لینے والی پکچرائزیشن حسن طارق کے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ لہٰذا جب حسن طارق نے بطور ہدایت کار اپنی پہلی فلم ''نیند'' بنائی تو نور جہاں کے ساتھ نیلو کو اچھا کردار دیا۔ یہی نہیں بلکہ اس کے بعد حسن طارق نے اپنی ہدایت کاری میں بننے والی فلموں ''بنجارن''، ''شکوہ'' اور ''قتل کے بعد'' میں بھی نیلو کو مرکزی ہیروئن کے طور پر کاسٹ کیا اور نیلو نے بھی ہر فلم میں اپنے کردار کے جزئیات بطریق احسن ادا کیے۔ یہی وہ دور تھا جب دیگر سبھی ہیروئنوں کی نسبت نیلو میں جنسی کشش کے آثار سب سے زیادہ پائے گئے اور نیلو کی دلکش و دلفریب اداؤں کی بنا پر اسے پاکستان فلم انڈسٹری کی پہلی پُرکشش ہیروئن کہا گیا۔

1960ء میں اس سیکسی اداکارہ نے 15 فلموں میں اپنے جلوے دکھائے۔ پہلی فلم کراچی میں پایۂ تکمیل کو پہنچنے والی ہدایت کار اے ایچ صدیقی کی ''انصاف'' تھی جس میں نیلو کا پیئر سید کمال کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ اس فلم نے اپنے دور میں اچھا بزنس کیا تھا۔ ہدایت کار لقمان کی تاریخی موضوع پر بننے والی فلم ''ایاز'' میں بھی نیلو کے مقابل کمال ہی کو لیا گیا تھا جبکہ فلم کا ٹائٹل رول اداکار حبیب نے کیا تھا اور ان کی جوڑی نیر سلطانہ کے ساتھ بنائی گئی تھی۔ نیلو اس فلم میں ایک کنیز اور نیر سلطانہ کی سہیلی بنی تھیں اور اس فلم کے اس گانے میں نیر سلطانہ اپنا رازِ محبت نیلو کے سامنے یوں آشکار کرتی ہے۔

☆ میں دل ہی دل میں ناچوں
دل ہی دل میں گاؤں
پر دل کی بات کیسے بتاؤں

جبکہ نیر سلطانہ کے سامنے نیلو پر اس سولو گیت کی فلمبندی ہوئی تھی جسے زبیدہ خانم نے اپنی آواز کے قالب میں ڈھالا تھا۔

☆ اے ماہِ لقا اے جانِ وفا
کیوں ہے تو شرمائی ہوئی

فلم ''ایاز'' کے لیے گلوکارہ زبیدہ خانم نے ایک ایمان افروز نعت نہایت چاؤ سے ریکارڈ کرایا تھا جسے نغمہ نگار تنویر نقوی نے لکھا اور خواجہ خورشید انور نے اس کی دھن ترتیب دی تھی۔ یہ نعت شریف فلم میں صبیحہ خانم، نیر سلطانہ، نیلو اور دیگر فنکاراؤں پر پکچرائز کی گئی تھی۔ یہ نعت تھی

جو نہ ہوتا تیرا ہالیہ
تو جہان تھا خواب و خیالیہ
صلو علیہ و آلہ صلو علیہ و آلہ

اس موقع پر یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ صبیحہ خانم اس دور کی نمبر ون اداکارہ تھیں مگر حیران کن بات ہے کہ ''ایاز'' میں وہ ہیروئن کے طور پر کاسٹ نہیں کی گئی تھیں۔ اس فلم میں انہیں ایک رقاصہ کے کردار میں پیش کیا گیا تھا مگر اس فلم کے سب سے زیادہ گانے انہی پر پکچرائز کیے گئے تھے جن میں ناہید نیازی کے گائے ہوئے اس کورس گیت کی تازگی آج بھی برقرار ہے۔

رقص میں ہے سارا جہاں
دھوم ہے یہ آج یہاں
آئے گا وہ شاہِ خوباں

''ناگن'' کی شاندار کامیابی کے بعد نیلو اور رتن کمار کی جوڑی 1960ء اور 1961ء کی تین فلموں میں جلوہ گر ہوئی۔ یہ تینوں فلمیں رتن کمار کے پروڈکشن ہاؤس جہات فلمز کے بینر تلے بنائی گئیں۔ ان تینوں فلموں کے فلمساز وزیر علی تھے۔ جن میں دو فلمیں ''الہ دین کا بیٹا'' اور ''تاج اور تلوار''

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

الف لیلوی کہانیوں پر مبنی تھیں۔ ان دونوں فلموں کی ہدایات ریاض احمد راجو نے دی تھیں۔ تیسری فلم ''نیلوفر'' تھی جو نیلو کے نام سے متاثر ہو کر بنائی گئی تھی۔ اس کے ہدایت کار رفیق رضوی تھے۔ یہ تینوں فلمیں نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکیں۔

1960ء میں نیلو نے سائیڈ رول کی جن فلموں میں اداکاری کی ان میں سلطنت سب سے زیادہ کامیاب رہی۔ یہ ہدایت کار ایس ایم ڈار کی کاسٹیوم فلم تھی۔ سنتوش کمار اور صبیحہ خانم نے اس فلم میں مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ اسی سال نیلو نے ہدایت کار ایم صادق کی فلم ''اسٹریٹ 77'' اور ولی صاحب کی فلم ''سوہنی کمہارن'' میں بھی ثانوی رول کیے تھے۔ ہدایت کار قدیر غوری نے اپنی فلم ''دو راستے'' میں اعجاز، بہار اور یوسف خان کے ساتھ نیلو کو کاسٹ کیا تھا یہ فلم 1961ء میں منظر عام پر آئی۔ اسی سال نیلو کو ہدایت کار ایم اے رشید کی فلم ''صبح کہیں شام کہیں'' میں اسلم پرویز کے ساتھ پیش کیا۔ ریاض احمد راجو نے ''تاج اور تلوار'' میں رتن کمار کے ساتھ اور ہدایت کار باقر رضوی نے اپنی اولین فلم ''بارہ بجے'' میں علاؤ الدین کے مقابل مرکزی ہیروئن کے کردار میں کاسٹ کیا۔ یہ کاؤ بوائے ٹائپ کی فلم تھی جو کراچی میں بنائی گئی تھی۔ اس فلم سے موسیقار جوڑی لعل محمد اقبال نے اپنی فلمی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اس فلم میں انڈیا سے آئی ہوئی ایک اسٹوڈنٹ نازش نے نشی کماری کے نام سے گلوکاری بھی کی تھی جو نیلو پر فلمبند ہوئی تھی۔ نشی کماری کے گائے ہوئے گیت کو سن کر آج بھی چلتے قدم رک جاتے رہیں۔

ہار گئی تو سے دل لگا کے
نینوں میں بسایا تو ہے کجرا بنا کے

اس فلم ''بارہ بجے'' کے نغمہ نگار یزدانی جالندھری، روپ بانی، وجد چغتائی اور شبیہ فاروقی تھے۔ نشی کماری کچھ دنوں کے بعد کینیڈا شفٹ ہو گئی تھیں وہیں 2007ء میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی آواز میں لعل محمد اقبال نے دو گیت ''بارہ بجے'' کے لیے ریکارڈ کیے تھے۔ دوسرے گیت کے بول تھے۔

بلما جیا ہے ویران میرا
زمانہ درد نہ جانے میرا

1962ء میں منظر عام پر آنے والی فلم ''حسن و عشق'' نیلو اور رتن کمار کی جوڑی کی وہ فلم تھی جس کے رائٹر اور ڈائریکٹر عزیز میرٹھی تھے۔ بطور ہدایت کار یہ ان کی پہلی فلم تھی جو انہیں کامیابی سے ہمکنار نہ کر سکی اور نیلو اور رتن کمار کی جوڑی سے بھی وہ متوقع فائدہ نہ اٹھا سکے۔

اسی سال عید الفطر کے موقع پر سیف الدین سیف کی فلم ''دروازہ'' نمائش پذیر ہوئی۔ اس فلم میں نیلو کے ساتھ یوسف خان نے مرکزی کردار کیا تھا۔ اس فلم کے لیے موسیقار سلیم اقبال نے مدھر دھنیں کمپوز کی تھیں۔ جن میں یہ گیت تو کمال کے تھے۔

☆ چھپ گئے تارے ندیا کنارے
تم نہ آئے پیا
(آواز نسیم بیگم۔ پکچرائزیشن نیلو)

☆ صورت توری دیکھے بنا
نہیں آئے چین، تو آجا
(آوازیں۔ سلیم رضا، نسیم بیگم)

شادی خانہ آبادی

نیلو کے حسن و جمال سے متاثر ہونے والے فلمی دنیا میں کئی لوگ تھے۔ جن میں ان کے ساتھی فنکاروں میں رتن کمار اور درپن سرفہرست تھے مگر ان کی جوڑی جو آسمانوں پر بنی تھی، وہ ریاض شاہد کے ساتھ بنی تھی اور وہی انہیں اپنی دلہن بنا کر اپنے گھر لے گئے۔

اولاد

زرقا (بیٹی)، اعجاز (بیٹا)، شان جن کا اصل نام ارسلان ہے (بیٹا)۔

فلم انڈسٹری سے کنارہ کشی

''زرقا'' کے بعد فلم انڈسٹری سے کنارہ کشی کر کے گھر گرہستی تک خود کو محدود کر لیا۔

دوبارہ آمد

شوہر کے انتقال کے تین سال بعد بچوں کی پرورش و پرداخت کے لیے دوبارہ فلم انڈسٹری جوائن کر لی، اس دور کی ان کی ریلیز ہونے والی پہلی فلم ''خطرناک'' تھی مگر ''زرقا'' اور ''خطرناک'' میں آسمان زمین کا فرق تھا۔ زرقا ایک نیک مقصد کے لیے بنائی گئی تھی جبکہ ''خطرناک'' ناپاک مقاصد کے لیے بنائی گئی تھی مگر عجیب اتفاق ہے کہ ان دونوں ہی فلموں نے 100 ہفتے چل کر ڈائمنڈ جوبلی کا اعزاز حاصل کیا تھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint

☆غریب دل کی محبت پکارتی ہے تجھے
جواب دے دے
(آواز سلیم رضا۔عکس بندی یوسف خان)

فلم ''دروازہ'' میں نیلو نے المیہ مناظر میں بھی متاثر کن پرفارمنس دی تھی۔ ایور نیو پکچرز کی نغمہ بار فلم ''عذرا'' میں نیلو کے مقابل اعجاز نے مرکزی رومانوی کردار کیا تھا۔ یہ نئی دل کی ہدایات میں بننے والی فلم تھی۔ یہ فلم تھی تو بلیک اینڈ وائٹ مگر اس کے تمام گانے رنگین تھے۔ نیلو نے اس فلم میں بڑی جاندار اداکاری کی تھی اس کے دیگر آرٹسٹ میں لیلیٰ، یوسف خان، نذر، زمرد، طالش، علاؤالدین، نعیم ہاشمی اور ہمالیہ والا تھے۔

موسیقار ماسٹر عنایت حسین کی دلنواز دھنوں سے آراستہ ان گیتوں نے ''عذرا'' کی یاد ہمیشہ تازہ رکھی۔

☆ کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے
کچھ کہتے کہتے رہ بھی گئے
(آواز۔نور جہاں، نیلو پر عکسبند ہوا)

☆ میری وفائیں تجھے بلائیں
سن لے دھڑکتے دل کی صدائیں
(آواز۔نور جہاں۔پکچرائز ہوا نیلو پر)

☆ جانِ بہاراں رشکِ چمن
غنچہ دہن، یمی بدن
(آواز۔سلیم رضا، اعجاز پر عکسبند ہوا)

☆ سب داغ دل چراغ بنا کر چلا دیے
آجا کہ ہم نے
(آواز۔نور جہاں۔پکچرائزیشن نیلو)

☆ شرما کے ہم سے آنکھ ملانے کا شکریہ
(آوازیں۔نور جہاں، سلیم رضا)

''بنجارن'' 1962ء میں ریلیز ہونے والی حسن طارق کی سپرہٹ فلم تھی، جس میں نیلو نے ٹائٹل رول اس خوبی سے ادا کیا تھا کہ ناظرین اور مبصرین نے دل کھول کر تعریف کی تھی۔ نیلو کی دل نشیں اداؤں اور شاندار کردار نگاری کا جادو باکس آفس پر بھی چل گیا اور اسے سپرہٹ کامیابی سے ہمکنار کر گیا۔ کمال اس فلم میں نیلو کے ہیرو تھے۔ یاد رہے کہ نامور قلمی نغمہ نگار مسرور انور کا تحریر کردہ سب سے پہلا فلمی گیت نیلو پر ہی پکچرائز کیا گیا تھا جس کے بول تھے۔

☆ ماسٹر جی مجھے سبق پڑھا دو
یہ ABC میں نہیں جانتی
(آواز۔آئرن پروین)

جبکہ اسی فلم کا فیاض ہاشمی کا تحریر کردہ یہ المیہ نغمہ بھی نیلو پر فلمایا گیا تھا جسے نور جہاں نے گایا تھا۔

☆ نجانے کیسا سفر ہے میرا
جہاں ہے منزل وہیں لٹیرا
یہ گیت بھی بہت مقبول ہوا تھا۔

ہدایت کار خلیل قیصر نے ''ناگن'' کی طرح اپنی نئی فلم ''دوشیزہ'' میں بھی نیلو کو ٹائٹل رول میں پیش کیا۔ دوشیزہ کا اسکرپٹ ریاض شاہد نے تحریر کیا تھا۔ نیلو کے مرکزی کردار میں یہ ریاض شاہد کے ساتھ اس کا غالباً پہلا اشتراک تھا۔ دوشیزہ کے روپ میں نیلو کا کردار بڑا ہی دلچسپ تھا۔ اسے ایک مجسمے کی شکل میں دکھایا گیا تھا۔ جس پر لوگ عاشق ہو جاتے ہیں۔ عاشق ہونے والوں میں اسلم پرویز، اسد بخاری اور اعجاز نمایاں ہوتے ہیں اعجاز نے اس فلم میں ہیرو کا کردار ادا کیا ہے۔ دیبا، چھم چھم، ساقی، ایمی مینوالا، لہری، قوی اور علاؤالدین بھی کاسٹ میں شامل تھے۔ ''دوشیزہ'' کے افسانوی کردار میں نیلو نے اپنے حسن و جمال اور پرفارمنس سے بہت متاثر کیا تھا۔ نیلو کے بہنوئی عکاس بابر بلال نے نیلو کو ''دوشیزہ'' کے روپ میں نہایت حسین ایکسپوز کیا تھا۔ ''عذرا'' کے بعد اعجاز اور نیلو کی جوڑی کی یہ دوسری فلم تھی۔ جبکہ موسیقار ماسٹر عنایت حسین کی بھی ''عذرا'' کے بعد اس جوڑی کے ساتھ یہ دوسری فلم تھی۔ ماسٹر صاحب نے اس فلم کے لیے بھی بڑی سریلی دھنیں تیار کی تھیں۔

☆ لو جی ہم جا رہے ہیں نگاہیں جھکاتے مسکراتے ہوئے
(آواز۔مالا)

☆ ہر نظر سے اک نیا سوال ہو گیا
آپ مسکرا دیے، کمال ہو گیا
(آوازیں۔ناہید نیازی، فضل حسین)

☆ انصاف نہ تھا جو تم نے کیا
اتنی دے سزا جتنی ہے خطا
(آواز۔سلیم رضا)

☆ اے مہ جبیں ناز آفریں
وہم ہے یا تو ہے یقین
(آواز۔مہدی حسن)

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

نیلو کی نئی صلاحیتوں کو ہر طرح سے آزمایا گیا۔ ہر روپ میں، ہر آزمائش میں وہ پوری اتری، اس سلسلے میں خواجہ خورشید انور نے اپنی فلم ''گھونگھٹ'' میں اسے منفی کردار میں پیش کیا۔ نیلو نے چیلنج سمجھ کر یہ کردار قبول کیا اور یہ تک نہ خیال کیا کہ اس طرح ان کی ہیروئن شپ پر برا اثر بھی پڑ سکتا ہے۔ شاید انہیں اپنے آپ پر اعتماد تھا کہ وہ ہر طرح کے کردار میں خود کو ڈھال سکتی ہیں۔ یہ کردار اسمگلروں کا ساتھ دینے والی ایک لڑکی کا تھا۔ جسے انہوں نے بخوبی نبھایا۔ ''گھونگھٹ'' خواجہ خورشید انور کی بطور ہدایت کار پہلی فلم تھی۔ نیر سلطانہ اس فلم کی ہیروئن اور سنتوش کمار ہیرو تھے۔ مہدی حسن کی آواز میں

مجھ کو آواز دے، تو کہاں ہے کہاں

اس فلم کا مقبول نغمہ تھا جبکہ نیلو پر ناہید نیازی کے گائے ہوئے دو گیت پکچرائز کیے گئے تھے۔

☆ تم چاہے بولو یا نہ بولو پیا
میں تمہاری ہوں

☆ میں ہوں ایک پہیلی
میں پھروں اکیلی

1962ء نیلو کی مقبولیت کا سال تھا۔ اس سال نئے ہدایت کار رضا میر کی فلم ''اونچے محل'' اور اداکار دبیت مرزا کی اوّلین پروڈکشن ''برسات میں'' میں نیلو کو ہیروئن کے طور پر کاسٹ کیا گیا۔ ''برسات میں'' ایک بڑی اثر انگیز فلم تھی۔ جس میں علاؤالدین کا ایک اہم کردار تھا نیلو کے مقابل اعجاز ہیرو تھے۔ اس فلم کا تھیم سانگ سلیم رضا کی آواز میں بیک گراؤنڈ میں پیش کیا گیا تھا جبکہ یہی نغمہ نور جہاں کی آواز میں ریکارڈ کر کے نیلو پر فلمایا گیا تھا۔

☆ زندگی مجبور ہے لاچار ہے
سانس بھی لینا یہاں دشوار ہے

ایک دلچسپ گیت علاؤالدین پر بھی پکچرائز ہوا تھا۔ جس کے بول تھے

☆ کالی کالی رات میں
بھیا برسات میں
گورا گورا ہاتھ دے دے
کوئی میرے ہاتھ میں
اللہ قسم، مولا قسم

اس گیت کی پکچرائزیشن پر علاؤالدین نے کمال کر دیا تھا۔ ان کا کردار بھی بڑا دلچسپ تھا۔ انہوں نے ایک جاہل نوجوان کا کردار ادا کیا تھا جنہیں لوگ منشی جی کہہ کر پکارتے تھے۔

1963ء میں نیلو کی بہترین کارکردگی سے مرصع فلموں میں ''عشق پر زور نہیں''، ''موج میلہ''، ''شکوہ''، ''بارات''، ''تیر انداز''، ''قتل کے بعد''، ''کالا آدمی'' اور ''دامن'' شامل تھیں۔ جن میں سنتوش کمار کی فلم ''دامن'' نے گولڈن جوبلی کی۔ حسن طارق کی فلم ''شکوہ'' الیاس کشمیری کی فلم ''عشق پر زور نہیں'' اور پنجابی فلم ''موج میلہ'' نے شاندار کامیابی حاصل کی۔ ہدایت کار ایم اکرم کی فلم ''تیر انداز'' میں ہیرو ہیروئن کا کردار سلطان اور رخسانہ نے ادا کیا تھا۔ مذکورہ فلم میں نیلو اور درپن پر ایک آئٹم سونگ پکچرائز کیا

اعزاز

نیلو کو اس بات کا اعزاز حاصل ہے کہ ان کی دو فلموں ''زرقا'' (اردو) اور ''خطرناک'' (پنجابی) نے ڈائمنڈ جوبلی کامیابی حاصل کی جبکہ ان کی کئی فلموں کو ایوارڈز سے بھی نوازا گیا ان کے پہلے دور کی طرح ان کے دوسرے دور میں بھی تماشائیوں سے انہیں زبردست پذیرائی ملی۔

آخری فلم

بطور ہیروئن آخری فلم اردو زبان ''جعلی ویزا'' تھی جو 1982ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اب تک وہ اردو اور پنجابی زبانوں کی فلموں کی ہیروئن کے طور پر کاسٹ کی جاتی رہی تھیں مگر اب ان کی عمر میں اضافے کی وجہ سے وہ ہیروئن کے لیے قابل قبول نہیں رہی تھیں۔ ثانوی کرداروں کی ان کی آخری فلم پنجابی فلم ''کالو'' تھی جو 1992ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔

اپنے وقت کی سپر ہیروئن پر وہ وقت بھی آیا جب وہ اپنے بیٹے شان کی ماں کے طور پر بھی فلموں میں پیش کی جانے لگیں۔ ایسی فلمیں جن میں وہ اپنے حقیقی بیٹے شان کی ماں کے کرداروں میں پیش ہوئیں ''نگینہ''، ''فتح'' اور ''کالو'' قابل ذکر ہیں۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

گیا تھا۔ احمد رشدی اور نسیم بیگم کے گائے ہوئے اس ڈوئیٹ کے بول تھے۔

☆بس ہم تو ہو گئے ہیں خادم جناب کے
اگر آپ ہمارے ہیں تو ہو گئے ہم آپ کے

فلم ''عشق پر زور نہیں'' میں جمیلہ رزاق اور اسلم پرویز مرکزی فنکار تھے۔ یاسمین پر شہرۂ آفاق نغمہ۔ ''کسی سے کوئی پیار نہ کرے۔'' فلم بند ہوا تھا جبکہ نیلو پر فلمائے گئے گیتوں میں یہ گیت بھی پسند کیا گیا تھا۔

☆جھر جھر بیریا کے بیر مت توڑو
کانٹا چبھ جائے گا

حبیب اور نیلو کی فلم ''کالا آدمی'' تو ناکام ہو گئی لیکن پنجابی فلم ''موج میلہ'' نے سپر ہٹ بزنس کیا۔ حسن طارق نے ''بنجارن'' کے بعد ''قتل کے بعد'' میں بھی نیلو اور کمال کی جوڑی کو آزمایا لیکن یہ فلم کامیاب نہ ہو سکی۔ ''قتل کے بعد'' جاسوسی کہانی پر بنائی گئی تھی جس میں نیلو اپنے بھائی محمد علی کے قتل کا سراغ لگانے کے لیے ایک کلب نما ہوٹل میں بطور رقاصہ ملازمت کر لیتی ہے جہاں کمال اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس فلم میں اسلم پرویز اور علاؤ الدین کے بھی اہم کردار تھے۔ حسن طارق ہی کی معاشرتی فلم ''شکوہ'' میں نیلو برصغیر کی حسین ترین ہیروئن درپن کی ہیروئن بنی تھیں۔ وہ اس فلم میں ایک کالج گرل کے روپ میں پسند کی گئی تھیں۔ ''شکوہ'' میں صبیحہ اور سنتوش نے درپن کے والدین کا کردار کیا تھا۔

سنتوش کمار کی ذاتی فلم ''دامن'' کی ہدایات قدیر غوری نے دی تھیں۔ اس فلم میں نیلو نے بطور ریمپ اپنا کردار بہترین انداز میں پورٹرے کیا تھا۔ فلم میں وحید مراد کے ساتھ مقابلہ رقص میں بھی نیلو نے خوب رنگ جمایا تھا۔ وحید مراد سے طلاق پانے کے بعد وہ سنتوش کمار کو اپنے جال میں پھنسانے والی نغمہ کے کردار میں نہایت کامیاب رہی۔ اس فلم میں نیلو پر ایک سولو گیت اور ایک ڈوئٹ پکچرائز کیا گیا تھا۔ ڈوئٹ میں نیلو کے ساتھ سنتوش کمار تھے۔ مالا اور احمد رشدی کے اس گیت کے بول تھے۔

☆میرے محبوب تیرا ساتھ ہے تنہائی ہے
میری راحت تیری سانسوں میں سمٹ آئی ہے

فلم ''بارات'' کی ڈائریکشن کے لیے مصنف رحیم گل کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ نیلو اور رتن کمار کی جوڑی کی یہ آخری فلم تھی۔ جس کی کاسٹ میں نغمہ، نذر، زینت، نجم الحسن، اسلم پرویز، زمرد، اسد بخاری، سلمیٰ ممتاز اور ساقی بھی نمایاں تھے۔ ''بارات'' کی موسیقی اعظم بیگ نے ترتیب دی تھی۔ جن میں چند گیت درج ذیل ہیں۔

☆وہ سامنے آجاتے تو تصویر حسیں بنتی
(آواز۔ منیر حسین، رتن کمار پر فلمایا گیا)

☆دن ڈھلے جی جلے
تم نہ آئے شام ہوئی
(آواز۔ مالا)

☆تم بڑے وہ ہو
تمہیں کاٹ کے ٹکڑے کر دوں
(آواز۔ مالا، پکچرائزیشن نیلو)

☆ذرا ٹھہرو، تھم جاؤ
یاد رکھنا تم میری بات رے
دیکھو سلام لیتے جاؤ
(آواز۔ نذیر بیگم، نیلو پر فلم بند ہوا)

☆پیار کرو گے پچھتاؤ گے
دھوکا کھاؤ گے
دیکھو دل نہ لگانا
(آواز۔ نسیم بیگم، پکچرائز نغمہ پر ہوا)

فلم ''بارات'' کے بعد نیلو اور رتن کمار کسی اور فلم میں یکجا نہیں ہوئے۔ دوستو! قابل ذکر بات یہ ہے کہ رتن کمار حقیقی زندگی میں بھی نیلو کے گھر بارات لانے کے خواہش مند تھے۔ ایک ساتھ رومانوی کردار ادا کرتے کرتے ان کے دل میں اپنی ساتھی اداکارہ کی چاہت پیدا ہو گئی تھی۔ ہدایت کار وزیر علی بھی اپنے بھائی رتن کمار (اصل نام سید نذیر علی) کی شادی نیلو سے کرانے کے حق میں تھے لیکن نیلو کے والدین نے بدلے میں رتن کمار کی بہن کا رشتہ نیلو کے بھائی انور الیگزینڈر سے کرانے کی شرط رکھی۔ جو سادات خاندان سے نسبت رکھنے کی بنا پر وزیر علی اور نذیر علی (رتن کمار) کے گھرانے کو قبول نہیں تھی۔ یوں نیلو اور رتن کمار حقیقی زندگی میں یکجا نہ ہو سکے۔ اداکار درپن کے ساتھ بھی نیلو کا افیئر چلا تھا لیکن درپن نے نیر سلطانہ کو جیون ساتھی بنا لیا۔ دوستو! آپ نے بھی سنا ہوگا کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ کاتب تقدیر نے نیلو کا جوڑ ار یاض شاہد کے ساتھ بنایا تھا۔ لہٰذا وہ وقت بھی آ گیا جب نیلو کو، درپن اور رتن کمار سے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کہیں بہتر اور بڑی شخصیت ریاض شاہد کی حقیقی ہیروئن بنا دیا جبکہ نیلو کی بہن کی شادی معروف عکاس بابر بلال سے انجام پائی۔

1964ء میں جعفر شاہ بخاری کی فلم ''شیر دی بچی'' کے ٹائٹل پر بطور پیش کار ریاض شاہد کا نام درج ہوا اور ان کے بھائی فیاض شیخ نے فلم کی کہانی اور مکالمے تحریر کیے جبکہ ''شیر دی بچی'' کے مرکزی کردار میں نیلو نے محمد علی کی ہیروئن کا کردار کیا۔ یاد رہے کہ یہ محمد علی کی بطور ہیرو پہلی پنجابی فلم تھی۔ اس فلم میں سلیم رضا اور مالا بیگم کی آوازوں میں محمد علی اور نیلو پر یہ پنجابی ڈوئٹ سونگ بھی فلمایا گیا۔

☆ چٹکی ممیں کھٹ پٹ
پا نہ تجھے اے وٹ

جبکہ فلم کے تھیم سونگ کے بول تھے

☆ لک چھپ رہنا تے لک کے نہ بہنا
شیر دی بچی آئی جے آجا آجا
(آواز۔ آئرن پروین، نذیر بیگم)

یہ وہ دور تھا جب نیلو اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کی فلموں میں یکساں طور پر مقبول تھیں۔ لالہ سدھیر کی ہیروئن بن کر نیلو نے پنجابی سپرہٹ فلم ''ڈاچی'' کے نغمات کی پکچرائزیشن میں فنی مہارت ثابت کی جبکہ اکمل کے ساتھ اس کی جوڑی ''میرا ماہی'' میں پسند کی گئی۔ اس فلم کے گانے بھی مقبول ہوئے۔ ایک اور پنجابی فلم ''جگنی'' میں نیلو یوسف خان کے ساتھ پیش ہوئیں۔ ان پنجابی فلموں کے ڈائریکٹر بالترتیب اسلم ایرانی، ایم جے رانا اور شفیع اعجاز تھے۔

1964ء میں نیلو کی ہیروئن کی کردار نگاری سے آراستہ فلموں میں اقبال یوسف کی ''نہلے پہ دہلا'' (ہیرو کمال) اشفاق ملک کی فلم ''گہرا داغ'' (ہیرو اعجاز) عزیز میرٹھی کی فلم ''خیبر پاس'' (ہیرو لالہ سدھیر) اور رضا میر کی بطور ہدایت کار پہلی فلم ''بیٹی'' (ہیرو اعجاز) شامل تھیں۔ فلم ''گہرا داغ'' میں نیلو پر فلمبند یہ گانا بہت پاپولر ہوا تھا۔

☆ آج ان پر ہمیں پیار آیا
جن سے چلتے تھے دامن بچا کر
آنکھوں آنکھوں میں ظالم نے پوچھا
میں نے ہاں کہہ دیا مسکرا کر

فلم ''گہرا داغ'' میں ہی مہدی حسن کا گایا ہوا نغمہ اعجاز پر عکسبند ہوا۔

☆ گر تم حسین نہ ہوتے ہم مہرباں نہ ہوتے

زندگی نامہ

خاندانی نام۔ والدین کا رکھا ہوا نام شیخ محمد ریاض تھا

فلمی نام۔ ریاض شاہد

پیدائش۔ 27 اپریل 1929ء

مقام پیدائش۔ لاہور

تعلیم۔ سینٹرل ماڈل ہائی اسکول بھاٹی گیٹ لاہور سے میٹرک پاس کیا اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور سے گریجویشن کیا۔

عملی زندگی کا آغاز۔ صحافت کے شعبے سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ روزنامہ مغربی پاکستان لاہور سے بھی منسلک رہے۔

فلمی کیریئر کا آغاز

سید جعفر شاہ بخاری کی فلم ''بھروسا'' سے فلم رائٹنگ کا آغاز کیا۔ اس کی کہانی اور مکالمے لکھے۔ فلم ہٹ ہوئی اور بطور کہانی نویس اور مکالمہ نگار وہ بھی ہٹ ہوگئے ''بھروسا'' 2 اگست 1958ء کو ریلیز ہوئی تھی۔

فلمی کیریئر

فلمی زندگی 15 برسوں پر محیط رہی۔ 1958ء سے 1972ء تک مسلسل کہانی نویس، مکالمہ نگار، فلمساز، ہدایت کار اور نغمہ نگار کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، 30 فلموں کی کہانیاں تحریر کیں، فلموں کی ہدایت کاری کی، اپنی فلموں کے علاوہ دوسروں کی کچھ فلموں کے لیے گیت بھی لکھے۔

آخری فلم

آخری فلم ان کی ذاتی فلم ''بہشت'' تھی جس کی آدھی فلم بندی ہی وہ کرا سکے تھے۔ ان کی بیماری اور وفات کے بعد حسن طارق نے یہ فلم مکمل کی۔ مکمل فلم کی حیثیت سے ان کی آخری فلم ''یہ امن'' تھی۔ اس فلم کے ساتھ سنسر بورڈ نے جو زیادتی کی اسی کے صدمے میں بیمار ہوئے اور جانبر نہ ہو سکے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

سرکار چپ نہ ہوتے جو قدر داں نہ ہوتے

رضا میر کی فلم ''بیٹی'' اور اشفاق ملک کی فلم ''گہرا داغ'' میں نیلو کی اداکاری کی بہت تعریف کی گئی۔ 1965ء کی پہلی فلم ہدایت کار ایم جاوٹ کی فلم ''فریب'' تھی جس میں نیلو کے ہیرو حبیب تھے ان دونوں پر مالا اور احمد رشدی کا یہ ڈوئٹ نہایت خوبصورتی سے فلمایا گیا تھا۔

☆ کہتا ہے دل تم میرے ہو صنم
تمہارے ہی رہیں گے تمہارے ہیں ہم

اس فلم میں نور جہاں کا گایا ہوا گیت۔

☆ مقدر سے گلہ ہے نہ شکوہ زمانے سے

بھی پسند کیا گیا تھا۔ یہ فلم ''فریب'' ناکام ہوگئی۔ اس سال کی دوسری فلم ''رقاصہ'' تھی کمزور ڈائریکشن کی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکی حالانکہ اس دور میں ''رقاصہ'' کے مرکزی کردار میں نیلو سے بڑھ کر کوئی اداکارہ نہ تھی۔ ''رقاصہ'' کے ہدایت کار اشرف خان تھے اور ہیرو یوسف خان۔ ان دونوں فلموں کی ناکامی کے اثر کو مبارک فلمز کی پنجابی فلم ''جی دار'' نے اے کلاس بزنس کرکے زائل کردیا۔ ہدایت کار ایم جے رانا کی اس سپرہٹ فلم کا مرکزی کردار لالہ سدھیر نے بھرپور انداز میں نبھایا۔ سدھیر کی ہیروئن شیریں تھیں جبکہ نیلو کا رومانٹک پیئر حبیب کے ساتھ بنایا گیا تھا اس فلم کے گانے بھی پسند کیے گئے تھے۔

دوستو! اب ذکر اس دور کا جب نیلو کی زندگی میں انقلابی تبدیلی آئی اور اس نے اپنے حقیقی محبوب کی خواہش پر انتہائی سنگین قدم اٹھایا۔ یہ سن 65ء کا سال تھا جب ایوب خان پاکستان کے حکمران تھے۔ یوں ہوا کہ 1965ء میں اس وقت کے ایرانی شہنشاہ رضا شاہ پہلوی پاکستان کے سرکاری دورے پر آئے تو پنجاب کے ناظم اعلیٰ نواب آف کالا باغ نے شہنشاہ کے اعزاز میں ایک جشن کا اہتمام کیا۔ اس میں رقص و موسیقی کا بھی پروگرام شامل تھا۔ اس وقت کی ٹاپ اداکارہ نیلو کو بھی حکم نامہ ملا کہ تمہیں بھی اس جشن میں شریک ہوکر رقص کرنا ہوگا۔

اس حکم نامہ کی خبر ریاض شاہد کو ہوئی تو انہوں نے نیلو کے پاس جاکر پوچھا۔ ''کیا یہ خبر سچ ہے کہ تمہیں سرکاری طور پر کوئی حکم نامہ ملا ہے جس میں تم کو سرکاری مہمان کے سامنے رقص کرنے کا حکم دیا گیا ہے؟''

''ہاں۔ یہ سچ ہے۔ مجھے نواب صاحب آف کالا باغ کے حوالے سے ایسا حکم نامہ ملا ہے۔''

''کیا تم اس جشن میں شریک ہوگی؟'' اور شہنشاہ کے سامنے ناچوگی؟''

نیلو ذرا دیر خاموش رہیں پھر ریاض شاہد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''میرا فیصلہ تمہارے حکم پر منحصر ہوگا۔ تم جو فیصلہ کروگے وہی میرا فیصلہ ہوگا۔''

ریاض شاہد کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ ''تم انکار کردو۔ کچھ بھی ہوجائے تم اس شہنشاہ کے سامنے رقص نہیں کروگی۔''

''بالکل ایسا ہی ہوگا۔ تم اطمینان رکھو۔''

اور نیلو نے ایسا ہی کیا۔ خبر بھجوادی۔ ''میں اس جشن میں رقص نہیں کروں گی۔''

یہ بہت بڑی نافرمانی تھی۔ حکمرانوں کو طیش آگیا۔ اسے مطلع کیا گیا۔ ''تم خود نہیں آؤ گی، تو ہم تمہیں اٹھا کر لے آئیں گے اور ہر حال میں تمہیں ناچنے پر مجبور کریں گے۔''

مگر سرکاری ہرکارے اس کوشش میں بھی ناکام ثابت ہوئے۔ جب وہ نیلو کو اٹھا کر لے جانے کے لیے آئے تو انہیں معلوم ہوا کہ نیلو اس وقت اسپتال میں ہے اور موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس نے ڈھیر ساری خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی ہے۔ سرکاری ہرکاروں نے اسپتال جاکر اس بات کی تصدیق کی۔ نیلو واقعی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھیں۔ ڈاکٹر ان کی جان بچانے کی کوشش کررہے تھے۔

یہ خبر اگلے روز کے تمام اخباروں میں نمایاں طور پر چھپی تھی کہ اداکارہ نیلو نے نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ساری تفصیل درج تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ ڈاکٹروں کی انتھک کوششوں سے ان کی جان بچ گئی ہے۔

اور لوگوں کی طرح جب نامور شاعر حبیب جالب نے بھی یہ خبر پڑھی تو اس سے متاثر ہوکر ایک نظم لکھی۔

تو کہ ناواقفِ آدابِ شہنشاہی ہے
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

اسی نظم کو ریاض شاہد نے تھوڑی تبدیلی کے بعد اپنی شہرۂ آفاق فلم ''زرقا'' میں بھی شامل کیا ہے۔ جس کی فلمبندی نیلو پر ہوئی ہے۔ تبدیل شدہ نظم یوں ہے

تو کہ ناواقفِ آدابِ غلامی ہے ابھی
سرکاری حکم پر رقص نہ کرنے کی ''نافرمانی'' نیلو نے

WaqarAzeem
Pakistanipoint

اس وقت کی تھی جب ریاض شاہد اور نیلو ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ چاہت کی ڈور میں بندھ چکے تھے مگر دو بولیوں کے بندھن میں نہیں بندھے تھے۔ ''زرقا'' اس وقت بنی تھی جب دونوں ایک دوجے کے شریکِ حیات بن چکے تھے۔

1966ء میں نیلو کی فلموں میں اضافہ ہوا۔ محمد علی کے ساتھ فلم ''نغمہ صحرا''۔ اعجاز کے مقابل ''بدنام'' اور درپن کے ہمراہ فلم ''جھنکار'' اردو فلمیں تھیں۔ ''جھنکار'' قبل ازیں ''پائل کی جھنکار'' کے نام سے پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔ اس فلم میں قتیل شفائی نے نیلو کے حسن و جمال کے پیشِ نظر یہ غزل تحریر کی جسے گلوکار سلیم رضا نے موسیقار رشید عطرے کی بنائی ہوئی طرز پر بڑے رچاؤ سے گا کر امر سنگیت کا حصہ بنایا۔

☆حسن کو چاند جوانی کو کنول کہتے ہیں
ان کی صورت نظر آئے تو غزل کہتے ہیں

اس غزل کے علاوہ اس فلم میں نیلو اور درپن پر ایک ڈوئٹ اور ایک سولو گیت بھی مقبول عام ہوئے۔ ڈوئٹ کے بول تھے۔

☆ہم نے تو تمہیں دل دے ہی دیا
اب تم یہ بتاؤ کیا دو گے

سولو گیت کے بول تھے۔

☆میرے دل کے تار بجیں بار بار
ہو اتم سے پیار آجا

فلم ''بدنام'' میں اہم ترین کردار نیلہ اور علاؤالدین کے تھے۔ جبکہ نیلو نے ان کی بیٹی اور اعجاز کی ہیروئن کا رول کیا تھا، اس پر گیت فلمائے گئے تھے۔

☆کان میں جھمکا ڈالے
چپکے سے کچھ بولے
سوچوں تو شرماؤں
(یہ سولو گیت تھا)

☆اک اور بات مانی
اک اور زخم کھایا
خود ہم نے اپنے ہاتھوں
(یہ ڈوئٹ سانگ تھا)

نیلو نے ان تینوں فلموں ''نغمہ صحرا''، ''بدنام'' اور ''جھنکار'' میں بطور ہیروئن مختلف انداز کے کردار بڑے اچھے انداز میں ادا کر کے اپنی نئی صلاحیتوں کا ثبوت دیا تھا۔

1966ء کی پنجابی فلموں میں ''مسٹر اللہ دتہ''، ''چلل خور''، ''ان پڑھ''، ''نظام لوہار''، ''لاڈو'' اور ''ابا جی'' میں سے فلم ''لاڈو'' میں نیلو کا کردار سب سے جاندار تھا۔ اس فلم کی ہدایات شریف نیر نے انجام دی تھیں۔ ''لاڈو'' کے مرکزی کردار میں نیلو کی کردار نگاری سب سے بھاری تھی۔ ماضی کی اداکارہ یاسمین نے بھی اس فلم میں ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ یاسمین پر فلمبند نغمہ

☆شکر دوپہر پیلی دے تھلے
میں چھنکاریاں ونگلاں
☆ڈنگ پیار دا سینے تے کھا کے
ہنجو پلکاں دے وچ لگا کے چپ رہیے

فلم ''مسٹر اللہ دتہ''، ''نظام لوہار'' اور ''ان پڑھ'' کے مرکزی کردار علاؤالدین کے پاس تھے۔ ریاض شاہد کے

فلمیں

ریاض شاہد کی مقبول اور مشہور فلموں میں بھروسا، نین، کلرک، ڈاکو کی لڑکی، شہید، سسرال، قانون، شکوہ، خاموش رہو، فرنگی رواج، مجاہد، آگ کا دریا، باغی سردار، بدنام، شعلہ اور شبنم، گناہگار، مفرور، دوسری شادی، میں زندہ ہوں، زرقا، غرناطہ، خاک اور خون، زخمی سماج، حیدر علی، بہشت اور امن ان کے ذہن اور قلم سے نکلے فن پارے تھے۔ انہوں نے اپنے فنی کیریئر میں کبھی کوئی فارمولا اور بے مقصد فلم نہیں بنائی۔

ایوارڈز

انہیں بہترین مصنف، بہترین مکالمہ نگار اور بہترین ہدایت کار کے جتنے ایوارڈ ملے وہ آج تک کسی اور تخلیق کار کو نہیں ملے۔

ان کا المیہ

ان کا المیہ یہ رہا کہ کسی بھی دور کی حکومت نے ان کی فلموں کی سرکاری سطح پر پذیرائی نہیں کی۔

وفات

بلڈ کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر جان کی بازی ہار گئے۔ یکم اکتوبر 1972ء کو اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ موت کے وقت ان کی عمر 55 برس تھی، دن اتوار کا تھا، لاہور کے پیر مکی قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

بینر تلے بنائی گئی تاریخی موضوع کی فلم ''نظام لوہار'' کی ڈائریکشن جمیل اختر نے دی تھی۔ اس فلم کے علاوہ ریاض شاہد کی بطور ہدایت کار دلچسپ پنجابی فلم ''مسٹر اللہ دتہ'' میں بھی نیلو نے ہیروئن کا کردار خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ حیدر چوہدری کی فلم ''ان پڑھ'' میں یوسف خان، خواجہ ریاض کی فلم ''چغل خور'' میں اکمل اور ایم جے رانا کی فلم ''اباجی'' میں لالہ سدھیر نے نیلو کے مقابل ہیرو کا رول کیے تھے۔

نیلو کی کامیابی کا سفر 1967ء میں بھی برقرار رہا۔ علاؤالدین کے بھائی ہدایت کار ریاض احمد راجو کی فلم ''دل داجانی'' میں نیلو کے ہیرو حبیب تھے۔ یہ فلم بے حد کامیاب رہی۔ ہدایت کار ایم جے رانا نے بھی اسی سال اپنی دو فلموں ''یار مار'' اور ''راوی پار'' میں نیلو اور حبیب کی جوڑی کا انتخاب کیا۔ اسی 1967ء میں ہدایت کار لقمان کی فلم ''دوہٹی'' کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ کامیڈین لہری کی غالباً پہلی پنجابی فلم تھی۔ اردو فلموں میں ''شام سویرا'' بھی کامیاب نہ ہوسکی۔ اس فلم میں نیلو کے ہیرو درپن اور صابرہ سلطانہ کے ہیرو عنایت حسین بھٹی تھے۔ فلم کی ڈائریکشن عنایت حسین بھٹی کے برادر نسبتی سعید اشرفی نے دی تھی۔ فلم ''شام سویرا'' میں درپن پر فلمبند مہدی حسن کا گایا ہوا یہ گیت کافی مقبول ہوا تھا۔

☆اک بے وفا نے داغ تمنا دیا مجھے

1967ء میں نیلو اور لالہ سدھیر کی اردو فلم ''چٹان'' پسند کی گئی۔ فلمساز وہدایت کار عاشق بھٹی کی اس فلم میں اسلم پرویز نے ڈبل رول کیا تھا۔ ایک کردار میں وہ ولن تھے اور دوسرے کردار میں ان کا پیئر دیبا کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ فلم ''چٹان'' کے لیے مالا کا گایا ہوا شادی بیاہ کا یہ گیت مقبول عام ہوا۔

گوری کر کے ہار سنگھار
ہو جا چلنے کو تیار
سجن تجھے لینے آئے

60ء کی دہائی میں جن فنکاروں کی شہرت کا ڈنکا بج رہا تھا ان میں نیلو کے علاوہ فردوس، نغمہ، دیبا، زیبا، شبنم، رانی، شمیم آرا، سلونی اور شبانہ جیسی ٹاپ کلاس ہیروئنیں شامل تھیں۔ 1968ء میں نیلو نے ایم جے رانا کی پنجابی فلم ''جگ بیتی'' میں سدھیر کی ہیروئن کا رول کیا تھا۔ یہ میلوڈی کوئن رونا لیلیٰ کی پہلی پنجابی فلم تھی۔ جس میں اس کا گایا ہوا نغمہ

☆ماہیا وے بنگلہ پھوادے

نیلو پر ہی فلمایا گیا تھا۔ اس سال نیلو کی تین اردو فلمیں منظر عام پر آئیں۔ اتفاق سے تینوں فلموں میں ان کی جوڑی محمد علی کے ساتھ رکھی گئی تھی۔ ہدایت کار عزیز میرٹھی کی فلم ''پرستان'' اور ''لالہ رخ'' کاسٹیوم موویز تھیں جبکہ ہدایت کار جمیل اختر کی فلم ''کرشمہ'' تجسس آمیز مووی تھی۔ ان فلموں کے یہ گیت بہت پسند کیے گئے۔

☆محبت کے دم سے یہ دنیا حسین ہے
محبت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے
(فلم۔ پرستان)

☆دل بہت اداس ہے
غبار گزرے وقت کا
نظر کے آس پاس ہے
(فلم۔ پرستان)

☆خاموش ہوا ہے چا، چا، چا
مدہوش فضا ہے چا، چا، چا
(فلم کرشمہ)

☆اک مدت سے دیوانہ دل
خوشیوں کا زمانہ بھول گیا
(فلم۔ کرشمہ)

1969ء میں نیلو کی ریلیز ہونے والی پہلی فلم ''اوکھا جٹ'' میں ہیرو کا رول سدھیر نے کیا تھا۔ ہدایت کار ایم جے رانا کی یہ فلم اوسط درجے کی رہی۔ اسی سال 17 اکتوبر کو ریاض شاہد کی بے مثال فلم ''زرقا'' کی صورت میں سلور اسکرین کی زینت بنی۔ اس فلم نے ریکارڈ بزنس کیا۔ اس نے سو ہفتے مکمل کر کے پاکستان کی پہلی ڈائمنڈ جوبلی فلم کا اعزاز حاصل کیا۔ اعجاز فلم کے روایتی ہیرو تھے۔ ان کے ساتھ نیلو کا پیئر پہلے ہی متعدد فلموں میں پسند کیا جاچکا تھا۔ ''زرقا'' بلاشبہ نیلو کی زندگی کی بہترین فلم تھی اس کی اعلیٰ پرفارمنس کی بنا پر انہیں بہترین اداکارہ کا نگار ایوارڈ دیا گیا۔ جبکہ ''زرقا'' میں علاؤالدین اور طالش نے بھی اہم ترین کردار ادا کیے تھے۔ نیلو کی نئی زندگی کی سب سے بڑی فلم کا کریڈٹ ان کے شریک حیات ریاض شاہد کو دیا جائے گا کہ انہوں نے نیلو کی صلاحیتوں کو پیش نظر رکھ کر اتنی اہم اور بین الاقوامی نوعیت کی کہانی لکھی اور نیلو نے بھی فلسطینی دوشیزہ زرقا کے کردار کو امر کرنے کے لیے اپنی تمام تر فنی صلاحیتوں

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کا بھرپور مظاہرہ کیا اور ان دونوں کو ان کی کاوشوں کا انعام ملا۔ اس فلم کے تمام شعبوں سے متعلق کارکنوں نے بہترین کارکردگی کا ثبوت دیا۔ موسیقی کے شعبے نے بھی ''زرقا'' کی کامیابی میں اپنا حصہ ڈالا۔ اس سپر کلاسک فلم کے نغمات کے بول ملاحظہ کیجئے۔

☆ میں پھول بیچنے آئی
میں توڑ کے بلبل کا دل
خوشبو بازاروں میں لائی
(آواز۔ نسیم بیگم، پکچرائزیشن نیلو)

☆ تو کہ ناواقف آداب غلامی ہے ابھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے
(آواز۔ مہدی حسن، اعجاز، نیلو اور طالش پر فلمایا گیا)

☆ واللہ بخدا میرا دل تھا بے قرار
تھا تمہارا انتظار
(آوازیں۔ نسیم بیگم، منیر حسین، نیلو اور اعجاز پر پکچرائز ہوا)

☆ جلتی ہوئی آگ کو شمع بنا کے رقص کرے پروانہ
(آوازیں۔ مالا، منیر حسین)

☆ یا حبیبی یا خلیلی قیس ہے تو، تو ہے صحرا
(آواز۔ نسیم بیگم)

☆ اے غم جہان ناچ
خلق بے زبان ناچ
(آوازیں۔ مالا، منیر حسین، نیلو اور اعجاز پر عکس بند ہوا)

☆ اے فلسطین ہمیں یقین ہے
ڈھلے گی اک دن ستم کی یہ شام
(آوازیں۔ نسیم بیگم، منیر حسین اور ساتھی۔ کورس سانگ)

''زرقا'' کی تخلیق کا دونوں میاں بیوی (ریاض شاہد اور نیلو) پر اتنا خوشگوار اور مثبت اثر ہوا کہ اس فلم کی تکمیل کے بعد جب ان کی پہلی بیٹی پیدا ہوئی تو انہوں نے اس کا نام زرقا رکھا اور پھر جب دوسری اولاد بیٹے کے روپ میں ان کے گھر آنگن کی رونق بنی تو اس کا نام انہوں نے اعجاز شاہد رکھا۔ ''زرقا'' کے ہیرو اعجاز کے نام پر بیٹے کا نام رکھا۔ اعجاز شاہد، شان کے بڑے بھائی کا نام ہے۔ اعجاز شاہد نے بھی کئی فلموں میں اداکاری کی ہے مگر اپنے حقیقی نام کی بجائے سروش کے فلمی نام سے اداکاری کی ہے۔ اس کی فلموں میں ''پیار ہی پیار''، ''جان'' اور ''دنیا دس نمبری'' قابلِ ذکر ہیں۔ سروش سے پہلے ان کے چھوٹے بھائی شان نے فلم ''بلندی'' سے فلم انڈسٹری میں بطور ہیرو قدم رکھا اور کامیابی حاصل کی۔ یاد رہے کہ شان کا اصل نام ارسلان ہے جو 1971ء میں پیدا ہوئے تھے۔

''زرقا'' کے بعد نیلو نے فلم انڈسٹری سے کنارہ کشی اختیار کر کے خود کو گھر گرہستی میں مصروف کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ریاض شاہد نے اپنی فلم ''غرناطہ'' کے لیے روزینہ اور آسیہ کو کاسٹ کیا تھا۔ جبکہ ''پرامن'' اور ''بہشت'' کے لیے نشو کا انتخاب کیا تھا۔ یاد رہے کہ فلم ''غرناطہ'' 21 مئی 1971ء اور ''یہ امن'' 20 نومبر 1971ء کو نمائش پذیر ہوئی تھیں اس کے بعد ریاض شاہد سرطان کے مہلک مرض میں مبتلا ہو گئے تھے اور یکم اکتوبر 1972ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ ''پرامن'' اور ''بہشت'' کے ٹائٹل پر بطور فلمساز عابدہ ریاض کا نام درج کیا گیا تھا۔ جب نیلو اسلام قبول کر کے ریاض شاہد کی زوجیت میں آئیں تو ان کا اسلامی نام عابدہ ریاض رکھا گیا تھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

شوہر کی وفات حسرت آیات کے بعد نیلو کے لیے سب سے بڑا امتحان ان کے تین بچوں کی پرورش و پرداخت تھی۔ ریاض شاہد نے کوئی جمع پونجی نہیں چھوڑی تھی جو کچھ تھا وہ ان کے علاج میں خرچ ہو گیا تھا اس لیے نیلو نے یہی فیصلہ کیا کہ انہیں ایک بار پھر فلموں سے ناطہ جوڑنا پڑے گا۔ لہٰذا ریاض شاہد کے انتقال کے تین سال بعد انہوں نے ایک بار پھر فلمی دنیا میں قدم رکھ دیا۔ اس دور کی ان کی پہلی ریلیز ہونے والی فلم ''خطرناک'' تھی۔ جس نے کراچی سرکٹ میں ڈائمنڈ جوبلی کا اعزاز حاصل کیا۔ عجیب اتفاق تھا کہ نیلو کی آخری فلم ''زرقا'' نے بھی اسی کراچی میں 100 ہفتے مکمل کیے تھے اور دوسرے دور کی پہلی فلم ''خطرناک'' نے بھی اسی شہر میں 100 ہفتے مکمل کر کے ڈائمنڈ جوبلی کامیابی حاصل کی۔ رحمت علی خطرناک کے ہدایت کار اور یوسف خان ہیرو تھے۔ یہ فلم اگست 1974ء کو ریلیز ہوئی تھی مگر دونوں فلموں میں آسمان زمین کا فرق تھا۔ ''زرقا'' ایک اعلیٰ مقصد کے لیے بنائی گئی تھی جبکہ ''خطرناک'' ایک ناپاک مقصد کے حصول کے لیے بنائی گئی تھی۔ عریانی اور فحاشی کو پروموٹ کرنے کے لیے اس فلم کا سہارا لیا گیا تھا۔ نیلو کی جسمانی کشش اور دل فریبی کا سہارا

لے کر تماشائیوں کے سفلی جذبات کو مشتعل کر کے ان کی جیبوں پر ڈاکا ڈالنے کی مذموم کوشش کی گئی تھی۔ جس میں توقعات سے بڑھ کر کامیابی حاصل ہوئی۔ اس موقع پر ریاض شاہد مرحوم کے جو چاہنے والے تھے انہیں بڑا دکھ ہوا تھا۔ نیلو کی دوسری فلم ہدایت کار جعفر شاہ بخاری کی اردو فلم ''عزت'' تھی جس میں ان کے ہیرو وحید مراد تھے جو 10 جنوری 1975ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی۔ نیلو کے کیریئر کے دوسرے دور کی اس فلم ''عزت'' کا یہ گیت بے حد مقبول ہوا تھا۔

ہزار بار منع کیا
میری گلی نہ سیاں آنا
ہزار بار منع کیا
(یہ گیت سنگیتا پر فلمایا گیا تھا)
نیلو پر فلمائے گئے یہ نغمے بھی پاپولر ہوئے تھے۔
☆ اچانک تم سے محبت ہوگئی
دل میرا کھو گیا
(آواز۔ روبینہ بدر)
☆ ساتھی نہ چھوڑوں دامن تیرا
یہ ہے میرا فیصلہ
(آوازیں۔ روبینہ بدر، احمد رشدی)
1975ء میں اردو فلم ''عزت'' کے بعد نیلو کی بطور ہیروئن پنجابی فلموں کی لائن لگ گئی۔ گلوکارہ ناہید اختر کی پہلی پنجابی فلم ''پیراں پھمن'' ہدایت کار نسیم حیدر نے بنائی تھی۔ اس میں نیلو کے ہیرو اقبال حسن تھے۔ نامور ہدایت کار ایم جے رانا نے نیلو کو اپنی فلم ''سر دا بدلہ'' ریاض احمد راجو نے اپنی فلم ''دھن جگر اساں دا'' اور ہدایت کار مظفر طاہر نے اپنی فلم ''سلطانہ ڈاکو'' میں لالہ سدھیر کی ہیروئن بنایا۔ ان فلموں میں نیلو پر پکچرائز کیے گئے یہ گیت مقبول ہوئے۔
☆ اک درشن کرنا سجناں دا
دیوانی پھر دی گلی گلی
(آواز۔ نور جہاں، فلم سر دا بدلہ)
☆ کراں میں پیار لکھ لکھ وار میرے دل دی
(آواز۔ نور جہاں، فلم دھن جگر اماں دا)
پرانی بلیک اینڈ وائٹ فلم ''پاٹے خان'' کو 1975ء میں ''میراناں پاٹے خاں'' کے نام سے ری میک کیا گیا۔ ہدایت کار مسعود پرویز کی اس فلم میں نیلو کے ہیرو شاہد بنے جبکہ بابر شریف کا پیئر منور ظریف کے ساتھ بنا۔ ہدایت کار ایم اکرم کی فلم ''وطن ایمان'' اور خواجہ سرفراز کی فلم ''اتھرا'' میں یوسف خان اور نیلو کی جوڑی بنائی گئی۔ ان فلموں میں ''اتھرا'' کو کامیابی نصیب ہوئی۔ فلم ''ہیرا پھمن'' کے بعد ہدایت کار نسیم حیدر شاہ کی اگلی فلم ''رجو'' میں بھی نیلو کے ٹائٹل رول کے مقابل اقبال حسن ہیرو بنے۔ ایم سلیم کی تاریخی موضوع پر مبنی فلم ''بلونت کور'' میں نیلو نے ایک مجاہدہ کے کردار کو بخوبی ادا کیا۔ اس کے دیگر ستاروں میں شاہد، سنگیتا، کویتا، سلطان راہی، طارق عزیز، نمو، سلمیٰ ممتاز، زاہد خان، ادیب اور ریحان نمایاں تھے۔ ہدایت کار داؤد بٹ نے اپنی اوّلین فلم ''جیلر کے قیدی'' میں نیلو کو ہیروئن لیا یہ فلم کامیاب ہوئی۔ اقبال حسن، سلطان راہی، یوسف خان، سلیم حسن، صبا، سیما، مسرت شاہین، چنگیزی اور الیاس کاشمیری بھی اس فلم کی کاسٹ کا حصہ تھے۔ 1976ء میں نیلو کی 9 فلمیں نمائش پذیر ہوئیں۔ یہ سب پنجابی زبان کی فلمیں تھیں۔ ہدایت کار رحمت علی کی فلم ''خوفناک'' میں نیلو منور ظریف کی ہیروئن بنی۔ منور ظریف کا اس فلم میں ڈبل رول تھا۔ اسی فلم کے ایک مختصر کردار میں پیش ہو کر نامور اداکارہ انجمن نے سلور اسکرین پر پہلی انٹری دی تھی۔ اس کے بعد وہ اردو فلم ''وعدے کی زنجیر'' میں ہیروئن کی حیثیت سے روشناس کرائی گئی تھی۔ ہدایت کار اقبال کشمیری کی فلم ''عیاش'' کا ٹائٹل الیاس کشمیری نے ادا کیا تھا جبکہ نیلو کے ہمراہ یوسف خان ہیرو بنے تھے۔ ظہور حسین گیلانی کی فلم ''پنڈی وال'' میں سلطان راہی نے نیلو کے مقابل مرکزی کردار کیا تھا۔ یہ فلم کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھی۔ سنگیتا، شاہد، اسد بخاری اور سلطان راہی بھی اس فلم کی کاسٹ میں شامل تھے۔ سدھیر ہی کے ساتھ نیلو اپنے بہنوئی بابر بلال کی ذاتی فلم ''یارانہ'' میں ہیروئن تھیں۔ ''یارانہ'' کی ڈائریکشن اقبال کشمیری نے انجام دی تھی۔ اس فلم کا سیکنڈ پیئر خانم اور شاہد کا تھا جبکہ نیر سلطانہ نے ماں کے کردار میں اثر انگیز جذباتی پرفارمنس دی تھی۔ لالہ سدھیر اور نیلو کی جوڑی ایک اور فلم ''مغرور'' میں بھی جلوہ گر ہوئی۔ اس بلیک اینڈ وائٹ فلم کے ہدایت کار اعزاز سید تھے۔ اسی سال ہدایت کار حفیظ احمد کی فلم ''گنگو پتر ماں دا'' منظر عام پر آئی۔ نسیم حیدر شاہ نے نیلو کے ساتھ منور ظریف کو لے کر فلم ''کل کل میراناں'' بنائی مگر یہ فلم نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ اسی سال سید کمال کی پہلی پنجابی پروڈکشن ''جٹ کڑیاں توں ڈردا'' نے شاندار بزنس کے ساتھ گولڈن جوبلی منائی۔ اس فلم میں

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کمال کی تین ہیروئن نیلو، نشو اور نجمہ تھیں.....اور فلم کی کہانی کے مطابق کمال کی تینوں سے شادی ہوئی ہے۔ اس دلچسپ فلم میں نیلو نے گاؤں کی دوشیزہ، نجمہ نے شہر کی امیر زادی اور نشو نے طوائف کا رول کیا تھا۔ اداکار کمال نے اپنی اس فلم کی ڈائریکشن خود دی تھی۔ فلم ''جٹ کڑیاں توں ڈردا'' کے ٹائٹل سانگ

☆ جٹ کڑیاں توں ڈردا غضب ہوگیا

کی پکچرائزیشن نیلو کے حصے میں آئی جبکہ نیلو اور کمال پر فلمبند ڈوئٹ سونگ کے بول یوں تھے

☆ او محبوبہ پیار تیرا
دل تو سوہنیا یار میرا

(آوازیں۔ احمد رشدی، مہناز)

اس فلم کی کامیابی کے بعد سید کمال نے دوسری پنجابی فلم ''اج دیاں کڑیاں'' بنائی۔ یہ فلم 22 نومبر 1977ء کو نمائش پذیر ہوئی۔ اس فلم نے بھی کامیابی حاصل کی۔ ''اج دیاں کڑیاں'' کی کاسٹ میں سید کمال، نیلو، نشو، نجمہ، نمی، نیر سلطانہ، منصور، ساعقہ، نوین تاجک، خانم، بدر منیر اور جمشید انصاری شامل تھے۔ 1977ء میں نیلو کی ریلیز ہونے والی پہلی فلم ہدایت کار داؤد بٹ کی ''ملک زادہ'' تھی۔ اقبال حسن کے ہمراہ نیلو کی اگلی فلم ''تیرا دی جواب نئیں'' کے ہدایت کار رفیق حیدر تھے۔ نیلو اور اقبال حسن کو ہدایت کار داؤد بٹ نے ایک بار پھر اپنی فلم ''ڈنکا'' کے لیے منتخب کیا۔ یہ فلم کامیاب ہوئی، اس فلم میں نیلو پر ناہید اختر کی آواز میں یہ گیت پاپولر ہوا۔

☆ بانکے یار دے اے ویلا نہیں انکار دا
ڈنکا وجے پیار دا

عنایت حسین بھٹی نے بھی اپنی ڈائریکشن میں بنی ہوئی فلم ''صدقے پتری موت توں'' میں نیلو کو ہیروئن لیا۔ 1977ء کی مزید دو فلموں ''جرم میں کیتیا مسی'' اور ''میرے بادشاہ'' میں بھی نیلو نے ہیروئن کا رول کیا تھا۔ پنجابی فلموں میں عموماً ہیرو کے کردار مضبوط ہوتے ہیں تاہم نیلو کو جہاں بھی قدرے جاندار رول ملا انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو منوایا۔

1978ء میں 6 پنجابی فلموں کے ساتھ تین اردو فلمیں بھی نیلو کی کارکردگی سے آراستہ ہوئیں۔ نامور ہدایت کار حسن طارق کی فلم ''ماضی حال مستقبل'' میں نیلو پر ایک آئٹم سونگ پکچرائز کیا گیا جس کے بول تھے۔

جینا سب کی جان ہے تو
تجھ پر یہ دنیا مرتی ہے
(آواز۔ ناہید اختر)

معروف دانشور اور شاعر و افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کے افسانے ''فیشن'' سے ماخوذ کہانی پر مبنی فلم ''نذرانہ'' بھی اسی سال منظر عام پر آئی تھی۔ نذر شباب نے اپنی فلم ''نذرانہ'' میں نیلو اور وحید مراد کا پیئر بنایا تھا۔ ان پر فلمبند ناہید اختر اور مہدی حسن کا یہ ڈوئٹ بے حد مقبول ہوا تھا۔

بانٹ رہا تھا جب خدا سارے جہاں میں نعمتیں
اپنے خدا سے مانگ لی میں نے تیری وفا صنم

تیسری اردو فلم ہدایت کار مجید رانا کی ''انقلاب'' تھی۔ نیلو کے ساتھ محمد علی ہیرو تھے۔

1978ء میں نیلو کی پنجابی فلموں میں ''غنڈہ'' 10 مارچ کو ریلیز ہوئی۔ اس میں نیلو، سلطان راہی، نجمہ، اقبال حسن اور مصطفیٰ قریشی نے کلیدی کردار کیے تھے۔ یہ ہدایت کار مسعود بن اسلم کی فلم تھی۔

''غریب دا بابل'' ہدایت کار عابد شجاع کی فلم تھی۔ مجید ظریف نے اس فلم میں ٹائٹل رول کیا تھا۔ نیلو مجید ظریف کی ہیروئن تھیں۔ یہ فلم کلک نہ کرسکی۔

ہدایت کار زندر حسین نے حساس موضوع پر فلم ''چمن خان'' بنائی جس کی کاسٹ میں نیلو، سلطان راہی، مصطفیٰ قریشی، اقبال حسن، عشرت چوہدری اور نیر سلطانہ شامل تھے۔ اسی سال نیلو ایم اکرم کی فلم ''شریف شہری'' اور ہدایت کار جاوید کی فلم ''ٹیکس'' میں بھی پیش ہوئیں۔ یہ فلم پہلے ''غنڈہ ٹیکس'' کے نام سے شروع ہوئی تھی مگر اسے بدل کر صرف ''ٹیکس'' رکھ دیا گیا۔ اس کی کاسٹ میں نیلو، سلطان راہی، مصطفیٰ قریشی، نجمہ اور اقبال حسن نمایاں تھے جبکہ ''شریف شہری'' میں نیلو کے ہمراہ اقبال حسن، اسد بخاری، اسلم پرویز، بہار، عرفان کھوسٹ، علی اعجاز، نجمہ اور ساون نے کام کیا تھا۔

1979ء میں نیلو کی اداکاری سے مرصع تین فلمیں سینما اسکرین کی زینت بنیں۔ ہدایت کار آصف رحمٰن کی اردو فلم ''موت میری زندگی'' میں نیلو کے ساتھ آصف خان، مصطفیٰ قریشی، ادیب اور صبیحہ خانم نے کردار نگاری کی تھی۔ اس فلم کے یہ دو گیت پسند کیے گئے تھے۔

☆ منزل اگر یہ ہے تو چڑھتے ہی رہیں گے

(آواز۔ مالا)

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

☆چوری چوری سیاں تو نے لکھا میرا نام رے
ڈر ہے ہو نہ جاؤں میں کہیں بدنام رے
(آوازیں۔مہناز، اے نیر)

تاریخی موضوع پر فلم ''جنرل بخت خان'' ہدایت کار سرشار ملک نے بنائی تھی۔اس کی کاسٹ میں سلطان راہی، نیلو، سدھیر، محمد علی، یوسف خان، بدر منیر اور الیاس کشمیری شامل تھے۔اسی سال ہدایت کار ظہور حسین گیلانی نے اپنی پنجابی فلم ''آرڈر'' میں نیلو کے ساتھ سلطان راہی کو مرکزی کردار میں پیش کیا تھا۔

1980 میں نیلو کی ایک اردو ایک پنجابی فلم نمائش پذیر ہوئی۔اردو فلم ''چھوٹے نواب'' ہدایت کار اقبال اختر کی فلم تھی۔اس فلم میں نیلو کے ساتھ وحید مراد اور بابرہ شریف کے ساتھ شاہد کی جوڑی بنائی گئی تھی۔اس فلم میں نذیر علی کی موسیقی تھی۔ان تمام لوازمات کے باوجود یہ فلم اقبال اختر کی دوسری فلموں کی طرح ہٹ نہ ہوسکی۔ درمیانے درجے کی رہی۔

پنجابی فلم ''ہیرا پتھر'' ہاشم خان کی پنجابی فلم تھی۔اقبال حسن اس فلم میں نیلو کے ہیرو تھے۔علی اعجاز، صاعقہ، اسلم پرویز اور بہار بیگم نے نمایاں کردار ادا کیے تھے۔اس فلم نے بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کی تھی۔

1981ء میں نیلو کی کوئی فلم ریلیز نہیں ہوئی۔

1982ء میں ان کی ریلیز ہونے والی فلم ''خطرہ 440'' تھی جس میں نیلو کو بدر منیر کی ہیروئن بنایا گیا تھا۔اس فلم کے ہدایتکار ذکی جرال تھے۔دوسری فلم جو پروگریسو پکچرز بینر تلے بنائی گئی تھی اور فلم ''جعلی ویزا'' تھی۔اس کے پروڈیوسر ساحر قدوائی اور ڈائریکٹر اے ایچ وطنی تھے۔اس فلم میں بھی بدر منیر کے ساتھ نیلو کی جوڑی بنائی گئی تھی۔جبکہ دوسرا پیئر سنگیتا اور غلام محی الدین کا تھا۔اس فلم میں نیلو پر یہ گانا بھی فلمبند ہوا تھا۔

☆کب میں نے چاہا کہ شمع محفل بنوں
''جعلی ویزا'' نیلو کی بطور ہیروئن آخری فلم تھی۔

ہدایت کار حسن طارق کی مقبول فلم ''تہذیب'' سے متاثر ہوکر ہدایت کار الطاف حسین نے 1985ء میں ایک پنجابی فلم ''دھی رانی'' بنائی تھی۔اس فلم میں نیلو نے مغربی تہذیب کی دلدادہ لڑکی کے کردار میں جان ڈال دی تھی۔نیلو پر یہ کورس گیت بھی پکچرائز کیا گیا تھا۔جس میں انجمن اور شاہدہ منی نے بھی حصہ لیا۔گیت کے بول تھے۔

☆ڈسکو دلدار میرا ڈسکو اے پیار میرا
میں ہوں ڈسکو دیوانی

''دھی رانی'' کا ٹائٹل کردار اداکارہ ممتاز نے ادا کیا تھا۔ہیرو علی اعجاز تھے۔یہ فلم بہت کامیاب ہوئی تھی۔

1986ء میں نیلو اداکار محبوب عالم کی سندھی زبان میں بنائی جانے والی فلم ''پوتی ایں پگ'' کی کاسٹ کا حصہ بنیں۔اس فلم میں محبوب عالم نے تین رول کیے تھے۔دیگر ستاروں میں شہباز اکمل، فردوس جمال، ساقی، ادیب، ملک انوکھا، عشرت چوہدری اور مصطفیٰ قریشی شامل تھے۔

1987ء میں ہدایت کار جمشید نقوی کی کو پروڈکشن کے تحت بنائی گئی فلم ''ہم سے نہ ٹکرانا'' میں نیلو نے افضال احمد، جاوید شیخ، انوجہ، بابر خان، ننھا اور بینش کے ساتھ اداکاری کی۔

1989ء میں ہدایت کار نذر الاسلام نے پہلی بار نیلو کی اعلیٰ صلاحیتوں سے فلم ''بارود کی چھاؤں'' میں استفادہ کیا۔اس فلم میں مغربی تہذیب اپنانے والی خاتون کے منفی کردار کو نیلو نے بہترین طریقے سے پورٹرٹ کیا تھا۔وہ فلم کی ہیروئن کویتا کی ماں بنی تھی۔سپر اسٹار ندیم نے ''بارود کی چھاؤں'' میں ہیرو کا کردار کیا۔یہ فلم کامیاب ثابت ہوئی تھی۔

1990ء وہ سال تھا جس میں ماں بیٹے نے ایک ساتھ کسی فلم میں کام کیا تھا اور یہ ماں، بیٹے نیلو اور شان تھے۔نامور ہدایت کار محمد جاوید فاضل نے ایک فلم بنائی تھی جس کا نام انہوں نے ''بلندی'' رکھا تھا۔اس فلم میں انہوں نے ایک نوعمر جوڑی متعارف کرائی تھی۔یہ جوڑی شان اور ریما کی تھی۔دونوں نے اپنی پہلی فلم ہونے کے باوجود اپنی بہترین کردار نگاری کا ثبوت دیا تھا اور جلد ہی فلمی افق کے چمکتے ستارے بن گئے تھے۔''بلندی'' میں ندیم اور ثمینہ پیرزادہ نے شان کے والدین کا رول کیا تھا جبکہ نیلو فلم کی ہیروئن ریما کی ماں کے کردار میں پیش ہوئی تھیں۔

اسی سال شان کی دوسری فلم ''نگینہ'' میں شان کی ماں کا کردار اس کی حقیقی والدہ نیلو نے ہی ادا کیا تھا۔جبکہ ان کے شریک حیات کا کردار عابد علی نے نبھایا تھا۔ڈبل ورژن میں بننے والی فلم ''نگینہ'' کے فلمساز عارف چوہدری اور ہدایت کار الطاف حسین تھے۔

1992ء میں رتن کمار کے بھائی وزیر علی نے بطور فلمساز کو پروڈکشن کے تحت ایک فلم ''ناگن رانی'' کے نام

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

سے پیش کی جس کی ڈائریکشن ایس حمیری کے سپرد تھی۔ پرانی فلم ''ناگن'' کی شہرت کے حوالے سے فلم ''ناگن رانی'' میں بھی نیلو کو کاسٹ کیا گیا تھا جبکہ بنگلہ دیش کے فنکار سینٹر اور الیاس کنچن اس فلم کے ہیرو ہیروئن بنے تھے۔

اسی سال نوآموز ہدایت کار ظفر شریف کی پنجابی فلم ''فتح'' میں نیلو بیگم نے اپنے بیٹے شان کی ماں کا رول ادا کیا۔ اس فلم میں نیلو کی اداکاری بہت جاندار تھی۔ اداکارہ کویتا فلم ''فتح'' میں شان کی ہیروئن کے روپ میں جلوہ گر ہوئی تھی۔ جبکہ کوئٹہ ٹیلی ویژن کے منجھے ہوئے آرٹسٹ ریاض مرحوم نے آصف خان اور رستم کے ہمراہ ولن کا رول کیا تھا۔ نبیل، خوشبو، عابد علی اور ہمایوں قریشی کے علاوہ ٹی وی اداکار ذوالقرنین حیدر بھی ''فتح'' کی کاسٹ میں شامل تھے۔

1992ء کی فلم ''فتح'' کے دس سال بعد 2002ء میں نیلو بیگم پنجابی فلم ''کالو'' میں جلوہ افروز ہوئیں۔ فلمساز محمد افضل بٹ اور ہدایت کارہ سنگیتا کی اس فلم میں نیلو، بہار، کے علاوہ سنگیتا نے بھی اداکاری کی تھی۔ ''کالو'' کے ہیرو شان تھے۔ نیلو بیگم ایک بار پھر ماں کے کردار میں پیش ہوئی تھیں۔ یہی اب تک کی ان کی آخری ریلیز شدہ فلم ہے۔

ماشاءاللہ عابدہ ریاض المعروف نیلو بیگم اپنی زندگی کی 79 بہاریں دیکھ چکی ہیں وردادی، نانی کے رتبے پر بھی فائز ہوچکی ہیں اور اپنے خاندان میں خوش حال زندگی گزار رہی ہیں۔ ان کے صاحبزادے شان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ پرانی طرز کی فلموں کے علاوہ نئے رجحان کی فلموں کے بھی کامیاب ہیرو سمجھے جاتے ہیں۔

نیلو بیگم نے فلم انڈسٹری میں بھرپور دور گزارا۔ لالی ووڈ کے کئی نمایاں ہدایت کاروں نے ان کی نئی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا۔ جن میں انور کمال پاشا، خلیل قیصر، ریاض شاہد، حسن طارق، ریاض احمد راجو، اقبال شہزاد، اقبال یوسف، جعفر شاہ بخاری، سعود پرویز، اشفاق ملک، الطاف حسین، اقبال کشمیری، جاوید فاضل اور نذر الاسلام قابل ذکر ہیں۔ پاکستان کے پہلے سپر اسٹار سنتوش کمار کے مقابل نیلو نے 1966ء کی فلم ''کافی ہاؤس'' میں ہیروئن کا رول کیا تھا لیکن یہ فلم ریلیز نہ ہوسکی۔ نیلو کے ساتھ ہیرو آنے والے فنکاروں میں لالہ سدھیر، علاؤالدین، اسلم پرویز، یوسف خان، اکمل، درپن، حبیب، اعجاز، کمال، رتن کمار، محمد علی، وحید مراد، شاہد، اسد بخاری، اقبال حسن، سلطان راہی، اقبال کشمیری، منور ظریف، مجید ظریف اور بدر منیر کے نام شامل ہیں۔

ایسی ورسٹائل اداکارہ جنہوں نے ہر طرح کی کردار نگاری میں اعلیٰ فنی مہارت کا ثبوت دیا اور طویل عرصہ تک پاکستانی فلمی صنعت کی خدمت کی، روز روز پیدا نہیں ہوتیں کیونکہ

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

☆☆☆

اللہ مجھے معاف کرے، دل تو نہیں چاہتا کہ ''خطرناک'' جیسی فلم کے بارے میں لکھ کر اپنے قلم کو ناپاک کروں مگر ہم صحافیوں کی بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ اپنے قارئین کو تصویر کا ہر رخ دکھانا بھی ہماری ذمے داری ہوتی ہے۔ چونکہ نیلو کے ضمن میں اس فلم کا ذکر خصوصی طور پر آیا ہے اس لیے یہ بات ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اپنے پڑھنے والوں کو اس فلم کے بارے میں جہاں تک ممکن ہوسکے پس پردہ معلومات سے آگاہ کروں۔ اداکارہ نیلو کے دوسرے دور کی پہلی فلم کے حوالے سے ''خطرناک'' کے بارے میں چند سطروں میں جو مختصر سی نوعیت کا اظہار کیا گیا ہے۔ وہ میرے قارئین کو شاید یہ سوچنے پر مجبور کرے کہ ''بس اتنا ہی؟ اس کے بارے میں اور کچھ نہیں بتایا۔''

تو دوستو! بادل نخواستہ ''خطرناک'' کے سلسلے میں مجھے جو کچھ معلوم ہے اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ یہ ایک انگریزی ناول ''لون اسٹار رینجرز'' سے ماخوذ کہانی پر بنائی گئی فلم تھی۔ جسے سعادت حسین زیدی نے فلمی اسکرپٹ کے روپ میں ڈھالا تھا۔ کہانی اور مکالمے کے شعبوں میں بھی انہی کا نام درج کیا گیا تھا۔ یہ ایک فل ایکشن فلم تھی جو تین ڈاکوؤں کی لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے مناظر پر مبنی ہے۔ اس فلم کی کامیابی کی بنیادی وجہ اس کے بولڈ انداز کے رقص ہیں۔ اس فلم کی نمائش سے پہلے ٹی وی اور ریڈیو پر اس کی زبردست پبلسٹی کی گئی تھی اس لیے اسے دیکھنے کے لیے لوگوں کا ہجوم سینما گھروں پر ٹوٹ پڑا تھا اور پھر جب انہیں بولڈ انداز کے مناظر اور ناچ گانے دیکھنے کو ملے تو اس کے تمام شوز فل ہونے لگے۔

زمے من گرے کے ناول کی کہانی سے ماخوذ فلم ''خطرناک'' کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ ''یوسف خان، جس کا فلمی نام بہادر اے، جیل سے رہا ہوتے ہی گھر جاتا ہے جہاں اس کی محبت نیلو اس کا انتظار کررہی ہوتی ہے۔ یہ فلم

Waqar Azeem
Pakistanipoint

مکمل طور پر فلیش بیک میں بنائی گئی ہے۔ بہادر اکے جیل سے رہا ہوتے ہی فلم فلیش بیک میں چلی جاتی ہے۔ یوسف خان کا باپ اجمل ایک ڈاکو ہے جس کے تین ساتھی ہیں افضال احمد، فاضل بٹ اور مصطفیٰ قریشی۔ یہ سب مل کر لوٹ مار کرتے ہیں اور لوٹا ہوا مال کمال ایرانی کو فروخت کرتے ہیں مگر کچھ عرصہ بعد اجمل کی زندگی میں ایک انقلابی تبدیلی آتی ہے اور وہ تائب ہوجاتا ہے اور عدالت پہنچ کر وعدہ معاف گواہ بن جاتا ہے۔ اس طرح اس کے ساتھیوں کو سزا ہوجاتی ہے مگر یہ ڈاکو جیل سے بھاگ کر باہر آتے ہیں اور اجمل کو قتل کردیتے ہیں۔ اجمل کا کمسن اور بھولا بھالا بیٹا یوسف خان، باپ کو قتل ہوتے دیکھتا ہے تو بڑے ہونے کے بعد باپ کے قاتلوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے اور جب وہ بڑا ہوتا ہے تو خطرناک بن جاتا ہے اور باپ کے قاتلوں کو چن چن کر قتل کردیتا ہے اور آخر میں گرفتار ہوکر جیل چلا جاتا ہے۔ آخر کار جیل سے سزا کاٹ کر بہادرا (یوسف خان) رہا ہوجاتا ہے اور دیوانہ وار جا کر اپنی محبوبہ نیلو سے ملتا ہے۔

یہ ہے اس خطرناک فلم کی مختصر کہانی جس کے ہدایت کار رحمت علی ہیں۔ رحمت علی کی ہدایت کاری خاصی جاندار ہے۔ شاندار ٹریٹمنٹ سے انہوں نے اس فلم کو یادگار بنادیا ہے جس وقت یہ فلم ریلیز کی گئی تھی۔ یہ نام عام لوگوں کے لیے نیا تھا کیونکہ اس سے پہلے وہ تدوین کار کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے۔ 60ء کے دور میں انہوں نے رحمت کے نام سے کئی اردو، پنجابی فلموں کی ایڈیٹنگ کی تھی۔ بطور ہدایتکار یہ ان کی پہلی فلم تھی۔ اچھے تدوین کار، اچھے ہدایت کار ثابت ہوتے ہیں۔ رحمت علی کی اس فلم کو کامیاب بنانے میں نامور اور تجربہ کار عکاس مسعود الرحمٰن کا بھی بڑا حصہ تھا۔ اس فلم کے ایکشن مناظر میں مسعود الرحمٰن نے بڑی مہارت کا ثبوت دیا تھا اور اعلیٰ معیار کا ایکشن پیش کیا تھا۔ رحمت علی نے اداکاروں سے کہانی کے تقاضے کے مطابق بہت عمدہ کام لیا تھا۔ خاص طور پر انہوں نے یوسف خان سے بہادرا کے رول میں بہت اچھی اداکاری کروائی تھی فلم کے دوسرے ہاف میں تو یوسف خان کی اداکاری سپر کلاس تھی۔

اس فلم سے نیلو کا کم بیک ہوا۔ ریاض شاہد کے انتقال کے بعد انہیں حالات سے مجبور ہوکر دوبارہ فلم انڈسٹری میں واپس آنا پڑا تھا۔ اس فلم میں انہوں نے روایتی ہیروئن کا کردار کیا تھا لیکن یہ پنجابی فلم تھی۔ پنجابی فلموں کی اداکاراؤں سے جس طرح کام لیا جاتا ہے اور جس ڈھب سے انہیں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ کام، یہ فریضہ نیلو بیگم سے بھی ادا کروایا گیا۔ جہاں تک ممکن ہوسکا ان کی جنسی کشش سے بھرپور جسم کی نمائش کروائی گئی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان سے کوئی ولگر مناظر پر کام نہیں کروایا گیا۔ اس فلم کی ساری عریانی اور فحاشی اس کے چند نہایت بولڈ قسم کے ڈانس سے وابستہ تھیں۔ نازلی، انیتا اور منرلا سے بے حد بولڈ رقص کروائے گئے تھے جنہیں دیکھ کر تماشائی دیوانے ہوجاتے تھے اور ہر آنے والا دن سینماؤں میں فلم دیکھنے والوں کی تعداد میں مزید اضافہ کرتا جاتا تھا۔

دوسری طرف اس فلم کی نمائش کے بعد اس کے خلاف احتجاج کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا۔ ہمارے معاشرے میں اچھے اور صاف ستھرے لوگوں کی بھی کمی نہیں۔ نقادوں اور مبصروں نے شور مچانا شروع کردیا کہ ایسی بے ہودہ فلم سنسر بورڈ نے کیسے پاس کردی؟ اس موقع پر عظیم اداکار محمد علی نے تو اس فلم کے خلاف باقاعدہ ایک مہم شروع کردی۔ ان کے اس احتجاجی مہم کے نتیجے میں ان پر فائرنگ بھی ہوئی مگر جواں ہمت محمد علی اس کے باوجود ڈٹے رہے اور اپنی احتجاجی مہم جاری رکھی جس کے نتیجے میں اس فلم پر پابندی لگادی گئی مگر یہ پابندی چند ہفتوں تک ہی رہی اور اس کے فلمساز اور تقسیم کاروں نے دوبارہ نمائش کی اجازت دلوادی۔ کہتے ہیں کہ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور اس فلم سے جو پیسے حاصل ہورہے تھے وہی اس کی پابندی کو ختم کرانے میں بھی کام آئے۔

''خطرناک'' 29 اگست 1974ء کو لاہور میں پہلی بار ریلیز کی گئی تھی۔ لاہور سرکٹ میں اپنے بولڈ انداز کے رقص کی وجہ سے جلد ہی عوامی توجہ کا مرکز بن گئی۔ لاہور میں کامیابی کے جھنڈے لہرانے کے بعد 14 ستمبر 1974ء کو کراچی میں تقسیم کار ادارہ فرینڈز فلمز کے توسط سے کراچی کے اوڈین کے ساتھ 15 سینماؤں میں ایک ساتھ ریلیز کی گئی جو 10 اپریل 1975ء تک جاری رہی اور اس نے کل 104 ہفتے مکمل کرکے ڈائمنڈ جوبلی کا اعزاز حاصل کیا۔

چند ہفتوں کی پابندی کے بعد 11 اکتوبر 1974ء کو دوبارہ ریلیز کردی گئی۔ یہ رمضان المبارک کا آخری جمعہ تھا۔ ایک ہفتہ بعد عید الفطر آگئی۔ اس عید پر نئی فلمیں مس ہپی، لیلیٰ مجنوں اور ننھا فرشتہ ریلیز ہوئیں۔ اس کے باوجود یہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

پنجابی فلم (خطرناک) ان اردو فلموں کے مقابلے میں پرہٹ بزنس کرتی رہی۔ نئی اردو فلموں کے بزنس کو اس نے بری طرح متاثر کیا۔

یاد رہے کہ 1977ء کے مارشل لاء کے دور میں جب کئی اردو اور پنجابی فلموں پر پابندی لگی تو ان فلموں میں ''خطرناک'' بھی شامل تھی پھر 1982ء میں خطرناک کی نمائش دوبارہ بحال کردی گئی۔

اداکاری کے اعتبار سے خطرناک ایک معیاری فلم تھی۔ تمام فنکاروں نے اپنے اپنے کردار خوبی سے نبھائے تھے۔ نیلو نے فلم کی ہیروئن کا کردار متاثر کن انداز میں کیا تھا۔ یوسف خان نے ایکشن اور رومانٹک ہیرو کے طور پر بڑی خوبصورتی سے اپنا رول پرفارم کیا تھا۔ ولن پارٹی کے کردار افضال احمد، مصطفیٰ قریشی، فاضل بٹ اور کمال ایرانی نے بھرپور طور پر ادا کیے تھے۔ مگر ان سب میں مصطفیٰ قریشی سب سے زیادہ کامیاب رہے۔ یاد رہے کہ خطرناک ان کی ابتدائی پنجابی فلموں میں سے ایک تھی۔ نامور اداکار اجمل نے بھی اپنا کردار بڑی خوبی کے ساتھ کیا تھا۔ اداکارہ انیتا، منرلا اور نازلی نے کلب ڈانسر کی حیثیت سے بے حد بولڈ ڈانس کیے۔ مبصرین کا خیال ہے کہ اگرچہ تکنیکی اعتبار سے ''خطرناک'' ایک اچھی فلم تھی لیکن اس کی بلاک بسٹر کامیابی ان بے حد بے باک اور بے ہودہ رقص کی مرہونِ منت تھی۔ اب موسیقار صفدر حسین کی سریلی موسیقی سے آراستہ گیتوں کے بارے میں عرض ہے۔

☆ آہو جی میں تہاڈے نال کرنی آں پیار
(آواز۔ مالا بیگم)

☆ تیرے صدقے وے جی دارا
(آواز۔ نور جہاں)

☆ ٹچ می ناٹ
(آواز۔ مالا)

☆ رکھ توں نہ گھبرا سجنا
(آواز۔ مالا)

☆ پیار مینوں کردے
(آواز۔ مالا)

☆ وے نیڑے نیڑے آ
(آواز۔ مالا)

☆ ہائے میں دل نی دنیا
(آواز۔ مالا)

☆ چڑھیاں خوشیاں یار بناں
(آواز۔ مالا)

یہ سارے گیت نغمہ نگار خواجہ پرویز کے تحریر کردہ تھے۔ ان گیتوں کی پکچرائزیشن نیلو سمیت انیتا، نازلی اور منرلا پر ہوئی تھیں۔

یاد رہے کہ خطرناک کے نام سے بعد میں بھی فلمیں بنائی گئیں جن میں اکرم خان کی ایک اور میڈم سنگیتا کی دوسری فلم قابلِ ذکر ہیں مگر یہ فلمیں رحمت علی کی خطرناک سے ہر صورت میں بہت کم تر تھیں۔ ہدایت کار رحمت علی کی خطرناک کے فلمساز ایم افضل ڈھاما تھے۔ ان کے فلمساز ادارے کا نام ڈھاما فلمز کارپوریشن تھا جس کے بینر تلے خطرناک کے بعد خوفناک، اولاد، بارود، کھوٹے سکے، اور دو بدن نامی فلمیں بنائی گئیں۔

ہدایت کار حسن طارق نے ڈھاما فلمز کے لیے ''اولاد'' نامی فلم بنائی تھی۔ اس کا ابتدائی نام ''کرائے کی ماں'' تھا۔ جسے سنسر بورڈ نے اولاد کے نام سے نمائش کی اجازت دی۔ اس فلم کا ایک منظر جورانی پر فلمایا گیا تھا۔ اسے نامور بھارتی ہدایت کار اور اداکار راج کپور نے اپنی فلم ''رام تیری گنگا میلی'' میں بھی فلمایا۔ ڈھاما فلمز کے بینر تلے بننے والی اردو فلم ''بارود'' بہت اعلیٰ معیاری فلم تھی۔

خطرناک کو اس بات کی بھی اہمیت حاصل ہے کہ وہ کسی انگریزی ناول پر بنائی جانے والی پہلی پنجابی فلم ہے۔ ''خطرناک'' کی کامیابی سے متاثر ہو کر کئی فلم میکرز نے اس سے ملتی جلتی فلمیں بنائیں جن میں اقبال کشمیری کی فلم ''جادو'' بھی ہے۔

''خطرناک'' کو خطرناک فلم کے روپ میں پیش کرنے کے لیے اس کے پیش کاروں نے بڑے جتن کیے تھے۔ عام فلموں سے ہٹ کر اس کی پبلسٹی کی تھی۔ اس کے یادگار مرکزی پوسٹرز میں یوسف خان ڈاکو کے روپ میں پستول پکڑے دکھائے گئے تھے۔ یوسف خان کے علاوہ اس پوسٹر میں کوئی اور نہیں تھا۔ فلم کی نمائش سے پہلے کراچی ٹی وی سے اس کے ٹریلر بار بار چلتے تھے جبکہ ریڈیو پر اس فلم کا شاندار پروگرام روزانہ نشر ہوتا تھا۔

کراچی میں ''خطرناک'' ستمبر 1974ء سے اپریل 1975ء تک مسلسل چلی۔ اس دوران اس پر چند ہفتے پابندی لگی۔ یعنی آٹھ مہینے سے چند ہفتے کم یہ فلم مسلسل مختلف سینماؤں پر زیرِ نمائش رہی جبکہ حیدر آباد میں خطرناک بیک

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

وقت چار سینماؤں شمس، شہاب، چاندنی اور چراغ محل میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس دور میں حیدرآباد میں کئی تھرڈ پارٹی بزنس کرنے والے تھے۔ ان میں مارکیٹ ٹاور پر ایک شریف ہیئر ڈریسر بھی تھا۔ وہ خطرناک کو خرید کر حیدرآباد لایا اور مالا مال ہوگیا۔ حیدرآباد میں خطرناک کا مرکزی سینما شمس تھا۔ اس سینما پر یہ فلم ستمبر 1974ء سے دسمبر 1974ء تک مسلسل چلی اس کے بعد قیصر سینما میں شفٹ ہوگئی۔ حیدرآباد میں خطرناک کا بزنس اس دور میں لاکھوں میں تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ آج سے کوئی 46 سال پہلے ریلیز ہونے والی بلیک اینڈ وائٹ پنجابی فلم نے ولگریٹی کا سہارا لے کر باکس آفس پر تہلکہ مچادیا تھا۔ فلمسازی آرٹ کے ساتھ ساتھ انڈسٹری (صنعت) بھی ہے اس لیے فلم بنانے کا بنیادی مقصد منافع حاصل کرنا بھی ہے اور یہ مقصد اچھی فلمیں بنا کر بھی پورا کیا جاسکتا ہے، اس کی بہترین مثال ریاض شاہد کی فلم ''زرقا'' ہے۔

☆☆☆

اللہ تبارک تعالیٰ جسے توفیق دیتے ہیں وہی اس آزمائش میں پورا اترتا ہے۔ اس موقع پر ریاض شاہد کا ذکر نامناسب نہیں ہوگا۔ انہوں نے نیک مقاصد کو سامنے رکھ کر فلمیں بنائیں ملک اور معاشرے کی بہتری کے لیے انہوں نے اپنے فلم کے ساتھ ساتھ اپنی فنی صلاحیتوں کا بھی مستحسن مظاہرہ کیا۔ اس موقع پر میں آپ کو ان کی فلم ''یہ امن'' کے بارے میں معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ ''یہ امن'' کا ذکر خیر نیلو بیگم کے ضمن میں بھی لکھی گئی تحریر میں کیا جاچکا ہے مگر وہ بہت ہی ضمنی طور پر تھا۔ لہٰذا اگر میں نے ''یہ امن'' کے بارے میں اپنے پڑھنے والوں کو بھرپور معلومات فراہم نہیں کیں تو یہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

ریاض شاہد کی آخری فلم ''امن'' تھی جو انہوں نے کشمیریوں کی جنگ آزادی کے بارے میں بنائی تھی۔ انہوں نے اپنی ساری جمع پونجی اس فلم پر لگادی تھی لیکن اس وقت کی حکومت نے اس پر پابندی لگادی اور ہزار دقتوں کے بعد ''امن'' سنسر کی بے پناہ کاٹ چھانٹ کے بعد ''یہ امن'' کے نام سے ریلیز ہوئی۔

پاکستان میں بننے والی فلموں کا تعلق پاکستان کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی حالات سے تو رہا ہے، مگر پاکستان میں بعض ایسی فلمیں بھی بنی ہیں جن کا تعلق خارجہ پالیسی اور پاکستان کے بیرونی ممالک اور اقوام عالم کے تعلقات سے ہے۔ اگرچہ ان کی تعداد کم ہے مگر ان کا بننا اور ان کی عوامی مقبولیت ظاہر کرتی ہے کہ پاکستانی فلم میکرز اور عوام اس حوالے سے کس قدر باشعور تھے۔ کچھ فلمیں تو خاص طور پر خارجہ پالیسی کی تفہیم کو لے کر بنائی گئیں جیسے شہید، غرناطہ، وطن اور چند برس قبل ریلیز ہونے والی فلمیں ''وار'' اور ''یلغار''۔ ''یہ امن'' کشمیری عوام کی تحریک آزادی کے حوالے سے بنائی گئی ایک کلاسک فلم کا درجہ رکھتی ہے۔ اس فلم کا مرکزی خیال بھارتی فوج کا کشمیر پر غاصبانہ قبضہ، کشمیری عوام پر ظلم وستم اور کشمیری عوام کا حق خودارادیت ہے جسے اقوام متحدہ نے بھی تسلیم کرتے ہوئے کشمیری عوام کو استصواب رائے کا حق دیا۔ استصواب رائے کے ذریعے دنیا کے کئی اقوام کو حق رائے دہی دیا گیا مگر بھارت نے ہٹ دھرمی سے مقبوضہ کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کردی۔ اس تناظر میں ''یہ امن'' جیسی فلم کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ریاض شاہد نے کس طرح کئی دہائیاں قبل اس صورت حال کا اندازہ لگالیا تھا۔

''یہ امن'' کے حوالے سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس فلم میں پاک بھارت تعلقات یا بھارتی فوج سے متعلق براہ راست کوئی بات نہیں کی گئی ہے۔ اس فلم میں کشمیری عوام کی تحریک آزادی، ڈوگرہ فوج اور حکومت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود فلم کو سنسر کے وقت کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ پاکستان اس وقت نہایت نازک سیاسی دور سے گزر رہا تھا۔ بہت سی تبدیلیوں کے بعد اس فلم کو ''امن'' کی بجائے ''یہ امن'' کے نام سے نمائش کی اجازت دی گئی جبکہ اس کے برعکس بھارتی سنسر بورڈ نے بھارتی فلم میکرز کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔ وہ پاکستان کے خلاف جو چاہیں، جیسا چاہیں دکھائیں، بھارتی سنسر بورڈ نے کچھ نہیں کرنا۔ بھارتی سنسر بورڈ کی کھلی چھوٹ کی کچھ جھلکیاں ملاحظہ کیجیے۔

بھارتی فلم ''بارڈر'' کے ایک منظر میں سنیل شیٹھی جو ایک بھارتی میجر ہے اس کو اور اس کے کچھ فوجیوں کو پاکستانی قومی پرچم کو زمین پر پٹختے ہوئے اور اس پر پیشاب کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اسی طرح بھارتی فلم ''غدر'' میں امریش پوری ایک منظر میں کہتے ہیں۔ ''بچو! بچھو میں اتنا زہر نہیں ہوتا جتنا ایک پاکستانی میں زہر بھرا ہوتا ہے۔'' دریں اثناء فلم ''طالبان'' کے ایک منظر میں دکھایا گیا ہے کہ ایک

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

پاکستانی فوجی آفیسر طالبان کے سربراہ سے کہہ رہا ہوتا ہے۔ ''پاکستان تمہاری ہر قسم کی دہشت گردی میں تمہارے ساتھ ہے اور ہر قسم کا تعاون جاری رکھے گا۔'' بھارتی فلم ''سلاخیں'' کے ایک منظر میں اداکار سنی دیول کہہ رہا ہوتا ہے ''پاکستانی فوجی جب بھی ہمارے سامنے آتا ہے اپنی گیلی پینٹ اتار کر ہمارے تلوے چاٹتا ہے۔'' بھارتی سنسر بورڈ کی کھلی چھوٹ کا اندازہ ان مناظر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جبکہ ہمارا سنسر بورڈ کشمیر یا بھارت پر بنائی جانے والی پاکستانی فلموں کو نمائش کی اجازت نہیں دیتا اور اگر اجازت دیتا تو اس قدر کاٹ چھانٹ کے بعد کہ اس کا حلیہ ہی بگڑ جاتا ہے، اپنے تھیم اور موضوع سے مختلف ہوجاتا ہے۔

کشمیر کے موضوع پر اب تک ہمارے فلم میکرز نے ''تیرے پیار میں''، ''مسلمان''، ''جہاد''، ''سن آف پاکستان''، ''آزادی'' اور ''سولجر'' نامی فلمیں بنا کر کشمیری مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کا ثبوت دے چکے ہیں مگر ہماری فلم انڈسٹری کے سب سے بڑے انقلابی رائٹر اور ڈائریکٹر ریاض شاہد کی شاہکار فلم ''یہ امن'' کشمیر کے موضوع پر بننے والی سب سے زیادہ معیاری، پُراثر اور جاندار فلم ثابت ہوئی ہے جسے صحیح معنوں میں کشمیری حریت پسند مسلمانوں کی ترجمان کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔

''یہ امن'' کی کہانی کو اگر مختصر طور پر بیان کیا جائے تو وہ کچھ یوں ہوگی۔

اقبال حسن (سلاما) ایک غریب محنت کش کشمیری ہے لیکن اس کا ایک روپ اور بھی ہے وہ کشمیری حریت پسندوں کا کمانڈر بھی ہے جسے حریت پسند ناصر کے نام سے جانتے ہیں۔ سلاما کا ایک بھائی یوسف بچپن میں غلطی سے سرحد عبور کر کے آزاد کشمیر چلا گیا تھا جو اب آزاد کشمیر فوج میں افسر ہے لیکن اسے اپنے خاندان والوں کا کوئی پتا نہیں۔ سلاما کا باپ علاؤالدین ایک بہادر کشمیری ہے جو اپنے بیٹے کو وطن کی آزادی کے لیے جان قربان کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

سلاما کی بہن نشو (آمنہ) ایک شکارا (کشمیری جھیلوں میں چلائی جانے والی کشتی جس پر چھت بنی ہوتی ہے۔) چلانے والے غریب نوجوان جمیل (رمضانا) سے پیار کرتی ہے اور اسے بزدل ہونے کا طعنہ دیتی ہے۔ جس پر رمضانا حریت پسندوں کی مدد کرتا ہے۔ طالش ایک برہمن پنڈت ہیں جو تحصیلدار ہے اور کشمیری ہونے کے ناطے کشمیری حریت پسندوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ طالش کی اکلوتی بیٹی سنگیتا (شانتی) سلاما سے پیار کرتی ہے۔ ادیب ڈوگرا فوج کے ایک ظالم اور سفاک کرنل کے کردار میں ہیں جو رمضانا کے دونوں ہاتھ تلوار سے کاٹ دیتا ہے محض اس لیے کہ رمضانا نے حریت پسندوں کی مدد کی تھی۔ ادیب، سنگیتا پر بھی بری نظر رکھتا ہے اور موقع ملنے پر اسے بے آبرو کردیتا ہے۔ شانتی کا باپ تحصیلدار پریم ناتھ (طالش) کو اس بات کا بے حد دکھ ہوتا ہے کہ ایک ہندو برہمن اور تحصیلدار ہونے کے باوجود اس کی بیٹی محفوظ نہیں رہی اور ایک ہندو فوجی افسر نے اس کی بیٹی کی عزت لوٹ لی۔

''یہ امن'' پر مزید بات کرنے سے پہلے یہ بات ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مسئلہ کشمیر کے تاریخی اور سیاسی پس منظر کو دیکھا جائے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس کی بنیاد پر پاکستان اور بھارت اب تک تین جنگیں لڑ چکے ہیں جبکہ کئی مواقع ایسے آئے کہ جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ جنوبی ایشیا میں پائیدار امن کے قیام اور معاشی ترقی کے لیے مسئلہ کشمیر کا حل بہت اہمیت رکھتا ہے اور حل بھی ایسا جسے پاکستان اور بھارت کے علاوہ کشمیری عوام بھی خوش دلی سے قبول کریں کیونکہ پاکستان اور بھارت کے ساتھ ساتھ کشمیری عوام اور ان کی نمائندہ تنظیمیں بھی اس کی فریق ہیں۔ ویسے تو کشمیر کی تہذیب ہزاروں سال پرانی ہے مگر ماضی قریب سے دیکھیں تو سولہویں صدی عیسوی سے اٹھارویں صدی عیسوی تک یہاں مغل حکمرانوں کی حکومت رہی اور اس دور میں کشمیر میں نمایاں ترقی دیکھنے میں آئی۔ مغلوں نے نہ صرف عمارتیں اور باغات تعمیر کیے بلکہ اس عہد میں کشمیر سے سارے ہندوستان اور ایران تک تجارتی راستے بھی کھولے جس سے کشمیر میں معاشرتی ترقی بھی شروع ہوئی۔ مغلوں کے دور زوال میں یہاں سکھوں نے اپنی حکومت قائم کرلی 1819ء میں رنجیت سنگھ نے کشمیر پر قبضے کے بعد جموں کا علاقہ اپنے ڈوگرہ کمانڈر گلاب سنگھ کی تحویل میں دے دیا اور پونچھ کا علاقہ اپنے بھائی دیہان سنگھ کو عطا کردیا۔ 1846ء میں انگریزوں اور سکھوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جسے ''معاہدہ لاہور'' کا نام دیا گیا۔ اس معاہدے کی رو سے سکھوں نے کشمیر انگریزوں کے حوالے کردیا۔ گلاب سنگھ انگریزوں سے لڑائی میں غیر جانبدار رہا تھا اس لیے معاہدہ لاہور کے ایک ہفتہ بعد ہی ''معاہدہ امرتسر'' کے تحت انگریزوں نے کشمیر گلاب سنگھ کو فروخت کردیا۔ جب برصغیر کی تقسیم کا فیصلہ ہوا تو طے پایا کہ ریاستوں کی مرضی ہوگی کہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

وہ جس ملک سے چاہیں الحاق کرلیں۔ اس مقصد کے لیے کچھ ریاستوں اور صوبوں میں ریفرنڈم بھی ہوا۔ دلچسپ صورتِ حال ریاست حیدرآباد اور ریاست کشمیر کی تھی۔ ریاست حیدرآباد کے نواب مسلمان تھے جبکہ آبادی کی اکثریت ہندو تھی۔ نواب صاحب پاکستان سے الحاق کے حق میں تھے مگر ہندو آبادی کی اکثریت کا بہانا بنا کر ہندوستان نے اسے بھارت میں شامل کرلیا۔ دوسری طرف کشمیر میں مہاراجا غیر مسلم تھے جبکہ وہاں کی آبادی مسلمانوں کی زیادہ تھی اس کے باوجود مہاراجا نے ہندوستان سے الحاق کا خط تحریر کیا جو متنازعہ تھا اور مسلمان آبادی کی اکثریت کو نظرانداز کردیا تھا۔ ہندوستان نے اس متنازعہ خط کو جواز بنا کر کشمیر میں اپنی فوج داخل کردی۔ اگست 1947ء کے ابتدائی دنوں میں گاندھی نے کشمیر کا دورہ کیا اور مہاراجا پر دباؤ ڈالا کہ وہ ہندوستان سے الحاق کا فیصلہ کریں۔ ریاست کشمیر کے اس وقت کے وزیراعظم رام چندر کاک خودمختار کشمیر کے حق میں تھے اس لیے گاندھی نے مہاراجا سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ فوری طور پر وزیراعظم کو برطرف کردیا جائے۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے کشمیری مسلمان رہنماؤں نے فیصلہ کیا کہ وہ بھارت کے ساتھ الحاق نہیں ہونے دیں گے۔ انہیں کشمیر کی اکثریتی مسلمان آبادی کی حمایت حاصل تھی۔ پاکستان سے بھی قبائلی علاقوں سے رضاکار قبائلی کشمیری مسلمانوں کی حمایت میں کشمیر کی طرف چل پڑے۔ بھارت نے جب یہ محسوس کیا کہ کشمیر اس کے ہاتھ سے نکل رہا ہے تو 27 اکتوبر 1947ء کو کشمیر میں اپنی فوج داخل کردی اور سری نگر پر قبضہ کرلیا۔ مقامی مسلمانوں نے مزاحمت کی تو کشمیر میں بھارتی فوج کے ظلم وستم کا نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ شروع ہوگیا جو آج بھی جاری ہے۔ کشمیر کی صورتِ حال کا نوٹس عالمی ادارے اقوام متحدہ میں بھی لیا گیا اور سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ جب بھارت نے دیکھا کہ کشمیر میں اس کے خلاف مزاحمت بڑھ رہی ہے تو اس سے پہلے کہ عالمی سطح پر اس کی مخالفت کی جائے وہ خود ہی مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ لے گیا۔ بھارت جو کہ بڑے زور شور سے کشمیر میں پاکستانی مداخلت کا الزام عائد کرتا رہا۔ خود اقوام متحدہ میں اس مسئلے کو جس شق کے تحت لے کر گیا اس کا تعلق مسائل کے پُرامن تصفیے سے ہے اور یہ اقوام متحدہ کی چھٹی شق ہے۔ جبکہ مداخلت والے مسائل کو ساتویں شق کے تحت پیش کیا جاتا ہے۔ 21 اپریل 1948ء کو اقوام متحدہ کے اجلاس میں قرارداد نمبر 47 پیش کی گئی جس میں کہا گیا کہ بھارت اور پاکستان دونوں کشمیریوں کو استصواب رائے کے ذریعے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق دینے کے لیے تیار رہیں۔ 5 جنوری 1949ء کو ایک ریزولیشن کے ذریعے استصواب رائے کے طریقہ کار کا بھی تعین کردیا گیا لیکن بعد میں بھارت اس سے منحرف ہوگیا۔ 1950ء سے 1957ء تک سیکیورٹی کونسل کے تمام صدور اور اقوام متحدہ کے نمائندوں نے جن میں جنرل میک ناٹن، ادون ڈکسن اور فرینک گراہم شامل ہیں۔ پوری کوشش کی کہ بھارت کشمیر سے اپنی فوج واپس بلالے تاکہ استصواب رائے کا انعقاد یقینی بنایا جاسکے مگر انہیں اس میں ناکامی ہوئی۔

ایک طرف تو بھارت مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ لے کر گیا۔ دوسری طرف اس نے ایسے آئینی وقانونی اقدام بھی جاری رکھے جن سے کشمیر کی خودمختار حیثیت آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئی اور وہ عملاً بھارت کا حصہ بن گیا۔ 1965ء میں جموں وکشمیر کے آئین میں ترمیم کرکے صدر ریاست اور وزیراعظم کے عہدے ختم کردیے گئے اور ان کی جگہ گورنر اور وزیراعلیٰ مقرر کیے گئے۔ یوں عملاً کشمیر بھارت کا حصہ بن گیا۔ یہاں تک کہ خود شیخ عبداللہ جیسا شخص بھی یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ بھارتی حکومت کشمیر کو بھارت کا حصہ بنانے پر تلی ہوئی ہے۔ ایک طرف تو عالمی سطح پر اور دونوں ممالک یعنی بھارت اور پاکستان کے درمیان مسئلہ کشمیر پر بات چیت بھی کبھی رکی، کبھی جاری رہی اور اقوام متحدہ کے مبصرین بھی دونوں ممالک میں اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ دوسری طرف کشمیر میں بھارتی فوج نے الحاق پاکستان اور آزادی کشمیر کے لیے کی گئی ہر کوشش کو سختی سے کچلنے کے لیے تشدد کا ہر راستہ اختیار کیا۔ یہاں تک کہ کشمیر میں کوئی خاندان ایسا نہ رہا جس کا کوئی فرد اس تحریک میں شہید نہ ہوا ہو۔

☆☆☆

دوستو! کشمیر ایک زندہ حقیقت ہے اس لیے اس کے پس منظر میں جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے، اس کی تفصیل اس جگہ اس لیے بتائی ہے کہ ریاض شاہد کی فلم ''یہ امن'' کے بارے میں آپ کو احساس ہو کہ انہوں نے یہ فلم بنانے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ کشمیریوں پر بھارتی اقتدار کے بھوکے بھیڑیوں نے ان کے حقوق کو پامال کرنے کے لیے ان پر کیا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کیا ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑے۔ ان ہی سارے حقائق کو سامنے لانے کے لیے ریاض شاہد نے بڑی فنی مہارت کے ساتھ ایک خوبصورت فلم بنائی تھی کہ دنیا کو اس کے ذریعے بھارت کا حقیقی روپ دکھائیں، مگر افسوس کہ اس وقت کی حکومت نے اپنی سیاسی مصلحتوں کے تحت اس کی نمائش نہ ہونے دی اس پر پابندی لگادی۔

ریاض شاہد ایک دبنگ صحافی، ادیب اور فلم میکر تھے۔ ان کی ایک حیثیت تھی، ایک مقام تھا، ان کے عزیزوں اور دوستوں نے کہا ''ارے یار! تم جیسا آدمی اپنے اثر ورسوخ کو کام میں کیوں نہیں لاتا؟ اس پابندی کو ختم کرانے کے لیے متعلقہ حکام سے ملو۔ ان کو بتاؤ کہ اس فلم میں کشمیری حریت پسندوں کی ترجمانی کی ہے تم نے یہ کشمیریوں کی جنگ آزادی پر بنائی گئی فلم ہے۔''

ریاض شاہد نے اسلام آباد کے چکر لگانے شروع کردیے اور اہم سرکاری لوگوں سے مل کر اس فلم کی پابندی ختم کرانے کی کوشش شروع کردی۔ متعدد چکروں کے بعد اور بہت سے بااثر افراد سے ملاقاتوں کے بعد سنسر بورڈ کو حکم دیا گیا کہ ریاض شاہد کی فلم ''امن'' کو دوبارہ سنسر کیا جائے۔ فلم بورڈ نے فلم دیکھی اور اس کے متعدد حصوں پر قینچی چلا کر کہا.....

''اس قطع وبرید کے بعد فلم نمائش کے لیے پیش کی جاسکتی ہے۔''

ریاض شاہد کو پابندی ختم ہونے کی اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنا دکھ اور صدمہ یہ ہوا کہ اس کاٹ چھانٹ کے بعد یہ فلم وہ فلم ہی نہیں رہی جو بنائی گئی تھی۔ جس مقصد کو سامنے رکھ کر بنائی گئی تھی اس کی شہ رگ پر ہی نشتر زنی کردی گئی تھی۔ انہیں لگا کہ فلم کے پرنٹس پر نہیں ان کی اپنی شہ رگ پر قینچی چلائی گئی ہے۔

ان کے چاہنے والوں اور بہی خواہوں نے ان سے کہا۔ ''جو کچھ بچا ہے اس کو نئے سرے سے ترتیب دے کر نمائش کے لیے پیش کرو۔''

''امن''، ''یہ امن'' کے نام سے 20 نومبر 1971ء کو نمائش پذیر ہوئی اور 22 نومبر 1971ء کو پاک بھارت جنگ چھڑ گئی۔

''یہ امن'' کے نام سے جو فلم ریلیز ہوئی، اس کے تناظر میں جو باتیں سامنے آئیں، مبصرین اور ناقدین نے اس پر جو کچھ کہا، اس کی روشنی میں یہ کہا جائے گا کہ ''یہ امن'' ریاض شاہد کی شاندار ہدایت کاری کی ایک اچھی مثال ہے۔ فلم میں جا بجا علامتوں کا استعمال کیا گیا ہے جس سے فلم کا نہ صرف حسن بڑھا ہے بلکہ جس موضوع کا انتخاب کیا گیا ہے وہ چونکہ سیاسی ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت حساس بھی ہے لہٰذا اسے موثر انداز میں پیش کرنے میں بھی آسانی ہوئی۔

اس فلم کا آغاز ہی علامتی انداز میں ہوتا ہے دنیا کے نقشے پر ایک خوبصورت منظر جہاں ابھرتے ہیں اور دلکش وادیاں ہیں، وہاں آگ کے شعلے بلند ہوتے ہیں۔ ایک معصوم بچہ بانسری پر دھن بجا رہا ہے کہ بانسری اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پہاڑی ندی میں گر جاتی ہے۔

بانسری اور موسیقی امن کی علامت ہے۔ فلیش بیک سے پتا چلتا ہے کہ بچے کا باپ بھی بانسری بجاتا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ ڈوگرہ کرنل نے کاٹ دیے تھے۔ جہاں ظلم ہو، وہاں امن کی موسیقی ختم ہوجاتی ہے۔ اسی طرح جہاں بھی بھارتی فوج کا دفتر دکھایا گیا ہے، عقب میں ڈوگرہ راجا کی تصویر لگی نظر آتی ہے تاکہ بھارتی فوج کی جگہ ڈوگرہ فوج کا تاثر ابھرے اور ظاہر ہے کہ یہ سنسر کی مجبوری تھی۔ ایک سین میں طالش کی بیٹی شانتی (سنگیتا) کی لاش آبروریزی کے بعد اس کے پاس لائی جاتی ہے تو وہ شدت غم سے بندوق تو اٹھا لیتا ہے مگر گولی کس پر چلائے؟ کیونکہ وہ خود ایک ہندو برہمن اور تحصیلدار ہے، حکومت کا حصہ ہے اور اس کی بیٹی کی عزت بھی ایک برہمن فوجی افسر نے لوٹی ہے تو وہ بندوق کا رخ ڈوگرہ مہاراجا کی تصویر کی طرف کرکے اس کی دونوں آنکھوں میں گولی مار دیتا ہے۔ ریاض شاہد کا یہ علامتی انداز اسے دنیا کے بڑے مصنفین اور ہدایت کاروں میں شامل کرتا ہے۔

فلم کے اختتام پر بھی نشوا اپنے ہاتھ میں بانسری اٹھا کر دنیا کی طرف دیکھتی ہے کہ عالمی برادری اس خطے میں امن کے لیے کیا کرتی ہے؟

ریاض شاہد نے کوئی بھی منظر مروجہ انداز سے فلمبند نہیں کیا ہے۔ ہر شاٹ میں کوئی نہ کوئی بات پیدا کی ہے۔ انہوں نے گانے اور رقص کی فلمبندی میں ندرت کا ثبوت دیا ہے۔ لڑائی اور چیزنگ کے مناظر پر بھی حقیقت کا گماں ہوتا ہے۔ یہی ہدایت کار کی سب سے بڑی کامیابی ہے کہ کسی منظر پر تصنع کا شبہ نہ ہو۔ ان تمام باتوں کے تناظر میں ''یہ امن'' کو ریاض شاہد کی ہدایت کاری کا شاہکار کہا جاسکتا ہے۔

Muhammad Waseem
Pakistanipoint.com

اداکاری کے شعبہ میں یوں تو تمام آرٹسٹوں نے اچھی پرفارمنس دی ہے مگر خاص طور پر اقبال حسن، طالش اور علاؤالدین نے کمال کی کردار نگاری کی ہے۔ اقبال حسن کے بارے میں یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اردو فلموں میں اس سے بہتر کردار انہیں کوئی اور نہیں ملا۔ ایک طرف تو بھولا بھالا غریب محنت کش کشمیری سلاما اور دوسری طرف کشمیری حریت پسند کمانڈر ناصر جو بہادر اور نڈر ہے اور اپنے وطن کی آزادی کی خاطر کچھ بھی کرسکتا ہے۔ طالش بھی اپنے کردار میں مکمل فٹ نظر آئے۔ ان کی اداکاری اس وقت قابل دید ہے جب وہ اپنی اکلوتی بیٹی کی لاش دیکھتے ہیں اور اپنے دکھ اور جذبات کا اظہار ریاض شاہد کے لکھے مکالموں کے ذریعے کرتے ہیں۔ ادیب بھی ڈوگر کرنل کے روپ میں لاجواب نظر آئے۔ ریاض شاہد نے اس فلم کے لیے کرداروں کے انتخاب میں بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ نشو اور سنگیتا پر کشمیری لڑکیوں کے کردار بالکل حقیقی لگتے ہیں۔ نشو نے ایک بھولی بھالی لڑکی کا کردار بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔ اسی طرح سنگیتا نے بھی اپنے کردار میں جان ڈال دی ہے۔ نشو نے زبان کاٹنے والے منظر میں اور زنجیر کے منظر میں، ابتدائی اور آخری مناظر میں بڑے اچھے فیس ایکسپریشن دیئے ہیں۔ اسی طرح سنگیتا نے آبروریزی کے منظر میں، چاندنی رات کے گانے میں اور باپ کے ساتھ ڈرامائی منظر میں اپنی اداکاری کا لوہا منوالیا ہے۔

''یہ امن'' کے مکالموں کے ضمن میں یہ عرض کروں گا کہ ریاض شاہد کا لکھا ہوا ایک ایک مکالمہ خون میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً ان مناظر میں جہاں طالش اور علاؤالدین آمنے سامنے آتے ہیں یا زبان کاٹنے والے مناظر میں جمیل اور ادیب کے ڈرامائی منظر میں ریاض شاہد نے ایک ایک لفظ میں کشمیر کی مظلومیت اور ڈوگرہ فوج کی درندگی کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔

ہدایت کاری اور مکالمہ نگاری کے بعد سب سے اہم شعبہ موسیقی کا تھا کیونکہ فلم ایک خاص پس منظر کی تھی۔ اس لحاظ سے گیت اور ان کی شاعری بھی ویسی ہی چاہیے تھی۔ موسیقار اے۔ حمید نے کشمیری پس منظر میں موسیقی تخلیق کی جو کشمیری جھرنوں اور وادیوں کا حسن اپنے اندر سموئے ہوئے ہے لیکن کشمیری ساز سنتور کی کمی محسوس ہوتی ہے انقلابی شاعری کی بات ہو تو ذہن میں حبیب جالب کا نام آتا ہے اس لیے ریاض شاہد کا انتخاب بھی جالب صاحب ہی تھے۔ اس فلم میں حبیب جالب نے جہاں انقلابی گیت لکھے وہاں رومانوی حوالے سے بھی لاجواب شاعری کی ہے۔

مجھے پیار سے جب بھی آواز دو
میں تو چلی آؤں میرے دلبرو

اس گیت میں دلبر کی جگہ دلبرو کا لفظ استعمال کرکے کشمیری تاثر کو اجاگر کیا گیا ہے۔

رونا لیلیٰ، مہدی حسن، مجیب عالم اور نورجہاں نے فلم کے گیتوں کو آواز دی۔

اڑتا ہوا وقت تھام لو ساتھی
نہ ہو جائے شام

اس گیت میں الفاظ کے چناؤ سے رومانس اور جذبات کے اظہار کو جس طرح بیان کیا گیا ہے وہ سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ انقلابی شاعری کے حوالے سے فلم کے گیت کشمیری عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

☆سورج کی کرنوں کا رستہ روکنے والو
سن لو، سو دیواریں چن لو
جب تک اس نگری میں چاروں اور اندھیرے ہیں
اپنی جنگ رہے گی

☆کھینچی ہوئی ہے دل پہ میرے خون کی سرخ لکیر
تو ہی بتا دے کب ٹوٹے گی پاؤں کی یہ زنجیر
اے میرے کشمیر

نورجہاں اور مہدی حسن کی آواز میں اس فلم کا سب سے مقبول گیت

☆ظلم رہے، اور امن بھی ہو
کیا ممکن ہے تم ہی کہو

کشمیری عوام کی آواز بن گیا۔

''یہ امن'' کی موسیقی کے بارے میں مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ موسیقی لاجواب ہے۔ تھیم سانگ کے علاوہ شادی کا گانا اور جمیل کے ساتھیوں کا نغمہ بہت عمدہ ہے۔ ان کی دھنیں کشمیری رنگ میں بنائی گئی ہیں۔ وہاں کی لوک دھنوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔ پس منظر موسیقی بھی معیاری ہے۔ ٹائٹل میوزک اچھا ہے اس فلم کے کئی گانے اس کی نمائش سے پہلے ہی مقبول ہوچکے تھے۔ حبیب جالب انقلابی گیت لکھنے میں جواب نہیں رکھتے۔ انہوں نے اپنے اشعار میں بڑے قاتل نشتر چھپا دیئے تھے۔ رومانی گانے بھی اچھے خاصے ہیں۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

''یہ امن'' کی ایک اور خوبی اس کی خوبصورت عکاسی ہے، کیمرا مین نبی احمد نے اس کی رنگین عکاسی میں بڑی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ فلم کے لیے لوکیشن کا انتخاب بھی بہت خوب کیا گیا ہے جو بے حد حسین ہیں۔ نبی احمد نے وادی کشمیر کے سارے حسن کو فلم کے فیتے پر منتقل کر دیا ہے۔ سر بفلک برف پوش پہاڑیاں، گاتے ہوئے جھرنے، جھلملاتی ہوئی جھیل اور چنار کے درخت، غرض کہ کشمیر کے تمام حسن کو انہوں نے اپنی عکاسی کے ذریعے اس فلم کا حصہ بنا کر اس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔

فنی اور تکنیکی طور پر ان تمام خوبیوں کے باوجود اس فلم نے وہ عوامی پذیرائی حاصل نہیں کی جس کی توقع تھی۔ باکس آفس پر اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ سنسر کی کاٹ چھانٹ کی وجہ سے فلم کی روح بری طرح مجروح ہو گئی تھی، فلم کا اصل مقصد ہی فوت ہو گیا تھا۔ ریاض شاہد نے بڑی محنت سے اس فلم کی تخلیق کی تھی اور یہ سوچا تھا کہ اسے ''زرقا'' سے زیادہ پذیرائی حاصل ہو گی۔ کشمیری بھائیوں سے یکجہتی کے اظہار میں یہ فلم کلیدی کردار ادا کرے گی مگر بے تحاشہ کاٹ چھانٹ کی وجہ سے ریاض شاہد کے سارے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے۔ اگر عوام نے اس فلم کے ساتھ یہ سلوک کیا، اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی، تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ انہیں کشمیر کے موضوع پر ریاض شاہد سے ایسے بے ربط فلم کی توقع نہیں تھی۔

اگر کوئی شخص کسی نیک مقصد کے لیے انتھک محنت کرے، اپنی ساری جمع پونجی لگا دے، اپنی ساری صلاحیتوں کا مظاہرہ کرے لیکن انجام کار اس کی ساری کوششوں اور کاوشوں پر کوئی پانی پھیر دے تو اسے کتنا دکھ، کتنا قلق ہو سکتا ہے؟ ریاض شاہد کو بھی اس کی فلم ''امن'' کو ''یہ امن'' بنانے اور اسے ناکامی کے دلدل میں دھکیلنے نے اتنا ہکان اور پریشان کیا کہ وہ سرطان کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے اور سرطان بھی کیسا، خونی سرطان۔ ''یہ امن'' 20 نومبر 1971ء کو ریلیز ہوئی اور یکم اکتوبر 1972ء کو اس فلم کا خالق اس دنیا سے کوچ کر کے اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

ریاض شاہد کی موت، محض ایک انسان کی موت نہیں، صحافت، ادب اور فلم نگری کا بھی ایک سانحہ ہے۔ عظیم اور بہت بڑا سانحہ..... ایسے نابغہ روزگار لوگ، روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ انہیں اگر بے دردی سے موت کے حوالے کر دیا جائے تو اس پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔

ریاض ہمارے ملک کے نڈر اور قلندر لکھاری تھے۔ جن کی تحریر ہر درد کے غلط لوگوں کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ وہ دنیائے ادب و صحافت میں ایک نمایاں مقام اور اہمیت کے حامل تھے۔ ان کا ناول ''ہزار داستان'' ادب میں ہمیشہ نمایاں اہمیت کا حامل گردانا جائے گا۔

وہ بلا کسی پروا، لالچ اور خوف کے لکھتے، سچ اور جھوٹ کی سرحد پر اکیلے کھڑے سپاہی تھے قلم سے مسلح، جرأت، بے خودی، بے باکی، استبداد اور اقتدار کے خلاف نبرد آزما ہونے کا دوسرا نام ریاض شاہد تھا۔ ان کے نزدیک فلم کی تجارت عزت کی تذلیل سے کم تر نہیں تھی۔ ریاض شاہد لوگوں کی پیشانیوں سے موضوع تلاش کرتے اور ان کی نظروں سے ان کے دلوں کے جذبات پڑھتے، کوچۂ ادب و صحافت سے ہوتے ہوئے فلم جیسے سب سے موثر ذریعہ ابلاغ پر انہوں نے جو کام کیے وہ کبھی فراموش نہیں کیے جائیں گے۔ ہماری مردہ حال فلم انڈسٹری کی تباہی کا بنیادی سبب فلموں کا کمرشل ازم اور مقصدیت کے دھارے میں بہنا ہے۔ پاکستانی فلمی صنعت میں صرف اور صرف ریاض شاہد ہی ایک ایسے صاحب طرز اور جدت طراز مصنف، فلمساز اور ہدایت کار تھے جنہوں نے فلموں میں ملکی اور غیر ملکی حوالوں سے ایسے موضوعات منتخب کر کے پاکستانی سینما پر پیش کیے جن میں معقولیت اور مقصدیت کے پہلو تھے۔ ریاض شاہد اداکاروں کو کبھی خاطر میں نہ لانے والے فلم میکر تھے۔ انہیں صرف اپنی تحریر کی پروا ہوتی تھی کیونکہ انہیں خود پر اعتماد تھا کہ ان کی کہانی اور مکالموں میں جان ہے اور اسی کے بل بوتے پر ایک اچھی فلم بنتی ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ریاض شاہد پاکستان کے پہلے فلمی مصنف تھے جنہوں نے کہانی لکھنے والوں کے وقار، معاوضے اور اہمیت میں ہوش ربا اضافہ کیا۔ بڑے سے بڑا فلمساز اور ہدایت کار ان کے کام کے سحر میں مبتلا اور ان کے کام میں مداخلت سے دور رہتا تھا۔ یوں تو ریاض شاہد کو فلم کے بیشتر بڑے اور اہم ترین شعبوں پر دسترس حاصل تھی لیکن کہانیوں اور ان کے کرداروں کے مکالمے لکھنے میں ملکہ حاصل تھا۔ ان کے مکالموں کی تراش سب سے انوکھی تھی۔ ان کا اسلوب جدا تھا، ان کا رنگ ہی مختلف تھا۔ لوگوں نے نہ صرف ان کے مکالموں کی بے پناہ داد دی بلکہ انہیں یاد بھی رکھا۔ بلاشبہ ریاض شاہد مکالمہ نگاری میں اپنے طرز تحریر کے موجد بھی تھے اور انہیں پر یہ فن ختم بھی ہو گیا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ریاض شاہد جب کہانی نویس اور مکالمہ نگاری سے ہوتے ہوئے فلمساز اور ہدایت کار بنے تو انہوں نے اپنے فنی کیریئر میں کبھی کوئی فارمولا اور بے مقصد فلم نہیں بنائی۔ ریاض شاہد کو بہترین مصنف، بہترین مکالمہ نگار اور بہترین ہدایت کار کے جتنے ایوارڈز ملے وہ آج تک کسی اور تخلیق کار کو میسر نہ آسکے۔

بھروسا، نیند، کلرک، ڈاکو کی لڑکی، شہید، سسرال، قانون، شکوہ، خاموش رہو، فرنگی، رواج، مجاہد، آگ کا دریا، باغی سردار، بدنام، شعلہ اور شبنم، گناہگار، مفرور، دوسری شادی، میں زندہ ہوں، زرقا، غرناطہ، خاک اور خون، زخمی، سماج، حیدر علی، بہشت اور امن ان کے ذہن اور قلم سے نکلے فن پارے تھے۔ ریاض شاہد کے حوالے سے یہ سچائی بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ انہیں گستاخ فلم مصنف کہا جاتا تھا۔ ان کی کہانیاں، منظرنامے اور مکالمے دلوں میں اتر جانے والے اور روح کو زخمی کردینے والے ہوتے تھے۔ ریاض شاہد چونکا دینے والے موضوعات پر فلمیں تحریر کرنے کے حوالے سے بہت شہرت یافتہ تھے۔ انہوں نے اپنے فنی کیریئر کے آغاز سے انجام تک ذریعہ ابلاغ کی حرمت اور اہمیت کا پاس اپنی فلموں کے ذریعے رکھا جو لوگ یہ کہتے نہیں تھکتے کہ پاکستانی فلمیں غیر معیاری ہوتی ہیں انہیں یہ علم بھی نہیں کہ پچاس، ساٹھ اور ستر کی دہائیوں میں کس قدر معیاری اور خوبصورت فلمیں بنائی گئیں جنہیں بڑے فخر سے بڑی بڑی بھارتی فلموں کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے اور اکثر موضوع اور ٹریٹ منٹ کے اعتبار سے ہمارے ماضی کی پاکستانی فلموں کا پلڑا بھاری ہوتا تھا۔

ریاض شاہد کا المیہ یہ رہا کہ کسی دور کی سرکار نے ان کی اہمیت کا خیال نہیں کیا۔ کسی بھی حکومت نے ان کی فلموں کی سرکاری سطح پر پذیرائی نہیں کی۔ ریاض شاہد کی یادگار اور بامقصد بین الاقوامی معیار کی فلم ''یہ امن'' کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس کا دکھ اتنا شدید تھا کہ وہ خون کے کینسر میں مبتلا ہوگئے۔ ایک تخلیق کار کو، ایک قلم کار کو، ایک محب وطن ہنرمند کو ہماری قوم اور ہمارے نظام نے اس کی زندگی بھر کی کاوشوں کا یہ صلہ دیا۔ ریاض شاہد کی موت ایک شخص یا انسان کی موت نہیں، ایک عہد، ایک زمانے کی موت ہے۔ ایک شناخت کی موت ہے جو ان کے نام کی وجہ سے اس ملک کی فلم انڈسٹری کو حاصل تھی۔ بلاشبہ وہ ایک عظیم اور بے مثل تخلیق کار تھے جنہوں نے تیر و شام بھی سہے، شام ناکام بھی دیکھی، صبح ناشاد بھی کاٹی اور رسم الزام کا شکار بھی ہوئے پھر بھی ان کے نام اور کام کا ڈنکا چہار سو بجا۔ کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جن کے نام ان کی زندگی ہی میں ان کی پہچان بن جاتے ہیں، اور جو اپنے قدموں کے نشان تاریخ کے صفحات پر چھوڑ جاتے ہیں۔ ریاض شاہد ان ہی معدودے چند لوگوں میں سے ایک تھے ریاض شاہد کے ساتھ اس ملک کی صنعت فلمسازی کا ایک زریں دور ختم ہوگیا۔ ایک انداز فکر تمام ہوگیا۔ کاٹ دار الفاظ تراشنے والا قلم نہ رہا نہ وہ تیکھے جملے کہنے والی زبان رہی اور نہ وہ عام روش سے ہٹ کر سوچنے والا ذہن۔ غرض یہ کہ ایک روایت تھی جو ختم ہوگئی لیکن..... پاکستان کی فلمی صنعت کے ہر شعبہ پر ریاض شاہد نے جو چھاپ لگائی ہے وہ مٹائے نہیں مٹ سکے گی۔

☆☆☆

ریاض شاہد کو جس قبرستان میں ابدی نیند سلایا گیا تھا اس کے قریب ہی موہنی روڈ ہے ریاض شاہد اسی علاقے سے کسی زمانے میں پی ڈی کے چیئرمین بھی منتخب ہوئے تھے۔ اسی محلے میں ان کا آبائی مکان بھی تھا۔ جس میں ان کے والدین اور بہن بھائی رہتے تھے جبکہ ریاض شاہد کی کوٹھی گلبرگ میں تھی جو ان کی بیگم نیلو شاہد کے نام پر تھی۔ یونائیٹڈ کرسچن اسپتال میں فوت ہونے کے بعد ان کی میت ان کے والدین اپنے گھر لے گئے اور اسی گھر سے ان کا جنازہ بھی اٹھایا گیا۔

یوں تو مرحوم کے تمام قریبی ساتھیوں اور دوستوں کو ریاض شاہد کی موت نے متاثر کیا تھا مگر ان کے دو جگری دوستوں آغا طالش اور علاؤالدین تو جیسے اندر سے ریزہ ریزہ ہوگئے تھے۔ یہ دونوں ان کے آخری ایام میں زیادہ تر ان کے پاس اسپتال میں رہے۔ ان کا کہنا ہے

''جب ریاض شاہد اپنی زندگی کے آخری لمحات پورے کررہا تھا تو وہ اپنے معصوم بچوں اور بیوی کے بارے میں بہت متفکر تھا اور بار بار اپنی نحیف آواز میں کہتا تھا۔ ان کا کیا ہوگا؟ یہ بے یارومددگار ہوجائیں گے۔'' پھر اسے اپنا گھر یاد آجاتا اور وہ اسپتال کی بجائے اپنے ذاتی مکان سے ہی سکون اور عافیت کے ساتھ اپنے معبود حقیقی کے دربار میں پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں بھی یہی رٹ لگاتا رہتا تھا کہ اسے اس کے گھر لے چلو لیکن اس کی اس استدعا پر کسی نے توجہ نہیں دی اور آخر کار اس نے اپنی مرضی

Waqar Azeem
Pakistani Point.com

کے خلاف اسپتال کی چہار دیواری ہی میں دم توڑ دیا۔''

ان دونوں کو اپنے یار کو یاد کر کے روتے روتے کئی دن بیت گئے۔ روتے روتے ان کی آنکھیں سرخ انگارہ بن گئی تھیں۔ اداکار محمد علی کو بھی ریاض شاہد سے محبت تھی۔ علی نے بھی اس قول کو سچ ثابت کر دیا تھا کہ دوست وہی ہوتا ہے جو برے وقت کا ساتھی ہوتا ہے۔ محمد علی نے ریاض شاہد سے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ ریاض شاہد کی دیکھ بھال کے لیے نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات۔ وہ دن رات ریاض شاہد کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے تھے۔ بیماری کے دوران محمد علی وہ شخص تھے جو پہروں ریاض شاہد کے سرہانے کھڑے رہتے تھے اور دل ہی دل میں ریاض شاہد کی صحتیابی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہتے تھے۔ یہ سب ایک دو روز کی بات نہیں تھی۔ ریاض شاہد کی بیماری سے لے کر ان کی موت تک جاری رہی۔ جو لوگ اس حقیقت کے گواہ ہیں ان کا کہنا ہے ریاض شاہد کی موت کا جتنا صدمہ ان کے والدین کو ہوا ہوگا اتنا ہی دکھ محمد علی کو بھی ہوا تھا۔

جن دنوں ریاض شاہد اللہ کو پیارے ہوئے تھے، ان دنوں میں ہفت روزہ نگار کراچی میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کے طور پر کام کرتا تھا۔ اخبار نگار اور نگار ایوارڈ کے بانی جناب الیاس رشیدی بھی ریاض شاہد کے چاہنے والے دوستوں میں تھے۔ ریاض شاہد کی بیماری کے دوران جب ڈاکٹروں نے انہیں پکے پپیتے کھانے کا مشورہ دیا تھا تو الیاس بھائی ہر دوسرے روز پکے پپیتوں کی ایک پیٹی بذریعہ پی آئی اے انہیں کراچی سے بھجواتے تھے، کیونکہ ان دنوں لاہور میں پکے پپیتے نہیں ملتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی جہاں تک ان سے ممکن ہوتا تھا اپنی دوستی کا حق ادا کرتے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے 12 اکتوبر کو نگار ایوارڈ کی تقریب کراچی میں انعقاد پذیر ہونے والی تھی جس کے لیے الیاس بھائی صبح سے خاصی رات تک بے حد مصروف ہوتے تھے۔ اپنے دوستوں کے ساتھ اس کی تیاریوں میں لگے رہتے تھے۔ یکم اکتوبر کو میں وقت سے کچھ پہلے ہی دفتر پہنچ گیا تھا کہ اپنا کل کا کام بھی آج ہی نمٹا دوں کیونکہ (12 اکتوبر کو) دفتر کے تمام لوگوں کی ڈیوٹی ہونے والی تقریب کی جگہ ہوگی۔ الیاس بھائی دفتر پہنچے تو بے حد پریشان دکھائی دیئے۔ ان کی پریشانی کی وجہ جان کر دفتر کے تمام لوگ بھی پریشان ہوگئے۔

وہ (الیاس بھائی) تمام اہم شخصیتوں کو بذریعہ فون مطلع کر رہے تھے

''کل نگار ایوارڈ کی ہونے والی تقریب منسوخ کر دی گئی ہے، کیونکہ آج صبح ساڑھے سات بجے لاہور میں ریاض شاہد کا انتقال پُرملال ہوگیا ہے۔''

اس تقریب میں شرکت کے لیے لاہور سے اداکارہ شبنم ان کے شوہر روبن گھوش، اداکار سلطان راہی، ہدایت کار شریف نیر اور ہدایت کار مسعود پرویز کے علاوہ کئی فنکار کراچی پہنچ چکے تھے۔ باقی جو کل آنے والے تھے انہیں بذریعہ فون لاہور ہی میں یہ خبر پہنچا دی گئی کہ ریاض شاہد کے انتقال کے سبب ایوارڈ کی تقریب ملتوی کر دی گئی ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ 1966ء میں خلیل قیصر کا قتل

جابر رضی اللہ عنہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ انصاری

(وفات 74ھ/694)

صحابی الرسول، ابوعبداللہ کنیت۔ قبیلہ غزرج میں پیدا ہوئے، آپ کا شمار آنحضورؐ کے مشہور صحابہ میں ہوتا ہے۔ غزوہ خندق میں رسولؐ اللہ کے ہمراہ خندق کھودنے میں شامل ہوئے۔ غزوہ حنین اور غزوہ تبوک میں بھی شرکت کی۔ 10ھ میں حجۃ الوداع میں بھی شامل تھے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں اختلاف ہوا تو حضرت علیؓ کا ساتھ دیا اور 37ھ میں جنگ صفین میں حضرت علیؓ کی طرف سے لڑے۔

حضرت جابر کی زندگی کا مقصد اشاعت حدیث رہا۔ آپ نے بڑی محنت سے احادیث جمع کیں۔ آپ سے بہت سی احادیث مروی ہیں۔ آنحضورؐ کو جب بھی قرض لینے کی ضرورت پڑتی تو آپ ہی سے قرض لیتے تھے۔ آنحضورؐ کو آپ سے بہت محبت تھی۔ باوجود آسودہ حالی کے نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ سادہ خوراک کھاتے تھے جب کوئی مہمان آتا تو کوئی تکلف نہ کرتے اور جو کچھ اس وقت موجود ہوتا سامنے رکھ دیتے تھے۔ جب حجاج مدینہ کا گورنر مقرر ہوا تو اس نے آپ کے ساتھ بھی سختی کی۔ آخیر عمر میں بہت کمزور اور نابینا ہوگئے تھے۔ 94 سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اور وصیت فرمائی کہ میری نماز جنازہ حجاج نہ پڑھائے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کے فرزند نے پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

مرسلہ: نصرت جاوید، کراچی

Waqar Azeem
Pakistanipoint

بھی نگار ایوارڈ کی تقریب سے ایک دن پہلے ہو گیا تھا اور اس وقت بھی تقریب کراچی میں ہونے والی تھی جسے منسوخ کر دیا گیا تھا۔

بھائی الیاس کا اگلا اور فوری پروگرام لاہور پہنچ کر اپنے یار کا آخری دیدار اور ان کی تدفین میں شرکت تھا۔ بڑی مشکلوں سے انہیں چانس پر پی آئی اے کا ٹکٹ ملا مگر وہ لاہور پہنچے تو اس وقت مرنے والے کو منوں مٹی کے نیچے سلا دیا گیا۔ وہ ایئرپورٹ سے سیدھے قبرستان گئے تھے انہیں دو مٹھی مٹی ڈالنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا، جس کا انہیں زندگی بھر افسوس رہا کہ وہ نہ صرف اپنے دوست کا آخری دیدار کر سکے نہ اس کے جنازے کو کندھا دے سکے۔ جب میاں مرتضیٰ (ناز سنیما اور نائیلہ فلمز کے ڈسٹری بیوٹر لاہور کے مالک) اپنی کار میں لے کر لاہور ایئرپورٹ سے قبرستان پہنچے تو مرنے والے کی قبر پر پانی چھڑک کر اس پر گلاب کے پتے بکھیرے جا چکے تھے۔ انہوں نے اشکوں اور آہوں کے درمیان فاتحہ پڑھی اور وہاں سے ریاض شاہد کے آبائی مکان پہنچے۔ وہاں کوئی ستر اسی کے قریب فلمی اور غیر فلمی لوگ موجود تھے باقی جا چکے تھے۔ فلمی لوگوں میں آغا جی اے گل، ہدایت کار لئیق اختر، موسیقار نثار بزمی، طالش اور علاؤالدین قابل ذکر ہیں جو غم سے نڈھال تھے۔

ریاض شاہد کی موت کے بعد ان کی شریک حیات نیلو بیگم کی حالت صدمے سے ناگفتنی تھی۔ دیکھی نہیں جاتی تھی، یوں تو وہ ریاض شاہد کی بیماری کے دوران بھی ہر وقت روتی رہتی تھیں مگر بیوگی کا تیر سینے پر لگنے کے بعد تو ان کی آنکھوں سے نہ رکنے والا آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو گیا تھا۔ روتے روتے وہ بے ہوش ہو جاتی تھیں۔ اداکارہ زیبا، مسز آغا جی اے گل، مادام نور جہاں اور مسز چوہدری ثناء اللہ ان کو ہوش میں لانے کے لیے ان کے منہ پر پانی چھڑکتیں۔ انہیں ہوش آتا تو ان کو تسلی دیتیں، دھاڑس بندھاتیں مگر ان کے دل کو کہاں چین آتا تھا۔ چند لمحے خاموش رہ کر پھر سینہ کوبی شروع کر دیتی تھیں اور رو رو کر ایک ایک طرف دیکھ کر کہتیں۔

''میرے بچے یتیم ہو گئے، میں کہیں کی نہ رہی، ہائے ریاض شاہد! تیرے بجائے میں مر جاتی، یا اللہ! یہ کیا ہو گیا.....!!''

قسمت کی ماری نیلو بیگم کے منہ سے ایسے دلخراش کلمات سن کر وہاں موجود لوگوں کو بھی ضبط کا یارا نہ رہتا۔ ان کی آنکھوں سے بھی غم کی ندیاں بہہ نکلیں۔

نگار ایوارڈ کی جو تقریب ریاض شاہد کی موت کی وجہ سے منسوخ کر دی گئی تھی، اس کے مہمان خصوصی اس وقت کے وزیر اطلاعات ونشریات مولانا کوثر نیازی تھے۔ بھائی الیاس ایوارڈ کی مجلس استقبالیہ کے چیئرمین جناب سیف الدین ولیکا اور نیٹ ایڈورٹائزر کے مسٹر ایس ایم ہاشمی اور افتخار احمد کشمیر والا کو ساتھ لے کر مہمان خصوصی مولانا کوثر نیازی کی قیام گاہ پہنچے اور انہیں ریاض شاہد کی المناک موت کی خبر سنائی اور انہیں بتایا کہ اس وجہ سے ایوارڈ کی تقریب فی الحال ملتوی کر دی گئی ہے۔

مولانا نے بھی یہ خبر سن کر افسوس کا اظہار کیا۔ بھائی الیاس نے اس موقع پر وزیر اطلاعات ونشریات سے بصد احترام استدعا کی۔

''مولانا صاحب! آپ اپنی جانب سے ایک تعزیتی پیغام مرحوم کی بیوہ کے نام ارسال کروا دیں۔''

مولانا کوثر نیازی نے ان کی یہ رائے پسند کی اور اپنے سیکرٹری کو بلا کر بذریعہ تار اپنی اور وزارت اطلاعات و نشریات حکومت پاکستان کی جانب سے تعزیتی پیغام ارسال کروا دیا۔

WaqarAzeem
Pakistanipoint.com

یہ تنظیم سانحہ آج سے کوئی 48 برس پہلے گزرا تھا.. مگر اس کی بہت سی باتیں اب بھی یاد ہیں۔ اگرچہ وہ ترتیب سے یاد نہیں آ رہی ہیں جیسے جیسے ان کا نقش ذہن کی اسکرین پر ابھرتا ہے ویسے ویسے بیان کرتا جا رہا ہوں۔

ریاض شاہد کی موت کے بعد ان کی میت ان کے آبائی گھر میں جہاں ان کے والدین رہتے تھے لائی گئی اس مکان سے تین چار گھر چھوڑ کر ایک میں شادی کی تقریب تھی جس طرح عام طور پر ہوتا ہے اس گھر کو خوب سجایا بنایا گیا تھا، بجلی کے قمقموں سے اسے روشن کیا گیا تھا اور گانوں کی ریکارڈنگ جاری رہتی تھی۔ جب اس گھر کے لوگوں کو معلوم ہوا کہ چند گھروں کے فاصلے میں ایک میت کو آخری غسل دیا جا رہا ہے اور وہاں کا ماحول یکسر ماتمی ہے تو انہوں نے ریکارڈنگ بند کر دی، روشن قمقمے بجھا دیئے اور اپنے گھر کو بھی ان کے دکھ میں شریک کر لیا، یہ تھا اس دور کے لوگوں کا اخلاقی معیار۔

جب ریاض شاہد کا جنازہ اٹھایا گیا تو جنازے کے جلوس میں ایک اندازے کے مطابق کوئی دس ہزار کے قریب فلمی اور غیر فلمی لوگ شریک تھے۔ فلمی افراد میں اسٹوڈیوز کے قلیوں سے لے کر مالکان اسٹوڈیوز تک شریک

تھے چونکہ اس روز تمام نگار خانے مکمل طور پر بند کر دیئے گئے تھے اس لیے فلمسازی کے تمام شعبوں سے متعلق مرد و خواتین موجود تھے اور سب غم سے نڈھال تھے۔

دوستو! مرنے والا کوئی عام شخص نہیں تھا، یہ موت حقیقت میں ایک لیجنڈ کی موت تھی۔ ایک عہد ساز شخصیت اس دنیا سے رخصت ہوگئی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس نے فلموں کے لیے بامقصد کہانیاں اور مکالمے لکھ کر یہ باور کرایا تھا کہ فلموں کے ذریعے بھی معاشرے کی اصلاح اور قوم کے لیے تعمیری کام احسن طریقے پر کیا جاسکتا ہے۔ اس لکھنے والے نے جب بھی لکھا تو جرأت، جوانمردی، دردمندی اور عاجزی کے ساتھ لکھا۔ وہ اپنے دل اور ضمیر کی آواز پر لبیک کہتا تھا۔ اس نے سامراجیوں کے عزائم کو بے نقاب کرنے کے لیے لکھا مسلمانوں کو ان کی نشاۃ الثانیہ کو بیدار کرنے کے لیے لکھا۔ اپنے 15 سالہ فلمی دور میں جو 1958ء سے 1972ء کے عرصہ پر محیط ہے کم و بیش 30 فلموں کے لیے کہانیاں تحریر کیں۔ وہ جو فلم کی دنیا میں ریاض شاہد کے نام سے پکارا جاتا تھا، اس کا فلم معاشرتی برائیوں، ظلم و استبداد، غربت، محرومیوں، جبر سے روزگاری، اجتماعی پریشانیوں، ضروریاتِ زندگی کے فقدان، فرسودہ رسومات، معاشرتی طبقات اور ناانصافی کے خلاف موثر انداز سے لکھتا رہا۔ جس کا عملی ثبوت اس نے فلمساز و ہدایت کار جعفر شاہ بخاری کی ''بھروسا''، ''فیصلہ''، ''نتیجہ''، ''خلیل قیصر کی ''عجب خان''، ''کلرک''، ''شہید''، ''دوشیزہ''، ''فرنگی'' اور ''حکومت''، حسن طارق کی ''نیند''، ''سوال''، ''مجبور'' اور ''وحشی''، جمیل اختر کی ''خاموش رہو''، ''نظام لوہار''، سعود پرویز کی تاریخی فلم ''حیدر علی''، فیاض شیخ کی ''زخمی''۔ ایس اے بخاری کی ''گناہ گار'' اور ''آنسو'' عباس نوشہ کی ''ایک رات'' اور انہی کی ہدایت میں بننے والی ''سسرال''، ''مسٹر اللہ دتہ'' اور ''بہشت'' (اس فلم کو بعد ازاں حسن طارق نے مکمل کیا) ہمایوں مرزا کی ''آگ کا دریا''، کے خورشید کی ''شعلہ اور شبنم''، اقبال شہزاد کی کلاسک مووی ''بدنام'' کی کہانیاں اور مکالمے تحریر کیے۔ ان تمام فلموں کے مکالمے بھی اتنے ہی معیاری اور اعلیٰ درجے کے تھے، جتنی معیاری ان کی کہانیاں تھیں۔

یہ نابغۂ روزگار قلم کار اور فلمساز و ہدایت کار 27 اپریل 1929ء کو لاہور میں پیدا ہوا۔ ان کے والدین نے نومولود کا نام شیخ محمد ریاض رکھا مگر جب یہ بچہ بڑا ہوا اور ادب و صحافت سے اپنا ناتا جوڑا جو اس نے اپنا ادبی نام ریاض شاہد رکھ لیا۔ اس ہونہار بردار نے میٹرک سینٹرل ماڈل ہائی اسکول بھاٹی گیٹ اور گریجویشن اسلامیہ کالج لاہور سے کیا۔ عملی زندگی کا آغاز شعبۂ صحافت میں روزنامہ ''امروز'' اور ''زمیندار'' میں کالم لکھ کر کیا۔ روزنامہ ''مغربی پاکستان'' سے بھی منسلک رہے۔

ریاض شاہد کی ملاقات یزدانی جالندھری کی توسط سے فلمساز و ہدایت کار سید جعفر شاہ بخاری سے ہوئی جبکہ ان کے چھوٹے بھائی شیخ فیاض احمد بھی اس وقت بحیثیت معاون عکاس کے فلمی صنعت جوائن کر چکے تھے۔ سید جعفر شاہ بخاری کے اصرار پر انہوں نے (ریاض شاہد نے) ان کی فلم ''بھروسا'' کی کہانی اور مکالمے تحریر کیے۔ جن کو بہت پسند کیا گیا۔ یہ بامقصد فلم 2 اگست 1958ء کو ریلیز ہوئی۔ اس فلم کی کامیابی کے بعد ریاض شاہد کو کامیاب کہانی نویس اور مکالمہ نگار کی سند حاصل ہوگئی اور یکے بعد دیگرے فلمسازوں نے ان کی خدمات حاصل کرنا شروع کر دیں اور انہوں نے کئی معرکتہ آراء فلموں کی کہانیاں اور مکالمے تحریر کیے۔ ریاض شاہد نے ظلم و استبداد اور آمریت کے دور میں آنکھ کھولی، طاقتور کو کمزور پر ظلم کرتے ہوئے اور مظلوموں کا حق غصب کرتے ہوئے دیکھا اس لیے ان کی کہانیوں میں ایک احتجاج ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے قلم نے معاشرتی برائیوں اور مسلمانانِ عالم کے زوال کے اسباب کو بڑی دردمندی کے ساتھ رقم کیا۔ جس کا ثبوت معروف ناول نگار نسیم حجازی کے ناول ''غرناطہ'' پر بنائی گئی ان کی فلم ''غرناطہ'' سے دیا جاسکتا ہے۔ یہ فلم اسپین کے مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر بنائی گئی تھی۔ اس کے ہدایت کار، مکالمہ نگار اور کہانی نویس ریاض شاہد تھے۔ اس فلم سے قبل ریاض شاہد نے کشمیر کے موضوع پر ''امن'' بنائی تھی جو سنسر بورڈ کی قینچی گردی کی بھینٹ چڑھ کر ''یہ امن'' بن گئی۔ ''غرناطہ'' کو بھی سنسر بورڈ نے اپنی زیادتیوں کا شکار بنایا تھا۔ ریاض شاہد کے لیے یہ زیادتیاں بڑے صدمے کا باعث بنیں۔ ریاض شاہد نے ہمیشہ اصلاحی مقاصد کے لیے اپنے قلم کو رواں دواں رکھا۔ ریاض شاہد ہماری فلم انڈسٹری کے ایک انمول فنکار تھے۔ وہ کہانی نویس، مکالمہ نگار، فلمساز و ہدایت کار کے ساتھ ساتھ ایک اچھے نغمہ نگار بھی تھے۔ انہوں نے اپنی چند فلموں کے علاوہ دوسروں کی کچھ فلموں کے لیے بھی وقتاً فوقتاً چند گیت لکھے۔ جن میں

WaqarAzeem
Pakistanipoint.com

پاکستان کرکٹ کے ہیرو، سابق ڈی آئی جی پولیس اور پرائیڈ آف پرفارمنس فضل محمود 18 فروری 1927ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے پاکستان کی طرف سے 53-1952ء کی سیریز میں دہلی کے مقام پر بھارت کے خلاف پہلے ٹیسٹ سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ آخری ٹیسٹ 1962ء میں انگلینڈ کے خلاف اوول کے میدان پر کھیلا۔ مجموعی طور پر 34 میچوں میں 6 مرتبہ ناٹ آؤٹ رہتے ہوئے 620 رنز بنائے۔ ان کا بہترین اسکور 60 رنز رہا۔ انہوں نے ایک نصف سنچری اسکور کیا اور گیارہ وکٹیں پکڑے جب کہ 1639 اوورز کیے جن میں 560 میڈن رہے۔ 3434 رنز کے عوض 139 وکٹیں حاصل کیں۔ 5 وکٹیں 13 مرتبہ اور 4 بار 10 سے زیادہ کھلاڑیوں کو آؤٹ کیا۔ ان کی بہترین کارکردگی ایک اننگز میں 42 رنز کے عوض 7 وکٹیں رہیں۔ 1955ء میں انہیں ویزڈن کرکٹر آف دی ایئر کا اعزاز حاصل رہا۔ 10 ٹیسٹ میچوں میں پاکستانی ٹیم کی قیادت کی 2 میں ٹیم کو فتح نصیب ہوئی، دو ٹیسٹ ہارے اور دو برابر رہے۔ فضل محمود اپنے دور کے فاسٹ بالر ہی نہیں بلکہ میچ ونر بالر بھی رہے ہیں۔ سوئنگ گیند کرنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ 1954ء میں اوول کے میدان میں انگلینڈ کے خلاف 99 رنز دینے کے بعد 12 انگلش کھلاڑیوں کو پویلین کی راہ دکھا کر پاکستانی ٹیم کو کامیابی دلائی اور تاریخ ساز کارکردگی پر اوول کے ہیرو کا خطاب حاصل کیا۔ فضل محمود نے بطور اسپورٹس جرنلسٹ کرکٹ پر بے شمار مضامین لکھے بلکہ نسلی امتیاز کے خلاف ان کے لکھے ایک مضمون پر جنوبی افریقا کی ٹیم پر انٹرنیشنل کرکٹ کے دروازے بند کردیئے گئے۔ وہ ''تلاش حق'' نامی ایک کتاب کے مصنف بھی ہیں۔ کھیلوں کے فروغ اور انسانی فلاح و بہبود کے کام ان کے پسندیدہ مشاغل ہیں۔ جن دنوں وہ اسپورٹس بورڈ کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اس دور میں انہوں نے

''یہ امن'' کا گیت
☆ اڑتا ہوا وقت تھام لے ساتھی
فلم ''گنہگار'' کا گیت
☆ ہم نے تو پیار کیا ہے اک دلربا سے
فلم ''گونج'' کا گیت
☆ اے چاند لے جا چاندنی اس شب
فلم ''بہشت'' کے گیت
☆ کل تک جو کہتے تھے اپنا
☆ نقاب اٹھایئے ذرا قریب آیئے
☆ میں جو شاعر بھی ہوتا
☆ رات بھر کا ٹیں نہ کیوں خوشی سے
فلم ''میں زندہ ہوں'' کا گیت
☆ ستارو، میری یادوں کے سہارو

کے علاوہ بھی کئی اور فلمیں ہیں جن کے لیے انہوں نے نغمہ نگاری کی۔

ایسا پیارا اور بے پناہ صلاحیتوں کا شہہ پارہ، بلڈ کینسر اور سنسر کے ہاتھوں بالآخر یکم اکتوبر 1972ء کو بروز اتوار 55 برس کی عمر میں زندگی کی جنگ ہار گیا اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملا اور اسے لاہور کے پیر کلی کے قبرستان میں آسودۂ خاک کر دیا گیا۔ حق مغفرت کرے، بہت بڑا، بہت عظیم فنکار تھا۔ اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین!

ریاض شاہد ایک سچے اور کھرے پاکستانی مسلمان بھی تھے۔ انہوں نے آمریت کے دور میں بی ڈی کا الیکشن لڑ کر مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دیا تو روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ لگانے والے ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی کے اپنے علاقے کے صدر بن کر ظلم کے خلاف دیوار بن گئے۔

ریاض شاہد کو اپنی 15 سالہ فنی کیریئر میں 13 نگار ایوارڈ حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہے جبکہ کئی بار تو انہوں نے ایک فلم کے مختلف شعبوں میں 2 یا 3 نگار ایوارڈز بھی حاصل کیے۔

یوں تو ریاض شاہد اپنے اعلیٰ اخلاقی معیار کی وجہ سے اپنے حلقۂ احباب میں بہت مقبول تھے مگر کچھ فلمی شخصیتیں ان کے بہت قریب تھیں۔ جن میں ایک ہدایت کار حسن طارق بھی تھے جو ان کے آخری دنوں میں زیادہ تر اسپتال میں ان کے قریب رہتے تھے۔ جس وقت ریاض شاہد موت و حیات کی آخری کش مکش میں مبتلا تھے، انہوں نے اکھڑی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ہوئی سانسوں سے نہایت نحیف آواز میں اپنے رفیق خاص حسن طارق سے کہا......

''میری بیوی بچوں کا خیال رکھنا۔''

اس سے آگے وہ اور کچھ نہیں کہہ سکے تھے۔ ان پر غفلت طاری ہوگئی تھی۔ دوسری طرف حسن طارق اور ان کی بیگم اداکارہ رانی کی فرط غم سے آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ ان کا اتنا پیارا اور دیرینہ دوست دنیا سے جارہا تھا اور وہ اسے بچانے کے لیے کچھ بھی نہ کرسکتے تھے۔ ریاض شاہد نہ بھی کہتے تب بھی وہ ان کی عدم موجودگی میں ان کی فیملی کا خیال رکھتے۔

فلمساز راجا غفنفر علی بھی ریاض شاہد کے قریبی دوستوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ ریاض شاہد کے دم واپسیں ان کے قریب تھے۔ انہوں نے ایک دلخراش واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے ایک مختصر تحریر کی صورت میں اسے بیان کیا ہے۔ ان کی اپنی ہی زبانی یہ دلخراش کہانی سنیے۔

30 ستمبر کی رات کافی بھیگ چکی تھی۔

یونائیٹڈ کرسچن اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کے باہر مکمل سکوت طاری تھا۔ وارڈ کے دروازے کے سامنے دو ستونوں کے ساتھ ٹیک لگائے دو آدمی جانے کتنی دیر سے بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آدمی ان ستونوں کا ہی حصہ ہوں۔ ستونوں کے عقب میں دیوار کے ساتھ ایک پتھریلی بینچ پڑی تھی جس پر بیٹھی ہوئی تین عورتیں پھٹی پھٹی نظروں سے ایمرجنسی وارڈ کے دروازے کو گھور رہی تھیں۔ ان کے قریب ایک ننھی منی خوبصورت بچی بیٹھی تھی جس کے ہاتھ میں ٹوفیوں کا پیکٹ تھا۔

ایمرجنسی وارڈ کے اندر ملک کا ایک عظیم فنکار اسٹریچر پر بے ہوش، موت اور زندگی کی کش مکش میں مبتلا تھا۔ اس کے قریب ہی اس کی بیوی ایک ہاتھ فنکار کے ماتھے پر اور دوسرا اپنی آنکھوں پر رکھے نہ جانے کتنی دیر سے یونہی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہورہی تھی۔

وارڈ کے باہر بدستور مکمل سکوت طاری تھا۔ پتھریلی بینچ......پھٹی پھٹی آنکھیں......بے حس و حرکت انسان......

یکایک اس ہیبت ناک سکوت کو ننھی منی بچی کے پاؤں کی حرکت نے توڑ دیا۔ بچی بینچ سے اتر کر ستونوں کی طرف بڑھی۔ ٹک ٹک ٹک وہ چلتی ہوئی پہلے ستونوں کے قریب رکی اور اپنا ننھا ہاتھ جس میں ایک ٹافی تھی، ستون کی طرف بڑھا کر کہا...... ''انکل ٹافی کھالو۔'' انکل خاموش رہا اور ستون کی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

بادشاہی مسجد کے قریب عتیق اسٹیڈیم بنوایا، اسکوائش کے لیے بھی حتیٰ المقدور خدمات انجام دیں انہی کے دور میں مری میں کرکٹ اسٹیڈیم بنانے کی منظوری دی گئی اور اس کے لیے 12 لاکھ روپے کے فنڈز اب بھی موجود ہیں۔ فضل محمود کا کہنا ہے کہ تعلیمی اعتبار سے ہمارے دیہات بہت پسماندہ ہیں اس سلسلے میں انہوں نے اپنے طور پر ایک اسکول کی بنیاد رکھی علم دوست لوگوں کو تقلید کی راہ بھی دکھائی ہے۔

نامور فاسٹ باؤلر اور پاکستانی ٹیم کے سابق کپتان فضل محمود کا کہنا ہے کہ کرکٹ میں نام کمانے کے لیے، جسمانی طور پر فٹ ہونا نہایت ضروری ہے۔ جسمانی فٹنس نہ ہونے کے باعث ہی کھلاڑیوں کے مسلز عموماً پل ہوجاتے ہیں۔ مسلز کی مضبوطی کے لیے تیراکی بہت ضروری ہے۔ تیراکی کرنے سے جسم میں تمام اعضاء کا زور لگتا ہے۔ جسم متحرک اور مسلز مضبوط ہوجاتے ہیں۔ نوجوان کھلاڑیوں کو دیگر تمام ورزشوں کے ساتھ تیراکی بھی لازماً کرنی چاہیے۔

فضل محمود کی شادی ان کے خاندان سے باہر میاں محمد سعید کی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان کے ایک بیٹے کا انتقال کم عمری میں ہوا۔ باقی بیٹوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ بچوں نے اپنے والد کی تقلید میں کرکٹ ضرور کھیلی لیکن ان کا کہنا ہے کہ کھیلتے ہم ہیں مگر لوگ نام ابو کا لیتے ہیں اس لیے ہم کسی اور فیلڈ میں نام کمانا چاہتے ہیں۔ کھیلوں کے فروغ اور کھلاڑیوں کی فلاح و بہبود کے لیے انہوں نے جو کام کیے اس حوالے سے وہ اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں جو کچھ کرسکتا تھا اس میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اوول کے ہیرو فضل محمود ان دنوں دنیاوی آسائشوں کو بالائے طاق رکھ کر لاہور سے چار گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد آنے والی ایک تحصیل بورے والا سے مزید بارہ کلومیٹر آگے ایک گاؤں EB331 میں اپنی ایک مربع اراضی کو انسانی فلاح و بہبود کے مصرف میں لانے کے لیے سرگرم رہے۔

☆☆☆

طرف ہی دیکھتا رہا جس سے وہ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

ٹک ٹک ٹک بچی دوسرے ستونوں کے قریب پہنچی۔

ریاض شاہد کی بچی زرقا نے اپنا ہاتھ اٹھا کر کہا ''انکل ٹافی کھالو.....'' دوسرا انکل بھی خاموش رہا۔ بچی کچھ پریشان سی ہوگئی۔ آج اس کے انکل اس قدر خاموش کیوں ہیں؟ اس نے حیرت سے دونوں ستونوں کی طرف دیکھا۔ ستون، بے حس و حرکت ستون۔

ٹک ٹک پر بچی نے ایمرجنسی وارڈ کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگئی۔ وہ اسٹریچر کے قریب رکی جہاں اس کا فنکار باپ بے ہوش پڑا تھا اور جس کے قریب اس کی بیوی اپنا ایک ہاتھ اس کے ماتھے پر اور دوسرا اپنی آنکھوں پر رکھے نہ جانے کتنی دیر سے یونہی کھڑی تھی۔

بچی نے اپنا ننھا ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ''ابو! ٹافی کھالو۔ ٹافی کھالو۔''

اسٹریچر پر لیٹے ہوئے ڈھانچے میں اچانک حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے اپنی بے نور آنکھیں کھولیں اور ایک ہاتھ کو جنبش ہوئی۔ بچی نے ٹافی ابو کے ہاتھ میں تھمادی۔ بچی کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔ فنکار کی نیم وا آنکھیں پھر بند ہوگئیں۔ بچی نے ماں سے کہا۔ ''مجھے چومے بغیر ابو کیسے سوگئے۔''

راجا غضنفر علی کی اس مختصر مگر بااثر تحریر کے بعد ایک اور تحریر کی یاد آرہی ہے جو بشیر نیاز کی تحریر ہے مگر یہ بہت پرانی ہے۔ 1964ء کی تحریر ہے۔ جو ایک انٹرویو ہے اور ریاض شاہد کی گفتگو اور اظہار و افکار سے متعلق ہے۔ یہاں میں اس انٹرویو کے کچھ اقتباسات پیش کروں گا۔

سوال۔ یہ بتایئے اردو ادب نے اس مرتبے کے فنکار پیدا کئے ہیں جنہیں ہم دوسرے ممالک کے شانہ بشانہ کھڑا کرسکیں؟

ریاض شاہد۔ اردو ادب نے دنیا کے مقابلے کے فنکار یقیناً پیدا کیے ہیں اور اس دور نے راجندر سنگھ بیدی اور فیض احمد فیض سے بڑا آرٹسٹ نہیں دیا۔ ان کے بعد احمد ندیم قاسمی ہے جو بعض معاملات میں بیدی سے زیادہ حساس ہیں۔

سوال۔ بیدی آپ کے نزدیک کتنا بڑا فنکار ہے؟

ریاض شاہد۔ میں نے جب اپنی کتاب ''ہزار داستان'' لکھی تھی تو اس پر یہ فقرہ لکھ کر بیدی کو بھیجی تھی، اور یہی بیدی کے بارے میں میرا تصور ہے۔

''راجندر سنگھ بیدی کی نذر..... جس کا چہرہ سکھ، ذہن ایک انسان کا، اور دل ایک خدا کا۔ جو اپنے ہر بندے کا دکھ محسوس کرتا ہے۔''

سوال۔ فیض آپ کی نظر میں کیا ہیں؟

ریاض شاہد۔ فیض ایک ایسا بچہ ہے جسے کوئی دولت مند آدمی جنگل میں پھینک گیا ہے۔ یاسر آغا خان جو امریکی شہریت رکھتے ہوئے بھی پاکستان کی نمائندگی کرتے رہے۔ فیض اونچی سوسائٹی کا فرد ہے مگر اس کلاس کی نمائندگی کرتا ہے جو گھٹن کا شکار ہے اس لیے اس کے زخم دوسرے آرٹسٹوں کی نسبت زیادہ گہرے ہیں جو نچلے طبقے سے آئے ہیں۔

سوال۔ ریاض شاہد صاحب! بحیثیت ایک فلمی کہانی نویس یہ بتایئے۔ ہمارے ہاں ادب نے جس سطح کے ادیب پیدا کیے ہیں کیا فلم نے اس سطح کے ہدایت کار پیدا کیے ہیں؟

ریاض شاہد۔ نہیں، ابھی وہ طبقہ نہیں آیا۔ میں سمجھتا ہوں ایک ہدایت کار کو بھی فلم کے ادبی پہلوؤں کا احساس ہونا چاہیے۔ اگر اسے علمی پہلوؤں کا پتا نہ ہوگا تو وہ تخیل کے معاملے میں پیچھے رہ جائے گا اور فلم کو فن پارہ بنانے کے بجائے فلاسفی کا ایک پارہ بنا کے رکھ دے گا۔

سوال۔ آپ خلیل قیصر کے ساتھ زیادہ فلمیں کیوں لکھتے ہیں؟

ریاض شاہد۔ میرے اور خلیل قیصر کے اشتراک کی وجہ یہ ہے کہ وہ میری بات کو کہنے سے پہلے سمجھ لیتا ہے۔ جو کہنے کے بعد سمجھا جاسکتا ہے اور جس چیز کو میں نے جس فریم میں کنویس کیا ہے عموماً اس نے وہی فریم پورٹرے کیا ہے اور بعض اوقات میری بات کو زیادہ بہتر فریم میں جڑا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ شاید میں اور وہ ایک ہی ماحول، ایک ہی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ہمارے زخم ایک جتنے گہرے ہیں ورنہ عام طور پر ایسا ہوا ہے کہ میں نے جس احساس کو کاغذ پر منتقل کیا اس کا چالیس فیصد بھی اسکرین پر نہیں آیا۔

☆☆☆

دوستو! کہاں تک سنو گے، کہاں تک سناؤں۔ جی تو چاہتا ہے کہ اس بے مثل رائٹر اور ڈائریکٹر کے بارے میں لکھتا ہی جاؤں، جس کی دنیا نے قدر نہیں کی اور وہ بے وقت اور بے موت مرگیا۔ یہ ہمارے خطے کی بدنصیبی ہے کہ ہم اپنے عظیم فنکاروں کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے، ان کی خدمات کی مناسبت سے ان کی پذیرائی نہیں کرتے، ان کی قدر نہیں کرتے، افسوس..... صد افسوس.....!

++

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

خطروں کے کھلاڑی

کشمنہ حسن

انسان کی سب سے بڑی ضرورت روٹی ہے۔ روٹی جو بھوک مٹاتی ہے۔ انسان روٹی کی خاطر کیا کچھ نہیں کرتا، اپنی جان بھی دائو پر لگادیتا ہے۔ ایسے پیشے اپناتا ہے جس میں نوّے فیصد جان جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ وہ سب بھی اپنی جان ہتھیلی پر لے کر روٹی کماتے ہیں۔

انتہائی خطرناک کام کو پیشہ بنانے والوں کا تذکرہ

سامنے سے ایک ریل چلی آرہی ہے۔

گاڑی ٹھیک پٹڑیوں کے درمیان جا کر پھنس چکی ہے۔ اب ایک لمحہ ہے اور ریل اس گاڑی کے پرخچے اڑادے گی۔ بہت ہی نازک صورتِ حال ہے۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ریل قریب آتی جارہی ہے، قریب اور قریب اسی وقت گاڑی چلانے والا دروازہ کھول کر باہر جمپ لگادیتا ہے۔ ریل، گاڑی کو ٹکر ماردیتی ہے۔ گاڑی کے ٹکڑے ہوجاتے ہیں۔ ایک بھیانک دھماکا ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی گاڑی میں آگ بھی

لگ جاتی ہے۔
صرف ایک لمحے کی کہانی ہوتی ہے۔
اس واقعے کے بعد کہیں کوئی اور واقعہ ہوتا ہے۔
یہ بھی ایک بھیانک اور خطرناک واقعہ ہے۔لڑکی بہت اونچی عمارت سے پھسل جاتی ہے۔اس کی چیخ دور تک گونجتی ہے۔ایک جوان اچانک ایک چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا کر ٹریفک کی پروا کیے بغیر اس عمارت کے نیچے اپنے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔گرتی ہوئی لڑکی اس کے بازوؤں میں سمٹ آتی ہے۔لوگ اس جوان کی ہمت کو داد دیتے ہیں اور اس کے کچھ دیر بعد وہ جوان اپنی مزدوری لے کر اپنے بیوی بچوں کے پاس چلا جاتا ہے۔
یہ دونوں مناظر فلموں کے ہیں اور ان میں کارنامے دکھانے والے خطروں کے کھلاڑی ہوتے ہیں۔ وہ کھلاڑی جن کو اسٹنٹ مین کہا جاتا ہے۔ یہ ہر ایکشن فلم کی ضرورت ہوتے ہیں۔ ایسے خطرناک کام یہ بے چارے انجام دیتے ہیں اور تعریف ہیرو کی ہوتی ہے۔
یہ ڈپلی کیٹ ہوتے ہیں۔ان کی ظاہری حالت ہیرو جیسی کر دی جاتی ہے۔ ویسا ہی کوٹ، ویسا ہی ہیٹ، چشمہ وغیرہ۔
یہ بہت جان جوکھوں کا پیشہ ہوتا ہے۔ دنیا بھر کی فلم انڈسٹری میں اسے ایک الگ شعبہ تسلیم کیا جاتا ہے۔
نہ جانے کتنے ڈپلی کیٹ اسی طرح کے کارنامے دکھاتے ہوئے مر چکے ہیں لیکن ستم ظریفی دیکھیں کہ ان کی کوئی خبر اہمیت کے ساتھ شائع نہیں ہوتی۔ دو سطری خبر لگ جاتی ہے۔اسی جگہ اگر اسی فلم کے ہیرو کا انتقال ہو جائے تو اخبارات مہینوں تک خبریں دیتے رہتے ہیں۔

دنیا کی فلم انڈسٹری ایسے ناموں سے بھری ہوئی ہے جنھوں نے فلموں میں اپنی جانوں پر کھیل کر خطرناک اسٹنٹ دکھائے۔بہت سے ایسے بھی ہیں جو اپنی جان کی بازی ہار گئے۔

یہ سب کیا ہے۔یہ ہماری جبلت کی تسکین ہے۔ہم پردہ پر ایسے ایکشن دیکھ کر اپنی رگوں میں خون کو دوڑتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ہمیں ایک ایسا لطف آتا ہے جس کو انسان کی وحشیانہ جبلت ہی کہا جا سکتا ہے۔
جب فلم کے ہیرو کے پاس ایسا کوئی اسکرپٹ آتا ہے تو وہ انکار کر دیتا ہے کیونکہ اس کی زندگی بہت قیمتی ہوتی ہے، ایسے میں اس کا ڈپلی کیٹ کاسٹ کر لیا جاتا ہے اور وہی بے چارہ ہیرو کو اس عذاب سے بچا لیتا ہے۔
اس تحریر میں ہم نے ایسے کئی اسٹنٹ مین کا ذکر کیا ہے۔ ان کی زندگی کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ان میں ہالی ووڈ سے لے کر بالی ووڈ تک کے ڈپلی کیٹ شامل ہیں۔چلیں شروع کرتے ہیں۔
اس فہرست میں پہلا نام ڈارر ابنسن کا ہے۔
اس بے جگرے شخص نے فلم ”Papillon“ سے شہرت پائی جس میں اس نے مشہور اداکار اسٹیو میک کوئن کے ڈپلی کیٹ کا کردار ادا کیا تھا۔
اس کا نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں بھی شامل ہے۔
اس کو سب سے مہنگا اسٹنٹ مین کہا جاتا ہے۔ایک اسٹنٹ دکھانے کا معاوضہ ایک لاکھ ڈالر لیا کرتا تھا۔
اس کا یادگار اسٹنٹ ٹورنٹو نیشنل ٹاور سے جمپ لگانے کا تھا جس کی بلندی نو سو فٹ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کو روکنے کے لیے نیچے تار لگا دیئے گئے تھے پھر بھی یہ ایک مشکل ترین کام تھا۔
اس کا معاوضہ بھی اس نے دو لاکھ ڈالرز وصول کیا تھا۔
اس کے دوست کہا کرتے تھے۔”بھائی تم نے اچھی خاصی رقم حاصل کر لی ہے۔اب یہ کام چھوڑ دو۔وقت گزرنے کے ساتھ تمہارے اعصاب جواب دیتے جا رہے ہیں تم جو بھی کرتے ہو اس میں سوائے موت کے اور کچھ نہیں ہے۔تم کوئی اور پروفیشن اختیار کر لو۔“
وہ کہا کرتا۔”بھائی یہی تو زندگی ہے۔ ہر لمحہ زندگی سے کھیلنے کا ایڈونچر مجھے زندہ رکھتا ہے۔ ایک سنسنی سی محسوس ہوتی ہے۔ میں ہر بار خود کو فاتح محسوس کرتا ہوں۔ یہ بھی کیا زندگی ہوئی کہ دفتر میں کرسی پر بیٹھے ہو۔زندگی وہی ہے جس میں تھرل ہو۔“

وہ صرف 39 برس کا تھا جب موٹر سائیکل پر ایک اسٹنٹ دکھاتے ہوئے مر گیا۔کئی ٹرالر کے اوپر سے اسے بائیک کو جمپ لگوانا تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا اور بائیک راستے میں گر گئی۔
ہال نیڈھم
اس نے تین سو فلموں میں اپنے کرتب دکھائے اور ساڑھے تین ہزار ٹی وی شوز میں شرکت کی۔
یہ ہر قسم کے کرتب دکھانے میں مہارت رکھتا تھا۔ کار اسٹنٹ، بائیک اسٹنٹ، اونچی جگہوں سے چھلانگ لگانا،

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

آگ سے گزر جانا اور نہ جانے کیا کیا۔ اس کی مشہور فلموں میں st,lois- How the west was won وغیرہ شامل ہیں۔

شوٹنگ کے دوران اس کے جسم کی 66 ہڈیاں مختلف اوقات میں ٹوٹیں۔ ایک بار اس کی ریڑھ کی ہڈی بھی ٹوٹی تھی پھر بھی اس نے پیشے سے منہ نہیں موڑا۔ وہ اپنے کرتب دکھاتا رہا۔ فلموں سے ریٹائر ہونے کے بعد اس نے فلموں کی ہدایات دیں۔ اس نے لاکھوں کمائے۔ 82 سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوا۔

Michelle Yeoh

اس مشکل پیشے میں عام طور پر مردوں کی رسائی ہوا کرتی ہے لیکن میچلی یوہ نے عورت ہونے کے باوجود نہ صرف اس پیشے کو اختیار کیا بلکہ اس نے اپنے ٹیلنٹ سے ثابت کر دیا کہ وہ بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ اس کا تعلق ہانگ کانگ سے ہے۔

جیکی چن ایک مشہور ایکٹر ہے۔ فلموں سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص اس کو جانتا ہے۔ وہ مارشل آرٹ کا بھی ماہر ہے بلکہ اسے ماسٹر کا درجہ حاصل ہے۔ 1992ء میں اس کی فلم ''سوپر کوپ'' میں ایک اسٹنٹ خاتون کی ضرورت تھی۔

انتخاب خود جیکی چن کو اپنے معیار پر کرنا تھا۔ یہ ایک مشکل امتحان تھا لیکن میچلی یوہ نے جیکی چن کو بھی حیران کر دیا تھا۔ اس نے اتنی مہارت اور بے خوفی کے ساتھ اپنے اسٹنٹ کیے کہ خود جیکی چن کو کہنا پڑا کہ اس سے بہتر انتخاب ہو ہی نہیں سکتا۔

اس سے پہلے وہ جیمز بانڈ کی مشہور فلم tomorrow never dies میں اپنے جوہر دکھا چکی تھی۔

جیکی چن کے انتخاب کے بعد اس نے جیکی کی کئی فلموں میں کام کیا اور حیران کرتی چلی گئی۔ اس نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ عورت بھی سب کچھ کر سکتی ہے۔

صنوبر پر ڈی والا

ایسا نہیں ہے کہ اس قسم کی بے جگری عورتیں صرف ہالی ووڈ ہی میں پائی جاتی ہوں بلکہ بالی ووڈ یعنی انڈین انڈسٹری میں بھی ہوتی ہیں۔ ایک نام بہت مشہور ہے اور وہ ہے صنوبر پر ڈی والا کا۔ اس کی عمر گرچہ زیادہ نہیں ہے لیکن اس کا ہر کرتب اور ہر ایکشن کمال کا ہوتا ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ اکثر اوقات یہ بے چارے یا بے چاریاں اپنی ہڈیاں تڑوا بیٹھتے ہیں یا بری طرح زخمی ہو جاتے ہیں۔ ہو

وھابی

عبدالوہاب کے بیٹے محمد عبداللہ وہاب کا قائم کردہ فرقہ۔ بانی فرقہ 1691ء میں نجد میں پیدا ہوا۔ فرقے کو یہ نام یورپیوں نے محمد بن عبدالوہاب کی زندگی میں دے دیا تھا اور اس نام کو فرقہ کے اکثر لوگ استعمال کرتے تھے کہ یہ خود کو موحدین یعنی اک خدا کے پیروکار اور سچے لوگ کہتے تھے۔ ان کے نزدیک باقی کوئی مسلمان نہیں۔ یہ خود کو سنی بھی کہتے ہیں۔

ان کے عقائد خاص خاص یوں ہیں۔ عبادت میں کسی بزرگ نبی یا فرشتے کو وسیلہ بنانا شرک ہے۔ وحدت پرستی کے قائل مشرک ہیں۔ خدا کے سوا کسی سے شفاعت مانگنا شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے آگے التجا کرنا کسی ایسی تعلیم کی ترویج جو قرآن وسنت پہ مبنی نہ ہو کفر ہے۔ تمام افعال، قدر سے انکار کفر الحاد کے برابر ہے۔

ابتدا اس فرقے کو ماننے والے صرف چار افراد تھے۔ انہوں نے درعیہ کے مقام پر مسجد کی بنیاد رکھی اور کتاب التوحید کی تعلیم شروع کی جو مستقلاً نہ آتا اسے سزا دیتے۔ جلد ہی (1743ء) اس فرقے نے ریاض کے شیخ دحام بن دواس سے جنگ کی۔ ابن مسعود اور ان کے بیٹے عبدالعزیز بہت اچھے جنرل ثابت ہوئے۔ جلد ہی انہوں نے طاقت حاصل کر لی۔ وہابیوں کی طاقت کا مرکز مشرقی عرب میں ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں بھی ان کے ماننے والے آباد ہیں۔

سکتا ہے کہ ان کی کوئی خبر بھی نہ آتی ہو اور ان کے علاج معالجے کا کوئی خاص بندوبست بھی نہ ہوتا ہو۔

انڈیا میں بھی صنوبر پر ڈی والا موجود ہے۔ اب دیکھیں کتنی مشکل سچویشن ہے۔ ایک گھر میں بری طرح آگ لگی ہوئی ہے۔ ایک بچہ اندر پھنسا ہوا ہے۔ کسی بھی لمحے آگ کے شعلے اسے چاٹ جانے والے ہیں۔ اسی وقت ایک لڑکی کھڑکی سے اندر کود جاتی ہے۔

اس کے آگے شعلوں کی دیوار کھڑی ہے۔ بے پناہ تپش ہے۔ دوسرے کمرے سے بچے کی گھٹی گھٹی آوازیں آ رہی ہیں۔ وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر اس دیوار سے گزر کر دوسرے کمرے سے اس بچے کو بہ حفاظت نکال لاتی ہے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

تو اصل خطروں کے کھلاڑی یہ ہوئے اور ملتا کیا ہے بس معمولی سا معاوضہ۔

سلندر ناتھ رائے

اس کرتب دکھانے والے یا اسٹنٹ مین کی کہانی بھی بہت عجیب ہے۔

یہ وہ اسٹنٹ مین ہے جس کا نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل کیا گیا ہے۔ اس نے بہت سی فلموں میں اپنی بے جگری کی دھاک بٹھائی ہے۔

وہ کئی دنوں سے بیمار چلا آرہا تھا۔ بخار نے اسے بہت کمزور کردیا تھا۔ کئی مہینوں سے اسے کوئی بڑا کام بھی نہیں ملا تھا۔

پھر ایک کام اس کے پاس آگیا۔ اسے ہگلی دریا کے پل سے نیچے کھڑی کشتی میں چھلانگ لگانا تھی۔

پرابلم یہ تھی کہ اس پل کی اونچائی بہت زیادہ تھی۔

اس پل کو بڑے بڑے آہنی ستونوں پر کھڑا کیا گیا تھا۔

دوسری پرابلم یہ تھی کہ اس دن بارش بھی ہورہی تھی اسی لیے وہ کشتی بری طرح ڈول رہی تھی۔

آفر بہت اچھی تھی۔ سلندر ناتھ نے آفر قبول کرلی۔

اس کی بیوی نے کہا۔ ''ناتھ تم ابھی کمزور ہو، بیمار ہو، منع کردو۔''

ناتھ نے اپنی بیوی کو سمجھایا۔ ''دیکھو! مجھے کئی مہینوں سے کام نہیں ملا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارا سونو بھی بیمار ہے۔ (سونو اس کے چار سال کے بچے کا نام تھا) اس کے علاج کے پیسے بھی چاہئیں۔ میں منع کردوں گا تو یہ مزدوری ہاتھ سے چلی جائے گی۔ جانے دو مجھے۔''

اور وہ چلا گیا۔ کمپنی والوں نے چونکہ پبلسٹی کر رکھی تھی اسی لیے بارش اور طوفان کے باوجود بہت سے لوگ اس اسٹنٹ کو دیکھنے کے لیے جمع ہوگئے تھے۔ اچانک جال کی کئی رسیاں ٹوٹ گئیں اور سلندر ناتھ فضا میں معلق تڑپنے لگا۔

اس نے کچھ کہنے اور بتانے کی کوشش کی لیکن بارش کے شور میں اس کی آواز نہیں سنائی دی۔ وہ ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا اور لوگ محظوظ ہورہے تھے۔ تالیاں بجا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔

اس وقت وہاں موجود لوگوں کو احساس ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔

سلندر کو اوپر کھینچا گیا تو وہ بے ہوش تھا۔ اسے فوری طور پر اسپتال پہنچا دیا گیا۔ وہاں پتا چلا کہ کچھ دیر پہلے اس کا ہارٹ فیل ہوچکا ہے۔ اس کی بھوک بیماری اور بچے کی محبت نے اس کی جان لے لی۔

اب ایسا بھی نہیں ہے کہ صرف اسٹنٹ مین ہی اس قسم کا ایکشن ڈبل کے طور پر دکھاتے ہوں۔

کبھی کبھی اصل اداکار بھی اس قسم کا ایکشن دکھاتے ہوئے خود کو مجروح کرلیتے ہیں یا ان کی موت واقع ہوجاتی ہے۔

ایک بہت مشہور فلم ہے lords of the ring یہ فلم دنیا بھر میں نمائش کے لیے پیش ہوچکی ہے۔ ہمارے ملک میں بھی یہ فلم کامیابی سے چل چکی ہے۔ اس فلم کا ایک سین ہے کہ اداکار کو غصے کی حالت میں ایک لوہے کے وزنی خول کو اس طرح ٹھوکر مارنی ہے کہ وہ اڑتا ہوا کیمرے کی طرف جائے۔ اداکار کا نام تھا vigo mortinsen۔ اس نے پہلی ٹھوکر ماری جس میں مطلوبہ شدت نہیں تھی۔ ڈائریکٹر کے کہنے پر اس نے دوسری ٹھوکر اس زور سے ماری کہ اس کا ٹخنہ ٹوٹ گیا۔ وہ ایک چیخ کے ساتھ زمین پر گر پڑا اور اسے اسپتال پہنچا دیا گیا۔

اب ایک اور مشہور فلم کا نام سن لیں۔ فلم تھی cast away اس فلم میں ہیرو ایک جزیرے میں تنہا پھنس جاتا ہے۔ وہاں وہ زندگی کی جنگ لڑتا رہتا ہے۔ بالکل اکیلا۔ اس کا survive کرنا بہت مشکل ہے لیکن وہ survive کر جاتا ہے۔ اس دوران کسی چیز سے اس کا ایک پیر زخمی ہوجاتا ہے۔ عام سا زخم تھا۔ ہیرو اس کی پروا نہیں کرتا۔ واپس آکر اس زخم میں سوجن شروع ہوجاتی ہے اور تکلیف بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اسپتال جاتا ہے جہاں پتا چلتا ہے کہ اس کے زخم میں زہر پھیل رہا ہے اور پوری ٹانگ کاٹنی ہوگی۔

یہ ایک عام سی کہانی ہے۔ خطروں کے کھلاڑیوں کے ساتھ اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔

سچ ہے کہ دیوانہ آدمی کو بناتی ہیں روٹیاں۔

ایک رجحان یہ بھی ہے کہ خطروں سے کھیلنے کا رجحان بڑھتا ہی جارہا ہے۔ فلمیں اسی کی عکاس ہوا کرتی ہیں۔ اب سے چالیس پچاس سال پہلے کی فلمیں دیکھ لیں۔ کتنے سافٹ موضوعات ہوا کرتے تھے۔

یہ فلمیں محبتوں کی عکاس ہوا کرتی تھیں۔ اب نفرتوں کی عکاس ہوا کرتی ہیں۔

دیکھنے والوں کو بھی اس وقت تک مزہ نہیں آتا جب تک ہر طرف لاشیں نہ بکھری ہوں۔ خون نہ بہتا ہو۔ دھماکے نہ ہوں۔ محبت اور نرم جذبوں کی اب گنجائش ہی ختم ہوگئی ہے۔

++

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

درختوں کی دنیا

راز محمد شاہد

اس سیارہ زمین کے لیے درخت اہم ہیں، یہ بقائے انسانی کے لیے بھی ضروری ہیں کہ ان کی افادیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے چند درختوں کے بارے میں مختصر مختصر سی معلومات۔

معلومات کے شائقین کی مدارات

قدرت کی صناعی ہر شے میں نظر آتی ہے۔ شجر، پیڑ، پودے اور درخت بھی انہی میں سے ایک ہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ درخت انسان دوست ہیں۔ ہمیں ان سے بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ یہ جہاں چھاؤں دیتے ہیں وہیں غذائی ضروریات بھی پوری کرتے ہیں۔ کاغذ اور فرنیچر بنانے کے علاوہ کئی ضروریاتِ زندگی میں ان کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ پرانے وقتوں میں جب انسان کے پاس گھر نہیں تھے تو یہ درخت ہی تھے جنہیں اس

نے اپنا بسیرا بنایا۔ بھوک کے وقت درختوں کے پتے اور پھل اس کا سہارا ہوتے تھے۔ آج ان کی اہمیت پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ خصوصاً ماحولیاتی تبدیلیوں سے ان کی ضرورت واہمیت بڑھ گئی ہے مگر ہم ان پر قہر ڈھا کر اپنے لیے تباہی خرید رہے ہیں۔

دنیا میں درختوں کی بہت سی اقسام پائی جاتی ہیں، جن میں کچھ بہت دلچسپ وعجیب خصوصیات رکھتی ہیں۔ کچھ ایسے ہی دلچسپ ومنفرد خصوصیات کے حامل درختوں کا ذکر کرتا چلوں۔

روٹی کا درخت

جی ہاں، یہ دنیا کی حیرت انگیز نعمتوں میں سے ایک ہے۔ یہ بحرالکاہل کے جزیروں میں پایا جاتا ہے۔ ان درختوں پر کروی شکل کے پھل لگتے ہیں جو روٹی کی طرح کے ہوتے ہیں۔ اس پھل کا وزن 1470 ماشہ ہوتا ہے۔ ہر سال آٹھ ماہ تک اس سے پھل توڑے جاسکتے ہیں۔ ان جزائر کے لوگ اس قدرتی روٹی پر گزر بسر کرتے ہیں۔ ہم لوگ پہلے آٹا گوندھتے ہیں، پھر آگ پر روٹی پکاتے ہیں جب کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ اس درخت پر پکی پکائی روٹی عنایت فرما دیتے ہیں۔ یہی ان کی غذا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی محنت کے انہیں روٹی مہیا کر دی ہے۔ اس درخت سے ان لوگوں کو اور بھی بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ ان کے تھال اس درخت کی لکڑی سے بنے ہوتے ہیں۔ اس کی چھال سے یہ لوگ اپنے کپڑے بناتے ہیں۔ اس درخت کے تنے سے یہ اپنے ڈونگے بناتے ہیں۔

برگد کا درخت

برگد کے درخت کو ''بوڑ'' یا ''بڑ'' کا درخت بھی کہتے ہیں۔ اس درخت کا شمار دنیا کے قدیم ترین درختوں میں ہوتا ہے۔ یہ برصغیر میں جابجا نظر آتا ہے۔ اس کی خاص بات وہ لمبے لمبے ریشے ہیں جو اس کی شاخوں سے نکل کر زمین میں دھنس جاتے ہیں۔ انہیں بوڑ کی داڑھی بھی کہتے ہیں۔ یہ درخت چھتری کی مانند بہت زیادہ رقبے کو گھیر لیتا ہے۔ یہ ریشے یا داڑھی اس کی پھیلی شاخوں کو سہارا دینے میں مدد کرتے ہیں۔ یہ درخت خاص طور پر دریائے چناب کے کنارے پھیلے نظر آتے ہیں۔ ایک مؤرخ کے مطابق سکندر اعظم کی فوج کے سات ہزار سپاہیوں نے ہندوستان کی مہم کے دوران ایک ایسے ہی درخت کے نیچے آرام کیا تھا۔ آپ کو یہ پڑھ کر حیرت ہوگی کہ سری لنکا میں بڑ یا برگد کے ایک قدیم درخت کے 350 بڑے اور 3000 چھوٹے تنے ہیں جو ایک ہی درخت کے حصے ہیں۔ مزید دلچسپ بات یہ ہے کہ مغربی بنگال کے باغ نباتات، علی پور کلکتہ میں واقع ایک ایسا درخت ہے جس کے نیچے تقریباً سات ہزار انسان کھڑے ہوسکتے ہیں۔

رنگ بدلنے والا انوکھا درخت

سفیدے کے درخت کا تنا اس کے نام کی طرح سفید ہوتا ہے لیکن یہ پڑھ کر آپ حیران ہوں گے کہ سفیدے کی ایک ایسی قسم بھی پائی جاتی ہے کہ جو کسی مصور کا تیار کردہ شاہکار لگتی ہے۔ جی ہاں فلپائن، انڈونیشیا اور پاپوانیوگنی میں سفیدے کی ایک ایسی قسم پائی جاتی ہے جس کی چھال پر سرخ، سبز، پیلے، نیلے، جامنی، غرض کہ دھنک کے ساتوں رنگ کی دھاریاں موجود ہیں اور دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ کوئی درخت اتنا رنگدار بھی ہوسکتا ہے۔ ماہرین نباتات نے تحقیق کے بعد بتایا کہ اس رنگ بدلتے درخت کی چھال پہلے سفید سے براؤن ہوتی ہے پھر اس کے کچھ حصے تنے سے اکھڑتے ہیں تو ان کی جگہ گہرے سبز رنگ کی چھال آجاتی ہے۔ اسی طرح دیگر حصوں پر یہ نیلی، جامنی، سرخ اور پھر مالٹا رنگ کی ہوجاتی ہے چونکہ یہ عمل آہستہ آہستہ کئی سالوں میں تکمیل کے مراحل طے کرتا ہے اس لیے تنے پر ہر رنگ کی دھاریاں نظر آتی ہیں۔ مختلف رنگوں کا یہ خوب صورت درخت صرف مرطوب علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ درخت اپنی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ فرنیچر وکاغذ بنانے اور ملیریا کے مچھروں کو بھگانے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک دلچسپ بات کہ یہ درخت مختلف دلکش رنگوں کا مجموعہ ضرور ہے۔ تاہم اس سے بننے والا کاغذ سفید ہی ہوتا ہے۔

پانی برسانے والا درخت

انڈونیشیا کے جزیرے سماٹرا میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جو پانی برساتا ہے۔ دراصل یہ پانی کے آبی بخارات کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس درخت کے نیچے کوئی بالٹی وغیرہ رکھ دی جائے تو تھوڑی دیر میں پانی سے بھر جاتی ہے۔ لوگ اس پانی کو شوق سے پیتے ہیں کیونکہ یہ عام پانی سے میٹھا ہوتا ہے۔

گھومنے والا درخت

وسطی افریقا کے ''باسطی'' نامی گاؤں میں ایک ایسا

درخت پایا جاتا ہے جو گھوم سکتا ہے۔ تند و تیز طوفان اور بارش کے دوران دوسرے درختوں کی جڑیں اکھڑ جاتی ہیں لیکن اس درخت کی جڑیں چاروں طرف گھومتی ہیں۔ یوں یہ درخت ہوا کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مقامی لوگ درخت کی اس صورت کو دیکھ کر اسے ایک ''مقدس درخت'' قرار دیتے ہیں۔

درخت، جس کے پتوں سے کپڑے دھوئے جاتے ہیں

میکسیکو میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جو 30 فٹ اونچا ہے۔ اس درخت پر 50 سال کے بعد پھول لگتے ہیں۔ اس کے پتوں کی خاص بات یہ ہے کہ یہ صابن کا کام دیتے ہیں۔ انہیں پانی میں ڈال دیں تو جھاگ پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے کپڑے دھوئے جاتے ہیں۔

طویل القامت درخت

افریقی ملک یوگنڈا میں ایک طویل القامت درخت پایا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ہزاروں سال پرانا درخت ہے۔ اسے ''بوآب'' کے نام سے پکارتے ہیں اس کا تنا کھوکھلا ہوتا ہے۔ اس میں جمع ہو جانے والے پانی کو بطور ٹانک استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا گودا پکا کر کھایا جاتا ہے۔ ریشے سے کپڑے بنے جاتے ہیں۔ اس کے پتے بھی بطور دوا استعمال ہوتے ہیں۔ اس درخت پر موجود چھتوں سے کثیر مقدار میں شہد نکالا جاتا ہے۔ یوں اس ایک درخت سے بہت سے فوائد حاصل کیے جاتے ہیں۔

درخت، جسے خطوط آتے تھے

جرمنی میں کارل ڈیزنگ نامی ایک ڈاکیا ہوتا تھا جسے ہر روز ایک درخت پر چڑھ کر ڈاک تقسیم کرنا پڑتی تھی۔ اس ڈاکیے کے علاقے میں محبوب اور محبوبہ کا ایک درخت تھا۔ اس درخت کے نام شوہر یا بیوی کے متلاشی لوگوں کے ہر روز خطوط آتے تھے چنانچہ کارل یہ تمام خطوط درخت میں بنے ہوئے پندرہ منٹ کی بلندی پر ایک سوراخ میں ڈال دیتا تھا۔ ضرورت مند یہاں آتے تھے اور اپنا مطلوبہ خط لے جاتے تھے۔ 1800ء کے قریب ڈیوک آف اولڈ برگ نے اس درخت کو ڈاک کے پتے کے طور پر بھی استعمال کیا تھا۔ سب سے دلچسپ بات کہ بے شمار مرد و زن اس درخت کی وجہ سے شادی کے بندھن میں بندھ چکے تھے۔ اس

ٹٹیریا سانپ (Rattle Snake)

سانپ کی ایک قسم جس کی دم سخت کھردری اور کھوکھلی ہوتی ہے۔ امریکا میں اس کی ابتدائی نوع بھی پائی جاتی ہے۔ دم ہلتی ہے تو اس سے کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ رنگ خاکستری، زرد اور سیاہی مائل ہوتا ہے اور اس پر خفیف سی دھاریاں ہوتی ہیں۔ لمبائی تقریباً آٹھ فٹ تک ہوتی ہے۔

ٹرینٹ برج

انگلستان میں کرکٹ کا وہ میدان جو نوٹنگھم میں واقع ہے۔ اسے ٹرینٹ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اس میدان میں کرکٹ 1837ء میں کھیلی گئی اور پہلا ٹیسٹ میچ 1899ء میں ہوا۔ ٹرینٹ برج پر کھیلے جانے والے ٹیسٹ میچوں میں سب سے زیادہ اسکور 1938ء میں ہوا جب انگلستان نے آسٹریلیا کے خلاف کھیلتے ہوئے آٹھ کھلاڑیوں کے عوض 658 رن بنائے۔ چار کھلاڑیوں نے سنچریاں بنائیں۔ اتفاق سے اس میدان پر سب سے کم اسکور بھی انگلستان کا ہی ہے۔ 1921ء میں آسٹریلیا کے خلاف پہلا ٹیسٹ کھیلتے ہوئے انگلستان کی ٹیم صرف ایک سو بارہ رن بنا کر آؤٹ ہوگئی۔

ٹنکچر آیوڈین

ایک زہریلا محلول یا لوشن۔ یہ دوا جراثیم کو ہلاک کر دیتی ہے۔ عموماً چوٹ وغیرہ لگنے پر لگائی جاتی ہے۔ اس کے لگانے سے خون بند ہو جاتا ہے اور جراثیم زخم کے اندر داخل نہیں ہوتے۔ ورم پر لگانے سے بھی افاقہ ہوتا ہے۔ چہرے پر آنکھ کے قریب یا گلے میں لگانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ زیادہ تیز قسم کی ٹنکچر آیوڈین لگانے سے جلد جل جاتی ہے، اس لیے زخم کے مطابق تیز یا کم تیز استعمال کرنی چاہیے۔

مرسلہ: فہیم الدین، شادی پور

Waqar Azeem
Pakistanipoint

درخت کے نام دنیا بھر کے مختلف ممالک سے مراسلات آتے تھے اور اس انوکھے درخت کو دیکھنے کے لیے بھی دنیا بھر سے لوگ جاتے تھے۔

روشنی والا درخت

ایک چینی کسان نے ایک ایسا درخت دریافت کیا کہ اس سے اتنی روشنی پھوٹتی ہے کہ جس سے رات کے وقت پورا گھر روشن ہوسکتا ہے۔ کسان نے جب اس درخت کی چھال اتاری تو اسے نیلے رنگ کی روشنی نکلتی نظر آئی۔ جو آٹھ واٹ ٹیوب لائٹ کی روشنی کے برابر تھی سب سے دلچسپ بات کہ درخت خشک ہونے پر اس کی روشنی کم ہونے لگی لیکن جب اسے پانی دیا گیا تو اس کی وہی روشنی دوبارہ لوٹ آئی۔

سب سے بڑا درخت

امریکی ریاست کیلی فورنیا کی پہاڑی ڈھلوانوں پر اگنے والا دنیا کا سب سے بڑا درخت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس درخت کی لمبائی 320 فٹ تک ہوتی ہے جب کہ تنے کی گولائی 110 فٹ تک ہوتی ہے۔ اس درخت کا مجموعی وزن چھ ہزار ٹن سے زیادہ ہے۔ بوسے ماؤنٹ نیشنل پارک میں ایسے ہی ایک درخت کا تنا کاٹ کر اس میں سے سڑک گزاری گئی ہے۔ اس دیوقامت درخت کو جائنٹ سیکوئیا کہا جاتا ہے۔

سب سے اونچا درخت

جائنٹ سیکوئیا جیسا ایک درخت جسے ریڈ وڈ کا نام دیا گیا ہے۔ دنیا کا سب سے اونچا درخت ہے۔ اس کی لمبائی ساڑھے تین سو فٹ (تقریباً 105 میٹر) تک ہوتی ہے۔ ایسے درخت صرف امریکی ریاست کیلی فورنیا میں ہی پائے جاتے ہیں۔ یہ درخت صنوبر کی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور ماہرین کے مطابق ان کی عمر ڈیڑھ ہزار سال سے زیادہ ہے۔

سب سے موٹا درخت

دنیا کا سب سے موٹا درخت افریقا میں پایا جاتا ہے۔ باؤبابا کے نام سے موسوم اس درخت کے تنے کی گولائی 50 سے 70 فٹ تک ہوتی ہے۔ اس پر لگنے والے سفید پھول صرف رات کو کھلتے ہیں۔ اس درخت پر پیلے رنگ کے پھل لگتے ہیں جو سائز میں لمبے ہوتے ہیں۔ ان پھلوں کو ترش کدو اور بندروں کی روٹی بھی کہتے ہیں۔ پھل کی لمبائی ایک فٹ تک ہوتی ہے۔ اس پھل کو کھانے کے علاوہ مختلف مشروبات کے لیے اس کا رس بھی شامل کیا جاتا ہے۔

موم بتی کی شکل کا درخت

پاناما میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے... جس کی شکل موم بتی کے مشابہ ہے۔ یہ چار فٹ کے قریب ہوتا ہے۔ اس درخت کے رس سے موم بتی بنتی ہے۔

تاڑ کا درخت

بنگال کے اطراف میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جو طلوع آفتاب کے ساتھ بیدار ہوتا ہے اور تدریجاً زمین سے اٹھ کر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے لیکن جیسے جیسے سورج ڈھلتا جاتا ہے... یہ درخت بھی جھکنے لگتا ہے اور غروب آفتاب کے ساتھ ہی سربسجود ہو جاتا ہے۔

بالوں والا درخت

آسٹریلیا میں ایک ایسا حیرت انگیز درخت پایا جاتا ہے جس کے پتے انسانی بال کے مشابہ ہیں۔ انسانی بالوں جیسے پتے ہونے کی وجہ سے اسے وہاں کے لوگ ''ہیئر ٹری'' کہتے ہیں۔

درخت سیاح

یہ درخت مشرقی افریقا کے قریب جزیرہ مڈغاسکر میں پایا جاتا ہے۔ یہ درخت ایک بلند و بالا ستون کی شکل میں بے برگ و بار رہتا ہے۔ اس درخت میں 24 عدد پنکھا نما پتے ہوتے ہیں۔ یہ درخت سیاحوں کے لیے کارآمد اور مفید ہونے کی وجہ سے ''سیاح درخت'' کہلاتا ہے۔ ہر پتے کے نیچے ایک پیالہ نما حصہ ہوتا ہے جس پر وہ پتا ہر وقت سایہ کیے رہتا ہے۔ اس میں گلاس بھر نہایت میٹھا پانی ہوتا ہے۔ مسافر اس پیالے میں چاقو وغیرہ سے سوراخ کر کے پانی حاصل کرتے ہیں اور اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔

ڈبل روٹی کے ذائقے والا درخت

بریڈ فورڈ جزائر غرب الہند میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جس کی شاخوں کا چھلکا اتار کر ڈبل روٹی کی طرح کاٹ کر کھایا جاتا ہے۔ اس کی شاخوں کا مزہ بھی ڈبل روٹی جیسا ہی ہوتا ہے۔

ہزاروں افراد کی جان لینے والا درخت

بھارتی ریاست کیرالہ میں ایک ایسا درخت پایا جاتا

WaqarAzeem
Pakistanipoint.com

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ''آفیشل پیج'' کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

ہے، جس کا پھل کھانے سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد جان کی بازی ہار رہی ہے۔ اس درخت کا نام odollam cerbera ہے۔ یہ درخت کیرالہ کے علاوہ دیگر علاقوں میں بھی ملتا ہے۔ مقامی لوگ اسے ''اوتھالنگا'' کہتے ہیں۔ اس درخت کا پھل ٹینس بال کے سائز جتنا ہوتا ہے۔ اس کے بیج دل کی دھڑکن کو روکنے کا سبب بنتے ہیں۔ یوں مریض کی ہلاکت ہو جاتی ہے۔ 2004ء میں کیے گئے ایک سروے میں کیرالہ کو خودکشی کا سب سے بڑا مرکز قرار دیا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ ہر ہفتے ایک شخص اس درخت کا پھل کھا کر خودکشی کر رہا ہے۔ 2012ء میں ایک بڑا واقعہ پیش آیا جب کیرالہ کی ہی سات خواتین نے اس درخت کے پھل کھا کر خودکشی کر لی۔ ماہرین کے مطابق اس درخت کے بیج بہت زہریلے ہیں۔ ان سے چوہے مارنے کی دوا بھی تیار کی جاتی ہے۔

اژدھا نما درخت

جاپان میں 2011ء میں سونامی کی تباہ کاریوں کے بعد اژدھے کی طرح دکھائی دینے والا ایک درخت دریافت ہوا۔ تباہی کے بعد اس درخت کی کوئی شاخ نہیں بچی تھی جس سے یہ سیاحوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ یہ درخت جاپان کے ساحلی شہر ''کنیو مین'' میں عدم توجہ کے باعث خراب ہو رہا ہے۔ درخت کی انتہائی مخدوش صورتِ حال کے پیش نظر جاپان میں اب اس درخت کو محفوظ کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے چنانچہ مقامی حکومت نے اس درخت کو محفوظ بنانے کے لیے 2 لاکھ ڈالر خرچ کرنے اور اسی مقام پر اسے دوبارہ لگانے کا ارادہ کیا کیونکہ گلنے سڑنے کے باعث یہ گر گیا تھا۔ دوبارہ گرنے سے بچانے کے لیے اس کے تنے کے اندر اسٹیل لگایا جائے گا جب کہ اژدھے کے سر سے مشابہت رکھنے والے حصے کو مضبوط پلاسٹک سے دوبارہ تیار کیا جائے گا۔

خونخوار درخت

ماہرین نباتات کا کہنا ہے کہ جنوبی افریقا میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جس کے پاس سے گزرنے والے لوگ چھینکنے لگتے ہیں۔ افریقا کے ہی کئی ملکوں میں ایسے خونخوار درخت بھی پائے جاتے ہیں جو اپنے اوپر بیٹھنے والے مختلف پرندوں کو چٹ کر جاتے ہیں اور پھر وہاں ان کے صرف پر ہی ملتے ہیں۔

پانی مہیا کرنے والا درخت

آسٹریلیا کے ریگستانی علاقے میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جو اس بے آب و گیا علاقے میں بھٹکتے سیاحوں کو شفاف پانی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے تنے میں ذرا سا شگاف کیجیے اور پھر جی بھر کر پانی پی لیجیے۔

ڈنک مارنے والا درخت

فرانس اور امریکا میں بعض مقامات پر ایک ایسا درخت بھی پایا جاتا ہے جو بچھو کی طرح ڈنک مارتا ہے جس سے سخت تکلیف ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں جاندار کی موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔

مالک کا ہم شکل درخت

ہالینڈ کے شہر ''گوز'' میں شہتوت کا ایک درخت پایا جاتا ہے۔ اس درخت کی خاص اور انتہائی دلچسپ و عجیب بات یہ ہے کہ اس درخت کے تنے پر اس کو اگانے والے شخص جیک وان برین کی ہو بہو شکل قدرتی طور پر بنی ہوئی ہے۔

کاٹنے والے درخت

آسٹریلیا میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جس کے پتوں پر روئیں ہوتے ہیں اگر یہ جسم کو لگ جائیں تو سخت درد پیدا کرتے ہیں اگر اس پتے کے ڈنٹھل کو کاٹ کر اس جگہ لگایا جائے تو تکلیف رفع ہو جاتی ہے۔

حیرت انگیز درخت

1۔ یورپی ملک اسپین میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جس سے آرائش سامان، گرے، بوتل کے کارک وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ اس درخت کی خوبی یہ ہے کہ دبانے سے گود ادب جاتا ہے اور پھر جلد ہی اپنی اصل حالت میں آجاتا ہے۔

2۔ انڈونیشیا میں ایک ایسا درخت ہے جس کے پتے صراحی کی طرح بن جاتے ہیں ان میں بارش کا پانی جمع ہوتا رہتا ہے جس سے لوگ پیاس بجھاتے ہیں۔

3۔ افریقا کے ایک چھوٹے ملک سینی گال میں ایک ایسا درخت ملتا ہے جس سے مکھن جیسی چیز برآمد ہوتی ہے جسے لوگ بڑے شوق سے کھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

4۔ آپ یہ پڑھ کر یقیناً حیران ہوں گے کہ ویسٹ انڈیز میں ایسے درخت پائے جاتے ہیں جو ہلکی ہوا کے جھونکوں سے ساز کی آواز پیدا کرتے ہیں۔

++

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

Waqar
Pakistanipoint.com

مسافر قطب جنوبی

فرزانہ نگہت

وہ اکیلا پیادہ پا برفانی ویرانوں کو عبور کرکے ایک نیا ریکارڈ بنانا چاہتا تھا مگر اب اس کی جان پر آبنی تھی۔

ایک مہم جو کی زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ

اس کی ایک آنکھ شدید سوجن کے سبب بند ہو چکی تھی۔ کئی دنوں سے اسے نیند بھی نہ آرہی تھی اور وہ فریب نظر کا شکار بھی ہو چکا تھا۔ چھتیس گھنٹوں سے اس کے سامنے طرح طرح کے مناظر نمودار ہوتے اور غائب ہوتے چلے آرہے تھے۔ اپنی ایک آنکھ سے اس نے اپنے سامنے اپنے دادا کا گھر دیکھا اور جب وہ اس کی طرف بڑھا تو وہاں کچھ نہ تھا۔ اس کی دادی، اس کی بہنیں اور ان کے بچے بار بار اس کے سامنے آن کھڑے ہوتے تھے۔ وہ

جانتا تھا کہ یہ اس کا فریب نظر ہے۔ حقیقتاً ان کے وہاں موجود ہونے کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس کے دادا 2002ء میں انتقال کر چکے تھے۔ باقی افرادِ خاندان امریکا واپس جا چکے تھے۔ اسے بہرحال ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا تھا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے اپنے سامنے ابھرتی ہوئی صورتوں سے کہا۔ ''بہت جلد۔''

بار بار یہ الفاظ دہراتے ہوئے وہ اپنی ہمت بندھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ حالانکہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ اس کے بچ نکلنے کے امکانات معدوم ہوتے جا رہے تھے۔

اڑتالیس سالہ ٹوڈ کارمائیکل فلاڈیلفیا کا مہم جو تھا۔ انٹارکٹیکا میں تن تنہا سفر کرتے ہوئے اسے انتالیس دن گزر چکے تھے۔ وہ اپنی برف گاڑی جسے اس نے ''بیٹی دی پگ'' کا نام دے رکھا تھا کو کھینچتے ہوئے تقریباً گیارہ سو تیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ اس کا وزن تیئیس کلوگرام کم ہو چکا تھا اور اس کا سینہ اس طرح جکڑا ہوا تھا گویا اس کی پسلیوں پر پلاستر چڑھا دیا گیا ہو۔ ایک سو ساٹھ کلومیٹر فی گھنٹا سے چلنے والی ہوا اسے کسی باکسر کی طرح گھونسے مار رہی تھی۔

برف گاڑی بیٹی دی پگ پر سو کلوگرام وزن کا سامان (غالب حصہ خوراک) لدا تھا۔ جب کارمائیکل نے ایک ماہ پیشتر سفر کا آغاز کیا تھا تو اس وقت کے بعد اب اس سامان کا وزن ستائیس کلوگرام رہ گیا تھا لیکن اس کی طاقت و توانائی اتنی گھٹ چکی تھی کہ اسے اتنا وزن بھی بے حد بھاری معلوم ہو رہا تھا۔ اسے شک تھا کہ اس کے پیر برف گزیدگی کا شکار ہو چکے تھے لیکن انہیں دیکھنے کے لیے وہ اس خیال سے بوٹ اتارتے ہوئے ڈرتا تھا کہ ایسا کرنے سے اس کے پاؤں سوج جائیں گے وہ پھر بوٹ پہننے کے قابل نہ رہے گا۔ اس علاقے میں سفر کرنے والے بہت سے مہم جو اپنے گلے سڑے پیروں ہی کی بدولت موت کے منہ میں جا چکے تھے۔

وہ بغیر رکے چالیس گھنٹوں سے زیادہ سفر کرتا چلا آ رہا تھا۔ اختتامی منزل یعنی قطب جنوبی میں واقع امریکن ریسرچ اسٹیشن اب قریب آ گیا تھا۔ وہ اسے دور سے دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کے خیال میں یہ فریب نظر بھی ہو سکتا تھا۔

اسے اب دو چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا یا تو برف گاڑی چھوڑ کر بغیر خوراک اور ضروری اشیا کے آگے روانہ ہو جائے یا اسے گھسیٹتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھے اور موت کا خطرہ مول لے۔ وہ اس بارے میں بھی الجھن کا شکار تھا کہ اسٹیشن تک کا راستہ کس حد تک طویل یا مختصر ہو سکتا تھا؟ وہاں اسٹیشن موجود بھی تھا یا نہیں۔

بالآخر اس نے برف گاڑی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

''میں بہت جلد تمہیں لینے آ جاؤں گا بیٹی دی پگ.....'' اس نے گاڑی سے کہا۔ ''میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ ضرور آ کر تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''

گزشتہ سال بھی کارمائیکل اس قطب جنوبی کی مہم پر روانہ ہوا تھا لیکن مسلسل حملہ آور ہونے والے برفانی طوفانوں نے اسے اس مہم کو ترک کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور یہ امر اس کے لیے خاصا توہین آمیز ثابت ہوا تھا اور وہ شدید قسم کے ڈپریشن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ''ناکامیاں ہمارے لیے ناگزیر ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''اپنی اس ناکامی سے میں بے حد دل شکستہ ہوا تھا لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اس ناکامی نے میرے اندر دوبارہ کوشش کرنے کا جوش و جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ ناکامیاں ہمیں آئندہ کامیابیوں کا راستہ دکھاتی ہیں۔''

اس مرتبہ وہ ورلڈ ریکارڈ بنانے کا عزم لے کر اس سفر پر روانہ ہوا تھا۔ اس سے پہلے آٹھ دس مہم جو بھی یہی عزم لے کر قطب جنوبی پہنچے تھے کہ وہ تن تنہا گیارہ سو دس کلومیٹر کا سفر کر کے بغیر کسی مدد کے بغیر خوراک اور طبی امداد کی ترسیل اور برف گاڑی کے جانوروں کے جنوبی سمندر کے مغربی ساحل کے جیوگرافک قطب جنوبی کا سفر کریں گے مگر ان میں صرف ایک خاتون برطانوی نژاد بینا میک نیڈ کو ہی یہ مہم سرجوئی نصیب ہو سکی تھی۔ امریکی نژاد ٹوڈ کارمائیکل اس کا ریکارڈ توڑ سکتا تھا اور اکتیس دن نو گھنٹے تینتیس منٹ میں قطب جنوبی کی چوٹی پر پہنچنے والا پہلا امریکی مہم جو ثابت ہو سکتا تھا۔

''یہ مہم میرے لیے کوئی انوکھی چیز نہیں۔'' اس نے بارہ نومبر 2008ء کو اس مہم پر روانہ ہوتے ہوئے کہا تھا۔ ''کسی بھی چیلنج کو قبول کرنا انسانی فطرت میں داخل ہے۔ زمانہ قدیم ہی سے انسان کے دل میں نئی سرزمینوں کی تلاش اور کھوج کی خواہش موجزن چلی آ رہی ہے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے اس نے وسیع علاقوں کے سفر کیے ہیں۔ سامان سے لدی گاڑیاں کھینچی ہیں مصائب اور مشکلات جھیلی ہیں لیکن یہ مہم میرے لیے ایک چیلنج ہے اور میں اس سے نمٹنا جانتا ہوں۔''

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اس کی بیوی پیالیس سالہ لورین ہارٹ بھی اس کی اس مہم کی پُرجوش حامی تھی۔ ان کی ملاقات 2004ء میں اس وقت ہوئی تھی جب وہ فلاڈیلفیا ٹی وی اسٹیشن کے لیے اس کا انٹرویو لے رہی تھی۔ اس نے اس سے پوچھا تھا کہ اس نے آخر اب تک شادی کیوں نہیں کی؟

''اس لیے کہ میں ایک ٹریکر ہوں مہم جو سیاح۔'' اس نے جواب دیا تھا۔

اس کے اس جواب سے وہ سمجھ گئی تھی کہ سیاحت اور مہم جوئی اس کا کوئی مسئلہ نہیں تھا بلکہ یہ اس کی جبلت تھی۔

انہوں نے 2005ء میں شادی کرلی۔ شادی کے بعد کارمائیکل لورین کے لیے ایک بہترین شوہر ثابت ہوا۔ اس نے فلاڈیلفیا میں ایک ریسٹورنٹ کھول لیا اور اس میں مصروف ہوگیا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ اوپیرا اور تھیٹر بھی جاتا تھا اور اس کی دلچسپیوں کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ جب وہ سیاحت پر چلا جاتا تھا تو وہ بڑی شدت سے اس کی کمی محسوس کرتی تھی مگر اس کو سیاحت پر جانے سے کبھی نہ روکتی تھی۔ وہ کینسر سے شفایاب ہوئی تھی اور جانتی تھی کہ کس موقع پر کیسا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ کارمائیکل کی قطب جنوبی کی پہلی مہم کی ناکامی کے بعد یہ اس کی بیوی ہی تھی جس نے دوبارہ اس سفر کے لیے ہمت بندھائی اور اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

ایک اور شخصیت نے بھی کارمائیکل میں نیا عزم اور حوصلہ پیدا کیا تھا۔ یہ اس کے دادا تھے جو دوسری جنگِ عظیم میں فضائی فوج میں پائلٹ تھے جنہوں نے اپنے جہاز پر ''ہر دم تازہ دم اور تیار'' کے الفاظ لکھوا رکھے تھے۔ کارمائیکل نے یہ الفاظ اپنے دائیں بازو پر کندوا رکھے تھے۔

اس وقت درجہ حرارت منفی 37 ڈگری تک پہنچا ہوا تھا جب ''ہرکولیس اِن لٹ'' سے کارمائیکل نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ ہوا اور برف سے بچاؤ کے لیے اس نے اپنے رخساروں اور ناک پر پٹیاں جمائیں۔ سر پر بھاری اونی ٹوپی اوڑھی۔ آنکھوں پر عینک لگائی۔ برفانی جوتے پہنے۔ بیٹی دی پگ کو اپنے کندھے پر لادا۔ اپنے قطب نما پر نگاہ ڈالی اور اپنے سفر پر چل دیا۔

پہلے اس کا ارادہ فی گھنٹا نو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کا تھا لیکن ڈھلوانی راستے نے اس کی رفتار ایک سو پانچ کلومیٹر فی گھنٹا کردی۔ تیز و تند ہواؤں کے جھکڑ اکثر اس کے راستے میں قدآدم برف کے تودے اور جہازوں جتنے ڈھیر کھڑے کردیتے تھے... ورنہ تاحدِ نگاہ ایک وسیع و ویران علاقے کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پاکستان

میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو اسٹال پہ پرچا نہیں ملتا اس سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس 100 روپے ادا کرکے اپنا پرچا بک کروالیں۔

یا

ادارے کو 1200 روپے بھیج کر سالانہ خریدار اور 600 روپے ادا کرکے 6 ماہ کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کرسکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

تیرہ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس کے برفانی جوتے کا تسمہ ٹوٹ گیا' پھر چھڑی بھی ٹوٹ گئی۔ اس کے لیے مشکل کھڑی ہوگئی کہ وہ اب اسی راستے پر اپنا سفر کیسے جاری رکھے۔ کیا اسے وہ راستہ چھوڑ دینا چاہیے؟ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ سترہ سال کی عمر سے جب اس نے واشنگٹن کے صحرائے کولمبیا، صحرائے اعظم اور عرب صحراؤں کو چھانتے ہوئے تن تنہا سفر کیے تھے ایسے راستے اختیار کیے تھے جو تن تنہا سفر کرنے والوں کے لیے ممنوع قرار دیئے جا چکے تھے۔

''میں اب بہت دور آچکا ہوں۔ میں اب کوئی دوسرا راستہ نہیں اختیار کرسکتا۔'' اس نے ویڈیو کیمرے میں کہا جو اس نے اپنے اس سفر کا ریکارڈ بنانے اور اس کی تصدیق کے لیے ہمراہ لے لیا تھا۔ وہ بددل ضرور ہو چکا تھا لیکن میک نیڈ کا بنایا ہوا ریکارڈ توڑنے کی خواہش اس کی ہمت و حوصلے کو بلند کیے ہوئے تھی۔

دو ہفتوں کے اندر وہ میک نیڈ کے بنائے ہوئے فاصلے کے ریکارڈ سے اسّی کلومیٹر پیچھے رہ گیا تھا۔ اب اس نے اپنے معمول میں تبدیلی کی اور ستر منٹوں میں بیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اس پر یقین رکھتا تھا کہ کامیابی کی کلید بغیر کسی ردوبدل کے کلی طور پر اپنے منصوبے پر عملدرآمد میں تھی اور اس کے لیے جوش و جذبے کے ساتھ عقل سے کام لینے کی بھی ضرورت تھی۔

لیکن اکثر اوقات منصوبے کے ساتھ ساتھ چلنا ممکن نہیں رہتا۔ کارمائیکل بھی یہ بخوبی جانتا تھا۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اس کے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھارے اس کے سامنے آنے لگے۔ انٹارکٹیکا میں فطرت اپنے جال بچھائے ہوئے ہوتی ہے۔ وہاں جا بجا زمین میں بنے ہوئے گڑھوں کے اوپر برف کی تہہ کچھ اس طرح بچھی ہوتی ہے کہ دیکھنے میں زمین کی سطح بالکل ہموار معلوم ہوتی ہے۔ کارمائیکل کا پاؤں بھی ایک ایسے ہی پوشیدہ گڑھے میں پڑ گیا تھا اور وہ اس میں جا گرا تھا۔ اس نے فوراً ہی گڑھے کے کنارے کو پکڑ لیا تھا اور جوں توں کر کے اس میں سے باہر نکل آیا تھا ورنہ وہ سینکڑوں فٹ نیچے یخ بستہ نیلے سمندر میں جا گرتا۔ یہ حادثہ اس کے سفر کے چوتھے دن پیش آیا تھا۔

مسائل نے اب گرتی ہوئی برف کی طرح اس پر یلغار کردی تھی۔ اس نے اپنی عینک سے جو نیوپرین کا پردہ منسلک کر رکھا تھا وہ سخت ہو کر برف کا ٹکڑا بن گیا تھا اور اس سے اس کی ناک کی کھال اتر گئی تھی۔ ٹھٹھراؤ سے اس کے رخسار سوج گئے تھے۔ ساتویں دن وہ ایک طویل کٹے پھٹے راستے پر پہنچ گیا۔ اس راستے کو برفانی جوتوں سے نہیں بلکہ پیدل طے کیا جانا تھا۔ یہ انتہائی مشکل راستہ تھا۔ اس نے اپنے سیٹلائٹ فون پر پیٹریاٹ ہیز کیمپ سے رابطہ کر کے اپنی صورت حال بتائی۔ ''کوئی حرکت مت کرو۔'' وہاں سے ہدایت ملی۔ ''آگے مت جاؤ'' کارمائیکل نے اپنی پوزیشن کا موازنہ میک نیڈ کے ریکارڈ سے کیا۔ کچھ سوچا پھر آگے بڑھ گیا۔

اب وہ ہر روز اکتیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر رہا تھا۔ ایک دن اس نے تینتالیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرلیا۔ یہ شاید انٹارکٹیکا میں ایک ہی دن میں طے کی جانے والی طویل ترین مسافت تھی۔ اس کی کلفتوں میں اب احساسِ فخر و مسرت کا امتزاج بھی شامل ہوگیا تھا۔ وہ ایک منفرد کارنامہ سرانجام دینے جا رہا تھا۔

''زندگی کا مقصد تکالیف و حوادث سے بچنا نہیں۔'' اس نے کیمرے میں کہا۔ ''خوب صورت چیزوں کا حصول بعض اوقات بڑی مشکل اور مصائب انگیز کرنے کا متقاضی ہوتا ہے۔ میری یہ مہم بھی ایسی ہی ایک چیز ہے۔'' پھر اس نے اپنی بیوی کے بارے میں سوچا جو کینسر سے شفایاب ہوئی تھی۔ پھر اس نے اس چھ سالہ ایتھوپیائی لڑکی کے بارے میں بھی سوچا جسے وہ اور اس کی بیوی گود لینے والے تھے۔ وہ اپنے باپ بننے کے خیال سے خوش بھی تھا پُرجوش بھی۔

اس کی برف زاروں کی سیاحت کی زندگی براستہ سیٹلائٹ اسے مصروف رکھے ہوئے تھی۔ اسے قدم قدم پر دنیا بھر کے لوگوں کی طرف سے پیغامات موصول ہوتے رہتے تھے۔ وہ اپنے بیداری کے اوقات میں مطالعہ کرتا تھا۔ کھانا تیار کرتا تھا۔ اپنا خیمہ کھڑا کرتا تھا۔ پھر جب آرام کا وقت آتا تو سلیپنگ بیگ میں گھس جاتا تھا اور الارم بجنے پر بیدار ہو جاتا تھا۔ ناشتے میں وہ دلیا، چاکلیٹ، سینڈوچ اور کباب کھاتا تھا۔ یہ خوراک اس کے جسم کی حرارت برقرار رکھتی تھی۔ بھاری ناشتے اور کھانے میں وہ ہر روز آٹھ ہزار کیلوریز جزوبدن بناتا تھا لیکن مسلسل چلتے رہنے سے اس کی بارہ ہزار کیلوریز جل جاتی تھیں۔ یوں ہر روز اس کا وزن ایک کلو کم ہو جاتا تھا۔

امید و بیم کے درمیان چکراتے ہوئے وہ آگے بڑھتا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ستائیسویں دن اس کا ذہن خدشات و شبہات کی آماجگاہ بننے لگا۔ اس کا چہرہ بری طرح سے کٹ پھٹ چکا تھا آنکھوں کے نیچے تھلساؤ جیسے نشانات پڑنے لگے تھے۔ وہ ... اپ سے یہ سوال کرنے لگا تھا کہ ''آیا میرے لیے یہ ممکن ہو سکے گا کہ میں اپنا مقصد حاصل کرلوں۔'' اس نے یہ ... اپنے ویڈیو کیمرے میں ریکارڈ کیا تھا۔ چلتے چلتے وہ ہر ... برف میں دھنس جاتا تھا۔ یوں برف میں ڈبکیاں ... اور باہر نکلتے وہ ایک دن میں بمشکل چودہ گھنٹے تک ہی چل پاتا تھا۔

سینتیسویں دن وہ ابھی بھی میک نیڈ کے فاصلے سے ... کلومیٹر پیچھے تھا لیکن اب اسے اس ریکارڈ کی زیادہ فکر ... تھی۔

وہ جب قطب سے ایک سو انتیس کلومیٹر کے فاصلے ... پہنچا تو اس کا GPS ٹوٹ گیا۔ اس کا قطب نما اس کی ... اب تک رہنمائی کرسکتا تھا۔ یعنی ریسرچ اسٹیشن ... اس کے پاس اب فاصلوں کا پتا بتانے والی کوئی ... نہیں تھی۔ اب اگر وہ اندازے سے صحیح راستے پر چلتا ... تو منزل مقصود پر پہنچ سکتا تھا۔ بصورت دیگر اس کی ... یقینی تھی۔

مزید ستم یہ ہوا کہ اس کے اسٹوو نے کام کرنا بند کردیا۔ ... پاس اب برف پگھلانے اور خوراک گرم کرنے کے ... نہ رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن ... سیٹلائٹ فون مردہ پڑ چکا تھا۔ اس نے اس کی مرمت ... کی مگر بے سود۔

اس نے برطانوی مہم جو رابرٹ فالکن سکاٹ کے ... میں سوچا جو 1912ء میں محفوظ جگہ سے اٹھارہ کلومیٹر دوری پر مرگیا تھا۔ ''میں قطب سے دو دن کی مسافت پر ہوں۔ کوئی نہیں جانتا کہ میں کہاں ہوں۔ یہ عین ممکن ہے میں یہیں پر مرجاؤں۔'' اس نے سوچا۔

اس وقت تک اس کے پٹھے ڈھیلے پڑ چکے تھے اور اس کے [illegible] رسیوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ اس کے ... برف گزیدگی کا شکار ہو چکے تھے اور اسے کھانسی ... خون کے ذرات آنے لگے تھے۔ فریب نظر کا شکار ... اکثر اپنے سامنے اپنے عزیزوں رشتے داروں کو ... اور غائب ہوتے دیکھنے لگا تھا۔

اس کی برف گاڑی میں اس کا خیمہ اور دیگر لوازمات ... اب تک برف گاڑی بھی اسے احساسِ تحفظ عطا کیے ہوئے تھی۔ وہ اس کے لیے ایک وفادار ساتھی چلی آرہی تھی لیکن اب وہ اسے ایک بھاری بوجھ معلوم ہونے لگی تھی۔

اس نے اسے کندھے سے اتارا، کھولا اور اس میں سے اپنا کیمرا نکالا اور آگے بڑھ گیا لیکن چند قدم چل کر وہ رک گیا۔ پھر واپس مڑا۔ برف گاڑی کے بغیر اسے تنہائی اور اکیلے پن کا احساس ستانے لگا تھا لیکن پھر وہ آگے بڑھ گیا اسٹیشن کو نظروں میں رکھتے ہوئے راستہ طے کرنے لگا۔ جب کبھی اسٹیشن اس کی نظروں سے اوجھل ہوتا تو وہ واپس مڑ کر راستے کو دیکھتا بھالتا اور صحیح راستے پر چل پڑتا۔

پھر 21 دسمبر کو سینتالیس گھنٹے تک چلتے رہنے کے بعد وہ قطب جنوبی اسٹیشن کی چوڑی ہوائی پٹی پر پہنچ گیا۔

اسٹیشن والوں کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ ٹوڈ کار مائیکل وہاں پہنچ رہا ہے مگر کب؟ وہ یہ نہ جانتے تھے۔ کار مائیکل کے قریب پہنچتے پہنچتے ایک عورت اسٹیشن سے باہر نکلی اور اس کی سمت نظریں دوڑانے لگی۔ اس نے اسے آتے دیکھ لیا اور اس کی جانب ہاتھ ہلانے لگی۔ وہاں گاڑے ہوئے پول کی طرف اشارہ کیا۔ کار مائیکل نے اسے پول کو ہاتھ لگایا۔ اس نے بالآخر میک نیڈ کا قائم کردہ ریکارڈ دو گھنٹوں کے فرق سے توڑ ہی دیا تھا۔ اس پر وہ بے پناہ مسرور تھا اور متفکر بھی لیکن اس کی حالت اس وقت بے حد خستہ ہو رہی تھی۔ وہ کچھ بے چین و مضطرب بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اس عورت سے کہا۔ ''میں اپنی ساتھی۔ بیٹی دی پگ کو لینے جانے چاہتا ہوں۔'' وہ عورت کچھ نہ سمجھی اور اسے اندر لے گئی۔

''ہم تمہارے لیے کیا کرسکتے ہیں؟'' اس نے کار مائیکل سے پوچھا۔

''مجھے کھانے کے لیے کچھ مل جائے۔''

وہ ایک ماہ تک چار ہزار کیلوریز یومیہ پر گزارا کرتا چلا آرہا تھا۔ اب اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا دماغ بھی خالی خالی سا ہو رہا ہے۔ اسے قریب ہی تلے ہوئے انڈوں اور گوشت کی اشتہا انگیز مہک سنگھائی دی تھی۔ اسے تقریباً چھ ہفتوں سے ایسی کوئی خوراک کھانے کو نہ ملی تھی۔

''مجھے افسوس ہے ہم ٹورسٹوں کو نہیں کھلا پلا سکتے۔'' وہ عورت بولی۔

''مجھے اس وقت کیلوریز کی سخت ضرورت ہے۔ مجھے کچھ مصالحے دے دیجیے میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ ہاں اگر تھوڑی سی چینی بھی مل جائے۔''

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

لیکن اسٹیشن کے اصول بڑے سخت تھے۔ خوراک صرف سرکاری اہل کاروں کے لیے ہی مخصوص تھی۔ اس اسٹیشن پر ایک سیزن میں سووزیٹر آیا کرتے تھے۔ جن میں غالب تعداد ان امیر ٹورسٹوں کی ہوتی تھی جو بذریعہ ہوائی جہاز وہاں پہنچتے تھے۔ وہ وہاں کی تصاویر کھینچتے تھے اور رخصت ہو جاتے تھے۔ مہم جوؤں کی ایک مختصر سی ٹیم اسکائی لاسٹ ڈگری نامی کلب کے راستے وہاں پہنچتی تھی۔ وہ نواسی سے نوّے ڈگری جنوبی عرض بلد کے راستوں کی دیکھ ریکھ کرتی تھی۔ یہ ایک سو گیارہ کلو میٹر کا سفر ہوتا تھا۔ مہم جو کار مائیکل کی طرح ماؤنٹ ایورسٹ کو ڈزنی ورلڈ کی طرح کی ایک شاندار چیز قرار دیتے تھے۔ ہر سال چھوٹے چھوٹے گروپوں میں وہاں پہنچتے تھے۔ انہیں بھی دوسروں کی طرح اپنا خیال خود رکھنا پڑتا تھا۔ ایک بڑے سے ڈبے میں کار مائیکل نے پیٹریاٹ ہل سے اپنے لیے سامان خوراک اور دیگر اشیا گرانے کا انتظام کیا تھا اور طے شدہ منصوبے کے مطابق وہ ڈبا اس کے راستے میں گرا دیا تھا لیکن وہ اسے کہیں نہ ملا تھا اور نہ ہی اس میں اسے کھینچنے کی ہمت رہی تھی۔ اسے سانس لینے میں بھی دشواری ہونے لگی تھی۔

اس نے اس عورت سے کہا کہ وہ اسٹیشن مینیجر سے اسے کچھ رعایت دلانے کی بات کرے۔ جب وہ چلی گئی تو کچن کا ایک ملازم اس کے پاس آیا اور اسے دو بڑے بڑے چاکلیٹ کیک دے گیا جو اس نے فوراً ہی پیٹ میں اتار لیے۔ اس کے بعد وہ اسٹیشن کی طرف سے مہیا کیے جانے والے خیمے میں چلا گیا کیونکہ وہاں پہنچنے والوں کو عمارت کے اندر سونے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ گٹھڑی بن کر بیخ بستہ فرش پر لیٹ گیا اور سو گیا۔

اس وقت تک اسٹیشن کے اسٹاف کو معلوم ہو چکا تھا کہ کار مائیکل کوئی ٹورسٹ نہیں تھا۔ اسے واقعی ان کی مدد کی ضرورت تھی۔ جب اسٹیشن مینیجر نے اسے نیند کی حالت میں کھانستے اور خون کے ذرات اگلتے دیکھا تو اس نے فوراً ہی اسٹیشن کے میڈیکل اسٹاف کو متحرک کر دیا۔ انہوں نے اس کے پھیپھڑوں کا ایکسرے لیا اور اسے نیبولائزر پر لگا دیا۔ اڑتالیس گھنٹوں بعد اس کے پھیپھڑوں کی استعداد پچاس فی صد تک بحال ہو گئی۔

''وہ خوش قسمت تھا جو زندہ رہ گیا۔'' کار مائیکل کا علاج کرنے والے ڈاکٹر وین مور نے کہا تھا۔ ''ورنہ اسے دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ وہ چند گھنٹوں تک بھی زندہ رہ سکے گا۔ اس کی سانس کی نالی اس حد تک سوج چکی تھی کہ اس میں سے ہوا کا بمشکل ہی گزر ہو پاتا تھا۔''

کار مائیکل کے اسٹیشن پہنچنے کا وقت بھی اس کے حق میں مبارک ثابت ہوا تھا۔ اگلے دن اس علاقے کو دھند کی ایسی دبیز چادر نے ڈھانپ لیا کہ چند گز سے آگے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا اگر اس وقت کار مائیکل راستے میں ہی ہوتا تو اسے اسٹیشن پر پہنچنے میں کئی دن لگ سکتے تھے۔

اب اسٹیشن پر ہر کوئی کار مائیکل کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہوا جا رہا تھا۔

جب اس کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو اس نے اسٹاف سے اپنی اس مہم کے بارے میں بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ''میرا خیال تھا مجھے سننے کے لیے چھ سات آدمی ہی آئیں گے مگر ڈیڑھ سو سے زائد لوگ آ گئے۔'' اس نے بعد میں بتایا تھا۔

اس نے مکمل طور پر صحت یاب ہونے تک چار دن اسٹیشن پر گزارے پھر تین دن فلاڈیلفیا پہنچنے میں لگائے۔ اس کی جلد ابھی تک کئی پھٹی تھی اور اس کا وزن دس کلو گرام تک کم ہو چکا تھا لیکن وہ اب ہر طرح سے ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس نے بالآخر اپنا مقصد حاصل کر ہی لیا تھا۔ اس نے قطب جنوبی تک پہنچنے کا ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا تھا۔

''کس چیز نے اسے اس مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی تحریک دی تھی؟'' اس سوال کے جواب میں اس نے کہا۔ ''میری بھرپور خود اعتمادی نے۔''

اس مہم کی کامیابی پر اسے بے شمار فیکسٹ میسجز موصول ہوئے۔ ان میں سے بہت سے ان لوگوں کے تھے جنہوں نے کینسر اور دیگر موذی امراض سے شفا پائی تھی۔ ان پیغامات نے بھی اس کی ہمت و حوصلے کو بلند کیا۔

''مجھے احساس تھا کہ مجھے ان لوگوں کو ہرگز مایوس نہیں کرنا چاہیے جو مجھ سے اس عظیم کامیابی کی توقع لگائے بیٹھے تھے۔ اس احساس نے میری ہمت اور حوصلہ پست نہ ہونے دیا۔ تحریک و ترغیب ایک محبت کی طرح ہوتی ہے۔''

پھر جب وہ گھر پہنچا تو ایک خوش خبری اس کی منتظر تھی۔ ان کے یمی کو گود لینے کی قانونی کارروائی مکمل ہو چکی تھی اور اب ایک دو ماہ میں وہ ان کے پاس آیا ہی چاہتی تھی ان کی بیٹی بن کر۔

++

Wadar Azeem
Pakistanipoint.com

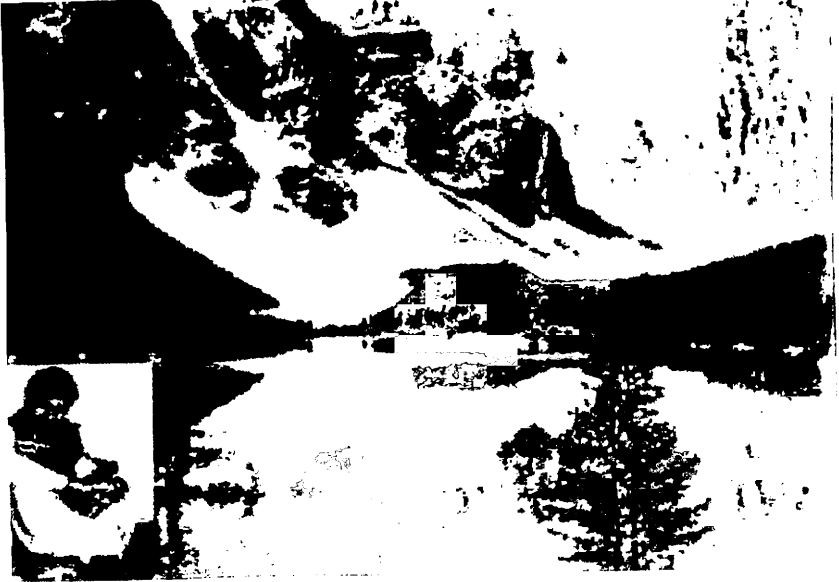

سفر پہلا پہلا

ندیم اقبال

احساسات، جذبات، فہم و فراست، حکمت و تدبر اور مشاہدے کو الفاظ کا پیرہن دینا۔ اندازِ بیان کے مختلف قرینوں، سلیقوں سے ناسٹلجیائی کیفیات اور عصری صورتِ حال کو اپنی اظہاری صلاحیت کے ذریعے قارئین کی نذر کرنا، اس طرح پیش کرنا کہ پہلی سطر سے آخری سطر تک قاری اسیر رہے۔ یہ کمال ہے ندیم اقبال کا۔ ”نانگا پربت کا عقاب“ اور ”شمشال سے ٹورنٹو“ کے بعد ان کا یہ تیسرا سفر نامہ جو جوانی کے ابتدائی ایام کا احوال ہے اور ایک نئے انداز سے لکھا گیا ہے، قارئین کو پسند آئے گا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ایک نوجوان کے احساسات و جذبات میں گندھی سفر کہانی کا بارھواں حصہ

میں نے کشمیرن کے بھائی کو کمرے میں لا کر خالی بیڈ پر بیٹھا دیا۔ طارق کے علاوہ گلو اور امتیاز بھی خراٹے لے رہے تھے۔ اتنے بھاری خراٹوں کی وجہ سے میں کچھ شرمندگی بھی محسوس کرنے لگا۔ میں اس سے بولا۔ ”توقیر بھائی۔ یہ بیڈ اب آپ کا ہے۔ آرام کرنا ہے تو لیٹ جائیں ورنہ بیٹھے بھی رہ سکتے ہیں۔“

”میری وجہ سے آپ کو بہت زحمت ہوئی۔ میں بہت شکر گزار ہوں۔“ وہ واقعی شرمندہ نظر آ رہا تھا، اور میں سوچ رہا تھا جسے تم زحمت سمجھتے ہو اس کے لیے طارق تمہیں اپنے بستر پر سلا کر ساری رات تمہارے سرہانے بھی کھڑا رہ سکتا ہے۔ میں نے کہا۔ ”اپنے ہی تو اپنوں کے کام آتے ہیں۔ آپ ایسا کچھ نہ سوچیں اور ریلیکس ہو جائیں۔“

میں نے ارادہ کیا تھا کہ طارق کو اتنی بڑی خبر اچانک نہیں دوں گا کہ کہیں کچھ کر نہ بیٹھے۔ وقتی طور پر دماغی توازن کھو بیٹھنے کا امکان بہرحال موجود تھا پھر توقیر سے طارق کا غائبانہ تعارف کرایا۔ دوسروں کا بھی کرایا مگر اہمیت طارق ہی کو دی۔ اپنا رشتہ بھی بتایا اور اس کے ذہن میں یہ بھی ڈالنے کی کوشش کی کہ ہو سکتا ہے ہم آپس میں مستقبل کے رشتہ دار بھی ہوں۔

میں خود طارق کے بیڈ پر پاؤں کی جانب آ بیٹھا تھا۔ انتہائی ملائم لہجے میں اس سے کہا۔ ”طارق اٹھ کر دیکھو کون آیا ہے؟“

جواب میں صرف بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ وہ کچھ ہلا جلا اور پھر ساکت ہو گیا۔

میں دوبارہ بولا۔ ”جاگ جاؤ۔ شام ہونے والی ہے......“

اب کی بار اس نے رضائی کے اندر صرف ٹانگیں چلائیں۔ جب میں نے ہلکی سی رضائی کھینچ کر اپنی بات

دہرائی تو کرخت آواز میں بولا۔ ''کیا ہے؟''

اس کا لہجہ سن کر میں شرمندہ سا ہو گیا۔ میں نے اگلی ٹرائی کی۔ ''دیکھو تو سہی کون آیا ہے؟''

پھر رضائی کے اندر سے اس کی ڈانٹ آئی ''جاتا ہے کہ نہیں۔ اپنے کام سے کام رکھ۔ نکل یہاں سے.....''

مجھے غصہ آ گیا۔ میں بھول گیا کہ ساتھ کون بیٹھا ہے۔ طارق کے اوپر سے رضائی کھینچی اور ساتھ بیٹھے تو قیر پر اسے پھینکتے ہوئے کہا۔

''اٹھتا ہے کہ نہیں۔ پورا دن کشمیرن کے پیچھے روتے رہتے ہو اور شام کو چرسیوں کی طرح سو جاتے ہو۔''

یہ سننا تھا کہ طیش میں بستر سے اٹھا اور چھلانگ مار کر نیچے اتر آیا۔ آنکھیں سرخ اور بال بکھرے تھے۔ وہ مرنے مارنے پر آ گیا۔ ''کئی بار تم کو کہا ہے کہ اس بیچاری کا نام نہ لیا کر مگر تجھے تو بیماری ہے۔''

میں نے بھی آستینیں چڑھا لیں۔ اتنے میں رضائی تلے تو قیر کو طارق نے ہلتے دیکھا تو سب بھول کر وہیں کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے پوچھنے لگا۔ ''کوئی جانور تو نہیں پکڑ لائے؟''

اتنے میں ہاتھ پاؤں چلا کر تو قیر اپنے اوپر سے رضائی ہٹا چکا تھا۔ اس پر شدید گھبراہٹ طاری تھی۔ طارق نے اسے دیکھا تو ایکدم ساکت ہو گیا۔ ''یہ لڑکا کون ہے؟''

''میرا دوست ہے.....''

''میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔'' پھر وہ تو قیر کی جانب متوجہ ہوا اور درشت لہجے میں اس سے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

''جی جی..... میں تو قیر.....'' یہ کہتے ہوئے تو قیر میری جانب دیکھنے لگا تھا۔

''کون تو قیر.....'' میری جانب اشارہ کر کے بولا۔ ''یہ تم کو لایا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں میں لایا ہوں، پھر؟''

مجھ سے بولا۔ ''تم سے تو بعد میں نمٹوں گا۔ پہلے اس لڑکے کو دیکھ لوں۔''

''کیا دیکھ لوں؟'' میں نے کہا۔

میں خود طارق کو بھڑکا رہا تھا تاکہ جتنی وہ بے عزتی کر سکتا ہے کر لے، بعد میں پچھتانا بھی تو اسی نے تھا۔

''کمرے میں مفت ٹھہرانے کے لیے لڑکا پکڑ کر لائے ہو؟ میں تمہاری حرکتوں کو جانتا ہوں۔''

میں نے سوچا کہیں اسے بازو سے پکڑ کر نکال نہ دے پھر اسے سب بتایا کہ کون ہے اور کس کا بھائی ہے اور یہاں کیوں بیٹھا ہوا ہے۔ سن کر طارق پہلے لرزا، پھر زرد ہوا اور اس کے بعد جیسے کسی نے جسم کا سارا خون پی لیا ہو۔ نڈھال ہو کر بستر پر سر پکڑے بیٹھ گیا۔ امتیاز اور گلو رضائیوں سے چہرے نکالے یہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ تو قیر بوکھلایا ہمارے چہرے دیکھ رہا تھا اور طارق کی حالت تو ظاہر ہے دیکھنے والی تھی۔ مسکرانے کی کوشش میں رونے والا لگتا۔ کبھی خوش نظر آنے کی کوشش کرتا اور کبھی اپنے کیے پر دکھی نظر آتا پھر اس نے ہمت باندھی، پہلے ہتھیلیوں سے آنکھیں ملیں، بال درست کیے اور خوشی و غم کے عالم میں تو قیر سے بڑھ کر مصافحہ کیا، پھر مجھے دیکھ کر دوستی بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''یہ ابھی پہنچے ہیں؟''

میں نے اکھڑے لہجے میں کہا۔ ''جی.....''

''تم کو کہاں ملے؟''

''سڑک پر.....''

یہ سن کر پھیکا پھیکا مسکرانے لگا پھر پوچھا۔ ''بے چارے ہوٹل ڈھونڈ رہے ہوں گے؟''

طارق کو جو لوگ اچھے لگتے ہیں ان کو بے چارہ کہنے لگتا ہے۔

میں نے جواب دیا۔ ''ہاں، ہوٹل ڈھونڈ رہے تھے؟''

''ان کو یہاں لا کر بڑی ذمے داری کا کام کیا ہے۔'' پھر اگلا سوال سوچنے کے بعد بولا۔ ''بے چارے تھک گئے ہوں گے؟''

''معلوم نہیں۔ اگر کہو تو پوچھ آتا ہوں۔'' میں نے باہر جاتے ہوئے کہا۔

مجھے دروازے کے قریب روک کر بولا۔ ''بیچاروں کو آرام کرنے دو۔ بعد میں پوچھ لیں گے۔''

میں نے بتایا۔ ''لگتا ہے ایک بیچاری، یعنی لڑکی بہت تھکی ہوئی تھی۔''

''انھیں چائے کا پوچھ لیتے؟''

''میں نے پوچھ کر آرڈر کر دیا تھا۔''

''یہ بہت اچھا کیا، بہت اچھا کیا۔'' مجھے وہ ترحم بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر تو قیر سے پوچھا۔ ''تم نے چائے پینی ہے؟''

''شکریہ۔ ابھی نہیں پینی۔''

''پی لیں۔ ایک کپ سے کچھ نہیں ہوتا۔''

گلو بولا۔ ''ہوتا تو دو کپ سے بھی کچھ نہیں ہے۔''

امتیاز نے کہا۔ ''دو کپ سے اکثر ہو جاتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہونا ہو تو ایک کپ سے بھی ہو جاتا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

(دائیں سے) قاضی صاحب، ڈاکٹر اکرم، گاڑی پر بیٹھا میں (ندیم)
(پیچھے) ستار دائیں جانب طارق، طارق کے پیچھے سلیم، ظفر، نصیر (سفاری میں) طاہر سلیم (پوائنٹ پر) مائیک

ہے۔''

طارق نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا ہو جاتا ہے.....؟''

امتیاز بولا۔ ''وہ جو ایک کپ سے نہیں ہوتا۔''

کچھ لمحے وہ غور کرتا رہا کہ آخر چائے پینے سے کیا ہو جاتا ہے اور آخر کار سر جھٹک کر تو قیر سے اس کا نام پوچھا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟''

''تو قیر.....''

نام سن کر۔ ''ہیں.....'' اتنے زور سے کہا کہ تو قیر سمیت میں بھی دہل گیا، وہ ڈر کر بولا۔ ''میں نے نہیں نام ابو نے رکھا تھا۔''

مگر طارق نے اس کا جواب سنا ان سنا کر دیا اور پوچھا۔ ''آپ بھی اس کی طرح نہیں تھکے؟''

''کس کی طرح؟''

میں نے تو قیر کو کلیر کیا۔ ''باجی کی طرح.....''

''ان کا تو معلوم نہیں مگر میں نہیں تھکا۔''

''الٹیاں بھی نہیں آئیں؟''

''جی نہیں آئیں۔''

طارق دل شکستہ ہو گیا۔ ''کسی کو بھی نہیں آئیں؟''

طارق کو بغور دیکھ کر وہ بولا۔ ''جی کسی کو نہیں آئیں۔''

معلوم نہیں طارق کیوں مایوس و مغموم تھا اور کچھ سوچ بھی رہا تھا۔ سوچتے سوچتے کچھ نہ سوجھا تو پوچھ بیٹھا۔

''کھڑے کیوں ہیں، بیٹھ جائیں۔ تھک جائیں گے۔''

تو قیر پریشانی کے عالم میں طارق کو دیکھنے لگا کیونکہ وہ تو بیٹھا ہوا تھا۔ طارق کو اپنی غلطی کا ادراک ہوا تو کہا۔ ''پھر پانی پی لیں؟'' یہ کہہ کر وہ گلاس ڈھونڈنے لگا۔ میں نے سائیڈ ٹیبل سے خالی گلاس اٹھا کر طارق کے ہاتھ میں تھما دیا۔

طارق نے خالی گلاس بڑھایا تو تو قیر ہلکے ترش لہجے میں بولا۔ ''مجھے نہیں پینا.....''

پھر مجھے گلاس تھما کر تو قیر سے شکوہ کیا۔ ''اتنا تکلف کیوں کر رہے ہیں؟ نہ چائے پی رہے ہیں نہ پانی؟''

پھر کچھ جمود چھا گیا۔ طارق دراصل شدید بوکھلا چکا تھا اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے اپنی غلطی کا ازالہ کرے اور اس کا دل بھی جیت لے۔ ہم سب اس کے بولنے کا انتظار کر رہے تھے کہ اچانک تو قیر کی ٹانگوں پر پڑی رضائی اٹھائی اور کہا۔

''آپ سو جائیں.....''

''مگر کیوں؟''

''بندہ بیٹھے بیٹھے تھک جاتا ہے۔''

یہ سن کر تو قیر مدد طالب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ طارق کو کچھ معلوم نہ تھا کہ کہاں اور کس کے سامنے کھڑا ہے اور کیا کر رہا ہے۔ اچانک طارق بلند آواز میں بولا۔

''آپ کیا کر رہے ہیں؟''

تو قیر لرزتی آواز میں بولا۔ ''کیا کر رہا ہوں؟''

''مطلب پڑھائی میں کیا کر رہے ہیں؟''

ایک گہرا سانس لے کر اس نے کہا۔ ''انٹر کے رزلٹ کا انتظار کر رہا ہوں۔''

اب طارق نے شک بھرے لہجے میں پوچھا۔

''واقعی؟''

جب پوچھنے کو کچھ نہ رہ گیا تو طارق پھیکا پھیکا مسکرانے لگا۔ جواب میں تو قیر بھی اسی کی طرح مسکرا رہا تھا۔ مسکراتے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ہوئے دونوں بور ہونے لگے تو امتیاز نے طارق کی مدد کی۔ ''تم تو ابھی نیند میں بول رہے تھے کہ مجھے باتھ روم جانا ہے۔''

''اوہ، وہ تو میں بھول گیا تھا۔'' پھر تو قیر کو شرمائی نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ''چلو باتھ روم ہی ہو آتے ہیں۔''

اب کی بار میں نے اپنی مداخلت ضروری سمجھی۔ طارق سے کہا۔ ''لوگ قبر اور باتھ روم میں اکیلے جاتے ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے۔ مجھے معلوم ہے۔'' یہ کہہ کر مجھے گھورتا ہوا بلاوجہ باتھ روم میں گھس گیا۔

☆☆☆

کشمیرن اور اس کی سہیلیوں کی آنے کی خبر ہوٹل کے دونوں کمروں میں ایک آگ کی طرح پھیل گئی۔ اس آگ کی حدت سے سارے دوست تمتمانے لگے۔ دونوں کمروں کے باسی کسی خواب خرگوش سے بیدار ہوئے اور ایکدم تازہ دم ہوگئے۔ جاگرز پلنگوں تلے کھسکا کر بوٹ نکالے جارہے تھے۔ کوئی خود کو سونگھ کر سردی میں نہا رہا ہے۔ استری کے گرد جھگڑا ہو رہا ہے۔ کپڑوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا جارہا ہے۔ کوئی کسی سے کچھ مانگتا تو دوسرا اس کو بری طرح سے دھتکار دیتا۔ کوئی اپنے کپڑوں کے متعلق رائے مانگتا تو رتی برابر اسے توجہ نہ ملتی۔ پرفیوم کسی کونے میں جاکر چوری چھپے چھڑکے جارہے تھے۔ کوئی آئینے کے سامنے کھڑا اپنا جائزہ لے رہا تھا اور کوئی دوسرے کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ غرض ایک نفسانفسی کا دور تھا جہاں ہر ایک خودغرض بنا ہوا تھا۔ ان سب کے بیچ میں اور سائیں ویلے ویلے گھوم رہے تھے۔

اسی دوران میں ڈائننگ ہال کے متعدد چکر لگا چکا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ کنول لالو سر لیک دیکھ کر واپس آچکی ہے کہ نہیں۔ میرے خیال میں آگئی ہوگی۔ اگر آگئی ہے تو کمرے میں آرام کر رہی ہوگی مگر صبح تو اس کو بولا تھا کہ شام کو انتظار کروں گا۔ اب شام آچکی ہے تو کم از کم ایک بار باہر جھانک لیتی کہ میں دیوانہ وار اس کو دیکھنے کے لیے بے تاب پھر رہا ہوں۔ میں کبھی ڈائننگ ہال میں آبیٹھتا اور کبھی باہر اسے ہواؤں فضاؤں میں تلاش کرنے لگتا۔

ایک بار کمرے میں گیا تو دیکھا طارق شرٹ پر جھکا استری کر رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر چوکنا ہوگیا اور بولا۔ ''دیکھو کوئی گڑبڑ نہیں کرنی۔ بیچاریاں کیا کہیں گیں کہ ڈیرہ والوں کو بالکل تمیز نہیں۔''

میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''تمہاری یہ کالی پینٹ پہن لوں؟''

''جو دل کرتا ہے پہن لے، اوڑھ لے، اور بڑے کہتے ہیں انسان کی عزت اس کی زبان تلے ہوتی ہے۔''

''اور وہ تیرا پرفیوم کہاں ہے؟''

''کون سا؟''

''جو کہتے تھے مجھے فرزانہ نے دیا ہے۔''

وہ اب استری چھوڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔ ''فرزانہ کا نام تجھ کو آج یاد آنا تھا؟ خدا کا نام مان، جس طرح میں اسے بھول گیا ہوں تو بھی اسے بھول جا۔''

''وہ پرفیوم؟''

''بیگ میں پڑا ہے مگر زیادہ نہیں تھوپنا۔''

میں نے پرفیوم خود پر چھڑکتے ہوئے پوچھا۔ ''اور ستار کیا کہتا ہے میں نشہ کرتا ہوں۔''

''وہ جہاں کا کوڑا (جھوٹا) بندہ ہے۔ اس کی بات سنا ہی نہ کر اور دیکھ اس بیچاری کے سامنے میری کوئی بات نہ کرنا۔''

سوتے تو قیر کو دیکھ کر میں نے کہا۔ ''لگتا ہے تیرا سالا سو گیا ہے۔''

وہ جھانک کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بیچارہ تھکا ہوا ہے۔ بڑی مشکل سے تو سویا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اسے الٹیاں بھی آئی ہوں گی۔''

☆☆☆

میں ایک بار پاکستان میں کسی مینجمنٹ ٹریننگ پر گیا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ جب آپ اپنے دفتر میں کوئی خوبصورت لڑکی رکھتے ہیں تو وہ آتے ہی ماحول تبدیل کر کے رکھ دیتی ہے۔ ہر کوئی خوش اخلاق اور خوش لباس ہو جاتا ہے۔ جلدی دفتر آجاتے ہیں اور دیر تک رکے رہتے ہیں۔ ہر ایک بندہ دوسرے سے اچھا بننے کی کوشش میں لگا ہوتا ہے۔

یہاں بھی ایسا ہی کچھ ہو رہا تھا۔ پہلے ہر ایک آزادی اور مزے سے گھوم رہا تھا۔ ہر ایک منہ پھٹ اور بدتمیز ہو چکا تھا۔ نہ کسی کو اپنے کپڑوں کی فکر تھی اور نہ بال بنانے کا تردد تھا۔ کھانے کے علاوہ کسی کو کسی چیز کی جستجو نہ تھی۔ لڑکیوں کے آنے کی خبر آئی تو ہر ایک اسمارٹ اور سوبر بن گیا۔ اب تو کوئی کھل کر قہقہہ بھی نہیں لگا رہا تھا۔ دوسروں کے عیب بڑے نظر آنے لگے۔ ہر کوئی دوسرے کو رقیبانہ نظروں سے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

دیکھنے لگا۔

پھر سب نے ایک متفقہ فیصلہ کیا کہ لڑکیوں کو آج رات ڈنر کی دعوت دینی ہے۔ مجھے کہا گیا کہ چاروں لڑکیاں کسی نہ کسی وقت تم کو بھائی کہہ چکی ہیں لہٰذا یہ دعوت لے کر تم ہی جاؤ گے۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا، جا کر ان کے دروازے پر دستک دے دی۔

میں چہرے پر مسکراہٹ سجا کر کھڑا تھا۔ دروازہ کھلا تو سامنے کنول مجھے حیران نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اسے وہاں دیکھ کر میں منہ کھولے کھڑا رہ گیا۔ میرے ذہن میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہ آیا کہ میں نے غلطی سے لڑکیوں کے بجائے کنول کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا دیا ہے۔ وہ دونوں کمرے متصل تھے اور یہیں مجھ سے چوک ہو گئی اور لڑکیوں کے بجائے میں کنول کے دروازے پر آ گیا۔ میں حیران یوں تھا کہ یہ لڑکیوں کے کمرے میں کیا کر رہی ہے۔ ذہن میں یہی آیا کہ یا تو یہ ایک دوسرے کو پہلے سے جانتی ہیں یا ان کی یہ دوستی ابھی یہاں آ کر ہوئی ہے۔

میں نے مسکرا کر اندر اشارہ کیا۔ ''کب سے جانتی ہیں ان کو؟''

''کیا مطلب کب سے جانتی ہوں؟''

''رشتہ دار ہیں کیا؟''

''جی؟''

''اتنی جلدی ان کو بھی دوست بنا لیا۔ بڑا ٹیلنٹ ہے آپ میں.....''

وہ مجھے تیکھی نظروں سے دیکھنے لگی۔

''میں کتنی دیر سے انتظار کر رہا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا۔ آپ ان لوگوں سے گھل مل کر بیٹھی ہیں۔''

وہ حیرت اور صدمے سے بولی: ''مجھ سے آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟''

میں رعونت سے اندر اشارہ کر کے بولا۔ ''آپ سے نہیں ان سے بات کرنے آیا ہوں۔''

اپنی جانب سے میں کنول کو نظر انداز کر رہا تھا مگر وہ سہم گئی۔ ''ان سے کیا بات کرنی ہے؟''

چہرے پر مسکراہٹ لا کر بولا۔ ''آپ کو کیوں بتاؤں۔ ہماری اپنی باتیں بھی تو ہو سکتی ہیں۔''

''آپ پلیز یہاں سے چلے جائیں.....'' وہ رونے والی ہو گئی۔

میں اترا کر بولا۔ ''صاف کہیں کہ جل گئی ہیں۔''

اس کے چہرے پر رنج اور دکھ کی کیفیت تھی۔ اتنے میں کمرے کے اندر سے اس کی والدہ کی آواز آئی۔ ''دروازے پر کون ہے؟''

ایک پل کے ہزارویں حصے میں مجھے ادراک ہو گیا کہ میں لڑکیوں کے نہیں بلکہ ان کے کمرے کے باہر کھڑا ہوں۔ میں بوکھلا گیا۔ وہ مجھے شک بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے کچھ نہ سوجھا تو میں نے ساتھ والے دروازے پر دستک دے دی۔ میری اس حرکت پر وہ زیادہ بوکھلا گئی۔ وہ سمجھ نہ سکی کہ میں ساتھ والے دروازے پر کیوں دستک دے رہا ہوں۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ سب ایک غلط فہمی میں ہو گیا ہے۔ وہ کچھ نہ سمجھ کر زیادہ پریشان ہو گئی۔

دوسرے کمرے کا دروازہ طاہرہ نے کھولا۔ جب ہم دونوں کو پریشان کھڑے دیکھا تو وہ بھی پہلی زرد پڑ گئی۔ وہ ہمیں ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے خدانخواستہ ہماری کوئی چوری رنگے ہاتھوں پکڑ لی ہو۔ انتہائی صدمے کی حالت میں اس نے پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''کچھ بھی تو نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے کنول کی جانب اشارہ کیا۔ ''یہی اسے بھی سمجھا رہا ہوں کہ سب غلط فہمی میں ہوا ہے۔''

ادھر طاہرہ مجھے آوارہ سمجھ رہی تھی اور دوسری جانب کنول قہر بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

اندر سے اس کی ماں کی آواز دوبارہ آئی تو کنول نے انھیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ ساتھ والے کمرے کی ایک لڑکی سے بات کر رہی ہوں۔

بمشکل میں اپنی اس حرکت کی وضاحت دیتا رہا۔ جب یہ معاملہ کلیر ہوا اور طاہرہ نے بھی میری شرافت کی گواہی دی تو کنول کے چہرے پر آیا تناؤ اترا۔ وہ مسکرائی تو میری جان میں جان آئی۔

اس سے کہا۔ ''اب تو خوش ہو کہ میں غلطی سے آپ کے دروازے پر آ گیا۔''

اپنی مسکراتی نظریں میری آنکھوں میں ڈال کر بولی۔ ''خوش نہیں ہوں.....''

''وہ کیوں؟''

''آپ غلطی سے دروازے پر کیوں آئے۔''

میں اس کے کہے الفاظ کے معنی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ شکوہ کر رہی تھی کہ غلطی سے کیوں، سیدھا کیوں

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

نہیں چلا آیا؟ اس کے لہجے سے محبت ٹپکتی تھی، آنکھوں سے پیار چھلکتا تھا۔ اس سے امڈ کر آتی چاہت نے مجھے سرتاسر ڈبو دیا۔ لڑکیوں کو رات کے کھانے کی دعوت دے کر میں ان الفاظ کے سحر میں ڈوبا باہر آ گیا۔ تادیر اس کے کہے الفاظ کو گلے لگائے بیٹھا رہا۔ برستی چاندنی نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ ہوائیں مجھے گدگدانے چلی آئیں۔ میں خود کو اس کے ہمراہ فضاؤں میں اڑتا محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

ڈائننگ ہال میں اکرام نے تین میزیں ایک ساتھ لگا کر ہمارے لیے ایک بڑی میز بنا دی تھی۔ لڑکیوں کے ساتھ ہم سب بہت مسرور بیٹھے تھے۔ طارق نے توقیر سے دوستی استوار کر لی تھی۔ اس سے کھسر پھسر کرتے طارق ایک ملتجانہ نظر مجھ پر بھی ڈال جاتا۔ توقیر طارق کی کسی بات پر ہنس دیتا، کسی بات پر مسکرا پڑتا اور کسی بات پر سنجیدہ ہو جاتا۔ کشمیرن اپنے بھائی کو مصروف دیکھ کر اپنی جگہ مطمئن بیٹھی تھی۔ جب طارق کو تشکر بھری نظروں سے دیکھتی تو وہ ٹماٹر سے زیادہ سرخ اور ہمالیہ جتنا شرمانے لگتا۔

ادھر مائیک ثروت سے فرینک ہو رہا تھا۔ اس سے پوچھ رہا تھا..... ”آپ نے کبھی Perry Steve یا Halen-Van کو سنا ہے؟“

وہ بولی۔ ”میری سمجھ میں انگریزی گانے نہیں آتے۔“

”کوئی مشکل نہیں۔ میں سمجھا دوں گا۔ دیکھنا آپ کو بہت مزہ آئے گا۔“

”اکتا کر بولی۔ ”مجھے نہیں سننا.....“

مگر مائیک بضد تھا۔ ”اگر پسند نہ آئے تو جرمانہ دوں گا۔“

”نہیں پلیز آپ خود سنیں۔ مجھے صرف عزیز میاں کی قوالیاں پسند ہیں۔“

”وہ تو میں نہیں سنتا۔“

”لگتا ہے آپ باہر پلے بڑھے ہیں؟“

فرید بولا۔ ”اگر آپ گھر سے باہر کی بات کر رہی ہیں تو ایسا نہیں ہے۔ ہماری خالہ نے اپنے اکلوتے لڑکے کو کبھی گھر سے باہر نہیں جانے دیا.....“

ثروت نے مائیک سے کہا۔ ”بھائی۔ اپنی زبان اور اپنا کلچر سب سے اچھا ہوتا ہے۔“

بھائی کا لقب ملنے پر مائیک اداسی سے چھت کو گھورنے لگا۔

دوسری جانب شہزاد خالدہ سے پہلے کی طرح الجھا ہوا تھا۔ ”آپ جیکٹ کے بغیر بہت حسین لگ رہی ہیں۔“

وہ پھٹ کر بولی۔ ”میں نے آپ سے پوچھا ہے۔“

”یہی تو غم ہے خالدہ کہ آپ پوچھتیں کیوں نہیں۔“

”لیکن میں آپ سے کیوں پوچھوں؟“

”خالدہ، میرا دل کرتا ہے آپ کی اتنی تعریف کروں کہ آپ خود شک میں پڑ جائیں۔“

”آپ دل سنبھال کر رکھیں۔“

”آپ دل دے کر آزمالیں۔ یوں سنبھال کر رکھوں گا جیسے سانپ خزانے پر بیٹھا ہوتا ہے۔“

سن کر وہ ہنس پڑی۔

”جیکٹ سے زیادہ آپ ہنستے ہوئے اچھی لگتی ہیں۔“ شہزاد سنجیدگی سے بولا۔

اب ہم ہنس رہے تھے اور خالدہ نے سر پکڑ لیا تھا۔

☆☆☆

میرا دھیان دوستوں کی باتوں سے ہٹ گیا جب دیکھا کہ کنول لبوں پر مسکراہٹ سجائے ڈائننگ آئی ہے۔ یوں لگا گھپ اندھیرے میں شمع روشن ہو گئی ہو۔

اس کے گھر والوں نے ہمارے ساتھ اتنی لڑکیاں دیکھیں تو وہ حیران نظر آئے۔ اتنے دنوں سے وہ ہمیں آوارہ لڑکوں کی طرح گھومتا پھرتا دیکھ رہے تھے۔ اب ہمارے ساتھ مہذب لڑکیاں دیکھیں تو ان کا چونکنا لازمی امر تھا۔ چھڑے لڑکوں سے لڑکیوں کے والدین چڑتے ہیں۔ وہی لڑکے اگر خواتین کے ہمراہ ہوں تو وہ ریلکس ہو جاتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں خطروں کی گھنٹیاں نہیں بجتیں۔ اب ان لڑکیوں کی بدولت ہمیں بھی شرافت کا لائسنس ملنے والا تھا۔ کنول کے خاندان تک میری رسائی بھی آسان ہو سکتی تھی۔

کنول آئی اور اس نے فضا بدل دی۔ جس طرح بہار اپنے ہمراہ خوشبو لاتی ہے، وہ اپنے ساتھ مسرتیں لے آئی تھی۔ ماحول بدلا اور انداز بدل گئے۔ جیسے چاند سے چاندنی پھوٹتی ہے اسی طرح اس کے چہرے سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ میز پر کہنیاں ٹکائے وہ اپنے نازک ہاتھوں سے کھیلنے لگی۔ غیر ارادی طور پر اس کی نظریں مجھ پر ٹھہرتیں اور پھر آس پاس بھٹکنے لگتیں۔ جب مسکراتی تو گالوں کے ڈمپل نمایاں ہو جاتے۔ وہ ایک خوبصورت کھیل تھا جس کا ہم

Waqar Azeem
Pakistanipoint

دونوں حصہ تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا طاہرہ کی آنکھیں ہم پر لگی ہیں۔

کشمیرن بتانے لگی۔ ''سنا ہے آپ لوگوں نے نو ٹراؤٹ مچھلیاں شکار کی ہیں۔''

فرید آہستگی سے بولا۔ ''تھیں تو پانچ مگر یہ خود کو ملا کر نو بتا رہی ہے.....''

ایک لڑکی کہنے لگی کہ مجھے بھی فشنگ کا بہت شوق ہے۔

میں بحث بڑھانے کی خاطر بولا۔ ''لڑکیوں کے لیے بہت مشکل ہے۔ اس میں صبر اور خاموشی چاہیے ہوتی ہے۔''

وہیں سے آواز آئی۔ ''عورت میں بڑا صبر ہوتا ہے۔''

میں نے بتایا۔ ''صبر صرف ماں میں ہوتا ہے جب وہ اپنے بچے کو جنم دیتی ہے۔''

''تو آپ کا مطلب ہے کہ عورت جب تک ماں نہیں بنتی اس میں صبر نہیں ہوتا۔''

''ہوتا ہوگا..... مگر مرد سے کم ہوتا ہے۔''

''ندیم بھائی! آپ بھی عام مردوں کی طرح عورت کو کمتر سمجھتے ہیں؟''

ایک اور لڑکی نے احتجاج درج کرایا۔ ''عورت میں قربانی، وفا، ایثار اور صبر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ آپ عورت کے بارے میں غلط کہہ رہے ہیں۔''

میں اپنے علم کا تاثر بڑھانے کی خاطر فلسفہ جھاڑنے لگا.....

''ہوسکتا ہے میں غلط کہہ رہا ہوں مگر یہ بھی غلط نہیں کہ شائد میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ آپ میری بات کو جھوٹ اور سچ کے قدیم نظریے کے تحت پڑھیں تو ہم سچ اور جھوٹ کو بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ جو بات کسی کو اچھی لگے سچ کہلاتی ہے۔ جس کو وہ مسترد کرتا ہے اسے وہ جھوٹ کہتا ہے مگر اب تک کے سارے فلاسفر ایک بات پر یکساں ہیں کہ ہر چیز قیاس سے شروع ہوتی ہے۔ قیاس پر جمہور جب متفق ہو جائے تو وہ بات سچ کہلانے لگتی ہے۔ اس قیاس پر سب لوگ متفق ہوئے تھے کہ مرد میں علم اور عورت میں دانش ہوتی ہے۔ یہ بات بھی لوگ مانتے ہیں کہ عورت کمزور نہیں بلکہ مرد سے زیادہ مضبوط ہے مگر ان نظریوں کو آپ تو مانیں گیں مگر شاید میرے دوست نہ مانیں۔ تو لہٰذا ہر ایک کا اپنا سچ اور ہر ایک کا اپنا جھوٹ ہوتا ہے۔''

طاہرہ نے پوچھا۔ ''آپ نے دو مختلف باتیں کی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر ایک کا اپنا سچ اور جھوٹ ہوتا ہے۔ دوسری یہ کہ سچ جھوٹ وہ ہوتا ہے جس پر جمہور یعنی اکثریت متفق ہو جائے۔ آپ بتائیں آپ کی کون سی بات ٹھیک ہے۔''

میں نے بڑے دانشمندانہ انداز میں اپنی بات کو آگے بڑھایا۔ ''سچ ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے۔ جس بات کی نفی دل کرے وہ جھوٹ اور باقی سچ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اپنے فائدے کے لیے کبھی کبھار حقیقت کو چھپانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ سچ اور جھوٹ کے درمیان امتیاز اللہ نے ہمیں سکھا دیا ہے۔ جھوٹ میں اضطراب اور سچ میں تسکین محسوس ہوتی ہے۔ یہ اور بات کہ اللہ کسی کو اندھا، گونگا اور بہرا کردے۔''

''لگتا ہے آپ فلسفی ہیں؟''

میں نے دھاک جمانے کی خاطر کہا۔ ''ہم فلسفی اس لیے بن جاتے ہیں کہ اپنے الفاظ سے دوسروں پر رعب ڈال سکیں۔ یہ اتنا مشکل کام بھی نہیں۔ چند نہ سمجھ آنے والی باتیں رٹ لیں، کہیں بھی اس طرح کی جمی محفل دیکھیں تو سنجیدہ اور پروقار چہرہ بنا کر انہی باتوں کو بہترین اداکاری کر کے بیان کردیں۔ جب دیکھیں کہ لوگ بات سن کر بھی الجھے بیٹھے ہیں تو سمجھیں آپ کا چلایا تیر نشانے پر جا بیٹھا ہے۔''

''تو آپ ہم پر رعب ڈال رہے تھے؟''

''آپ یہی سمجھیں کہ میں رعب جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی لیے کہتے ہیں کسی پر پہلی ملاقات میں مکمل بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔''

سب لڑکیاں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ کنول کی نگاہیں میری جانب بار بار اٹھ رہی تھیں۔ میرا حدف کسی حد تک حاصل ہو چکا تھا۔ اب میں نے موضوع بدلنے کی خاطر سائیں کو چھیڑا جو کسی وجد میں آنکھیں موندے بیٹھے تھے۔ ہونٹ ان کے متواتر ہل رہے تھے۔ ان کے کندھے کو ذرا سا جھنجوڑ کر بولا۔ ''استاد جی! لگتا ہے آپ سو گئے ہیں؟''

ہڑبڑا کر اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر مجھے دیکھنے کے بعد بولے۔ ''مجھے اس حالت میں کبھی ہاتھ نہ لگانا۔ میری تو خیر ہے مگر نظر نہ آنے والے ملاقاتیوں کو یہ حرکت ناگوار گزرتی ہے۔''

''معاف کردیں استاد جی۔ معلوم نہ تھا کہ کوئی آیا ہوا ہے۔ اگر مہمان موجود ہیں تو ان سے معافی چاہتا ہوں۔''

سائیں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا، بولے۔ ''کندھا ہلا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کر انھیں اڑا دیا اور اب کہتا ہے مہمان موجود ہیں؟ جب دوبارہ آئیں گے تو بتا دوں گا۔ یاد سے معافی مانگ لینا۔''

''نہیں استاد جی..... انھیں ابھی ابھی واپس بلائیں۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔''

سائیں بولا۔ ''ہمارے درباروں کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔ سوالی اگر ایک بار چلا گیا تو واپسی تین دن سے پہلے نہیں ہوتی۔''

میں نے رنج بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''چاچا شفیع بھی گیا؟''

نہیں میں سر ہلا کر بولے۔ ''وہ دربار کا نہیں بلکہ دروازے کا نگران ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاتا۔''

فرید نے پوچھا۔ ''وہ زنانی سے ملنے گیا ہے کہ کمرے میں لیٹا ہے؟''

''نہ کمرے میں ہے اور نہ زنانی سے ملنے گیا ہے.....'' پھر کنول کی والدہ کی جانب آنکھ کا اشارہ کیا..... ''اس بی بی کے پیچھے بیٹھا تسبیح پڑھ رہا ہے۔''

اس کی والدہ نے مڑ کے خالی کونے کو دیکھا اور پھر ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ فرید نے کھڑے ہو کر خالی کونے کو بہ آواز بلند سلام کر ڈالا۔ امتیاز نے صرف ہاتھ ہلانے پر اکتفا کیا۔ ہمارے ساتھ بیٹھی لڑکیاں پٹ پٹ سبھی کونے کو اور کبھی سائیں کو دیکھتی تھیں۔

تو قیر حیرت و استعجاب کے عالم میں بیٹھا تھا۔ طارق سے پوچھا۔ ''کونا تو خالی پڑا ہے اور یہ چاچا شفیع کون ہے؟''

کسی نے سمجھایا۔ ''چاچا شفیع دراصل سائیں کا خاص عامل ہے۔ وہ ہے تو ذات کا جن مگر زندگی کے پانچ سو سال انسانوں میں گزار چکا ہے۔''

تو قیر حیران اور ڈری نظروں سے سب کو دیکھے جا رہا تھا۔ لڑکیاں گو سائیں کی ''کرامات'' جانتی تھیں مگر ایک نظر نہ آنے والے جن کی قربت نے انھیں بھی لرزا دیا۔

شہزاد نے بتایا۔ ''ہم تو گنہگار لوگ ہیں اسی لیے ہمیں وہ نظر نہیں آتے، مگر سائیں اسے حکم دیں تو ابھی اپنا دیدار سب کو کرا دیں گے۔''

کنول کی والدہ تصدیق کے لیے اپنے شوہر کی جانب دیکھ رہی تھیں اور وہ سر جھکائے مسکرا رہے تھے۔ سائیں نے آنکھیں موند لیں۔ تو قیر انھیں دیکھ کر کسی سے پوچھنے لگا۔ ''یہ جادوگر ہیں.....؟''

''آہستہ بولو۔'' فرید چہرے پر خوف طاری کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ سندھ کے ایک بڑے پیر کے بہت بڑے خلیفہ ہیں۔ سائیں تو جادوگر کہنے پر معاف کر دیں گے۔ چاچا شفیع غصے میں آ گئے تو سائیں کی بھی نہیں سنتے۔''

خالدہ نے پوچھا۔ ''چاچا کے کوئی دوست بھی آئے ہوئے ہیں؟ طارق بھائی نے ابھی بتایا ہے۔''

شہزاد بولا۔ ''تم کو یاداشت بڑھانے کا دم کرد انا چاہیے۔ یاد نہیں جب ٹھنڈیانی پر ایک چیتا ساتھ دو جنوں کے ملنے آ گیا تھا۔ یہ وہی لوگ ہیں۔''

وہ گھبرا کر بولی۔ ''نہیں۔ مجھے یاد تو ہے مگر سمجھی کوئی اور مہمان ہیں.....''

اتنے میں ہم سب کے لیے سوپ آ گیا۔ تو قیر ذرا سہم کر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ اس ہوٹل میں ٹھہر کر پچھتا رہا ہے۔

ستار نے سائیں سے استدعا کی کہ سوپ سے پہلے ذرا بچے کو دم کر دیں۔

سائیں کو ستار نے عین سوپ پینے کے دوران سوال کر کے غصہ دلا دیا۔ اس نے گھور کر ستار کو دیکھا۔ سوپ سے بھرا چمچ واپس پیالے میں رکھا اور زیر لب کوئی نہایت مختصر سا دم پڑھ کر تو قیر پر پھونک دیا پھر سے چمچ سوپ سے بھر کر منہ کے قریب لائے ہی تھے کہ میں نے کہا۔ ''استاد جی پورے ہال پر پھونک دیں۔ لگتا ہے سب ڈر گئے ہیں۔''

چمچ مونچھوں کے قریب لیے ترچھی نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ آنکھوں میں غصہ چھلک رہا تھا۔ دانت پیستے ہوئے چمچ کو دوبارہ پیالے میں رکھا۔ کچھ لمحے اپنا غصہ ضبط کرتے رہے پھر بغیر کچھ پڑھے ایک لمبی پھونک پورے ہال پر پھیر دی۔ اس کے بعد بھرا پیالہ اٹھایا۔ میں سمجھا اسے منہ لگانے والے ہیں مگر اسے مونچھوں کے قریب لائے اور چمچ بھر بھر کر پیالہ لمحوں میں خالی کر دیا۔

دوسری جانب فرید تو قیر کو تسلی دے رہا تھا۔ ''چاچا شفیع سے کبھی نہ ڈرنا۔ ذات کے تو جن ہیں مگر کردار فرشتوں والا ہے۔ جنات تو ان کو طعنے دیتے ہیں کہ ہم میں کیا کر رہے ہو جا کر انسانوں میں بیٹھو۔ اتنے نیک کہ کیا بتاؤں۔ ایک بار صبح کی نماز پر جب نہیں اٹھے تو اذان دے کر ہمیں بیدار کر دیا تھا۔''

ستار نے بات آگے بڑھائی۔ ''اتنے با اصول اور ایماندار کہ ایسا جن ہم نے پہلے نہ دیکھا اور نہ سنا۔ درخواست کی کہ کیمسٹری کا پرچہ بتا دیں مگر نہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint

مانے۔ منتیں بھی کیں مگر ضد پر آ گئے۔ پیر سائیں تو کبھی کسی کی سفارش نہیں کرتے لہٰذا ہم نے موسیٰ زئی کے پیر سے کہلوایا..... پھر بھی نہ مانے۔ چاچا بولا اصولوں پر تو جنگ ہے۔ فزکس کا پرچہ بتا دیا مگر کیمسٹری کا پھر بھی نہ بتایا۔''

طاہرہ نے سب سے پوچھا۔ ''آپ لوگوں کو ڈر نہیں لگتا.....؟''

امتیاز نے کہا۔ ''شروع میں لگتا تھا مگر اب تو ہنسی آتی ہے.....''

فرید نے بتایا۔ ''اب بھی چپ بیٹھے ہوں تو آکر سر پر شفقت کا ہاتھ پھیر جاتے ہیں۔ تسلی ہو جاتی ہے کہ کسی بزرگ کا دست شفقت ہم پر ہے۔''

فرید نے سائیں سے درخواست کی۔ ''طاہرہ ڈری ہوئی ہے۔ چاچا جی سے کہیں کہ کل صبح نماز کے لیے صبح اسے اٹھائیں۔ ثواب کے علاوہ اس کا ڈر بھی دور ہو جائے گا۔''

سائیں نے مدبرانہ انداز میں اپنا سر ہلایا اور اسی لمحے طاہرہ کی لرزتی، کپکپاتی آواز پورے ڈائننگ ہال میں پھیل گئی۔ ''نائیں نائیں..... پلیز۔ میں الارم لگا لوں گی۔ انھیں نائیں کہیں..... پلیز۔''

مجھے فکر تھی کہیں کنول ڈر نہ جائے۔ میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی مگر کوئی اسے ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔

شہزاد بتانے لگا کہ ہم نے گیارہ ٹراؤٹ پکڑیں اور اب نو رہ گئی ہیں۔ دو سائیں نے چاچا شفیع کو دے دیں۔

سوال آیا۔ ''وہ مچھلی بھی کھاتے ہیں.....؟''

''بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ بنوں کی مہندی اور مصالحے دونوں انہیں پسند ہیں۔'' شہزاد اس کے بعد بتانے لگا۔ ''کوئی مچھلی کے کانٹے نہ پھینکے۔ چاچے نے اپنی دوائی تیار کرنی ہے۔''

کسی لڑکی کی حیرت بھری آواز آئی ''کیا.....؟''

شہزاد نے کہا۔ ''انھیں دائمی قبض ہے۔ حکیم صالح نے مچھلی کے کانٹوں کا نسخہ بنا دیا ہے۔ اب تو انہیں بہت افاقہ ہے..... ماشاءاللہ۔''

کشمیرن بولی۔ ''آپ مذاق کر رہے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟''

فرید نے پوچھا۔ ''آپ چاچا شفیع کو مذاق لے رہی ہیں؟''

''نہیں تو.....'' وہ سہم کر بولی۔ ''میں تو ان کی بیماری کی بات کر رہی ہوں۔''

شہزاد نے کہا۔ ''جب ہم بیمار ہو سکتے ہیں، جانور بھی بیمار ہو جاتے ہیں تو جن بیمار نہیں ہو سکتے؟''

''کیوں نہیں..... میں نے یہ تو نہیں کہا تھا۔''

فرید نے مائیک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک سچا واقعہ سناتا ہوں جس کا گواہ یہ مائیک سامنے بیٹھا ہے۔ یہ بھی آپ کی طرح چاچے شفیع کو سیریس نہیں لیتا تھا۔ ہمارا فرسٹ ایئر تھا۔ ایک دن ہم لیب میں پریکٹیکل کر رہے تھے۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ چاچا بھی یہیں کہیں ہے۔ پیر سائیں بتا رہے تھے کہ چاچے کی پڑپوتی کی نواسی کے پیٹ میں کیڑے پڑ گئے ہیں۔ چاچا علاج کروا کر تھک گیا تھا۔ آخر ڈاکٹر بگو نے دوائی دی تو کیڑے مرے۔ مائیک نے خوب مذاق اڑایا۔ ہم نے مائیک کو چپ بھی کرایا مگر یہ آپ بھی جانتی ہیں کہ بچپن کا ضدی ہے۔ یہ باز نہ آیا۔ پھر ہم نے یہ دیکھا کہ مائیک نے بیکر میں تیزاب ڈالا اور پینے لگا تھا۔ ابھی چکھا ہی تھا کہ سائیں نے بیکر اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اسے ہم اسپتال لے گئے۔ بعد میں مائیک نے بتایا کہ اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔''

(دراصل مائیک نے غلطی سے بیکر میں پڑے تیزاب کو پانی سمجھ کر پینا چاہا تھا)

ستار نے فرید کی ادھوری بات آگے بڑھائی... مگر چاچے نے اسے معاف نہ کیا تھا۔ گرمیاں تھیں اور مائیک اپنے گھر کے صحن میں رات کو چارپائی پر سو رہا تھا۔ اچانک اس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ کپڑے جل گئے۔ پہلے تو یہ بڑا گورا چٹا ہوتا تھا۔ یہ تو آگ لگنے کے بعد جل کر کالا ہوا ہے۔ پھر تو اس کی ماں چارپائی کے ساتھ پانی کا ٹب بھر کر رکھتی تھیں کہ آگ لگے تو شور مچانے کی بجائے ٹب میں کود جایا کرے......

کشمیرن صفائی پیش کرتے ہوئے بولی۔ ''خدانخواستہ میں نے یہ نہیں کہا کہ آپ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں۔ حیرت اس لیے تھی کہ پہلے ایسا کہیں نہیں سنا......''

اتنے میں دو پراتیں فرائی مچھلی کی ہماری میز پر سج گئیں۔ کشمیرن سر پر دوپٹا لپیٹے سب میں برابر برابر مچھلی تقسیم کرنے لگی۔ دو ٹکڑے بچ گئے تو کشمیرن نے سائیں کو دیتے ہوئے کہا کہ یہ بھی چاچے شفیع کو دے دینا۔ اس پر اس نے بس نہ کیا بلکہ سارے کانٹے بھی جمع کر کے سائیں کو تھما دیے۔ اس پر سائیں نے پھر کچھ زیر لب پڑھا اور اکیلی کشمیرن پر سارا پھونک دیا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کھانا آیا تو مقدار دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ میں نے پوچھا بھی کہ چاچے نے بھی کھانا ہے؟ مگر معلوم ہوا کہ طارق نے جذبات میں آکر اتنا سارا کھانا آرڈر کر دیا تھا۔

کھانا سب نے خاموشی سے کھایا کیونکہ سائیں نے حکم دے رکھا تھا کہ کھانے کے دوران دوسرے کی پلیٹ میں دیکھنے کے علاوہ خاموش بھی سب نے رہنا ہے۔

☆☆☆

میں کھانا آہستگی سے کھا رہا تھا۔ میری توجہ کا مرکز کنول تھی۔ سب کی باتیں مجھے اس کی جانب مائل ہونے سے روک نہ سکیں۔ اس کی قربت میری انگلیوں کی پوروں میں سرسرا رہی تھی۔ اس کی ایک نظر مجھے بے خود کر دیتی۔ اس کے دیکھنے میں ایک دل آویزی اور خمار تھا۔ اس کی آنکھوں میں پیار مسکراتا ہوا نظر آرہا تھا۔ کنول کو دیکھ کر احساس ہوتا کہ محبت واقعی دنیا کا سب سے خوبصورت احساس ہے۔ سوچ رہا تھا کہ وہ اتنی حسین ہے تو اس کا پیار کتنا حسین ہوگا۔ وہ کبھی اپنے نازک ہاتھ دکھاتی، کبھی کلائیوں کے کنگن کھنکھناتی، کبھی بالوں کی لٹ جھٹکتی، کبھی مسکرا پڑتی، کبھی سہم جاتی، کبھی ہنس دیتی اور کبھی سوچنے لگتی۔ میرے دل میں اس کے پیار کا ایک کانٹا چبھا تھا جس کی کسک میری روح میں پھیل گئی تھی۔

کھانے کے بعد سوچا گیا کہ واک کرنے چلتے ہیں۔ سب کے علاوہ طارق کہتا تھا کہ بے چارے تھکے ہیں۔ انہیں آرام کرنے دیں۔ کشمیرن نے جب یہ کہا کہ ہم آرام نہیں سیر کرنے آئے ہیں تو طارق نے اپنی رائے بدل دی، بولا۔ ''جب تک واک نہ کریں سیر سپاٹے کا مزہ ہی نہیں آتا.....''

جب ہم باہر نکلنے کے لیے اٹھے تو سائیں دھاڑا۔ ''سب بیٹھ جائیں۔ منہ اٹھا کر اندھیرے میں نہیں نکلتے۔ میں پہلے باہر جا کر جائزہ لیتا ہوں۔''

یہ کہہ کر مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب ستار بھی ساتھ اٹھا تو اسے جھاڑ دیا کہ تو ابھی شاگرد ہی میں نہیں آیا لہٰذا ادھر ہی بیٹھا رہ۔

ہم دونوں ساتھ والوں کی میز کے قریب سے گزرے تو اچانک کنول کی والدہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ باادب ہو کر سائیں کو سلام کیا اور سائیں نے جواب میں سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ ہمارے دروازے سے نکلنے تک وہ کھڑی رہیں۔

سائیں بولے۔ ''جنڈی یہ تو اپنی مریدنی بن گئی۔ اب سمجھ تیرا کام پکا.....''

میں سائیں کو بیچ میں نہیں لانا چاہتا تھا۔ اگر سائیں کا پول کھلتا تو میرا بنا بنایا کام بگڑ جاتا۔

باہر آکر سائیں نے اردگرد اندھیرے میں کچھ دیکھا۔ پھر دریا کی جانب کچھ دیر کچھ دیکھتے رہے۔ ایک دو سیٹیاں بجائیں اور آخر کار مجھ سے بولے۔ ''اندر جا کر بتا دو لائن کلیر ہے.....''

☆☆☆

ہم ٹولیوں کی صورت چہل قدمی کر رہے تھے۔ میں اور طاہرہ ایک ساتھ چل رہے تھے۔ ہر ایک خوش تھا۔ لڑکوں کے چہروں پر مستقل مسکراہٹ تھی۔ سائیں متبرک ہوئے تو ایک ہجوم ان کے گرد جمع تھا۔ خوش گوار موسم نے لڑکیوں کو کھل کھلا دیا۔ سب آہستگی سے چلتے گہری سانسیں لیتے تھے۔ ہوا کے خنک اور نرم جھونکے بدن کو تازہ دم رکھتے تھے۔ لڑکیوں نے آکر ماحول بدل ڈالا تھا۔ مائیک سے توجہ ہٹ گئی تھی۔ سب کے حدف بدل گئے تھے۔ مجھ سے طارق کی نظر ہٹ کر کشمیرن کی جانب مبذول ہوگئی۔ کنول تک میری رسائی آسان لگنے لگی۔ لڑکیاں بھی اپنی اہمیت سمجھنے لگیں۔

چھوٹے سے بازار میں کچھ دکانیں کھلی تھیں۔ چند ملکی اور ایک دو غیر ملکی سیاح گھوم رہے تھے۔ ناران کی وادی مجھے خوشیاں مناتی محسوس ہو رہی تھی میرے قدم بہکے بہکے اور دل میں مسرتیں بھری تھیں۔ لگتا تھا پہاڑوں سے مجھ پر پھولوں کی برسات ہو رہی ہے۔ آسمان پر چمکتا چاند اور ٹمٹماتے تارے تھے۔ پوری کائنات کسی سحر میں ڈوبی تھی۔ کنول نے مجھ سے پیار کا اظہار کیا اور مجھے پر مل گئے۔ میں بلندیوں میں اڑتا پھرتا تھا۔ میرے اندر خواہش پیدا ہوتی کہ وہ ان خاموش مگر چاندنی سے دھلے راستوں پر میری ہم سفر ہو۔ ہم ایک ساتھ چاند کا سفر کریں۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ایک لمبی راہ پر چلیں۔ مجھے لگے وہ ہوا بن کر مجھ سے بغلگیر ہے۔ وہ میرے کانوں میں محبت کی سرگوشیاں کرے۔ میں یہ دیکھوں کہ یہ رات اس کی گہری سیاہ آنکھوں کا عکس ہے۔ پلٹ کر آتیں نرم ہواؤں کے بوسے اس کے حسیں لبوں کی خیرات ہیں۔ میرے بہکے قدم اس کی محبت کا خمار ہیں۔

''بھائی۔ آپ اس لڑکی کو کب سے جانتے ہیں؟'' طاہرہ نے یہ پوچھ کر مجھے میرے خیالوں سے کھینچ

لیا۔

میں نے اسے مختصر طور پر کنول کے بارے میں بتایا کہ وہ کس طرح مجھے مری کے رستے پر نظر آئی اور کس طرح سے مجھے سفر کے ہر مقام پر ملتی رہی۔ طاہرہ یہ سب سن کر سخت متعجب ہوئی۔

''یہ وہ تو نہیں جس کے بارے میں ہمیں ٹھنڈیانی میں بتایا تھا.....؟''

میں اس کی بات پر خود حیران ہو گیا۔ انھیں تو میں نے یہ بات مذاق میں کہی تھی۔ وہ کہنے لگی۔ ''ہم نے گھر آ کر آپس میں بات کی تو سب نے یہی سمجھا کہ تم نے گپ لگائی ہوگی۔'' ذرا توقف کے بعد اس نے کہا۔ ''مگر یہ کس طرح سے ممکن ہے کہ تم دونوں ہر جگہ پر اکٹھے ہو جاتے ہو؟ حیرت ہے۔''

''ہم صرف مل نہیں رہے بلکہ ایک دوسرے کے لیے چاہت بھی پیدا ہو گئی ہے.....''

''اس سے بات ہوئی ہے.....؟''

میں نے جھوٹ بولا۔ ''نہیں ہوئی.....''

''مگر کمرے کے دروازے پر تم سے یوں بات کر رہی تھی جیسے پہلے سے واقفیت ہے۔''

''یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ ہم پیار کرنے لگے ہیں.....''

وہ کہنے لگی۔ ''یہ باتیں ہم افسانوں میں پڑھتے تھے کہ کسی ہل اسٹیشن پر لڑکا لڑکی ملتے ہیں اور پھر محبت ہو جاتی ہے۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ یہ حقیقت میں بھی ہوتا ہے.....''

''یہ حیرت مجھے بھی ہوئی تھی مگر حیرت اب خوشی میں بدل گئی ہے.....''

''اب کیا کرو گے؟''

''ہم شادی کریں گے.....''

''کیا.....؟ پاگل ہو۔ راستے میں لڑکی ملی اور کہہ رہے ہو شادی کروں گا.....واقعی تم لوگ پینڈو ہوتے ہو۔''

میں بولا۔ ''اگر تم سمجھتی ہو ہماری چند دن کی محبت ہے تو یہ غلط ہے۔'' جیکٹ کی جیب سے غزالہ کی تصویر نکال کر اسے دی اور کہا۔ ''ہماری تو سالوں پہلے کی محبت ہے.....''

وہ تصویر کو کچھ لمحے دیکھتی رہی۔ ''تم تو ابھی کہہ رہے تھے کنول سے تمہاری کبھی بات نہیں ہوئی۔ پھر یہ تصویر کہاں سے لی؟''

''یہ کنول نہیں غزالہ ہے.....'' تصویر اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے میں نے کہا۔

وہ کھڑی حیرت سے میرا چہرہ دیکھتی تھی۔ میں نے دوبارہ چلتے ہوئے اسے غزالہ کی کہانی بتائی۔ محبت سے لے کر اس کی شادی کو بڑے اختصار سے بتایا۔ آخر میں کہا۔ ''میں محسوس کرتا ہوں یہ کنول نہیں بلکہ غزالہ کا ایک نیا روپ ہے۔''

وہ بولی۔ ''تصویر نہ دیکھتی تو تم کو احمق سمجھتی۔ تصویر دیکھنے کے بعد اب کیا کہوں.....؟'' پھر اس نے بات بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''رشتے اس طرح راہ چلتے نہیں بنتے۔ تم دونوں ابھی عمر کے اس حصے میں نہیں کہ خود سے شادی کرنے کے فیصلے کر سکو۔ معلوم نہیں کہ تم کس طرح سے رشتے کی بات کرو گے اور وہ کیا ہاں کہہ دیں گے؟ بہت مشکل ہے۔''

میں اس کی بات پر رنجیدہ ہو گیا کیونکہ ہمارے ملنے سے پہلے اس سے جدائی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ''رشتہ کیوں نہیں دیں گے۔ ہم دونوں کی خاطر اس کے والدین تین چار سال انتظار تو کر سکتے ہیں.....''

وہ بولی۔ ''لگتا ہے آپ بہت جذباتی ہیں۔ رشتے یوں کب بنتے ہیں.....؟''

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''سب باتوں کو چھوڑو اور کسی طرح ہم دونوں کی بات کرا دو.....'' وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ''کل ہم سب جھیل پر جا رہے ہیں۔ تم نے کہا کہ وہ بھی وہیں چلی آتی ہے جہاں تم ہوتے ہو۔ یہ بھی دیکھ لیں گے وہ آتی ہے کہ نہیں۔ اگر آ گئی تو وعدہ ہے کہ بات کروا دوں گی اور پھر آگے تمہاری اپنی قسمت.....''

طاہرہ کی بات نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا۔ سوچتا اگر وہ نہ آئی تو ساری بات یہیں ختم ہو جائے گی۔ میں شک میں پڑتا تو عقیدہ کمزور ہونے لگتا۔ میں نے خود کو یقین دلایا کہ وہ ضرور آئے گی۔

طاہرہ نے اسی دوران پوچھا۔ ''معلوم نہیں اتنی خوبصورت لڑکیاں تم پر کیوں مرمٹتی ہیں.....؟''

میں نے اسے بتایا۔ ''حسن کو ہم چہروں میں ڈھونڈتے ہیں۔ انسانی چہرہ کتنا ہی حسین کیوں نہ ہو محبت کا چہرہ سب سے حسین ہوتا ہے۔ پیار شکلوں کو خوبصورت کر دیتا ہے۔ خوبصورتی چہروں سے زیادہ انسانی وضع قطع اور اس کی تمکنت میں ہوتی ہے۔ کسی کے بولنے اور دیکھنے کے انداز میں ہوتی ہے۔ کسی کے علم اور برتاؤ میں ہوتی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ہے۔ سب سے خوبصورت وہ ہے جس کی عادتیں خوبصورت ہیں۔ محبت ہو جانے کی وجوہات مختلف ہوتی ہیں اور یہ اکثر دوسروں کی سمجھ میں نہیں آتیں......''

☆☆☆

ہمارے ہوٹل کے باہر دو جیپیں ہمیں جھیل سیف الملوک لے جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ ایک تو سب کو جھیل دیکھنے کی خوشی تھی اور اس سے بڑھ کر اتنی ساری لڑکیوں کے ساتھ جانے کا جوش وخروش بھی تھا۔ لڑکیوں نے کھانے پینے کی ساری ذمّے داری اپنے سر لے لی تھی۔ اکرام سے بہت سے پراٹھے، آلو، انڈے اور شامی بنوا کر انھیں جیپ میں رکھ دیا تھا۔

ہوا رکی تھی اور سورج آسمان پر چمک رہا تھا۔ خاموش فضا میں بہتے دریا کی لہریں شور مچائے ہوئے تھیں۔ میں سوچ میں گھرا گھوم رہا تھا۔ طاہرہ سے تو بول دیا تھا کہ کنول جھیل پر آج آئے گی۔ یہ نہ سوچا کہ کیسے آئے گی۔ اندیشہ ہوتا کہ نہ آئی تو پھر کیا ہوگا، پھر خود کو یقین دلاتا کہ نہیں وہ ضرور آئے گی۔

اس صبح بہت دعا کی کہ وہ جھیل پر کسی طرح آ ملے۔ میں اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا کاغذ پر یہ سطریں اُتارتا تھا......

تو کبھی تو آمل بیٹھ
تجھ کو دل کے حال سناؤں
کیا کیا مجھ پر بیت رہی ہے
تم کو سارے راز بتاؤں
جہاں جہاں ہم ملے تھے
وہ سارے لمحے یاد کراؤں
تم کو میں سُروں میں ڈھونڈوں
کبھی تجھے غزلوں میں پاؤں
تجھ سے تیری باتیں کروں
تجھ کو اپنے خواب سناؤں
تم سے اپنی صبح کروں
تیرے ساتھ شام مناؤں
تم پر میں گیت لکھوں
تم کو اپنے گیت سناؤں
تجھ سے ساری باتیں کروں
تجھ سے روشن راتیں کروں
تجھ کو ہر دم یاد کروں
ہر دم تمہیں یاد میں آؤں
سنگ تیرے ان ہواؤں میں اڑوں
سنگ تیرے ان گھٹاؤں میں رکوں
تجھے یہ رنگین وادیاں اور جھومتے پھول دکھاؤں
پرندوں کی میٹھی بولیاں سنے تو
ساگر کی بھی لہریں گنے تو
تتلیوں کی اڑان بھرے تو
خاموشیوں کی زباں بنے تو
تھک پڑے تو میرے پاس آئے
پہلو میں میرے بیٹھے اور
سر کاندھے پر ٹکائے
کچھ سوچتے سوچتے اور سو جائے......
کبھی تو آمل بیٹھ......

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

میں نے کنول سے اس کی پہچان ہی چھین لی تھی۔ کبھی اسے غزالہ سمجھتا کبھی اس کا روپ اور سایہ۔ ہر طرح سے خود کو یقین دلایا کہ وہ کوئی اور نہیں غزالہ ہے۔ کئی بار خود پر ہنسا اپنے پر ندامت بھی ہوئی مگر اپنے خیالوں پر قابو نہ پا سکا۔ کنول کو اپنے ذہن سے جھٹکنا بھی چاہا مگر یہ اپنے بس میں نہ تھا۔ اس کی وجہ صرف ایک تھی کہ میں اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ اس نے میری سیاہ راتوں میں چاندنی بھر دی تھی۔ اس کے وجود سے مجھے زندگی سے پیار ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

میں کمرے سے نکل کر راہداری میں آیا تو دیکھا کومل چلی آ رہی ہے۔ وہ شناسا نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں رکا تو وہ بھی قریب آ کر مجھے دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں شوخی اور شرارت تھی۔ تواتر سے منہ چلاتے ہوئے ہل بھی رہی تھی۔ ایسے جیسے چیونگم کھا رہی ہو۔ چہرے پر اس کے مسکراہٹ پھیلی تھی۔ میں نے کہا۔ ''تو آپ کومل ہیں......؟''

بڑی حیرت سے کہا۔ ''اچھا! مجھے معلوم نہیں......''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''پھر آپ کون ہیں......؟''

اسی طرح لہراتے ہوئے کہا۔ ''کیوں بتاؤں......''

وہ بہن کا الٹ تھی۔ کنول میں سنجیدگی اور متانت تھی اور اس میں چلبلا پن تھا۔

میں بولا۔ ''چلو نہیں بتاؤ...... میں جادو کے زور پر معلوم کر لوں گا......'' میں نے پھر پوچھا۔ ''آج کا دن آپ لوگ کمرے میں بند رہیں گے کہ کہیں جا رہے ہیں؟''

وہ بولی۔ ''یہ بھی آپ جادو کے زور پر معلوم کریں.....اگر ٹھیک بتایا تو آپ کی بڑی مدد کر سکتی ہوں۔''

میں نے اپنی خواہش کے مطابق کہا۔ ''جھیل سیف الملوک.....!''

وہ ہلتی ہلتی اپنے پاؤں پر ساکن ہو گئی۔ متعجب ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ ''آپ کو کس نے بتایا؟''

''بولا ناں اپنے جادو سے معلوم کیا ہے.....''

''آپ کو تو مان گئی۔ لگتا ہے آپ جادو نہیں بلکہ دلوں کا حال جان لیتے ہیں۔''

''ایسا ہی سمجھو۔ بلکہ خاص لوگ اپنے دلوں کا حال اپنے چہرے پر لکھ کر مجھے بتا دیتے ہیں۔''

اچانک جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ ''ہائے اللہ میں بھی کیا ہوں کہ برآمدے میں کھڑی آپ سے باتوں میں لگ گئی۔ میں تو جیپ کا پتا کرنے جا رہی تھی۔''

میں بھی اس کے ہمراہ ہو لیا۔ کاؤنٹر پر پہنچ کر اس نے اکرام سے جیپ کا پوچھا۔ وہ میری جانب اشارہ کر کے بولا۔ ''انہیں چھوڑ کر آپ لوگوں کو لے جائے گی۔ آپ تیار رہنا.....''

اکرام کی بات سن کر وہ معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگی، بولی۔ ''تو آپ لوگ بھی جا رہے ہیں؟''

اکرام کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اتنے میں لڑکیاں ڈائننگ ہال میں داخل ہوئیں۔ طاہرہ نے مجھے کومل کے ہمراہ کھڑے دیکھا تو اس کی آنکھیں مسکرانے لگیں۔ میں جلدی سے کومل کو اللہ حافظ کہتا ہوا لڑکیوں کو باہر لے آیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ طاہرہ کو معلوم پڑے کہ کنول بھی جھیل دیکھنے آج جا رہی ہے۔ رات جس جذباتی انداز میں میری اور کنول کی بات کرانے کا وعدہ کیا تھا، میں اس کو اسی جذباتی کیفیت میں اسے رکھنا چاہتا تھا۔ اگر طاہرہ کو معلوم ہو جاتا کہ مجھے کنول کے جھیل پر آنے کا پہلے سے معلوم تھا تو وہ مجھ سے بدک سکتی تھی۔ بہتر یہی تھا کہ وہ بھی میری طرح ہماری محبت کو کوئی کرامت سمجھتی رہے۔

ایک جیپ میں چار لڑکیاں اور کشمیرن کا بھائی توقیر بیٹھا تھا۔ دوسری میں ہم سب دوست تھے۔ اتنے میں ہماری جانب کشمیرن چلی آئی۔ ''ندیم بھائی۔ آپ اور لطیف ہماری جیپ میں آ جائیں۔ راستے میں اگر جیپ خراب ہو جائے تو دھکا کون لگائے گا۔''

وہ یہ کہہ کر واپس چلی گئی۔ اس پر سب دوست ہمیں چھیڑ رہے تھے۔ کوئی ہمیں لڑکیوں کا چمچہ کہہ رہا تھا اور کوئی ہماری قسمت پر ناز کر رہا تھا۔ ندیم بھائی ندیم بھائی کا شور مچ گیا۔

کسی نے کہا۔ ''ندیم بھائی۔ ہمیں ہنسنا ہے، کوئی لطیفہ ہو جائے۔''

کوئی بولا۔ ''یہ خالی کولر ہے۔ اسے پانی سے تو بھر دیں۔''

شہزاد نے کہا۔ ''چار جوان بہنوں کی ذمے داری اس ناتواں کندھے پر آ پڑی ہے۔''

طارق نے کہا۔ ''وہاں زیادہ بکواس نہیں کرنی۔ میری کوئی بات بھی نہیں بتانی۔''

سائیں بولا۔ ''جو دم بتایا تھا وہ پڑھ کر سب پر پھونک دینا۔''

اور تو اور ڈرائیور بھی کہنے لگا۔ ''ندیم بھائی۔ جیپ کو دھکا لگاؤ۔ برف میں پھنس گیا ہے۔''

ہم دونوں جیپ سے اترے تو آوازیں کسی گئیں۔ بڑے بڑے نازیبا القابات دیئے گئے۔ ہم بھی خاموشی اختیار کیے اتر آئے۔ سائیں نے معلوم نہیں کون سا دم پڑھنے کا بولا تھا لیکن میں آیت الکرسی پڑھ کر ان کی جیپ میں سوار ہو گیا۔

☆☆☆

ہماری جیپ نے بابوسر راستے سے جھیل کی جانب رخ کیا تو لگا کہ ہم ایک کم تنہائی سے نکل کر کسی مہیب تنہائی میں داخل ہو گئے ہیں۔ ناران سے کہیں زیادہ خاموشی اس راستے پر بچھی تھی۔ ہم قدرے ہموار راستے سے اچانک پہاڑی ڈھلوان پر رینگنے لگے۔ ہر جانب بلند پہاڑ، چٹانیں، پتھر اور تنہائی تھی۔ کہیں سبزہ اور کہیں پہاڑوں پر چیڑ کے بلند درخت نظر آ رہے تھے۔ ہر ایک اردگرد پھیلی نئی دنیا کو دیکھ رہا تھا۔ دوست بھی نئے اور راستے بھی نئے تھے۔ کیا خوبصورت احساسات تھے اور کیا خوبصورت زندگی تھی۔

توقیر اور کشمیرن گو پہلے بھی یہاں آ چکے تھے مگر مناظر میں ان کی دلچسپی ہم سے کم نہ تھی۔ دوسری لڑکیاں کچھ خوف اور زیادہ حیرت و خوشی لیے بیٹھی تھیں۔ میرے اندر کئی احساسات ایک ساتھ چلے آئے۔ پیار، سنسنی، حیرت، خوشی اور تجسس۔ یہ نئی طرح کے راستے تھے جن پر درخت کم اور پتھر پہاڑ زیادہ ہیں۔ برفوں کے پہنچ بلندیوں سے نیچے تک ان پہاڑوں پر لگے تھے۔ برفوں کی سفید بڑی بڑی پٹیاں

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

لہراتی ہوئیں پہاڑوں سے نیچے گرتی چلی آرہی تھیں۔ بلند چوٹیاں ایک ایک کر کے ہمیں اوپر سے جھانکنے لگیں۔ راستہ ویران تھا اور صرف جیپ کے انجن کی آواز گونج رہی تھی۔ پہاڑوں کے اندر سے کوئی مقناطیسی لہریں نکل کر مجھے اپنی جانب کھینچ رہی تھیں۔ کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ایک نیا احساس میرا اندر جذب ہوتا جا رہا ہے۔ کسی کشش نے مجھے مجذوب کر دیا۔ مجھ میں پہاڑوں کے اندر کوئی کھوج لگانے کی جستجو جاگنے لگی۔ ان کے بیچ کچھ اسرار و بھید چھپے ہیں جن کی کھوج میں میری روح بے چین ہو گئی۔ لگنے لگا میرا چین و اطمینان ان وادیوں میں کہیں چھپا ہے۔ یا پھر کوئی ایسی راہ وہاں سے نکلتی ہے جو مجھے میری منزل تک پہنچا دے گی۔ مجھے جس یزداں کی تلاش ہے وہ ان پہاڑوں کے پردوں میں موجود ہے۔ اگر یزداں یہاں نہ ملتا تو اللہ کے ولی ان ویرانوں کا رخ کیوں کرتے۔ رب کو پانے کے لیے جو یکسوئی چاہیے وہ مجھے یہیں مل سکتی ہے۔ میں تصور میں ان پہاڑوں اور وادیوں کے اندر جھانکنے لگا۔

یہ گھاٹیاں مری اور نتھیا گلی سے مختلف تھیں۔ یہاں کوئی اور طرح کا رعب و دبدبہ تھا جس سے میں مرعوب و مغلوب ہو کر بیٹھا تھا۔

چپ کی دیوار طاہرہ نے گرائی۔ مجھ سے کہا۔

''ڈرائیور بھائی سے پوچھیں کہ واقعی پریاں اس جھیل پر اترتی ہیں؟''

ڈرائیور سن کر خود بتانے لگا۔ ''آپ کی طرح باہر سے جو لوگ آتے ہیں وہی بتاتے ہیں کہ یہاں پریاں ہیں۔ ہم اسکول تو نہیں گیا کہ کتابوں میں پڑھتا۔ میں نے کوئی پری نہیں دیکھی اور نہ دیکھنی ہے۔ ہم نے تو بچوں کا پیٹ بھرنا ہوتا ہے اور یہ جیپ میری پری ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پریاں ایسے نظر نہیں آتیں۔ صرف چودھویں چاند کی رات کو اترتی ہیں اور صرف شہزادے انہیں دیکھ سکتے ہیں۔''

کشمیرن نے کہا۔ ''تم نے کہا تھا کہ رات وہاں کیمپنگ کروں گا کیونکہ پریاں دیکھنی ہیں۔ لگتا ہے خود کو شہزادہ سمجھتے ہو۔''

میں بولا۔ ''اگر ہم شہزادے نہ ہوتے تو کیا چار چار پریاں ہمارے ساتھ جیپ میں بیٹھی ہوتیں؟''

لطیف بولا۔ ''لوگ ثواب کمانے کے لیے چڑیاں اڑاتے ہیں اور ہم چار پریاں جھیل پر چھوڑنے جا رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اللہ کرے وہاں ان کو کوئی شہزادے آکر پسند کر لیں۔ یہاں تو سب کو انہوں نے بھائی بنا رکھا ہے.....''

کشمیرن کا بھائی تو قیر بھی بول اٹھا۔ ''شہزادے تو ان کو دیکھ کر ہی دوڑ جائیں گے۔''

کشمیرن نے بھائی کو ڈانٹا۔ ''تو قیر بری بات ہے۔ مہمانوں کو یوں نہیں بولتے.....''

''مہمانوں کو کب بولا۔ ''یہ تو آپ سے کہا ہے۔''

ہم سب ہنسنے لگے۔

جیپ اپنا پورا زور لگائے چلی جا رہی تھی۔ انجن کا شور گونج رہا تھا۔ راستے کے دائیں جانب کھائی اور دوسری جانب پہاڑ تھا۔ ایک گلیشیر اوپر سے آتا ہوا راستے سے گزر کر نیچے جا رہا تھا۔ برف کی ایک موٹی تہہ راستے کو ڈھانپے ہوئے تھی۔ جیپ اس گلیشیر پر ذرا سا چلی اور پھر وہیں پھنس کر رک گئی۔ ٹائر برف میں پھنسے تھے اور وہ ایک جانب جھکی وہاں سے نکلنے کے لیے شور مچا رہی تھی۔

لڑکیاں ڈری بلیوں کی طرح ارد گرد دیکھتیں جیپ سے اتریں اور گلیشیر پر قدم رکھتے ہی چڑیوں کی طرح چہکنے لگیں۔ ہم نے زور لگا کر جیپ کو برف سے نکالا۔ لڑکیوں نے برف کے گولے بنائے اور ایک دوسرے کو نشانے پر رکھ لیا۔ ہم دھکے لگا کر فارغ ہوئے گولے ہم پر بھی برسنا شروع ہو گئے۔ ہم ان گولوں کو بخوشی سہہ رہے تھے۔ اتنے میں پچھلی جیپ آ پہنچی۔ جب سب نے ادھر کا ماحول دیکھا تو گولوں کی بہتی گنگا میں اشنان کرنے دوڑتے چلے آئے۔ لڑکیوں نے جب اتنے سارے لڑکوں کو کسی آندھی اور طوفان کی طرح بڑھتے دیکھا تو سہم کر ہمارے پیچھے چھپ گئیں۔ دوسری جانب سب ہاتھوں میں برفوں کے گولے بنائے شرمندگی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ جب آسان حدف سامنے نہ آیا تو ایک دوسرے کی درگت بنانا شروع کر دی۔

☆☆☆

ہمارا سفر پھر شروع ہوا۔ دائیں جانب وہی گہرائی اور اس سے پرے پہاڑ تھے جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی تھیں اور دامن پر برف کے سفید دھارے بہتے چلے آرہے تھے گہرائی میں ایک گاؤں تھا جو ہماری نظروں سے اوجھل تھا، ڈرائیور بتانے لگا کہ جھیل سے ایک راستہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اسی گاؤں سے گزر کر ناران جاتا ہے۔ میرے ذہن کی سلیٹ پر وہ راستہ درج ہوگیا۔ سوچا واپسی گاؤں کے راستے سے پیدل چل کر ناران جاؤں گا بھلے مجھے اکیلا ہی کیوں نہ جانا پڑے۔

راستہ خوبصورت ہو تو تھکاوٹ بے معنی ہوجاتی ہے۔ ضروری نہیں خوبصورت راستہ ہمیشہ پھولوں بھرا ہو۔ خوبصورت راستہ وہ ہوتا ہے جس پر قدم بے اختیار اٹھنے لگتے ہیں۔ خوبصورت راستے کی مشکلیں آسان لگنے لگتی ہیں۔ خوبصورت راستہ کبھی زندگی کے سفر میں مل جاتا ہے اور کبھی کسی سفر میں دوسرا سفر آجاتا ہے۔ کچھ راستے خود خوبصورت ہوتے ہیں اور کچھ کو خوبصورت ہم بنا دیتے ہیں۔ جب کسی کو اپنا راستہ مشکل لگنے لگتا ہے تو وہ کیوں نہیں سوچتا کہ کئی ایک کے راستے مجھ سے زیادہ دشوار ہیں۔ زندگی ہر ایک کو سب کچھ نہیں دیتی۔ راستے پر آئے کانٹوں سے کوئی دامن بچا کر گزر گیا تو اسی نے اپنا سفر خوبصورت بنا لیا۔ انہی لوگوں کی آنکھوں میں چمک ہوتی ہے۔ یہی لوگ لمبا سفر کر کے بھی نڈھال نہیں ہوتے اور یہی لوگ کامیاب لوگ ہوتے ہیں۔

کچھ دیر بعد ہمارے بائیں جانب سرتاسر برفوں سے لدے پہاڑ تھے۔ ان کی چوٹیاں آسمان سے سرگوشیاں کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ڈرائیور بتا رہا تھا یہاں سے ایک ٹریک لالہ زار جاتا ہے۔ اس پہاڑ پر چڑھ کر دوسری جانب اترنا انتہائی جان جوکھوں والا کام ہے۔ کوہ پیمائی کی تربیت آپ کے پاس ہونی چاہیے۔ لالہ زار ایک سرسبز چراگاہ ہے۔ جہاں پھول، گھاس، برف سے ڈھکے پہاڑ اور صرف آپ ہوتے ہیں۔

طاہرہ نے مجھ سے کہا۔ ''ڈرائیور بھائی سے پوچھیں کیا ہم وہاں جاسکتے ہیں؟''

جواب میں نے دیا۔ ''کیوں نہیں۔ آسان ہونے کے علاوہ وہاں جانے میں..... زیادہ ٹائم بھی نہیں لگتا.....''

اوپر جھانک کر بولی۔ ''آسان لگ تو نہیں رہا.....''

''نہیں سامنے ہی تو ہے۔ پہاڑ ہر ایک کو دور اور اونچے لگتے ہیں۔ حالانکہ ہوتے نہیں.....'' میں نے اس کی ہمت بڑھاتے ہوئے کہا۔

ہم سب اپنی مسکراہٹیں چھپا رہے تھے مگر وہ سنجیدہ تھی۔ ''تو چلیں؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں کیوں نہیں..... چلو۔''

اس نے کہا۔ ''میرے جاگرز میں برف پھنس جائے گی۔''

کشمیرن نے کہا۔ ''جاگرز مجھے پکڑا دو۔ جرابیں تو پہنی ہیں۔ پاؤں بھی نہیں پھسلیں گے؟''

وہ ہمارے چہرے دیکھ کر ہماری سنجیدگی کا اندازہ لگانے لگی۔

لطیف بولا۔ ''اوپر ریچھ بھی ہوتے ہیں.....''

''ریچھ.....!''

میں نے کہا۔ ''ریچھ نہیں پانڈا ہوتا ہے۔''

بولی۔ ''وہ کیا ہوتا ہے.....''

''شکل ریچھ کی ہوتی ہے مگر خرگوش کی طرح بالکل معصوم ہوتا ہے۔''

لطیف بولا۔ ''یہ جو اپنا شہزاد ہے۔ سمجھ لو اسی طرح کا ہوتا ہے۔''

کہنے لگی۔ ''یہ چھوٹا تو نہ ہوا.....''

میں بولا۔ ''گدھے سے تو چھوٹا ہے.....''

سوچتے ہوئے بولی۔ ''نہیں۔ میں نے نہیں جانا.....''

اسی دوران میں نے جیپ رکوادی اور نیچے اتر آیا۔ ''چلو اتار کر آجاؤ..... جیپ کھڑی ہے۔ ہم ابھی واپس آجائیں گے۔''

جب سب کو ہنستے دیکھا تو اس کا شک یقین میں بدلا۔ ''میں نہیں آتی۔''

''کہا ناں اترو، ورنہ باہر کھینچ لوں گا۔''

پھر وہی چلاتی ہوئی آواز جیپ سے نکلی اور خاموش وادی میں چاروں جانب پھیل گئی۔

''نائیں نائیں..... پلیز میرا ہاتھ چھوڑو۔ میں نے نائیں جانا..... پلیز۔''

☆☆☆

ہم وہاں سے نکلے اور لمحوں میں ایک بلند مقام پر آرکے۔ وہاں سامنے برفوں سے ڈھکے پہاڑ ایک نیم دائرے میں کھڑے نظر آئے۔ ڈرائیور بولا اوپر چڑھیں گے تو سامنے جھیل ہے۔ ہم نے جیپ سے سامان اتار کر نیچے رکھا۔ میں متجسس نظروں سے وہ بلندی چڑھنے لگا۔ وہاں پہنچ کر سامنے دیکھا تو نظریں جھپکانا بھول گیا۔

جس زندگی کے سفر کا میں نے کچھ دیر پہلے ذکر کیا تھا۔ اس زندگی کے سفر میں کبھی کبھی کچھ لوگ، کچھ مقامات

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

یا کچھ مناظر یا کچھ لمحات ایسے بھی ملتے ہیں جو ہماری زندگی پر ایک گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ ہم حیران کھڑے رہ جاتے ہیں اور سوچتے ہیں یہ کوئی خواب ہے کہ حقیقت یا کوئی معجزہ ہے۔ یقین سے کہیں دور اور گمان کے قریب ہم ان کو محسوس کرتے ہیں۔ جب ان کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے تو ہمیں ان کے علاوہ کچھ یاد نہیں رہتا۔ نہ یہ دنیا اور نہ کوئی اور ہمیں یاد رہتا ہے۔ ان کو دیکھ کر پچھلی ساری تمنائیں بھول جاتی ہیں۔ نہ کوئی اور خواہش دل میں باقی رہتی ہے اور نہ کسی اور چیز کا حرص دل میں باقی رہتا ہے۔ ان چیزوں پر اپنی ملکیت جتانا چاہتے ہیں۔ اپنے فانی ہونے کا دکھ ہونے لگتا ہے۔ جھیل سیف الملوک کو دیکھ کر اس دن میری کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ اسے دیکھ کر میں غیر ارادی طور پر زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ میں جھیل سے نظریں نہیں ہٹا پا رہا تھا۔ وہ جھیل تھی کہ نیلے اور سبز پانیوں سے بھرا ایک پیالہ تھا۔ پہاڑوں کے قدموں میں وہ ایسے پڑی تھی جیسے کسی دیوتا کے قدموں میں داسی پڑی ہوتی ہے۔

جھیل سیف الملوک اللہ کی ایک ایسی تخلیق ہے جس کی تعریف میں مجھے الفاظ نہیں مل رہے۔ جو اسے بیان کرنے کے لیے الفاظ استعمال کر رہا ہوں وہ وہی لگے لپٹے لفظ ہیں جو ہر بار دہراتا رہتا ہوں۔

یہ وہ جھیل نہ تھی جسے آج کل ہم دیکھتے ہیں۔ یہ وہ مقام تھا جہاں تا حد نظر کوئی ذی روح نظر نہ آتی تھی۔ ایک گہری خاموشی نے وادی کو گھیر رکھا تھا۔ اس تنہائی میں ہم ہی تھے جو آ کر مخل ہوئے تھے۔ وہ ایک نئی نویلی دلہن تھی جس پر کسی غیر کی نظر نہیں پڑی تھی۔ ایک سناٹا تھا جو کانوں میں گونج رہا تھا۔

وہ ایک عام جھیل نہ تھی۔ ایک جادو نگری تھی۔ ایک طلسم کدہ تھا۔ وہاں کچھ ایسا تھا جو نظر نہ آتا تھا۔ جو نظر آ رہا تھا وہ کوئی فریب تھا۔ جو حقیقت تھی وہ نظروں سے اوجھل تھی۔ وہاں ہر وقت کسی کی موجودگی کا احساس رہتا ہے۔ آپ اِدھر اُدھر... متلاشی نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے آپ کو کسی کی تلاش ہے۔ جیسے آپ کسی کو ڈھونڈنے آئے ہیں۔ وہ جو ہے تو سہی مگر نظر میں نہیں سماتا۔ کبھی لگتا ہے کوئی بلندیوں سے آپ کو دیکھ رہا ہے۔ کبھی لگتا ہے کوئی ایسی چیز ہے جو آسمان سے پانیوں کی سطح پر اتر رہی ہے۔ شائبہ ہوتا ہے یہاں کچھ تھا اور جب دیکھا تو کچھ نہ تھا۔ وہاں کی مہیب خاموشی مجھے ڈراتی تھی۔ یوں لگتا تھا یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

کئی پڑھنے والوں نے اس جھیل کو دیکھا ہوگا۔ خاص کر جنہوں نے اس دور میں دیکھا ہے وہ میرے الفاظوں کو میری رنگ آمیزی سمجھ رہے ہوں گے۔ انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں وہاں ایک الگ ماحول اور مختلف ذہنی کیفیت میں گیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب لوگ اس جانب کم جاتے تھے۔ ناران کا بازار چند دکانوں اور ہوٹلوں پر مشتمل تھا۔ جب ناران کی فضا خاموش تھی تو جھیل کا کیا حال ہوگا۔ جب وہاں شور صرف ہواؤں کے چلنے کا تھا۔ جھیل تن وتنہا اور اداس اداس نظر آتی تھی۔ میں بلندی پر بیٹھا جھیل پر چھائے سناٹے کو دیکھ رہا تھا۔ پہاڑ برفوں سے ڈھکے تھے اور ہوا کی سنسناہٹ کانوں میں دوڑتی تھی۔

جھیل میں آسمان، پہاڑوں، برفوں اور بادلوں کا عکس کسی پانی میں نہیں بلکہ چمکتے آئینوں میں دکھتا محسوس ہو رہا تھا۔ بلند پہاڑوں کی چوٹیوں اور ان کے دامن سے بادل لپٹے تھے۔

وہاں ایک دبدبہ تھا میں جس کی گرفت میں بیٹھا تھا۔ اس منظر میں مجھے کنول کا انتظار تھا۔ یہاں کے حسن نے میری اس سے محبت کو کہیں زیادہ بڑھا دیا تھا۔ میں کنول کو یہاں کے پس منظر میں دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں پتھر دل بھی موم ہو جاتے ہوں گے۔

میں وہاں کچھ دیر بیٹھا رہا۔ پھر سب دوست ٹہلتے ہوئے.... کنارے کی جانب چلے گئے۔ جب دیکھا کہ میرے اور جھیل کے بیچ وہ آ گئے ہیں تو میں نے وہاں سے اٹھ جانا مناسب سمجھا۔ میں اور لطیف چھوٹے چھوٹے قدم لیتے دوستوں کی طرف چلے آئے۔

جھیل کنارے ایک پتھر رکھا تھا۔ ہر ایک اس پر بیٹھا کیمرے سے تصویر بنوا رہا تھا۔ نیلگوں آسمان سارا جھیل میں سمایا تھا اور پانی نیلو نیل نظر آتے تھے۔ کیمرے کلک کلک کرتے تھے۔ کیمروں میں فلمیں ڈالی جا رہی تھیں۔ دھوپ کے چشمے ایک دوسرے سے مستعار لے کر پوز بنائے جا رہے تھے۔ قہقہے تھے، ہنسی تھی اور ایک دوسرے سے چھیڑ خوانی تھی۔

ہمارے پاس دو کیمرے تھے۔ ہر رول میں چھتیس فوٹو ہوتے۔ لہٰذا ہر ایک کے حصے میں گنے چنے فوٹو آتے۔ ہم بڑی احتیاط سے تصویریں کھنچواتے۔ کیمرے کا رزلٹ ہمیں ایک ماہ بعد معلوم ہوتا جب ملتان سے فوٹو

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

پروسس ہو کر واپس آتے۔ اسی لیے ایک ایک تصویر ہمارے لیے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔

میں دری پر نیم دراز لیٹا تھا۔ طاہرہ ایک بڑا چشمہ لگائے قریب آ بیٹھی۔ ''بھائی۔ اگر پہاڑ کہیں اور ہوتے تو جھیل اتنی خوبصورت نظر آتی؟ یا جھیل کہیں اور ہوتی تو یہ پہاڑ دیکھنے ہم یہاں آتے؟''

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اگر یہ برف پوش پہاڑ اور جھیل ایک ساتھ اس منظر میں نہ ہوتے تو ہم بھی یہاں نہ بیٹھے ہوتے۔ آئینے میں اگر شبیہ نظر نہ آئے تو اس آئینے کی کوئی حیثیت نہیں۔ جھیل میں کوئی عکس نہ ہو تو اس میں کسی کے لیے کوئی کشش نہیں۔

اتنے میں لطیف اور ثروت بھی باتیں کرتے ہمارے قریب آ بیٹھے۔

طاہرہ نے ثروت سے کہا۔ ''لطیف اور تم میں کیا باتیں ہو رہی تھیں؟''

وہ بولی۔ ''میں نے اس سے کہا کہ کتنا حسین منظر ہے۔ تو مجھے جواب دیا کہ تم سے بڑھ کر نہیں.....''

میں نے ثروت سے کہا۔ ''اس کی رائے پر آپ کو خوش ہونا چاہیے.....''

''خوش ضرور ہوتی مگر آگے یہ بولا کہ یوں ناں جھیل کے کنارے بیٹھ کر پانیوں میں تمہارا عکس دیکھیں.....''

''تو دیکھ لیتے.....'' طاہرہ نے کہا۔

''وہ بھی دیکھ لیا مگر پھر کہا یہ منظر بے رنگ ہوتے اگر تم یہاں نہ ہوتی..... جب میں نے پوچھا کیوں تو کہنے لگا کیونکہ پہاڑوں اور آسمان کے سارے رنگ تم میں چھپے ہیں۔''

''پھر تم نے کیا کہا.....؟'' ہم بے تحاشہ ہنس رہے تھے۔

''میں نے کہا اگر یہ صرف تعریف ہے تو آپ کا بہت شکریہ اور اگر آپ کچھ اور چاہتے ہیں تو میری منگنی ہو چکی ہے۔''

لطیف بولا۔ ''یہاں پتھر بھی موم ہو جائیں مگر یہ نہ ہوگی۔''

☆☆☆

ہم چاروں چائے پینے چھپر ہوٹل کی جانب چلے جو ہمارے پیچھے ذرا بلندی پر تھا۔ چند لکڑی کی کرسیاں اور بینچ رکھے تھے۔ اس پاس چند مرغیاں پھر رہی تھیں۔ وہاں سے جھیل کا بھرا پیالہ ہمارے سامنے تھا۔ سماں وہی تھا مگر ہر زاویے سے زیادہ دلکش لگنے لگا۔

جھیل کے پیچھے ملکہ پربت کا برف پوش پہاڑ ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ جھیل کنارے سے لگا ہے۔ مگر یہ وہاں سے چھ کلو میٹر دور ہے۔ اونچائی سترہ ہزار فٹ سے زائد ہے۔ اس کو سر کرنا بہت مشکل رہا ہے کیونکہ چوٹی کے قریب یہ ایک عمودی دیوار بن جاتا ہے۔ جہاں برفیں اور پھسلن رہتی ہے۔ اس کے دامن میں بٹہ کنڈی گلیشیر بچھا ہے۔ اس گلیشیر کی برفیں پگھل کر جھیل کا پیالہ بھرتی ہیں۔ یہ پیالہ ہر وقت لبالب بھرا رہتا ہے اور زائد پانی ایک مقام سے باہر نکل کر نالے کی صورت ایک فاصلہ طے کر کے دریائے کنہار میں جا گرتا ہے۔

کینیڈا میں لاتعداد چھوٹی بڑی جھیلیں ہیں۔ لیک لوئیس ان میں ایک ہے۔ یہ مغربی صوبے البرٹا کے banff نیشنل پارک میں ہے۔ اس جھیل کی تصاویر میں نے پاکستان میں دیکھ رکھی تھیں۔ سرسبز پہاڑوں میں گھری یہ بڑی حد تک جھیل سیف الملوک سے مشابہ ہے۔ اس کو بھی ایک گلیشیر فیڈ کرتا ہے۔ میں جب نارتھ امریکا شفٹ ہوا تو پہلی فرصت میں یہ جھیل دیکھنے البرٹا گیا۔ جھیل کے سامنے ایک شاندار ہوٹل بھی ہے۔ اس میں رہائش کا بھی اتفاق ہوا۔ لیک لوئیس کو میں نے ہر زاویے سے دیکھا۔ بوٹنگ کر کے اس کے دوسرے کنارے اترا۔ دور پہاڑوں کی بلندیوں پر چڑھ کر دیکھا۔ مگر جو کشش جھیل سیف الملوک میں ہے وہ لیک لوئیس میں ہرگز نہیں۔ لیک لوئیس اپنی انفرادیت اس لیے بھی کھو جاتی ہے کہ ہم کار ڈرائیو کرتے اس کے کنارے جا اترتے ہیں۔ نایاب جگہوں اور حسین چہروں تک رسائی آسان ہو تو ان کی کشش کم ہو جاتی ہے۔

من میں عشق کی جوت جگائے میں جھیل سیف الملوک پر نظریں گاڑے بیٹھا تھا۔ میری نظریں وہاں سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔

طاہرہ نے پوچھا۔ ''بھائی۔ لگتا ہے وہ یاد آ رہی ہے؟''

''کچھ تو ہوا بھی سرد تھی کچھ تھا تیرا خیال بھی
دل کو خوشی کے ساتھ ساتھ ہوتا رہا ملال بھی''

میں نے کہا۔

طاہرہ مسکرانے لگی، بولی۔ ''اگر وہ آپ کے کہنے کے مطابق آ گئی تو میں آپ کی محبت تب مانوں گی.....''

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ثروت نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''کس نے آنا ہے؟''

طاہرہ نے مجھ سے پوچھا۔ ''اسے بتا دیں.....؟''

لطیف نے جواب دیا۔ ''اگر یہ ہمارا گروپ چھوڑ کر نہیں جاتی تو اسے بھی معلوم ہونا چاہیے۔''

طاہرہ نے کہا۔ ''یہ کہیں نہیں جانے والی.....'' اور پھر اس کو غزالہ سے لے کر کنول تک سب بتا دیا۔ یہ بھی کہا کہ ان دونوں کو قدرت بار بار کس طرح ملا رہی ہے۔

سننے کے بعد ثروت نے مجھ سے پوچھا۔ ''مگر وہ تو دو بہنیں ہیں۔ ان دونوں میں وہ کون سی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ جس کی آنکھیں بقول فراز سونے والوں کی طرح اور جاگنے والوں جیسی ہیں.....''

ہنس کر بولی۔ ''اس کے علاوہ کون سی نشانیاں ہیں؟''

''دونوں میں وہ وہی ہے جو اس جھیل جیسی ہے۔ رنگت ایسی شفاف ہے جیسے سفید پربتوں کا عکس جھیل میں نظر آ رہا ہے۔ مسکراتے ہوئے دو آنکھیں یوں چمکتی ہیں جیسے کرنیں جھیل کے پانیوں پر لشک رہی ہیں۔ ہنسی ایسے ہے جیسے خاموش پانیوں میں کوئی لہر اٹھی ہے۔ مزاج کی یوں نرم جیسے ملکہ پربت کی چوٹی پر برفوں کا تازہ سفوف پڑا ہے۔ آواز ایسی جیسے ہوا پتوں سے کھیل رہی ہے۔ رنگت ایسی جیسا یہ چہرہ نہیں چاند ہے۔ لہجہ اس کا محبت سے مہکتا ہے۔ اس کا سراپا ایک اُمید ہے۔ چال میں اس کی اطمینان ہے۔ شائد تم لوگوں کو وہ عام لگے مگر وہ خاص ہے۔ دیکھ کر فوری پہچان جاؤ گی۔''

سب میرے جذبے کی شدت کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

چائے کے بعد لطیف نے ادائیگی کی تو چار کپ کے سولہ روپے ہم سن کر حیران رہ گئے۔ ثروت چائے والے کو کہتی رہی کہ ناران میں دو روپے کا کپ اور یہاں چار روپے؟

وہ سر کھجاتے صفائی پیش کر رہا تھا۔ ''بی بی۔ پورے دن میں چار پانچ گاہک آ جائیں تو بھی دیہاڑی نہیں بنتی اور آج تو صرف آپ لوگ ہی آئے ہیں۔''

''میں نے پوچھا کہ جگہ اتنی خوبصورت ہے مگر لوگ کم کیوں آتے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''ایک تو یہ دور بہت ہے پھر راستے بھی خراب ہیں۔ ناران تک آنا مشکل ہے تو یہاں تک کیسے پہنچیں.....؟''

''میں نے پوچھا کہ کسی نے رات کو یہاں کیمپنگ کی ہے؟''

''دن میں کم آتے ہیں تو رات میں کون آئے گا؟ پچھلے سال ''تین لڑکوں نے یہاں خیمہ لگایا تھا۔'' اس نے وہاں اشارہ کیا جہاں مرغیاں گھوم رہی تھیں۔ ''مجھے بھی روک لیا تھا۔ ساری رات جھیل پر معلوم نہیں وہ کیوں بیٹھے رہے۔''

طاہرہ نے پوچھا۔ ''کبھی تم نے یہاں پریاں بھی دیکھیں؟''

جواب دینے کی بجائے وہ دانت نکالے ہنسنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''ناران تک پیدل راستہ کہاں سے اترتا ہے؟''

پیچھے بازو سے اشارہ کر کے بولا۔ ''یہاں سے جاتا ہے۔ نالے کے ساتھ ساتھ اترین تو چار گھنٹوں میں ناران پہنچ جائیں گے۔''

مرغیوں کی جانب اشارہ کر کے لطیف نے پوچھا۔ ''ان کی کڑھائی کھلاؤ گے.....؟''

''کیوں نہیں۔ میرا بنایا کڑاہی بابو سر تک مشہور ہے۔''

☆☆☆

ہم دوبارہ جھیل کنارے دری پر آ بیٹھے۔ اب وہاں سب بیٹھے کھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ طارق کی محنت رنگ لے آئی تھی۔ وہ توقیر کو بتا رہا تھا۔ ''ان پہاڑوں کے پیچھے بھی پہاڑ ہیں۔ وہاں کوئی جھیل نہیں ہے۔ سامنے بڑے پہاڑ کی سائیڈ سے نکل کر چلتے جائیں چلتے جائیں تو آگے کے۔ ٹو پہاڑ آ جائے گا۔ سارے راستے میں برف ہی برف ہے۔''

وہ پوچھ رہا تھا۔ ''ادھر آبادی بھی ہے.....؟''

''ہاں۔ لوگ رہتے ہیں۔ پہلے نہیں رہتے تھے۔ جب لوگ سعودی عرب پہنچ گئے تو یہاں کیا مشکل ہے۔''

''سردی نہیں لگتی.....؟''

''اب تو بہت ترقی ہو گئی ہے۔ جاپانی کمبل بھی تو آ گئے ہیں۔''

''جانور بھی بہت ہوتے ہوں گے.....؟''

''ہاں بہت ہیں۔ سارا علاقہ بھرا ہوا ہے مگر

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

خوب صورت و مسحور کن تحریروں سے مرصع ماہِ اگست 2020ء کا یوم آزادی نمبر

ماہنامہ

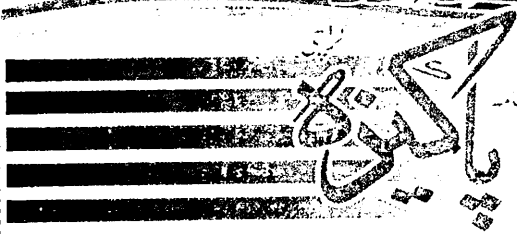

پاکیزہ

افشاں آفریدی و نایاب جیلانی کے قسط وار ناول نہایت اہم موڑ پر

سعدیہ رئیس کے انمول خیالات ..... پڑھیے منی ناول میں انمول میں

مدیحہ شاہد، عائشہ خان اور عفت گل اعزاز کی متاثر کُن تحریریں

Waqar Azeem

عورت کہانی میں فرحین اظفر لائی ہیں ایک اور شاہکار داستان......

Pakistanipoint.com

نامور مصنفہ و ڈراما نگار

غزالہ عزیز کی زندگی کے

خوب صورت رنگ ملاحظہ کیجیے

وہ آئے بزم میں

شمع ہدایت میں

اختر شجاعت کا تحقیقی مقالہ

تقدیر ...... کاتبِ الٰہی

کے عنوان سے

اس کے علاوہ

فوزیہ سرور، صدف آصف، فرحت انصاری

سلمیٰ غزل و دیگر کی شاندار قلم آرائیاں......

رنگا رنگ مستقل سلسلے پُر مزاح تراشے اور مسحور کن شاعری......

یہ سب آپ جیسے باذوق اور باشعور پڑھنے والوں کے لیے ہی تو ہے

انسانوں کے عادی ہوگئے ہیں۔"

"کون کون سے جانور ہوتے ہیں.....؟"

"سارے ہوتے ہیں....."

"پھر بھی.....؟"

"برفانی خرگوش، برفانی بلی، برفانی لومڑی، برفانی کھوتا، برفانی تیتر اور برفانی ہرن۔ سنا ہے برفانی اونٹ بھی ہوتا ہے....."

دوسری طرف کشمیرن مائیک سے مخاطب تھی۔ "آپ کو یہ جگہ کیسی لگی؟"

وہ ہیڈ فون کو اتارتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ ایک بار آیا جاسکتا ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہاں تو لوگ بار بار آتے ہیں۔"

"آپ عام لوگوں کی بات کررہی ہوں گی؟"

وہ بولی۔ "سب لوگ عام ہوتے ہیں۔"

وہ ہمیشہ کی طرح اختلاف کرتے بولا۔ "سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ آپ ہم لوگوں کو دیکھ لیں۔ میں جو پسند کرتا ہوں کوئی اور نہیں کرتا۔"

"مثلاً؟"

"جو گانے سب سنتے ہیں وہ میں پسند نہیں کرتا۔ جو لٹریچر میں پڑھتا ہوں وہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے ارسطو، افلاطون، کنفیوشس، ایمرسن اور مارکس کو پڑھا ہے۔"

کشمیرن نے برا سا منہ بنایا، بولی۔ "آپ نے کبھی ابن رشد، الرازی، ابن خلدون، الفارابی، بجستانی اور نصیر خسرو کا نام سنا ہے؟ یہ دنیا کی تاریخ کے بڑے بڑے فلاسفر ہیں۔"

مائیک بولا۔ "ان کی جانب کبھی خیال نہیں گیا....."

طاہرہ نے پوچھا۔ "جب آپ کے دوست آپ سے اتنے مختلف ہیں تو ان کے ساتھ کیوں آئے؟"

"میں تو صرف change کے لیے آیا ہوں۔ ماموں نے بولا بھی کہ لندن آجاؤ۔ لندن دوبار جاچکا ہوں۔ سوچا اس بار یہ علاقہ بھی دیکھ لوں۔"

ساتھ بیٹھے فرید نے کہا کہ پیرس والے ماموں کے پاس چلے جاتے۔

بولا۔ "وہ بھی لندن آئے ہوئے ہیں۔"

"کوئی خالہ باہر نہیں؟ اس کے پاس چلے جاتے؟"

"میری کوئی خالہ نہیں....."

ساتھ بیٹھا گلو بھڑک گیا۔ "جو وہاڑی میں رہتی ہیں وہ کون ہیں۔"

"وہ تو چھوٹی خالہ ہیں۔"

تپ کر گلو نے کہا۔ "چھوٹی خالہ کو خالہ نہیں کہتے؟"

"ہم اسے آنٹی کہتے ہیں....."

"اور جو خالہ چھوٹے بازار میں رہتی ہیں؟"

"تو میں چھٹیاں گزارنے ساتھ والی گلی میں جاتا؟"

اب گلو کا پارہ آسمان سے باتیں کرنے لگا تھا۔ بولا۔ "قسم سے یہ تیری باجیاں یہاں نہ بیٹھی ہوتیں تو تیرے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس جھیل میں پھینک آتا۔ آکر تجھے کل نکالتا۔ تو اتنا ضدی ہے کہ پھر بھی نہ مرتا..... نہ دیکھ مجھے۔"

پھر وہ سائیں کو دیکھنے لگا۔

سائیں بولا۔ "جندڑی کئی بار تم کو بولا ہے چپ رہا کر چپ..... مگر تو بھی باز نہیں آتا۔ سمجھا دوں گا گلو کو۔ منہ کا گندا ہے مگر دل کا برا نہیں۔"

دوسری جانب شہزاد نے خالدہ کا ناک میں دم کیا ہوا تھا۔ میں کھسکتا ہوا ان کے قریب آگیا..... وہ اسے اپنا کوئی خواب سنا رہا تھا۔ "بالکل تازہ خواب ہے۔ کل شام آپ کو دیکھنے کے بعد سوتے ہوئے یہ خواب دیکھا۔"

"سیدھی طرح یہ کیوں نہیں کہتے کہ رات خواب دیکھا۔ میرا ریفرنس دینا ضروری تھا؟"

"اس لیے کہ خواب آپ کے بارے میں تھا....."

کوئی الٹا سیدھا دیکھا ہوگا.....؟"

"سنو تو سہی....."

"سنائیں گے تو سنوں گی....."

"رات دیکھتا ہوں کہ لمبی اور اونچی کھجور ہے یعنی کھجور کا درخت ہے۔ میں اس کی چوٹی پر بیٹھا ہوں۔ تم نیچے کھڑی ہو۔ میں اوپر سے پکی پکی کھجوریں توڑ توڑ کر تمہاری جانب نیچے پھینکتا ہوں۔ تم مجھے شفقت بھری نظروں سے دیکھ رہی ہو۔ اتنے میں باغ کا چوکیدار آجاتا ہے۔ ڈر کے مارے تمہیں کچھ نہیں سوجھتا تو تیزی سے درخت پر چڑھنے لگتی ہو۔ پھر میں کیا وہ چوکیدار بھی حیران رہ جاتا تھا کہ تم جس تیزی سے اوپر چڑھتی ہو۔"

وہ تنگ آکر بولی۔ "جھوٹ کیوں بول رہے ہو۔ مجھے درخت پر چڑھنا کہاں آتا ہے۔"

"خالدہ۔ یہ حقیقت نہیں خواب ہے....."

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

''اچھا جلدی سے سناؤ.....''

''چوکیدار کے ہاتھ میں بندوق ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے نیچے اترو مگر ہم انکار کر دیتے ہیں۔ وہ کہتا ہے میں دونوں کو مار گراؤں گا۔ میں اسے کہتا ہوں ایک شرط پر نیچے اتریں گے کہ تم اس لڑکی کو کچھ نہیں کہو گے۔ وہ مان جاتا ہے۔ ہم درخت سے نیچے اترتے ہیں۔ وہ تم کو تو کچھ نہیں کہتا مگر مجھے باندھ کر کھجور کی لیلی شاخ سے وہ مارتا ہے، وہ مارتا ہے کہ میرا سارا جسم لہولہان ہو جاتا ہے۔ خالدہ اگر تم کو ایک بھی لگتی تو قسم سے تمہیں سمجھ آجاتی۔''

وہ ناراض ہو گئی۔ ''خواب آپ کا تھا۔ مجھے کیوں چابک مارتا..... اور یہ خواب آپ مجھے کیوں سنا رہے ہیں؟''

شہزاد بول اٹھا۔ ''میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمہارے لیے میں نے کتنے زخم کھائے۔ جو تمہارے لیے چابک کھا سکتا ہے وہ بڑا ہو کر تارے توڑ کر نہیں لائے گا؟''

''پلیز آپ چپ کر جائیں.....''

''آپ کو میری بات کا یقین نہیں آرہا ہے تو خود دیکھ لیں۔ ابھی تک زخموں کے نشانات ہیں۔'' وہ اپنی قمیص اتارنے لگا۔

خالدہ چیخ پڑی۔ ''خبردار جو آپ نے قمیص..... اتاری.....''

''پھر آپ میری اس قربانی کا یقین کیوں نہیں کر رہی ہیں؟''

وہ غصے میں کھڑی ہو گئی۔ ''ادھر کہہ رہے ہو خواب ہے۔ پھر کہتے ہو زخم درد کر رہے ہیں..... ہٹو راستے سے مجھے جانے دو..... ہٹتے ہو کہ نہیں؟''

شہزاد کراہ کر بولا۔ ''زخم کے لیے کوئی مرہم پرس میں ہے؟''

وہ جاتے جاتے بولی۔ ''چپ! میرے تو پیچھے ہی پڑ گیا ہے..... جھوٹا کہیں کا.....'' یہ کہہ کر وہ کشمیرن کے ساتھ بیٹھ گئی۔ شہزاد اب مسکرا رہا تھا۔

ادھر کشمیرن پراٹھوں پر کباب رکھے سب میں تقسیم کر رہی تھی۔

ہم ایک فیملی کی طرح بیٹھے پکنک منا رہے تھے۔ وہ لڑکے جو صبح خوب بن ٹھن کر آئے تھے وہ اب ریلیکس بیٹھے نظر آنے لگے۔ پہلے والا جوش و خروش ماند پڑ چکا تھا۔

کشمیرن نے اعلان کیا۔ ''سب کو صرف ایک ایک ملے گا۔ ہم گھر پر نہیں بیٹھے۔ پکنک پر آئے ہیں۔''

''لیکن میں تو کمزور بندہ ہوں۔ اکثر بیمار رہتا ہوں..... خون کی کمی ہے۔ ہاضمہ بھی خراب رہتا ہے۔'' ستار نے فریاد کی۔

''پھر خون کی بوتل لگوائیں.....؟''

''سب کا خون سفید ہو گیا ہے۔ لہٰذا کوئی بھی نہیں دے رہا۔''

''لیکن پراٹھا پھر بھی ایک ہی ملے گا.....''

''پلیز مجھے دو دیں۔ اس کے بدلے.....'' ستار نے بات کاٹ دی۔

اس نے نظریں اٹھا کر پوچھا۔ ''اس کے بدلے کیا.....؟''

''اس کے بدلے آپ مجھے سارا دن بھائی بھائی کہتی رہیں۔ برا ہرگز نہیں مناؤں گا.....''

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ''قسم سے آپ سارے ڈرامے باز ہیں.....''

طارق اپنی جگہ بیٹھا چور نظروں سے کشمیرن کو دیکھ کر لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ ایک دم کشمیرن نے اسی جانب دیکھا تو وہ سٹپٹا گیا.....

''آپ ایسے کیوں بیٹھے ہیں.....''

امتیاز نے کہا۔ ''اسی کی یاد میں ہر وقت گم صم رہتا ہے.....''

کشمیرن نے پوچھا۔ ''اسی کی بات کر رہے ہیں جسے ابھی تک اپنے دل کی بات بھی نہیں بتا سکا.....؟''

''ہاں۔ اس بے چاری کے علاوہ کون ہو سکتی ہے.....؟''

وہ اب طارق سے براہِ راست مخاطب ہوئی۔ ''ایک بار اس کو کہہ دیں۔ میں دعوے سے کہتی ہوں وہ بھی آپ کو چاہتی ہو گی۔''

امتیاز نے بے دلی سے کہا۔ ''بزدل ہے۔ پیار کے دو لفظ بھی نہیں بول سکتا.....''

''آپ دوست اس کی مدد کیوں نہیں کرتے؟''

پھر سب نے طارق کی مدد کی۔ جھیل کے سامنے کھڑا کر کے اسے بار بار اظہارِ محبت کے جملے رٹائے گئے۔ طارق نے بھی خوب یاد کر لیے۔ جب اسے ازبر ہو گئے تو کشمیرن کے سامنے اسے بٹھایا گیا کہ وہی جملے بولو۔ وہ تنک کر بولی۔

''کیا مطلب.....؟''

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ہم نے کہا۔ ''صرف پریکٹس ہے پریکٹس۔ آپ کی بھی مدد چاہیے.....''

اب کشمیرن بھی طارق کا حوصلہ بڑھانے لگی۔ ''ہاں ہاں کہہ دو۔ کب تک اس سے ڈرو گے؟ وہ اسی انتظار میں بیٹھی ہوگی کہ تم آکر کچھ تو منہ سے پھوٹو.....''

ہم سب یہ کہے جا رہے تھے۔ ''آج موقع ہے بول دو۔ آنکھیں بند کر کے کہہ دو جو کہنا ہے.....''

مگر وہ پھر سے گونگا ہو گیا۔ زبان بند اور خنکی کے باوجود چہرے پر پسینا تھا۔ کشمیرن بھی مایوسی میں سر ہلائے جا رہی تھی۔ ''تمہارا کام ہونا مشکل ہے.....''

لڑکوں نے طارق کو ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹا۔ لاتوں گھونسوں سے خوب اس کی تواضع کی۔

☆☆☆

کھانے کے بعد شہزاد نے گٹار سنبھالا اور بڑے پتھر پر جا بیٹھا۔ میں نے فرمائش کی اور اس نے یہ گانا سنایا.....

یہ وادیاں یہ ہوائیں بلا رہی ہیں تجھے
خموشیوں کی صدائیں بلا رہی ہیں تجھے

ہر ایک اپنے اپنے تصور میں کھو گیا۔ ہر کوئی خیالوں میں کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ میں اسے یاد کر رہا تھا جو میرے دل میں بیٹھی تھی۔ کنول نے آنے میں دیر کر دی تھی۔ میں بار بار راستے کی جانب دیکھتا۔ دل میں وسوسے اٹھتے کہ کہیں آج یہاں آنے کا ارادہ نہ بدل دیا ہو۔

یہ سحر انگیز سماں یہ پہاڑ اور یہ برفوں سے لدی چوٹیاں، خاموش مگر بہت کچھ کہتی یہ جھیل، یہ ہوا اور اجلے بادل، یہ نیلا آسمان یہ سب میری طرح کنول کا انتظار کرتے نظر آ رہے تھے۔

کچھ دیر بعد دیکھا کہ وہ راستے سے اترتی ہوئی جھیل کی جانب چلی آ رہی ہے۔ میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ شوخ رنگ کا لباس اس پر خوب جچ رہا تھا۔ اسے دیکھا اور پھر سارے منظر مجھے پھیکے لگنے لگے۔ ہواؤں کی تازگی بڑھ گئی۔ فضا نغموں سے گونج اٹھی۔ ایک عجیب سا خمار مجھ پر چھایا گیا۔

دھوپ کا چشمہ لگائے وہ آس پاس کی خوبصورتی کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ جب اس کی نظر ہماری جانب اٹھی تو وہ ٹھٹک گئی۔ لحظہ بھر ہمیں دیکھنے کے بعد وہ تھم تھم کر اترنے لگی۔ اس کے قدموں کی چاپ میرے دل کی دھڑکن سے مل گئی۔

طاہرہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ اسے میرا یہ کہنا سچ ہو گیا تھا کہ جہاں ایک جاتا ہے دوسرا بھی کسی کشش کے باعث وہیں چلا آتا ہے۔ وہ اور ثروت دونوں حیران بیٹھے تھے۔

وہ اپنے گھر والوں کے ہمراہ کچھ دور بائیں جانب کھڑی جھیل دیکھنے لگی۔ معلوم نہیں کون کسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جھیل دیکھ رہی تھی کہ جھیل اسے دیکھے جا رہی تھی۔ دیکھ کہیں اور رہا تھا مگر دھیان میں وہی تھی۔ مجھ پر اس بات کا سحر چھایا تھا کہ ہم دونوں ایک راستے کے مسافر ہیں۔ آگ یہاں بھڑکی ہے تو تپش ادھر بھی ہے۔ ہم دونوں ایک مضبوط تعلق میں بندھے تھے۔ اس تعلق کا نہ کوئی معاہدہ تحریر ہوا اور نہ کوئی شرائط تھیں۔ نہ گواہ آئے اور نہ ضمانتی ڈھونڈے گئے۔ نہ اس کی کوئی شقیں تھیں، نہ جزیں اور نہ کوئی معاوضہ تھا۔ یہ رشتہ ایک سیدھے سادے انداز میں جڑ گیا۔ دل میرا تھا۔ میں نے دیا اور اس نے لے لیا۔ پل کی بات ایک پل میں طے ہو گئی.....

میری محویت دیکھی تو طاہرہ نے کہا۔ ''اتنا اس کو خود پر طاری نہ کرو۔ لائٹ لو گے تو دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔ روگ لگاؤ گے تو بھولنا مشکل ہو جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''اسے یاد رکھنے یا بھول جانے کا اختیار میرے پاس کہاں ہے... اور نہ مجھے ایسا کوئی اختیار چاہیے کہ کسی کو اپنے دل سے کھرچتا پھروں۔''

وہ سن کر خاموش ہو گئی۔

اس دوران ہمارے ساتھی جھیل کے گرد چکر لگانے نکل کھڑے ہوئے۔ میں کنول کو وہاں چھوڑ کر خود کو تنہا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے بس میں نہ تھا کہ اس کی قربت سے نکل جاؤں۔ ادھر لطیف مشتعل تھا کہ تیری وجہ سے ہم بھی کہیں نہ جائیں؟

میں نے حتمی بات کی۔ ''تم لوگ جاؤ۔ میں کچھ دیر میں آ ملوں گا۔''

اتنے میں وہ لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کے والد ہاتھ کے اشارے سے جھیل کے گرد والا ٹریک دکھا رہے تھے۔ وہ بھی جھیل کے گرد چکر لگانے جا رہے تھے۔ میں انھیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ثروت نے کہا۔ ''آپ دونوں آگے آگے چلیں۔ ہم پیچھے رہ کر ان سے دوستی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اگر دوستی نہ کر سکے.....؟''

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

''بھائی نہ خود کو کنفیوز کرو اور نہ ہم کو..... اور جلدی کرو وہ لوگ نکل رہے ہیں۔''

☆☆☆

ہم جھیل کنارے پہاڑوں کے قدموں تلے چل رہے تھے۔ ہمارے پیچھے کچھ فاصلے پر طاہرہ اور ثروت چلی آرہی تھیں۔ ان کے پیچھے کنول اور اس کے گھر والے تھے۔ بائیں جانب جھیل اور دائیں جانب بلند پہاڑ تھے۔ کسی سے سن رکھا تھا کہ جھیل دو سو فٹ تک گہری ہے۔ اگر یہاں جھیل کی جگہ دو سو فٹ گہری کھائی ہوتی تو اس طرح کنارے چلنا مشکل ہو جاتا۔ ہم بے خوف جا رہے تھے۔ جھیل کے اندر کناروں کے ساتھ نیلی اور سبز کائی آگئی تھی، جس کے باعث وہاں کے پانی سبز اور نیلے نظر آتے تھے۔ ایک رنگ برنگی ایکویریم کی طرح کنارے نظر آرہے تھے۔ آسمان نیلا اور شفاف تھا۔ سورج کبھی بادلوں میں چھپتا اور کبھی باہر آکر چمکنے لگتا۔

جب لڑکیاں رکتیں تو ہم بھی کسی بہانے ٹھہر جاتے۔ کبھی پانیوں میں جھانکتے اور پہاڑوں کو تکتے۔ وہ چلنے لگتیں تو ہم بھی وہی فاصلہ برقرار رکھے چل پڑتے۔

نظر میری آگے تھی مگر دھیان پیچھا لگا تھا۔ ایک مقام پر کنول اور اس کا خاندان لڑکیوں کے قریب آرکا۔ ہم یہاں ایک پتھر پر تصویریں لینے کے بہانے چڑھ بیٹھے تھے۔ دیکھا تو وہ دونوں ہنس ہنس کر کنول سے بات کر رہی تھیں۔ میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ میری باتیں ہو رہی ہیں۔ شاید میرا پیغام دے رہی ہیں۔ لگتا ہے میرا ذکر سن کر وہ مسکرائی ہے۔ وہ میری بات کر رہے ہیں جو اتنے غور سے سن رہی ہے۔

اچھی بات یہ ہوئی کہ سب ہم عمر تھیں اور ایک ہوٹل کے علاوہ کمرے بھی متصل تھے۔ ان کی دوستی بننے میں پھر دیر کہاں لگنی تھی۔

میں اپنی جگہ دور بیٹھا خود کو کنول کے قریب محسوس کر رہا تھا۔ کبھی نظریں بچا کر ان کی طرف دیکھ لیتا۔ اس کے کندھوں پر ڈھلکے بال دیکھ کر اس کی ماں انہیں باندھنے لگی۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا کہ طاہرہ نے بڑھ کر اس کے بال سنوار دیے۔ وہ اس کے نخرے ایسے اٹھا رہی تھیں جیسے کم عمر نندیں بھابیوں کے اٹھاتی ہیں۔ پھر ایک دوسرے کے کیمروں سے تصویریں اتاری جانے لگیں۔ اس کے والدین ان سب کو ہنس ہنس کر باتیں کرتا دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

جب وہ چلتی ہوئیں ہمارے قریب آنے لگیں تو ہم چل پڑے۔ اتنے میں پیچھے سے طاہرہ کی آواز آئی۔ ''بھائی کہاں چل دیے۔ کراچی سے ہمیں ناران بلوایا اور یہاں اکیلا چھوڑ دیا.....؟''

میں اور لطیف ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے رک گئے۔ وہ سب قریب آئے تو بڑھ کر ہم دونوں نے سلام کیا۔ میں نے ہاتھ ملایا تو اس کے والد بولے ''ناں میاں۔ ہم سے دور دور کیوں بھاگ رہے ہو؟''

''ایسی بات نہیں سر۔ میں مختلف قسم کے Algae پلانٹ دیکھ رہا تھا۔ اللہ کی کیا حکمت ہے کہ یہ جھیل کی خوبصورتی بڑھانے کے علاوہ یہ Weeds Sea مچھلیوں کی خوراک بھی ہوتے ہیں۔''

اپنا بھرپور تاثر قائم کرنے کے لیے میں سوجھ بوجھ سے کام لے رہا تھا۔ ایک ایک فقرہ بولنے سے پہلے کئی بار سوچتا تھا کہ کہیں پکڑا نہ جاؤں۔

وہ مجھے مرعوب نظروں سے دیکھنے لگے۔ ''بڑے ہنر تم میں ہیں۔ کبھی بندروں کے درمیان، کبھی اژدھا کے سامنے کبھی میڈیسنل پلانٹس اور کبھی weeds sea کی اسٹڈی.....؟''

طاہرہ بتانے لگی۔ ''اسے تو فشنگ، کیمپنگ اور ٹریکنگ کا شوق بھی ہے.....''

''بہت خوب۔ بہت خوب۔ تو یہاں سے ناران پیدل جاؤ گے.....؟''

''جی سر۔ یہی پروگرام ہے.....''

''واقعی.....؟ میں نے تو ایسے ہی پوچھ لیا تھا.....''

''سر اتنا دور نہیں۔ صرف چار پانچ گھنٹے لگتے ہیں.....''

حیرت سے اس کی والدہ بولیں۔ ''چار پانچ گھنٹے پہاڑوں میں چلنا کیا کم ہے.....؟''

اطہر ماں سے بولا۔ ''امی۔ میں بھی ان کے ساتھ جاؤں گا.....''

اس کی تو کسی نے سنی بھی نہیں، مگر اس کے والد نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''مجھے ساتھ جانے کی اجازت مل سکتی ہے.....؟''

اور بیوی نے شوہر کی بھی سنی ان سنی کر دی۔

طاہرہ نے بات کاٹ کر کہا۔ ''اس نے فون کر کے امی سے کہا کہ ہم ناران جا رہے ہیں اور طاہرہ کو

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

بھیج دیں۔ کوئی اور ہوتا تو امی نے کہاں ماننا تھا۔ مگر ان کے کہنے پر ہمیں بھیج دیا۔''

اس کی ماں نے پوچھا۔ ''تم آپس میں رشتہ دار ہو؟''

''جی آنٹی۔ یہ میرے خالہ زاد ہیں اور ثروت کی خالہ زاد کے کلاس فیلو ہیں.....''

اس کے علاوہ میری کچھ تعریفیں اور بھی کی گئیں جن کی خوبیاں میرے اندر ہرگز نہ تھیں۔

کنول کی والدہ مجھے بغور دیکھ رہی تھیں۔ یہ نہیں کہ میں انہیں بہت اچھا لگ رہا تھا بلکہ وہ پیر سائیں تک اپنی آسان رسائی چاہتی تھیں۔ رات جس طرح سے وہ سائیں کے احترام میں کھڑی ہوئی تھیں تو صاف لگ رہا تھا کہ وہ ان کی معتقد ہو چکی ہیں۔

''پتر ذرا میری گل سننا..... (بیٹا میری بات سننا)''

اس کی والدہ نے مجھے اپنی جانب بلایا۔

میں گیا تو آہستگی سے بولیں۔ ''رات والے پیر صاحب بہت پہنچے ہوئے لگتے ہیں؟''

''جی۔ ہمیں پہلے ان کے بارے میں معلوم نہ تھا۔ مگر اس ٹرپ پر کھلے تو پتا چلا ہے.....''

مجھے گھور کر بولیں۔ ''کیسے کھل کر سامنے آئے؟''

میں گڑبڑا گیا۔ ''کہتے ہیں ناں کہ سفر میں ہمسفر کا پتا چلتا ہے۔ ہمیں تو وہ کچھ نہ بتاتے۔ مگر ٹرپ کی وجہ سے ہم بہت جان گئے ہیں کہ وہ واقعی صاحب علم ہیں۔''

''بیٹا کوئی ان کی کرامت مجھے بھی بتاؤ.....''

میں نے لطیف کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تو پیری فقیری کو ایک دھندا سمجھتا ہوں مگر یہ بہت مانتا ہے۔''

مجھے ڈانٹ کر کہا۔ ''احترام سے بات کرتے ہیں۔ کہیں گستاخی نہ ہو جائے؟''

''آنٹی۔ لوگوں نے اسے دھندا بھی بنا رکھا ہے۔ سادہ لوح ان کے جھانسوں میں آجاتے ہیں۔''

وہ کہنے لگیں۔ ''ہمیں کیا معلوم بیٹا کہ کون اللہ والا ہے کہ نہیں۔ ہم بے خبر لوگ ہیں دلوں کے حال نہیں جانتے۔ لہٰذا ہمیں سوچ سمجھ کر بات کرنی چاہیے.....''

وہ اپنے نظریے پر کوئی دوسری بات نہیں سننا چاہتی تھیں۔ میں نے بھی بات بدلی۔ ''آپ کی بات بجا ہے۔ پیر سائیں خود کہتے ہیں کہ لوگوں کو جعلی پیروں سے... دور رہنا چاہیے۔ وہ لوگ جنہوں نے اس منصب کو دھندا بنا رکھا ہے وہ دوسروں کو کیا فیض دیں گے۔ پیر صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ کسی کو اپنا ذاتی احوال تب تک نہیں دینا چاہیے جب تک اس کو اچھی طرح سے جان نہ لیں.....''

پھر وہ حال احوال دینے لگیں۔ ''میرا بہت سے جعلی لوگوں سے پالا پڑا، اتنے دھوکے کھانے کے بعد اب صحیح سمجھ آئی ہے۔ رات پیر صاحب کو دیکھا تو اسی وقت دل نے کہا یہی سچے اور کھرے ہیں۔ یہی مجاہدے اور نفس کی ریاضت سے گزرے ہوئے ہیں۔ بیٹا ایمانداری سے بتانا جو نور ان کے چہرے پر ہے وہ جعل سازوں کے چہروں پر کہاں ہوتا ہے؟''

''آپ ٹھیک فرما رہی ہیں۔ پیر سائیں کی زندگی دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ واقعی دنیا میں اس طرح کے لوگ بھی زندہ سلامت پھر رہے ہیں۔ ورنہ تو ہر جانب نفسانفسی پھیلی ہے.....''

میری بات کا وہ کیا مطلب سمجھیں کہ چہرہ ان کا چمکنے لگا۔ بولیں۔ ''ایسے لوگوں کی نیازمندی اور شفقت بہت ضروری ہوتی ہے۔ ہم تو لاعلم لوگ ہیں۔ ہمیں کیا معلوم جنت کا راستہ کہاں سے ہو کر جاتا ہے۔''

میں نے سوچ رکھا تھا کہ اپنے آپ کو سائیں اور ان کے معاملے سے دور رکھوں گا۔ بہتر یہ تھا کہ لطیف کو درمیان میں لے آتا۔

میں نے ان سے کہا۔ ''آنٹی یہ لڑکا پیر سائیں کا خاص بندہ ہے۔ بلکہ رازداں ہے۔ کوئی بات پہنچانی ہو تو اس سے بہتر کوئی نہیں۔ میں ابھی اس سے آپ کی بات کرواتا ہوں۔ خیال رہے کہ یہ بہت خاص بندہ ہے.....''

''یہ بھی تعویذ دیتے ہیں.....؟''

''ابھی تو نہیں مگر بہت جلد یہ بھی دینے لگے گا۔ ابھی تو یہ قبر والے وظیفے کر رہا ہے۔''

''پیر صاحب ان کا کہنا بھی مانتے ہوں گے.....؟''

''مانتے کیا ہیں، کبھی بھی اس کو نہیں ٹالتے.....''

اتنے میں میں لطیف کو میں نے اشارہ کر کے قریب بلا لیا۔

''آنٹی اب آپ نے جو کہنا ہے ان سے کہیں.....''

لطیف کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہاں کیا چل رہا ہے۔ وہ منہ کھولے کبھی مجھے اور کبھی انہیں دیکھتا تھا۔

(جاری ہے).....

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

عالمی وبا

شیراز خان

بیماریاں بھی انسانوں کے لیے امتحان ہیں۔ کب کون سی بیماری انسانی زندگی کا چراغ گل کردے کوئی نہیں جانتا۔ معمولی معمولی بیماریاں بھی انسان کو اس کی اوقات بتادیتی ہیں۔ وبائی صورت اختیار کرکے سمجھا دیتی ہیں کہ اشرف المخلوقات بن کر بھی انسان بہت بے بس ہے۔

معلوم تاریخ میں پھیلی وباؤں کا تذکرہ...

جب سے یہ دنیا بنی ہے۔ تب سے انسان پریشانیوں اور آفتوں میں رہا ہے۔
کبھی قدرتی آفتوں کی زد میں رہتا ہے جیسے زلزلے، سیلاب، طوفان، آتش زدگی، اور پھر خود حضرتِ انسان کی لائی ہوئی آفتیں۔ جیسے جنگیں، سازشیں، جرائم وغیرہ۔ اسے سکون کا ایک سال یا سکون کی کوئی ایک صدی بھی نصیب نہیں ہوسکی ہے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

انسان روتا ہی رہا ہے۔ ''ایک لحظہ بھی جو پاؤ غم ہستی سے نجات۔ اک نیا رنج پکارے ہے کہ تنہا کیوں ہو؟'' یا پھر ''موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں۔''
آج کل پوری دنیا کرونا وائرس کے چنگل میں گرفتار ہے۔ مالک نے بتادیا ہے کہ ہم جب چاہیں پوری دنیا کی سرگرمیاں موقوف کرسکتے ہیں کیوں کہ سب کچھ اسی کے اختیار

میں ہے۔

دیکھ لیں پوری دنیا کی سرگرمیاں کس طرح موقوف ہوچکی ہیں۔ بڑے بڑے ترقی یافتہ ممالک ایک حقیر سے ... ذرے یا جرثومے کے سامنے بے بس ہوکر رہ گئے ہیں۔

میں اس مضمون میں بہت کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ پہلے تو یہ دیکھ لیں کہ ایسی بیماریوں کی تاریخ کیا ہے۔

یعنی وہ بیماریاں جن کی وجہ سے شہر کے شہر خالی ہوگئے۔ ہر دور میں ایسا کچھ نہ کچھ ہوتا رہا ہے۔

آئیں۔ تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس کے بعد آگے بڑھیں گے۔

BC430

اسمال پاکس یا چیچک کی وبا پھیلی تھی۔ اس کا پھیلاؤ ایک دوسرے سے منتقل ہوتا ہے یا اس کے جراثیم ہوا میں گشت کرتے رہتے ہیں۔ اس کا سبب Virolia Virus ہوتا ہے۔ یہ ایک خطرناک بیماری ہے۔ عام طور پر تو اس میں موت واقع ہوجاتی ہے۔ اگر کوئی بچ بھی گیا تو اس کا چہرہ بلکہ پورا جسم بدنما ہوجاتا ہے۔

BC430 میں یہ وبا یونان ایتھنز سے شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پورے ملک اور روم تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس وبا سے چالیس ہزار آدمی ہلاک ہوئے تھے۔

وہم کا کوئی علاج نہیں ہے۔ ہندوؤں کے یہاں تو چیچک سے ڈر کر اسے دیوی مان لیا گیا ہے اور اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ باقاعدہ مورتی بنائی جاتی ہے۔

BC426 سے BC429

اسی زمانے میں ایتھنز یونان میں پلیگ یا طاعون کی وبا پھیلی تھی۔ یہ بہت زیادہ مہلک تھی۔ اس میں 75 ہزار سے ایک لاکھ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ یہ وبا یونان کے بعد روم میں منتقل ہوگئی تھی۔

یہ زمانہ ہے 165 سے لے کر BC180 تک کا۔ کئی لاکھ انسان ہلاک ہوئے تھے۔ ایک بات اور بتاتا چلوں کہ یہ بیماریاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔

تقریباً ہزار سال پہلے ہی مختلف بیماریوں کی شناخت شروع ہوگئی تھی۔ جیسے ملیریا، اسمال پاکس، ٹی بی، لپروسی، انفلوئنزا وغیرہ۔

زمانہ شاہد ہے کہ جب انسان نے گروہی شکل اختیار کی اور ایک شہر سے دوسرے شہر جانے لگا۔ جب فاصلے سمٹنے لگے تو ایک دوسرے کی اختلاط سے بیماریاں بھی مشترکہ ہوگئیں اور بیماریوں کا دائرہ کار بڑھتا چلا گیا۔ یونان سے شروع ہونے والے امراض، لیبیا، ایتھوپیا، مصر وغیرہ تک پھیل گئے تھے۔

اب یہ بھی جان لیں کہ اس قسم کے جان لیوا امراض کی دو اقسام ہوتی ہیں۔ Epidemic and Pena demic فرق یہ ہے کہ ایپیڈیمک اپنے علاقے شہر یا ملک تک محدود رہتا ہے جبکہ پینا ڈیمک ملک کی سرحدوں سے باہر نکل جاتا ہے۔ (بدقسمتی سے موجودہ کرونا وائرس پینا ڈیمک ہے۔ کیوں کہ یہ چین سے لے کر دنیا کے بیشتر ملکوں میں پھیل چکا ہے)۔

735 سے 740 تک جاپان میں اسمال پاکس کی وبا پھیلی رہی۔ اس کی ہولناکی کا اندازہ اسی سے لگالیں کہ جاپان کی ایک چوتھائی آبادی اسی مہلک مرض میں مبتلا ہوکر مرگئی تھی۔

467 سے لے کر 747 تک لاکھوں لوگ پلیگ سے ہلاک ہوچکے تھے۔ یہ بازنطینی دورِ حکومت تھا۔

اس وبا نے مغربی ایشیا اور افریقا کے بہت سے علاقوں کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ 1331 سے 1353 تک ایک ایسی مہلک وبا پھیلی جس کو بلیک ڈیتھ کا نام دیا گیا تھا۔

امراض کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود انسان کی۔

بس اتنا سمجھ لیں زندگی بہت مشکل ہے۔ اک آگ کا دریا ہے اور تیر کے جانا ہے۔ ایسے میں انسان کے پاس صرف ایک راستہ رہ جاتا ہے اور وہ ہے احتیاط، پرہیز۔ ان چیزوں سے پرہیز جن کے بارے میں اللہ نے ہمیں ہدایت دے دی ہے۔ آپ اس کے کرم کا اندازہ لگالیں کہ ایک طرف تو دنیا بھر کی بیماریاں اسی کے حکم پر پھیلتی ہیں اور دوسری طرف خود ہی ان بیماریوں سے محفوظ رہنے کے اسباب بھی بنا دیتا ہے اور ہدایت بھی کردیتا ہے۔

چلیں پھر امراض کی ہسٹری پر آجاتے ہیں۔

1520 عیسوی میں میکسیکو سے شروع ہونے والی وبا نے ایک قیامت برپا کردی تھی۔ یہ قیامت تھی اسمال پاکس کی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس میں پانچ سے آٹھ ملین افراد ہلاک ہوئے تھے۔ اس کے بعد پندرہ سو پینتالیس سے پندرہ سو اڑتالیس تک میکسیکو ہی میں Cocolitzi سے پندرہ ملین افراد ہلاک ہوگئے تھے۔

یہ کوئی منفرد مرض نہیں ہے بلکہ بہت سے امراض کا مجموعہ ہے۔ اس میں وہ ساری علامات ہوتی ہیں جو بہت سے دوسرے امراض میں ہوتی ہیں۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

1563ء سے 1564ء تک پلیگ کا موذی مرض لندن میں پھیل گیا۔ اس سے لاکھوں افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ اس کو طاعون کہا جاتا ہے۔

گوکہ اس کے انسان میں نمودار ہونے کی شرح کم ہوتی ہے لیکن یہ ایک خطرناک متعدی مرض ہے۔ یہ مرض جرثوموں سے پھیلتا ہے۔ اس کی کئی اقسام ہیں لیکن طبی طور پر تین اقسام مہلک تصور کیے گئے ہیں۔

1- Bubonic Plague

2- Septicemic Plague

3- پھیپھڑی طاعون

اس مرض کی تشخیص مریض کے خون یا بلغم یا پھیپھڑوں سے نکالے ہوئے مواد سے کی جاتی ہے۔

چونکہ تاریخ میں اس مرض میں ہلاکتوں کی تعداد زیادہ ہوئی تھی اسی لیے ہم نے اس کا ذکر ذرا تفصیل سے کیا ہے۔ یہ مرض 1345 عیسوی میں یورپ میں ایشیا سے آنے والے جہاز رانوں کی وجہ سے پھیلا تھا۔ یورپ کے پچاس سے ستر فیصد افراد اس مرض میں مبتلا ہوکر مرے تھے۔

1896ء میں انڈیا میں طاعون کی ہولناک وبا پھیلی تھی۔ اس میں پندرہ سے بیس لاکھ افراد ہلاک ہوئے تھے اسی لیے اس مرض کو بلیک ڈیتھ کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی سیاہ موت۔

بہرحال آج کل انجکشن اور دوائیں وغیرہ موجود ہیں جو اس مرض کی تشخیص کے ساتھ علاج بھی کرتی ہیں۔

1592ء عیسوی میں مالٹا میں ایک وبا پھوٹ پڑی تھی جس میں تیس ہزار افراد ہلاک ہوئے تھے۔ یہ وبا میزلز کی تھی۔

مالٹا ایک چھوٹا سا خوبصورت جزیرہ ہے۔ خود سوچیں کہ جہاں کی آبادی ہی مختصر ہو وہاں اگر ایک بڑی تعداد میں لوگ ہلاک ہوجائیں تو کیا رہ جاتا ہوگا۔

1592ء سے 1593ء تک لندن ایک بار پھر پلیگ کی زد میں آگیا تھا۔

لندن کے بعد پلیگ نے اپنا سفر ختم نہیں کیا بلکہ وہ اسپین تک پہنچ گیا تھا۔ 1569 عیسوی سے 1602ء تک وہ اپنی تباہ کاریاں پھیلاتا رہا تھا۔

1603ء میں پھر انگلینڈ میں اور 1609ء میں مصر میں پھیلا تھا۔

یہ تھیں پلیگ کی کارفرمایاں۔

1600 عیسوی سے 1650 عیسوی تک ساؤتھ امریکا ملیریا کی زد میں رہا تھا۔

1616ء سے 1619ء تک یہ دنیا پھر امراض کی زد میں آگئی تھی۔ بے شمار بیماریاں ایک ساتھ پھیل گئی تھیں۔ جیسے زرد بخار، انفلوئنزا، چیچک، اسہال پاکس، ہیپاٹائٹس سی وغیرہ۔

یہ اعداد و شمار اس لیے نہیں دیے جارہے کہ آپ جینے سے ہی مایوس ہوجائیں گے۔ جہاں ترقی شروع ہوئی کوئی نہ کوئی وبا نے دبوچ لیا۔

1621ء سے 1629ء تک ایک بار پھر پلیگ نے اپنا کام دکھایا اس بار اس کا اصل میدان اٹلی تھا۔

ہوتا یہ ہے کہ اس قسم کی وبا جہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اس کو اسی ملک یا شہر کا نام دے دیا جاتا ہے۔ جیسے چین کا کرونا وائرس۔ اسی طرح اٹلی کا پلیگ تھا۔

اس میں تین لاکھ انسانوں کی اموات ہوئی تھیں۔ ویسے تو دنیا بھر میں ایک دن میں لاکھوں افراد ہلاک ہوتے رہتے ہیں۔ پوری دنیا کو سامنے رکھیں۔ مختلف امراض میں، حادثات میں ایک دوسرے سے جھگڑوں میں، لیکن یہ اموات انفرادی نوعیت کی ہوتی ہیں۔

قدرتی آفات اور بیماریوں نے اتنے افراد نہیں مارے ہوں گے۔ جتنوں کو خود حضرت انسان نے مار دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اربوں کی تعداد ہیں۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

بیماریوں سے مرنے والوں کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس میں اچانک پینک پھیل جاتی ہے۔

1648ء میں سینٹرل امریکا میں زرد بخار نے ہزاروں کی جانیں لے لی تھیں۔

زرد بخار کو آپ انفلوئنزا کی انتہائی صورت سمجھ لیں۔ اس میں سردی لگتی ہے۔ جسم میں درد ہوتا ہے۔ خاص طور پر پیٹھ یا پشت میں درد، سر میں درد، بخار، جو ہر مرض کی اولین علامت ہے۔

ابتدائی طور پر اس کی تشخیص اس لیے بھی مشکل ہوتی ہے کہ اس کی علامت عام طور پر دوسرے مرض ہی کی ہوتی ہے۔ یہ کچھ دنوں کے بعد علاج سے ٹھیک ہوجاتا ہے لیکن جان لیوا بھی ہوا کرتا ہے۔

ابھی حالیہ برسوں میں یعنی 2013ء میں یہ مرض افریقا کے کئی علاقوں میں پھیل گیا تھا۔ اس سے پچاس ہزار افراد ہلاک ہوئے تھے۔ اس کے علاج کے لیے ویکسین کی جاتی ہے۔ انجکشن دیا جاتا ہے اور وہ سو فیصد موثر ہوا کرتا ہے۔

2020ء میں کرونا نے دنیا میں سراسیمگی پھیلا رکھی ہے۔ دنیا کا کوئی بھی ملک خود کو محفوظ نہیں سمجھ رہا ہے۔

ایک شعر سن لیں۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

یعنی اس مرض نے ہر طرف تیر چلا دیے ہیں۔

ترقی یافتہ اور پس ماندہ ممالک کے امراض میں فرق یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کے افراد ذہنی طور پر ٹرینڈ ہوتے ہیں۔ وہ معاملے کی سنگینی کا احساس کر کے خود ہی محتاط ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس پس ماندہ ممالک میں شعور کی کمی کی وجہ سے بہت سی چیزیں نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔ جیسے گندگی، ہر طرف کچرے کے ڈھیر۔ بدقسمتی سے خود اپنے ہی ملک میں دیکھ لیں۔ گٹر بہہ رہے ہیں۔ گندا پانی بہہ رہا ہے۔ ہر طرف گندگی مچھروں اور مکھیوں کی پرورش کا ہم نے ہر طرح خیال رکھا ہے۔ ان کے لیے ٹھکانے مہیا کر دیے ہیں۔ لہٰذا بیماریاں تو پھیلیں گی۔ جبکہ ہمارا کہنا ہے کہ صفائی نصف ایمان ہے۔ تو کہاں ہے ہمارا نصف ایمان؟

1855ء میں ہندوستان میں پلیگ پھیلا تھا جو Panademic ہو گیا تھا۔ یعنی اس کی تباہ کاریاں دوسرے ملکوں تک چلی گئی تھیں۔ اس میں دو کروڑ انسان ہلاک ہوئے تھے۔ کوئی بھی مرض ہو اس کی ابتداء بہت معمولی ہوا کرتی ہے پھر آہستہ آہستہ وہ پھیلتا ہی چلا جاتا ہے۔ یعنی پہلے جاں پھر جانِ جاں پھر جانِ جاناں ہو جاتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ کسی بھی منفی علامت کو اپنے جسم میں پروان نہ چڑھنے دیں۔ فوری طور پر دھیان دیں۔ یہ ڈاکٹر حضرات بس یوں ہی تو نہیں بیٹھے ہیں۔

چاہے کوئی بھی مرض ہو۔ اس میں آپ کو احتیاط کی ضرورت ہے۔ خدا کی مرضی اگر ایک طرف بیمار کرنے کی ہے تو دوسری طرف شفا دینے کی بھی ہے۔ بیمار بھی وہی کرتا ہے اور شفا بھی وہی دیتا ہے۔

اس قسم کی وبائیں اس وقت پھیلتی ہیں جب انسان خود کو مختار سمجھنے لگتا ہے لیکن ہمارا رب یہ بتا دیتا ہے کہ وہ جب چاہے پوری دنیا کی رفتار روک سکتا ہے۔ کیوں کہ سب کچھ اسی کے اختیار میں ہے۔

ایک معمولی سا مچھر جہاں ایک طرف مہلک مرض پھیلا سکتا ہے۔ وہاں نمرود کو بھی عاجز کر کے مار سکتا ہے۔ دیکھ لیں اس نے کیسے ترقی یافتہ ممالک کو ایک حقیر سے جرثومے کے ذریعے عاجز کر دیا ہے۔

اس وقت مجھے مدر ٹریسا کا ایک خوبصورت قول یاد آ رہا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ مرض یہ نہیں ہے کہ آپ کسی متعدی مرض میں گرفتار ہو گئے ہوں بلکہ مرض یہ ہے کہ دنیا کو آپ کی ضرورت ہی نہ رہے۔

ایسے لوگ وہ ہوتے ہیں جن کا ضمیر مطمئن ہو، جو اپنے اندر سے پاک ہوتے ہیں۔ کیوں کہ بیماریاں بھی پاکی کو دیکھ کر قریب نہیں آتیں۔

آپ نے حالیہ برسوں میں ایک نئی بیماری چکن گونیا کے بارے میں سنا ہوگا۔

کئی برسوں پہلے اس بیماری کا کسی نے نام بھی نہیں سنا تھا۔ اس بیماری نے ظاہر کر دیا کہ چاہے اس کا نام مشہور ہو یا نہ ہو اس کا وجود یقینی ہے۔ اسے اتفاق ہی سمجھ لیں کہ 2006ء میں انڈیا ہی میں کئی بیماریاں سامنے آئی تھیں۔

ملیریا۔ ڈینگی۔ چکن گونیا

2007ء اور 2008ء میں چین میں ایک مرض پھیل گیا تھا۔ یہ ہاتھوں پیروں اور چہرے کا مرض تھا۔ اس میں ہوتا یہ تھا کہ جسم پر سرخ سرخ دھبے یا دانے نمودار ہونے لگتے۔ اس کے ساتھ ہی تیز بخار بھی ہو جاتا تھا۔

دوسری طرف 2007ء میں یوگنڈا میں ایبولا وائرس پھیل گیا تھا۔

پھر ایک وبا شروع ہوئی جو آج بھی جاری ہے۔ وہ ہے ہیپاٹائٹس کی۔ جس کی نہ جانے کتنی اقسام سامنے آ چکی ہیں۔ ہیپاٹائٹس اے۔ بی۔ سی۔ ڈی۔ کے تک گنتی چلی گئی ہے۔ تو یہ سب کیا ہے یہی نا کہ اتنا ہی ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے۔

یہ مرض ہندوستان کے صوبہ گجرات میں قابو سے باہر ہو گیا تھا۔

2009ء میں تقریباً پوری دنیا ایک مرض کے چنگل میں گرفتار ہو گئی تھی۔ خاص طور پر بچے اس کے شکار ہوتے رہے تھے۔ یہ Mumps تھا۔

ایک تکلیف دہ مرض۔ اس کی ابتداء بخار سے ہوا کرتی۔ یاد رکھیں کہ بخار بذاتِ خود کوئی بیمار نہیں ہے بلکہ یہ آنے والی بیماریوں کا الارم ہے۔ خبردار کر دیتا ہے کہ عقب میں کوئی مرض آنے والا ہے۔

تو اس بیماری میں بخار کے ساتھ ساتھ سر کا درد۔ پورے بدن کا درد۔ بھوک کا نہ لگنا۔ اس کے ساتھ ہی گلے کے غدود میں سخت تکلیف کے ساتھ ورم وغیرہ۔

2016ء اور 2015ء میں دنیا کے بہت سے حصوں میں ایک مرض نے اپنا تسلط قائم کر لیا گیا تھا۔ وہ تھا زیکا وائرس۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

زیکاوائرس کی ابتداء یوگنڈا کے زیکا فورسٹ سے ہوئی تھی۔ پہلی بار یہ مرض 1947ء میں سامنے آیا تھا۔ یہ بیماری ایک مچھر کے کاٹنے سے ہوتی ہے۔ یہ مچھر دن کے وقت اپنی کارکردگی دکھاتا ہے۔ اس میں تیز بخار کے ساتھ ساتھ پورے بدن کا درد، الٹیاں اور گردن کا اکڑاؤ ہو جاتا ہے۔

اب ہم آپ کو ان چند بیماریوں کے بارے میں بتاتے ہیں کہ جن کے نام ہم نے نہیں سنے ہوں گے۔

بیماریوں کی اس طویل فہرست میں ہوسکتا ہے کہ آپ کے لیے یہ اجنبی بیماریاں ہوں لیکن جہاں یہ موجود ہیں وہاں کے لیے یہ کسی آسیب کی طرح منڈلا رہی ہیں۔ ایک طویل فہرست ہے لیکن ہم یہاں چند بیماریوں کے نام بتا رہے ہیں۔

Acan Thosis Nigricane
Achalasia
Acquired Hemophilia
Acth Defiency
Adams Oliver Syndrome
Addisons Disease
Adie Syndrome
African Iron Overload
Alpha Thalassemia

یہ ایک طویل فہرست ہے۔ کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں۔

اب چند بیماریاں بھی سن لیں۔ جن کے بارے میں ہم بہت کچھ سن چکے ہیں بلکہ ہم میں سے بہت سے ایسے بھی ہوں گے جو ان میں مبتلا رہ چکے ہیں۔ ویسے تو یہ سب بہت عام سی بیماریاں ہیں لیکن ان کو پُراسرار اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کی اصل وجوہات کا پتا نہیں چل سکا ہے۔

Aids

جی ہاں یہ ایک جانا مانا مرض ہے۔

پوری دنیا اس موذی مرض سے واقف ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس مرض کے حوالے سے بیشمار روایات ہیں۔ کہانیاں ہیں۔

اس کا پورا نام Acquired Immouno Deficiency Syndrome ہے۔

ترقی پذیر ملکوں میں اس مرض نے بہت تباہی مچائی ہے۔

ابھی تک مکمل اندازہ نہیں ہوسکا ہے کہ اس مرض کی وجوہات کیا ہیں لیکن اب حالیہ ریسرچ کے مطابق انسان کو یہ مرض چمپینزی سے لگتا ہے۔ اس مرض کے خوف میں ہمارا ملک بھی رہا ہے۔

Alzheimer Disease

یہ یادداشت کی خرابی کا مرض ہے۔

عام طور پر زیادہ عمر کے لوگ اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ فلاں چیز کہاں رکھی ہے۔ یا فلاں چہرہ کس کا ہے۔ یہ ایک عام سا مرض ہے۔ ہمارے یہاں کہہ دیا جاتا ہے کہ بڑے میاں سٹھیا گئے ہیں لیکن کوئی اس کی وجہ دریافت نہیں کرتا۔

میں اس مرض کو پُراسرار خانے میں اس لیے رکھ رہا ہوں کہ بہت عام ہے لیکن ابھی تک اس کا کوئی ٹھوس سبب دریافت نہیں ہوسکا ہے۔

دامن کی ہوا یاد نہ زلفوں کی گھٹا یاد
اب کچھ بھی نہیں سوز غم دل کے سوا یاد

عام نزلہ زکام

یہ بہت عام ہے۔

خاص طور پر جب موسم تبدیل ہوتا ہے تو لوگ نزلہ کھانسی اور بخار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ہم اس مرض کو بہت عام سا مرض سمجھتے ہیں۔ ہمارے ڈاکٹر حضرات آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ کسی الرجی کی وجہ سے ہے۔

چلیں مان لیا کہ کسی الرجی کی وجہ سے ہے لیکن وہ الرجی کیا ہے؟ ڈاکٹر حضرات ابھی تک اس کا سراغ نہیں لگا سکے ہیں۔

ہم عام طور پر مقامی ٹوٹکوں سے کام چلا لیتے ہیں۔ یعنی کھانسی نزلے کی دوا لے لی یا جوشاندہ پی لیا۔ یا چکن سوپ بنا کر پلا دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مریض ٹھیک بھی ہو جاتے ہیں لیکن ابھی تک اس کا پراپر سبب سامنے نہیں آسکا ہے۔

Avian flu

جی ہاں یہ بھی فلو کی ایک قسم ہے۔

فلو سے تو ہم سب واقف ہیں۔ کیوں کہ ہم سب کبھی نہ کبھی اس میں مبتلا رہے ہیں۔

لیکن یہ ایویئن فلو کیا ہے؟

یہ عام طور پر پرندوں سے لگتا ہے۔ پرندے بہ ظاہر بہت معصوم ہوتے ہیں اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے لیکن یہی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

پرندے اپنے ساتھ ایوین فلو جیسی بیماری بھی لے کر گھومتے ہیں۔

اور بڑی فراخ دلی سے پیار کرنے والے انسانوں میں تقسیم بھی کر دیتے ہیں۔ ابھی تک پرندوں میں اس مرض کی افزائش کا پتا نہیں لگایا جاسکا ہے۔

Pica

جی ہاں یہ بھی ایک مرض ہے جس کا نام ہے پیکا۔

یہ مرض عام طور پر بچوں میں دیکھنے کو آتا ہے۔ جب وہ الٹی سیدھی چیزیں کھانے لگتے ہیں۔ عام طور پر مٹی، کاغذ وغیرہ۔ والدین یہ سمجھتے ہیں کہ بچے کی عادتیں خراب ہوگئی ہیں لیکن یہ عادت کی خرابی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک مرض ہے۔

ابھی تک اس مرض کی مکمل وجوہات کا پتا نہیں چلا ہے لیکن کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ بچے میں کچھ معدنیات (منرلز) کی کمی پیدائشی طور پر ہوتی ہے تو وہ اس کی کو اسی قسم کی چیزیں کھا کر پوری کرتا ہے۔

عام طور پر بچے میں اس قسم کی عادات سے اس کے پیٹ میں جونکیں پیدا ہوجاتی ہیں پھر اس کا علاج تلاش کیا جاتا ہے۔ پہلے ٹونے ٹوٹکے سے کام چلایا جاتا تھا۔

ایک بات یاد آگئی۔ آپ سے شیئر کرتا چلوں۔ مجھے اتفاق سے کئی جگہوں پر رہنے کا موقع ملا ہے۔ جیسے ہندوستان، بنگلہ دیش، جو اس زمانے میں مشرقی پاکستان ہوا کرتا تھا، پھر پاکستان۔ میں نے مختلف بیماریاں مختلف علاقوں میں دیکھی ہیں۔

جیسے ہندوستان میں فیل پا۔ جس میں پیر سوج کر ہاتھی کے پیر جیسے ہوجاتے ہیں۔ یہاں بھی اس قسم کے کئی کیسز دیکھنے میں آئے ہیں۔ یا ہائیڈروسیل جس میں فوطے پھول جاتے۔ بنگلہ دیش میں ایک مرض عام دیکھنے میں آیا کرتا ہے۔ گلے کا سوج جانا، گردن میں بڑی گلٹی پھولنے لگتی ہے اور سوج کر باہر کو لٹک آتی ہے۔ وہاں اس مرض کو گیگھا کہتے ہیں۔

جبکہ پاکستان میں ذرا مہذب قسم کی بیماریاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ بلڈ پریشر، شوگر، دل کے امراض وغیرہ۔

چلیں یہ کچھ یاد آگیا تھا اسی لیے لکھ دیا ہے۔ اب پھر اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔

Auto Immune Disorder

یہ بھی ایک مرض ہے۔ اس میں کسی نامعلوم وجہ سے انسان کی قوت مدافعت ختم ہوجاتی ہے۔

یعنی کسی بھی مرض کے مقابلے کی سکت نہیں رہتی۔ اس میں صورت حال خطرناک ہوجاتی ہے۔ بہرحال اس کا بھی سبب ابھی تک دریافت نہیں ہوسکا ہے۔

شیزوفرینیا یہ ایک عام اصطلاح ہے۔

بہت سننے میں آتا ہے۔ اس مرض کا تعلق ذہن یا دماغ سے ہوتا ہے۔

عام طور پر اسے نفسیاتی مرض سمجھا جاتا ہے۔ بہت عجیب وغریب صورت ہوجاتی ہے۔ اس میں مبتلا شخص کی دنیا الگ ہی ہوتی ہے۔ اسے جاگتے میں خواب دکھائی دیتے ہیں۔ وہ وہم کا شکار ہوتا ہے۔ اسے روشنیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اسے صورتیں دکھائی دیتیں ہیں جن سے وہ باتیں کیا کرتا ہے۔ اس کی گفتگو میں کوئی ربط نہیں رہتا۔ کہنا کچھ اور چاہتا ہے لیکن کہتا کچھ اور ہے۔ عام طور پر ایسے لوگوں کو ذہنی مریض سمجھ لیا جاتا ہے۔

Creutzfeldt Jakob Disease

یہ کتنا مشکل نام ہے۔

لیکن آپ کی آسانی کے لیے اس مرض کو بہت آسان Mad Cow کردیا گیا ہے۔

پچھلے دنوں ہمارے ملک میں اس کے بہت چرچے رہے ہیں۔ یہ ایک دماغی مرض ہے اور عام طور پر گائے کے گوشت سے ہوا کرتا ہے۔

بیماریوں کے سلسلے میں ایک بات جان لیں۔ کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ برسوں کچھ نہیں ہوتا اور کبھی فوری طور پر گرفت میں لے لیتا ہے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ بھائی ہم تو برسوں سے گائے کا گوشت کھا رہے ہیں۔ ہمیں تو کچھ نہیں ہوا۔

ٹھیک ہے آپ کو کچھ نہیں ہوا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس مرض کا کوئی وجود نہیں ہے۔

Chronic Ftigue Syndrome

جی ہاں یہ بھی ایک مرض ہے۔ اس کی علامت سستی، تھکن وغیرہ ہے۔

ہم بڑی آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ فلاں بہت منحوست زدہ ہے۔ ہر وقت سویا ہی رہتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بے چارہ اسی مرض میں مبتلا ہو۔

انسان کو بیمار ہونا ہے۔ دنیا کو علاج کرنا ہے۔ یہ ایک سلسلہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ کو آگاہی تو ہو لیکن ضروری نہیں ہے کہ بیمار ہر وقت مرجھایا ہوا ہی دکھائی ہے۔

بس خدا سے دعا کریں اور احتیاط کرتے رہیں۔ بیماریاں آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔

++

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

شوہر خور

ایم الیاس

عورت کی فطرت میں رحم دلی ہوتی ہے۔ ظالم تو مرد ہوتا ہے مگر وہ عورتیں کیسی تھیں؟ یورپ میں صنعتی ترقی نے کس طرح نفسیاتی الجھنیں پیدا کردی ہیں، کیسے کیسے عجیب و غریب جرائم پنپنے لگے ہیں اس کی ایک ہلکی سی جھلک۔

ایسے جرائم یورپ میں ہی پنپتے ہیں

مسز زو کے جانے کے بعد پڑوس والا مکان مہینوں تک خالی رہا۔

کسی نے مکان کو کرائے پر نہیں لیا۔ کرائے پر نہ لینے کی دو وجوہ تھیں۔

ایک تو مالک مکان نے اس کا کرایہ اتنا بڑھا دیا تھا، جیسے ایسا مکان پورے علاقے میں نہ ہو۔ کرائے کے مکان نایاب تھے اور کرایہ دار بھی اچھے نہ ملتے تھے۔

دوسری بات یہ تھی کہ اس مکان میں زو کے ساتھ جو

دردناک واقعہ پیش آیا تھا اس وجہ سے بھی اسے کوئی بھی کرایہ پر لینے کو تیار نہیں تھا۔ ہوا یہ تھا کہ زو کے ایک دوست نے جو اس کے دفتر میں افسر تھا، وہ نشے میں دھت آیا تو زوا کیلی تھی اس نے زو کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کی تھی۔ زو نے عزت بچانے کے لیے مزاحمت کی لیکن وہ اس کے قابو میں بے بس ہو چکی تھی پھر اس نے خود سپردگی سے من مانیاں کرنے دیا تو وہ خوش ہو گیا اور اس کی گرفت کمزور پڑ گئی تو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس شرابی کو اپنی پوری قوت سے اپنے اوپر سے دھکیل کر فرش پر بستر سے گرا دیا اور لپک کر پھل کاٹنے والی چھری اٹھائی اور اس کے سینے میں گھونپ دی۔ زخم کاری نہیں تھا اس لیے وہ بچ گیا اور زو کی عزت بھی بچ گئی لیکن محلے والوں نے اس واقعے کو ایسا رنگ دیا کہ میاں بیوی مکان چھوڑ کر چلے گئے۔

اسٹیٹ بروکر جب کسی کو یہ مکان دکھانے کے لیے لاتا تو ان کے جانے کے بعد وہ میرے ہاں چائے پینے کے لیے آجاتا تھا۔ اس کی عمر ستر برس کے لگ بھگ تھی۔ جب اس سے پوچھا جاتا کہ کیا ہوا؟ کیا مکان پسند آیا تو وہ جواب دیتا کہ تمہارا... یہ پڑوس کا مکان بند گلی میں واقع ہے اور یہاں آسیب زدہ سناٹا اور ویرانی نے بسیرا کیا ہوا ہے اس لیے لوگ کرائے پر لینے سے گریز کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بدروحوں نے بسیرا کیا ہوا ہے اور زو کا واقعہ وہ کسی سے سن لیتے ہیں تو خوف زدہ اور ہراساں ہو جاتے ہیں۔ میں بھی مکان دکھا دکھا کر تھک چکا ہوں۔ میں نے لینڈ لورڈ کو یہ تجویز دی ہوئی ہے کہ رنگ و روغن کروا کر اور باہر سے آرائش کر کے اس مکان کو فروخت کر دے۔ اسے خریدنے کے لیے دو تین گاہک لگے ہیں، دیکھیں مالک مکان کی کھوپڑی میں کیا سماتا ہے؟

جب ایک روز اس مکان کی صفائی اور رنگ و روغن ہونے لگا تو میں سمجھ گئی کہ یہ مکان خدا خدا کر کے فروخت ہو گیا ہے۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا تو ایسا لگ رہا تھا کہ بس اب یہ کسی بھی دن آباد ہونے والا ہے۔ میں اس لیے بھی خوش تھی کہ میری تنہائی دور ہونے والی ہے جب سے زو والا واقعہ اس مکان میں رونما ہوا تھا اس نے میرے دل میں ایک ان جانے خوف کو جنم دے دیا تھا کہ کہیں کوئی درندہ صفت کسی دن ہمارے ہاں بھی گھس نہ آئے۔ دیوار نہ پھاند لے۔ اس لیے کہ میں سارا دن اکیلی رہتی ہوں۔ اس کے باوجود کہ مکان کو اندر سے مقفل رکھتی ہوں۔ اس گھر میں جو خاندان آنے والا ہے اس میں عورتیں اور بچے بھی ہوں گے۔ ان کی محبت میں نہ صرف میرا وقت کٹ جائے گا بلکہ دل بھی بہلتا رہے گا۔ میرا دل جو ان جانے خوف میں بسا ہوا ہے اس کا دھڑکا ختم ہو جائے گا۔

اس روز رات کے وقت جب میرے شوہر شیفرز نے مجھے گنگناتے ہوئے سنا تو بڑا حیران ہوا... کیونکہ وہ کئی دنوں سے مجھے فکرمند اور چپ چاپ سا دیکھتا آرہا تھا۔ میں اب گرم جوشی سے پیش نہیں آرہی تھی اور خود کو ایک سرد لاش کی طرح اس کے حوالے کر دیتی تھی۔ جب میں اس سے گرم جوشی سے پیش آئی تو اس نے حیرت اور رشک بھرے لہجے میں کہا۔ ''کیا بات ہے، آج تم بہت خوش اور سرشار سی لگ رہی ہو، تمہارا چہرہ دمک رہا ہے اور بڑا نکھار آگیا ہے۔ آنکھیں بھی چمک رہی ہیں؟ میں نے تمہیں کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا۔ کیا لاٹری میں بڑا انعام نکلا ہے؟''

''ہاں، بڑا انعام۔'' میں نے اس کے گلے میں اپنی بانہیں حائل کر کے کہا۔

''بڑا انعام؟'' وہ میرے چہرے پر جھکتے جھکتے رک گیا۔ ''دس لاکھ ڈالر کا؟''

''نہیں..... انعام یہ کہ شاید یہ مکان فروخت ہو گیا ہے۔'' میں اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''اس کی صفائی مکمل ہو چکی ہے، رنگ و روغن بھی ہو گیا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ دو ایک دنوں میں بس یہ گھر بسنے والا ہے۔ بس اس خیال سے خوش ہو رہی ہوں کہ اچھی پڑوسن ملے گی۔''

''میں اس بات کو قطعی پسند نہیں کرتا کہ کوئی ہماری آزادی اور تنہائی میں مخل ہو۔'' اس نے میری بات پوری ہونے نہیں دی۔ ''میں ہرگز ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ پڑوس کی عورتیں اور بچے منہ اٹھائے جانوروں کی طرح گھسے چلے آئیں۔ لہٰذا تمہیں پڑوس سے دوستی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''تم کسی بات کی ذرہ برابر فکر نہ کرو اور نہ ہی پریشان ہو۔'' میں نے جھٹ سے کہا۔ ''میں خود بھی نہیں چاہتی کہ ہماری یہ تنہائی ان کی وجہ سے متاثر ہو۔ میں ان کے قریب رہ کر بھی کوسوں دور رہوں گی۔ کسی کو اپنے گھر میں گھسنے اور اپنی تنہائی میں مخل ہونے نہ دوں گی۔ میں صرف اس لیے اس گھر کے بسنے سے خوش ہوں کہ اس ویرانے میں احساس تحفظ ہو گا۔''

میں نے یہ بات شیفرز کو خوش کرنے کے خیال سے کہی تھی۔ میرے من میں کیا تھا، میں نے کیا سوچا ہوا تھا اور اس

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

وقت میں کیا سوچ رہی تھی، یہ بات اس سے کہنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے اس بات کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں تھا کہ مجھے تنہائی نے اپنے شکنجے میں کس بری طرح جکڑ رکھا ہے۔ اسے نہ میری تنہائی کا احساس تھا اور نہ ہی اسے اس بات کی کوئی فکر تھی کہ اس کی حسین اور نوجوان بیوی گھر میں اکیلی رہتی ہے اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ پڑوس کا مکان خالی ہے اگر کوئی برے ارادے سے گھسا اور میں نے مدد کے لیے شور مچایا تو کوئی بچانے اور مدد کرنے والا بھی نہیں ہے۔

وہ ایک بے حس، بے فکر، بے پروا اور خودغرض قسم کا شوہر تھا۔ مجھے اس کی فطرت اور عادت بہت کھلتی تھی لیکن میں کیا کر سکتی تھی۔ صبر اور ضبط کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

میں بھی ان لڑکیوں میں سے تھی جو شادی سے قبل یہ خواب دیکھتیں اور سوچتی ہیں کہ شادی کے بعد ازدواجی زندگی خوشگوار، پُرلطف اور پُرکیف بسر ہوگی۔ میں نے جو سوچا، خواہش کی اور سپنا دیکھا وہ پورا ہوا۔ تین برس ہم دونوں اس تنہائی سے بہت محظوظ ہوتے رہے۔ زندگی سپنوں کی طرح حسین اور رنگین لگی۔ جب یہ جذبات کا رنگ و روغن اتر گیا تو وہ رنگین اور حسن و کیف نہیں رہا، ہم دونوں جیون کی اس راہ پر اجنبی مسافر بن گئے بستر پر ہمارے درمیان فاصلے بڑھنے لگے۔ چھونے تک کی خواہش نے دم توڑ دیا۔ اس نے مجھے یہ...ا نہیں ضرورت کا ساتھی سمجھ لیا تھا اور بڑے رسمی انداز سے پیش آتا تھا۔ ہم دونوں ساتھ ہوتے ہوئے بھی تنہائی محسوس کرتے تھے اور یہ تنہائی رفتہ رفتہ کسی زہریلی ناگن کی طرح ڈسنے لگی تھی۔

یہ میرا اکیلا پن اس لیے جان لیوا بن گیا تھا کہ اسے میری ملازمت پسند نہیں تھی۔ میں ایک ملٹی نیشنل فرم میں ایم ڈی کی پرسنل سیکریٹری تھی۔ اس کا خیال تھا کہ باس اور سیکریٹری کے درمیان بے تکلفی اور بڑھ جاتی ہے تو وہ میاں بیوی بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس کی بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ سو فیصد درست تھا، ایسا اکثر دفاتر اور بہت ساری فرموں میں ہوتا تھا اس لیے بھی کہ انہیں ہراساں کر کے فائدہ اٹھایا جاتا تھا اور وہ اپنی خواب ناک زندگی اور مستقبل کے لیے مجبور اور بے بس ہو جاتی تھیں۔ ایسا صرف ہمارے ہاں نہیں تھا، باقی دنیا میں بھی ایسا ہوتا تھا لیکن میرے ساتھ ہرگز ایسا نہ تھا کیونکہ میرا باس نہ صرف بہت سخت گیر بلکہ اصولی شخص تھا، وہ میری یا دفتر کی کسی لڑکی اور عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا اگر میں اپنے شوہر سے بات کرتی اور یقین دلانے کی کوشش کرتی کہ باس ہرگز ایسا نہیں ہے تو بھی وہ یقین نہیں کرتا بلکہ اور مشکوک ہو جاتا، کیونکہ میں بلا کی حسین اور بے پناہ پُرکشش تھی اگر نوجوان لڑکے اور مرد مجھے حریصانہ نظروں سے دیکھتے تو اس میں میرا کیا قصور تھا۔ جب کہ میں ایسا لباس نہیں پہنتی تھی کہ لوگ میری طرف متوجہ ہو جائیں۔

وہ مجھے ایک لگژری اپارٹمنٹ سے نکال کر اس کالونی میں لے آیا تھا۔ یہ کالونی شہر سے میلوں دور ایک ویرانے میں واقع تھی۔ یہاں تعمیرات کا سلسلہ بڑی سست رفتاری سے جاری تھا۔ آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں نے اس سے متعدد بار کہا تھا کہ مجھے ایک گاڑی خرید کر دے دو، کیونکہ میں کہیں آجا نہیں سکتی۔ سواری بھی نہیں ملتی۔ اس کے لیے مین روڈ پر جانا پڑتا تھا جو دو تین میل کی مسافت پر تھا اگر جاؤں تو ڈر اس بات کا ہے کہ اس ویرانے میں کوئی مجھے ہوس کا نشانہ نہ بنا دے۔ اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی تھی۔

اس نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یہ عیاشی ہے جو اس کی تنخواہ میں ممکن نہیں اور نہ ہی بینک بیلنس اتنا ہے کہ گاڑی خرید سکے۔ اس کے پاس جو گاڑی ہے وہ اس کی قسطیں ابھی تک پوری ادا نہیں کر سکا ہے۔ چونکہ کمپنی کی گاڑی مجھے لاتی لے جاتی تھی اس لیے میں نوکری کر پا رہی تھی۔ وہ مجھے شہر سے اس لیے یہاں لایا تھا کہ وہاں اس کے دوستوں کی آمدورفت بہت بڑھ گئی تھی۔ اس کی وجہ میرا حسن و شباب تھا۔ جب بھی اس کا کوئی دوست آتا اور جو کچھ بھی لاتا وہ صرف میرے لیے ہوتا۔ وہ گھنٹوں بیٹھ کر میرے ہاتھ کی چائے اور کھانوں کی جو تعریف کرتے تھے اور جو جذبہ کارفرما تھا میں اس کی تہہ میں پہنچ جاتی اور وہ بھی اس بات کو محسوس کرتا تھا۔ وہ بڑا شکی مزاج بھی تھا۔ اس وقت تک گھر سے نہیں نکلتا تھا جب تک میں کمپنی کی وین میں چلی نہیں جاتی پھر خاصی دیر بعد ٹیلی فون کر کے تسلی کرتا کہ میں دفتر پہنچی یا نہیں اور پھر اس نے دفتر کی ایک عورت کو جو چالیس برس کی تھی مخبر بنا رکھا تھا جو اس سے روز رپورٹ لیتا رہتا تھا کہ میں دفتر میں ہوں یا نہیں۔ لنچ کیا اکیلی کرتی ہوں یا باس کے ساتھ۔ کیا باس یا کسی افسر سے ہنس ہنس کر بات کرتی ہوں۔ دفتر کے اسٹاف میں میری کس کس سے دوستی اور بے تکلفی ہے۔

میں یہاں ایک طرح سے قیدی بن کر رہ گئی تھی۔ یہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

گھر میرے لیے کسی زنداں سے کم نہیں تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے ایک انجانا سا خوف محسوس ہوتا ہے کہ درندے مجھے اس مکان میں اکیلی دیکھ کر گھس نہ آئیں۔ میں صبح نو بجے دفتر جاتی اور پانچ بجے واپس آتی تھی۔ ہفتہ اور اتوار چھٹی ہوتی تھی۔ میں اچھی طرح سے مکان کو چاروں طرف سے بند کر کے رہتی تھی۔ شیفر مجھے شاپنگ اور ڈنر پر بھی کبھار لے جایا کرتا تھا لیکن اس کی نوبت دو ایک مہینے میں کسی دن آتی تھی کیونکہ وہ اپنی مصروفیت کے باعث تقریباً ہر روز رات کے وقت دیر سے آتا تھا۔ میں نے اس سے دبی زبان سے شکایت بھی کی تھی لیکن اس نے سنی اَن سنی کر دی تھی۔ ایک روز تو وہ مجھ پر بہت بگڑ گیا تھا۔ اس دن سے میں نے اس سے کچھ کہنا بند کر دیا تھا کیونکہ اس سے کچھ حاصل نہ تھا۔

☆.....☆

ایک روز دن کے دس بجے سوزوکی وین سامان لیے برابر والے گھر کے سامنے رکی تو میرا دل خوشی سے دھڑک اٹھا اور مجھ پر ایک عجیب سی سرشاری چھا گئی۔ اگر شیفر میری اس خوشی کو دیکھتا تو اس کا شک میں مبتلا ہو جانا فطری تھا۔ وہ یہ سمجھتا کہ میرے کسی چاہنے والے نے یہ مکان لیا ہے۔ بیوی کا انتہائی حسین و جمیل ہونا بھی مصیبت ہے۔ میں نے کھڑکی کے پردے کی اوٹ سے اپنی پڑوسن کا جائزہ لیا۔ اس وقت شیفر گھر پر نہیں تھا۔ اتوار کا دن تھا اور وہ کسی سے ملنے گیا تھا۔ وہ جاتے وقت کہہ گیا تھا کہ اس کی واپسی سہ پہر کے بعد ہوگی اس لیے پڑوسی سے ملنے میں کوئی قباحت نہیں تھی لیکن میں نے سوچا کہ فون کی گھنٹی بجی تو میں کیا کروں گی۔ اس کی آواز باہر سنائی دینے سے رہی۔ وہ چھٹی کے دن تین چار بار باہر سے ضرور فون کرتا تھا۔ کسی وقت کسی وجہ سے فون ریسیو نہ کرتی تو وہ مشکوک ہو جاتا تھا، دو ایک بار دن میں آ کر یہ دیکھتا تھا کہ کہیں میں گئی ہوئی تو نہیں ہوں۔ بستر کی چادر کی شکنیں اور میرے چہرے پر غور سے دیکھتا کہ کہیں اس پر نشانات تو نہیں ہیں؟ پھر لباس کو دیکھتا کہیں وہ بے ترتیب تو نہیں؟ غسل خانے، کمرے اور چھت پر بھی جا کر دیکھتا کہ کہیں کوئی چھپا ہوا تو نہیں ہے؟ اس نے اپنے کسی دوست کو اس گھر کا پتا تک نہیں بتایا تھا۔ وہ اس قدر شکی تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ میں کیا کر سکتی تھی سوائے صبر اور برداشت کے۔

میں ٹیلی فون کی گھنٹی کی پروا کیے بغیر اپنے قید خانے سے باہر نکل آئی۔ میں نے اس کمرے کا دروازہ اور کھڑکی کھلی رکھی جس میں ٹیلی فون رکھا تھا۔ میں نے دیکھا تو مجھے یقین نہیں آیا۔ وین سے جو عورت ساماں اتروا رہی تھی وہ بیس برس کی حسین و جمیل اور سرو قد لڑکی تھی، اس کے چمکدار اور سیاہ بال اس کے حسن کو بے پناہ دلکش بنا رہے تھے۔ اس کی صورت بھی بڑی موہنی تھی۔

''ہیلو!'' میں نے اسے بڑی خوش دلی سے مخاطب کیا۔

میں نے متلاشی نظروں سے وین کے اندر باہر دیکھا۔ شاید اس کا شوہر بھی موجود ہو لیکن ڈرائیور اور مزدوروں کے سوا کوئی اور دکھائی نہ دیا۔ میں نے حیرت سے سوچا کیا وہ اس مکان میں اکیلی رہے گی۔ بعض ملازمت پیشہ لڑکیاں، عورتیں فلیٹ یا وومن ہوسٹلز میں اکیلی رہتی تھیں لیکن اتنی دور کاؤنٹی میں اکیلی رہنا سمجھ سے بالاتر تھا۔

وہ آواز سن کر میری طرف گھومی تو میں نے اس سے کہا۔ ''میرا نام ٹیزر ہے میں آپ کی پڑوسی ہوں۔''

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔'' اس نے بڑی شگفتگی اور گرمجوشی سے جواب دیا۔ ''میرا نام اونیل ہے۔ آپ کیسی ہیں؟'' وہ دل کش انداز سے مسکرائی تھی لیکن اس کا لہجہ سپاٹ تھا اور اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ وہ کسی متوحش ہرنی کی طرح لگ رہی تھی۔

میں تو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہ رہی تھی کہ اس کی ایسی دیرینہ دوست بن جاؤں جیسے بچپن کی سہیلی ہوں۔ اس لیے میں نے اس سے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ''یہ کاؤنٹی بہت ہی خوب صورت اور پُرسکون ہے۔ بس شہر سے دور اور مین روڈ سے فاصلے پر ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں لانے کے لیے بھی دو فرلانگ طے کرنا پڑتے ہیں۔ دوسرے پڑوسی ہم سے خاصے فاصلے پر ہیں۔''

اس نے کچھ دوری پر واقع سفید رنگ کے مکان کی طرف اشارہ کر کے متوجہ کیا۔ ''کیا اس مکان والوں سے شناسائی ہے؟ کیسے لوگ ہیں؟''

''جی نہیں۔'' میں نے نفی کے انداز میں سر ہلایا۔ ''میں نے یا میرے شوہر نے کبھی ان سے ملنے کی کوشش نہیں کی ہم اپنی دنیا میں مگن ہیں۔''

اونیل نے اس سفید مکان پر سے نگاہیں ہٹا کر میری طرف دیکھتے ہوئے مترنم لہجے میں پوچھا۔ ''شہر چھوڑنے اور اس کاؤنٹی میں یہ مکان خریدنے کی وجہ یہ ہے کہ شہر مچھلی بازار بنتا جا رہا ہے اور وہاں چین سکون غارت ہونے لگا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ہے۔ ہم لوگ سکون و اطمینان سے رہیں اس لیے ایسی جگہ کی تلاش ہے۔ ایک اور بات بھی ہے کہ شہر میں آلودگی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور پھر جب دیکھو لوگ منہ اٹھائے چلے آرہے ہیں۔ شکم سیر کیے بغیر جانے کا نام نہیں لیتے ہیں۔''

جب میں نے دیکھا کہ وین سے سارا سامان اتار کر اندر پہنچا دیا گیا ہے تو میں نے سوچا کہ اب اس سے باتیں کرنا مناسب نہیں۔ میں واپس جانے کے لیے مڑ رہی تھی تو اس نے پیاری سی مسکراہٹ سے کہا۔ ''جب میں نے پہلی بار اس مکان کو آکر دیکھا تو یہ بہت ہی اچھا لگا۔ یہ ہمارا پہلا مکان ہے۔ اس سے پہلے ہم فلیٹ میں رہائش پذیر تھے۔ فلیٹ ایک قید خانہ کی طرح ہے۔ اس کی کوئی تعمیری چیز اپنی نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی تعمیری تبدیلی اس میں کی جاسکتی ہے۔ جب کہ مکان میں ایسی کوئی بات نہیں ہوتی ہے اور پھر یہاں تازہ ہوا ہے، آلودگی سے پاک۔ یہاں آتے ہی تازہ دم ہوگئی ہوں۔ سامان باندھتے وقت جو تھکن ہوئی تھی وہ ایک دم سے اتر گئی ہے۔ بڑا اچھا لگ رہا ہے۔''

''اگر آپ کچھ خیال نہ کریں تو کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ نے یہ مکان کتنی مدت کے لیے لیا ہے؟'' جب میں نے محسوس کیا کہ وہ باتیں کرنے کے موڈ میں ہے تو میں نے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ میں اس طرح اپنی بوریت اور اکتاہٹ کو دور کرنا چاہتی تھی۔

''جو بھی مکان لیتا ہے وہ ایک مدت کے لیے ہوتا ہے۔ کتنی مدت کے لیے یہ کہنا قبل از وقت ہے۔'' اس کا لہجہ شوخ سا تھا۔ ''ہوٹل میں تو چند دن رہا جاتا ہے، کیونکہ زیادہ مدت رہنا غیر ضروری اخراجات کو دعوت دینا ہے۔ رافیل کا دل جب تک یہاں سے بھر نہیں جاتا، وہ جڑیں نہیں نکال لیتا۔ رافیل میرے شوہر کا نام ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''رافیل کی خواہش پر سارا دارومدار ہے۔''

میں اس کی بات سے خوش ہوگئی کہ وہ یہاں ایک لمبی مدت تک رہے گی لیکن اس کی جڑیں نکالنے والی بات مجھے بے حد پُراسرار لگی۔ تاہم میں نے حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ میں نے سوچا کہ اس کے ساتھ وقت بہت اچھا گزرے گا اور اب تنہائی دور ہو جائے گی۔ بوریت اور اکتاہٹ کی کوفت اب نہیں ہوا کرے گی۔ زوکے جانے سے جو خلا پیدا ہوا وہ پُر ہو جائے گا۔ میں نے بڑے خلوص سے کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ مکان تبدیل کرنا کیسا دشوار اور مشکل ترین کام ہوتا ہے، میں بھی اپارٹمنٹ سے اس مکان میں آئی ہوں۔ ہاں، آپ کھانا مت بنائیں۔ دوپہر اور رات کا کھانا آج میری طرف سے ہے، اس میں تکلف کی کوئی بات نہیں۔ پڑوسی ہونے کے ناتے نہ صرف میری ذمے داری بلکہ فرض بھی ہے۔ میں ابھی جا کر کھانا بناتی ہوں۔''

''آپ کی اس محبت اور نوازش کا بہت بہت شکریہ۔''

اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں کی گہرائیوں میں عجیب سی پُراسرار چمک تھی۔ ''میں اپنے شوہر کو لینے جارہی ہوں، پلیز آپ زحمت نہ کریں۔''

اس نے یہ بتانے کی زحمت نہیں کی کہ وہ اپنے شوہر کو کہاں سے لانے جارہی ہے اور وہ اس کے ساتھ کیوں نہیں آیا؟

جب وہ دو دن کے بعد لوٹی تو میرا خیال درست نکلا کہ اس کا شوہر کہیں بہت دور تھا۔ جب وہ اپنے شوہر کے ساتھ آئی تو دن ڈوب چکا تھا اور شام کے سائے گہرے اندھیرے کی آغوش میں جا چکے تھے۔ اس وقت میں کھڑکی میں کھڑی شیفر کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اس وقت وہ ٹوٹی تھی۔ باہر چونکہ ایسا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا اس لیے مجھے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے پر بھی وہ نظر نہیں آیا تھا۔

میری اس تانک جھانک کی وجہ یہ تھی کہ میرے پاس وقت گزاری اور دل بہلانے کے لیے کوئی مصروفیت نہ تھی۔ ٹی وی پر ملی اور غیر ملی چینلز تھے، ہر قسم کے تھے اور ہر طرح کے پروگرام اور فلمیں آتی تھیں مگر میں یہ سب کچھ دیکھ کر تنگ اور بے زار ہو چکی تھی۔ بار بار فلمیں، فحش بے ہودہ مناظر جن سے اب ابکائی آنے لگی تھی۔ عورت کی اس سے بڑی توہین اور تذلیل کیا ہو سکتی ہے کہ اسے بے حجابی کے ساتھ پیش کیا جائے... اس لیے تانک جھانک میں کوئی برائی نہ تھی۔ شیفر بھی دیر سے آتا تھا۔ جب وہ آتا تو پھر ٹی وی کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی... کیونکہ ہم دونوں کھانا کھا کر چہل قدمی کرنے نکل جاتے تھے۔ ایک لمبے عرصے بعد پڑوسی آئے تو لگا کہ چپکے سے بہار آگئی ہے۔

اس پڑوسی کی آمد سے مجھے جو خوشی اور بے پایاں مسرت ہوئی تھی وہ دیرپا نہ رہی۔

میں نے نہ جانے کیا کچھ سوچ لیا تھا لیکن وہ سوچ پوری نہ ہو سکی۔ رافیل کا زیادہ وقت شاید گھر ہی میں گزرتا تھا کیونکہ وہ مجھے ایک بار بھی نظر نہیں آیا۔ اونیل بھی اپنے گھر میں سامان سجانے میں اس قدر مصروف رہتی تھی کہ اسے شاید سر کھجانے کی مہلت بھی نہیں ملتی تھی۔ میں نے صبح و شام کام

Qadar Azeem
Pakistanipoint.com

کے اوقات میں ایک سراغ رساں کی طرح بھی دیکھا۔ چھت سے کمروں کی کھڑکیوں سے بھی تانک جھانک کی مگر وہ مجھے بھی نظر نہ آیا۔

جب میں کچن میں رات کا کھانا بنا رہی تھی تب شیفر میرے پاس آکر کھڑا ہوگیا اور پڑوس کے متعلق پوچھا۔

''ٹیزر! تم نے نیا پڑوس کیسا پایا؟''

''اس کا نام اونیل ہے۔ وہ ایک حسین وجمیل لڑکی ہے۔''

''میں نے تم سے لڑکی کے جغرافیہ کے بارے میں نہیں اس کے شوہر کے متعلق پوچھا ہے۔'' شیفر نے بے پروائی سے کہا۔

''معلوم نہیں وہ کیسا ہے؟ کیونکہ میں نے ابھی تک اس کی شکل تو کیا ایک جھلک بھی نہیں دیکھی ہے۔ اس کا نام رافیل ہے۔'' میں نے شیفر کو بتایا۔

''لیکن تم نے اس کا نام کیسے معلوم کرلیا؟'' وہ استہزائی لہجے میں بولا اور اس کے چہرے پر ناگواری سے پھیل گئی۔ وہ مشکوک سا ہو رہا تھا کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ اس کے بارے میں بتانے سے دانستہ گریز کررہی ہوں۔ اس کا جملہ میرے دل پر چابک بن کر لگا۔ میں کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' میں نے تنک کر کہا۔

''میں صرف اس کے نام سے واقف ہوئی ہوں۔ اس کی شکل تو کیا اس کی پرچھائیں تک نہیں دیکھی ہے۔ اس کا نام مجھے اس کی بیوی نے بتایا تھا۔''

''کیا میں نہیں جانتا ہوں کہ تم سارا دن میری غیر موجودگی میں کیا کرتی ہو؟'' شیفر نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

''میں دیر سے گھر لوٹتا ہوں۔ اب تک اس سے ملا نہیں ہوں۔ میرے خیال میں وہ کسی کارخانے میں رات کی شفٹ میں کام کرتا ہے، وہ تم دونوں کو خوش رکھتا ہوگا۔ میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں اس کا مطلب صاف اور واضح بھی ہے۔ تم اس بات سے انکار نہیں کرسکتیں۔''

''شیفر! خدا کے لیے تم اس انداز سے تو نہ سوچو۔'' میں نے حسب معمول ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ لہجے کو ٹھنڈا رکھنا میری مجبوری تھی۔ ایک مرتبہ جب میں اس سے الجھ پڑی تھی تو وہ آپے سے باہر ہوگیا تھا۔ میرا چہرہ تھپڑوں سے لال کر کے گھر سے باہر دھکا دے دیا تھا۔ میں اگر چاہتی تو پولیس کی مدد لے سکتی تھی مگر ایسا کرتے ہی میں اس واحد سہارے سے محروم ہو جاتی۔ اس بھری دنیا میں میرا کوئی بھی سگا نہیں تھا۔ تعلیم بھی بہت معمولی تھی کہ بڑی نوکری مل نہیں سکتی تھی۔ وہ دو تین گھنٹے بعد آیا اور میرا بازو پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا۔

شیفر جب بھی شک وشبے کی باتیں کرتا تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی لیکن میں کسی نہ کسی طرح اپنے غصے، نفرت اور جذبات پر قابو پالیتی... کیونکہ میں جانتی تھی کہ غصے سے کچھ حاصل نہیں۔ اس سے الجھنا جہالت تھی، اس لیے میں زہر کا گھونٹ پی لیتی۔ ضبط کر کے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیتی تھی۔ جب کبھی بھی اس کی کوئی نامناسب اور شرمناک بات میرے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی تو میری اس سے تلخ کلامی ہو جاتی۔ وہ آپے سے باہر ہو جاتا جب تک اس کے دل کی بھڑاس نکل نہیں جاتی۔ کبھی کبھی میں جذباتی اور شکستہ دل ہو کر سوچتی کہ اس سے علیحدگی اختیار کرلوں۔ یہاں سے بھاگ کر کہیں دور چلی جاؤں... لیکن جاؤں تو کہاں جاؤں؟ مجھے ایک عورت ایلی کا واقعہ یاد آیا۔ اس کا شوہر بھی بڑا ظالم اور شکی مزاج تھا۔ اس پر ستم ڈھایا کرتا تھا۔ اس کے گھر والے دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ ایک دن وہ فرار ہو کر میکے جارہی تھی کہ اسے اغوا کرلیا گیا۔ سات مردوں نے اسے دن دنوں تک بے حرمتی کا نشانہ بنایا اور پھر اسے ایک رات بے ہوش اور بے لباسی کی حالت میں سڑک پر پھینک گئے۔ اس نے مرنے سے پہلے نرس کو جو بتایا وہ میڈیا والوں نے خوب اچھالا۔ میں ایلی بننا نہیں چاہتی تھی... اس لیے کہیں نہیں جاسکتی تھی کہ دنیا میں نہ تو میرا کوئی تھا اور نہ ہی شیفر کا۔

شیفر اس وقت جذباتی ہو جاتا اور آپے سے باہر ہو جاتا تھا جب اس پر حسد اور جذبات کی یورش ہوتی تھی مگر اس میں اچھی بات بھی تھی۔ وہ یہ کہ اب تک وہ ایک اچھا شوہر ثابت ہوا تھا۔ وہ کام سے سیدھا گھر آتا اور گھر کے کام کاج میں میرا ہاتھ بٹاتا تھا۔ برتن دھونے اور کمروں میں جھاڑو تک بھی دیتا تھا۔ واش روم کی صفائی میں عار نہیں سمجھتا تھا۔ پھر بھی اس کے ساتھ زندگی گزارنا کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ اس کے ساتھ زندگی جو بسر کررہی تھی اذیت ناک تھی اور آخری سانس تک گزارنا تھی اس لیے کہ میں ایک کمزور عورت ٹھہری۔

☆.....☆

''مجھے رافیل سے ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں ہے۔'' میں نے اس کے سامنے میز پر کھانا چنتے ہوئے کہا۔ اس کی کمزوری یہ تھی کہ وہ کھانا دیکھ کر غصہ بھول جاتا تھا۔ اسے مجھ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

پر پیار آجاتا۔ جیسے میں اس کی کوئی مرغوب ڈش ہوں۔

''میں تمہاری یہ بات سچ مانے لیتا ہوں۔'' اس نے نوالہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تم اس سے جتنی دور رہو گی یہ تمہارے لیے اچھا رہے گا۔ اس کی بیوی سے زیادہ دوستی اور میل جول بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اس کے بشرے سے قیاس کرلیا ہے کہ وہ کوئی اچھی عورت نہیں ہے۔''

نہ جانے کیوں اور کیسے شیفر کو یہ وہم ہوگیا تھا کہ رافیل مجھے اپنے جال میں پھانس لے گا۔ میں اس کے سلوک اور رویوں سے متنفر ہوکر رافیل کی محبت کی اسیر ہو جاؤں گی۔ حالانکہ میں ہرگز اس قماش کی نہیں تھی کہ غیر مردوں کی جھولی میں کسی پکے پھل کی طرح ٹپک پڑوں۔ اگر میں ایسی ہوتی تو میرے لیے مردوں کی کیا کمی تھی۔ میں اس کی آنکھوں میں ایسی دھول جھونکتی کہ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی اور پھر اونیل کوئی عام سی ناسمجھ عورت نہ تھی۔ اس کے پُرشباب بدن میں ریشم کا سا گداز تھا اور انگ انگ سے مستی ابلی پڑتی تھی۔ اس کے جسمانی نشیب و فراز میں بجلیاں بھری ہوئی تھیں اور اس کے چھریرے متناسب بدن کو قامت نے شعلہ مجسم بنا دیا تھا۔ لباس میں بھی اس کے جسمانی شادابی اور باریک سے باریک خدوخال بھی انگاروں کی طرح دہکتے تھے۔ ایسی عورت کا شوہر دنیا کی کسی بھی حسین عورت کی طرف متوجہ ہونے سے رہا۔ اس کا جادو میں بھلا کیسے توڑ سکتی تھی۔

مگر میں کسی بھی قیمت پر اونیل سے دور نہیں رہ سکتی تھی۔ کچھ دنوں کی ملاقاتوں نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے اس طرح سے قریب کردیا تھا جیسے ہم جنم جنم کے ساتھی ہوں اور ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ ایک دوسرے کی ذات کا جزو بن گئی تھیں۔ ایک دوسرے کو ملے بغیر چین نہیں آتا کیونکہ اس کا لہجہ بتاتا کہ وہ بھی عورت ہونے کی سزا بھگت رہی ہے مگر زبان سے اقرار نہیں کرتی ہے۔

جب ہم اپنے گھروں کے خالی احاطوں میں باغ بانی کرتی تو دیر تک گہری سہیلیوں کی طرح گفتگو ہوتی۔

''یہ جگہ اب مجھے اس قدر پسند ہے کہ یہاں سے کبھی نہیں جاؤں گی۔'' یہ بات اونیل نے پودوں کو پانی دیتے وقت کہی تو اس کے لہجے سے بلا کا اعتماد اور پختہ ارادہ ظاہر ہو رہا تھا۔ ''میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اپنی ساری زندگی یہاں گزاروں گی۔ تم سے کیا چھپانا۔ میں تمہیں بتادوں کہ میں نے بڑی سیمابی طبیعت پائی ہے۔ ہماری شادی کے پانچ برس کا عرصہ دیکھتے ہی دیکھتے بیت چکا ہے۔ ان پانچ برسوں میں ہم اب تک دو درجن مکان بدل چکے ہیں۔ شاید تمہیں اس بات کا یقین نہ آئے۔ ہم ہر مکان چھ سات ماہ بعد اس لیے بدلتے تھے کہ کوئی مکان راس نہ آسکا اور ہمارے مزاج اور معیار کے مطابق نہ تھا۔'' اس نے سانس پر قابو پانے کے لیے توقف کیا۔ ''دربدر کی خاک چھاننے کے بعد رافیل کو یہاں آکر سکون ملا۔ اس کا کہنا ہے کہ اونیل اب یہاں سے کہیں نہیں جانا ہے۔ اس کی خوشی میری خوشی ہے۔''

''مگر اب میرا ارادہ بدل گیا ہے۔ اب میں اس گھر میں بالکل بھی رہنا نہیں چاہتی۔'' میں نے بڑی بے اطمینانی سے کرب ناک لہجے میں کہا۔ ''میرا بس چلے تو میں جتنا جلد ہوسکے اس گھر کو چھوڑ دوں۔''

''وہ کس لیے میری جان؟'' اس کے حسین چہرے پر گہرا استعجاب سا چھا گیا اور اس نے اپنی پلکیں جھپکائیں۔

''اس لیے کہ میں اس گھر میں ایک پنچھی کی طرح قید کی سزا کاٹ رہی ہوں۔'' میں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

''تم ایسی مایوسی اور دل شکستگی کی باتیں نہ کرو۔'' وہ ایک دم سے کھلکھلا کر ہنس پڑی گویا کسی سُر کی طرح بج اٹھی۔ ''بس تم اتنی سی بات پر اس قدر پریشان، جذباتی اور فکرمند ہورہی ہو؟ اس قید خانہ سے نکلنا بہت ہی آسان ہے۔ اتنا آسان کہ تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ بازار چلو۔ میں شاپنگ کروں گی اور تمہارا وقت بھی خاصا گزر جائے گا اگر تم اس کے لیے تیار ہو تو کل شاپنگ کے لیے چلتے ہیں۔''

''میرے لیے اتنا آسان نہیں ہے؟'' میں نے بے بسی سے کہا۔ میرا لہجہ بجھ سا گیا۔

''کیوں؟ شاپنگ کرنے ہی تو جانا ہے۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''اس لیے کہ مجھے اپنے ڈکٹیٹر شوہر سے اجازت نہیں ہوگی۔ میں کل ہی بتاؤں گی کہ اس نے کیا کہا۔''

جانے کیا بات تھی کہ شیفر بڑے خوشگوار موڈ میں گھر آیا تھا۔ گھر میں گھستے ہی وحشیانہ طور پر جذباتی انداز سے مجھے بانہوں میں جکڑ کر پیار جتانے لگا۔ بمشکل میں نے اس سے الگ ہوکر اپنے بال اور لباس کو درست کیا۔ مجھے پھر سے

میک اپ بھی درست کرنا پڑا۔ اس کی خواہش نہیں بلکہ حکم ہوتا تھا کہ میں میک اپ اور بھڑکیلے لباس میں اس کا استقبال کیا کروں۔ جب وہ گھر میں داخل ہوتا تو بڑی محبت اور گرم جوشی سے پیش آنے کے لیے مجبور ہوتی تھی۔

پھر میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”میں کل اونیل کے ساتھ بازار خریداری کے لیے چلی جاؤں؟ اجازت ہے۔“

”کیا کہا؟“ اس نے میرا ہاتھ اس بری طرح جھٹک دیا جیسے وہ دہکتا ہوا انگارہ ہو۔ وہ اس طرح برافروختہ ہو گیا جیسے میں نے کوئی غلیظ گالی دی ہو۔

”ضرورت نہیں ہے۔ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ اس عورت سے دوستی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے یہاں اس لیے گھر لیا ہے کہ اپنے آشناؤں کو شوہر کی غیر موجودگی میں بلا کر دل بستگی کرے۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھتی ہو اور اس کے ساتھ شاپنگ کے لیے بازار جانا چاہتی ہو؟“

”اونیل اس قماش کی عورت نہیں ہے۔ یہ محض تمہارا قیاس ہے کہ وہ غلط قسم کی عورت ہے۔ مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ وہ ایک شوہر پرست عورت ہے۔ بیوی ہے۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟“ میں نے دبی زبان میں کہا۔ ”اس بہانے میری تھوڑی بہت تفریح ہو جائے گی۔ دفتر سے آ کر میں سارا دن گھر میں بور ہوتی رہتی ہوں۔ کیا تمہیں اندازہ نہیں ہے؟“

”تم مجھے بے وقوف بنانا چاہتی ہو؟“ وہ بھڑک اٹھا۔ ”کیا میں کوئی بچہ ہوں؟ کیا میں نہیں سمجھتا۔ ڈی وی ڈی اور ہر قسم کی فلموں کی سی ڈیز سے کیبنٹ بھر نہیں رکھی ہے تاکہ تم ان سے دل بہلاؤ۔ کیبل پر ہر قسم کی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ بوریت اور وقت نہ گزرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتی ہو کہ تم رافیل کے ساتھ وقت گزارنا چاہتی ہو۔ مجھے شک ہے کہ شاید وہ اپنی بیوی کی غیر موجودگی میں تم سے من مانیاں کرتا ہے۔ آئندہ تم یہ بات زبان پر مت لانا۔“

دوسرے دن جب میں نے اونیل کے ساتھ بازار جانے سے معذرت کی اور ایک بہانہ تراشا تو وہ میرا بشرہ بھانپ گئی وہ اس بات کو محسوس کر رہی تھی یا اس نے کر لیا تھا کہ ہم میاں بیوی کے درمیان کس قسم کے تعلقات ہیں۔

”میں نے بھی اپنا ارادہ ملتوی کر دیا ہے کہ میں اکیلی شاپنگ کرنے جاؤں۔“ اس نے کہا۔ ”کیوں نہ ہم اپنے باغیچے میں نئے نئے پودے لگائیں جو جاپان کے ہیں اور میں ایک نرسری سے لائی ہوں۔“

میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس قدر مخلص اور مہربان دوست ثابت ہو گی۔ اس نے محض میری خاطر اپنا پروگرام ملتوی کر دیا تھا۔ پھر ہم دونوں نے مل کر پودے اٹھائے اور اپنے اپنے باغیچے میں آ گئے۔ کھلا آسمان تھا۔ سورج کی روشنی میں بڑی تپش تھی۔ سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ اس سخت گرمی میں کام کرتے ہوئے ہم دونوں کا تھکن سے برا حال ہو گیا۔ میں نے اسے ٹھنڈا مشروب پینے اور لنچ پر مدعو کیا تو وہ خلاف توقع فوراً تیار ہو گئی۔ اس نے میری دعوت قبول کر لی تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ ہم میں سے کوئی کسی کے گھر میں گیا تھا۔ ہماری ملاقاتیں اب تک گھر سے باہر لان ہی تک محدود رہی تھیں۔

”تم نے پنیر کے سینڈوچز کتنے مزے دار بنائے ہیں۔“ اونیل نے خوش ہو کر داد دی۔ ”واقعی مزہ آ گیا۔ میں نے شاید ہی کبھی ایسے عمدہ اور لذیذ سینڈوچز کھائے ہوں۔ یہ سلسلہ شروع ہوا ہے تو اسے جاری رہنا چاہیے۔“

”میری جان! یہ سلسلہ ہر صورت میں جاری رہے گا۔“ اس کی بات سن کر میرے دل کو بہت خوشی ہوئی۔ ”میں اب یہ سوچ رہی ہوں کہ کیوں نہ کسی دن تمہیں اور رافیل کو رات کے کھانے پر مدعو کر لوں مگر میں کچھ پیشگی کہہ نہیں سکتی کہ شیفر کی رات کو کب تک واپسی ہو گی۔ بعض اوقات اسے بہت دیر ہو جاتی ہے۔“

”تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔“ اونیل ہنس کر بولی۔ ”میرا شوہر بہت ہی خشک مزاج ہے۔ وہ کسی کے ہاں جانا بالکل بھی پسند نہیں کرتا ہے لیکن مجھے اس کی یہ بات بالکل ناپسند بھی ہے۔“

”اچھا!“ میں نے قدرے حیرت سے سر ہلایا۔ ”عجیب سی بات ہے لوگ دعوت فوراً قبول کر لیتے ہیں۔“

مجھے اس بات کی اُمید تھی کہ شاید وہ اپنے شوہر کے بارے میں مجھے کچھ بتائے گی لیکن اس نے خاموشی اختیار کر لی تو میں نے سکوت کو توڑا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ اس نئے مکان میں آنے کے بعد سے رافیل کچھ زیادہ ہی مصروف ہو گئے ہیں؟“

چونکہ میں نے پہلی بار اس موضوع پر اس سے گفتگو کی تھی لہٰذا اس بات کی توقع تھی کہ وہ اپنے شوہر کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو بتائے گی اور کہے گی کہ رافیل کی مصروفیت

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کس قسم کی ہے اور وہ کیا کرتا ہے۔ اس نے ایک سینڈوچ اپنی پلیٹ میں رکھ لیا۔

''میرے شوہر تو آج کل شاخوں کو جنم دے رہے ہیں۔'' اونیل نے قدرے سنجیدگی سے بتایا۔

میں اس کی بات سن کر خاموش رہی۔ میں اس کے منہ سے یہ سننا اور جاننا چاہتی تھی کہ اس کا شوہر کس چیز کی شاخیں نکال رہا ہے مگر اس سے پہلے کہ میں اس عجیب اور پُراسرار بات کی وضاحت چاہتی اس نے فوراً ہی بڑی خوب صورتی سے موضوع بدل دیا۔

''کیا تم نے صوفے کے کشن اور پردے خود ہی سیے ہیں؟'' اونیل نے کہا۔ ''تمہارا ذوق بڑا اعلیٰ اور نفیس ہے، جو میں نے بہت کم عورتوں میں دیکھا ہے۔''

پھر وہ کھانوں کی ترکیبوں کے بارے میں باتیں کرنے لگی اور اس نے بتایا کہ اسے کون کون سے کھانے پسند ہیں اور اس نے کس کس میں مہارت حاصل کی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اسے باغ بانی کا کتنا شوق ہے۔ میں نے محسوس کرلیا کہ وہ کسی وجہ سے اپنے شوہر کے بارے میں کچھ بتانے سے اجتناب کر رہی ہے۔ جب وہ بتانا ہی نہیں چاہتی تو میں کیوں دلچسپی لوں اگر کریدوں تو شاید وہ بدک جائے یا کسی شک میں مبتلا ہو جائے۔ میں نے دل میں تہیہ کرلیا کہ آئندہ کبھی بھولے سے بھی اس کے شوہر کے متعلق کچھ دریافت نہیں کروں گی۔ اپنے شوہر کے متعلق کچھ باتیں ایسی بھی تھیں کہ جس کے بارے میں اسے اعتماد میں لینا نہیں چاہتی تھی۔

میں اپنے شوہر کے بارے میں الجھی ہوئی تھی اور طرح طرح کے خیالات کے بھنور سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے میرے کان میں گرم گرم سیسہ انڈیل دیا گیا ہو۔ جب بھی اس کی چیک اپ کال آتی تھی تو مجھے ایسا ہی محسوس ہوتا تھا۔ نفرت اور غصے کی لہر میرے دل و دماغ کو پتھر بنا دیتی تھی۔ میں اس سے باتیں کر رہی تھی کہ اونیل کے ہاتھ سے پھل کاٹنے کی چھری ننگے فرش پر گر گئی تو اس کی گونج شیفر نے بہت صاف سن لی تھی۔ اس کا پارہ چڑھ گیا تھا۔

''پڑوسن مسز اونیل ہیں۔'' میں نے اس کے دریافت کرنے پر بتایا۔ ''ہم دونوں لنچ کر رہے ہیں۔''

''تم جھوٹ مت بولو۔'' وہ کرخت لہجے میں چیخ کر بولا۔ ''تم میری آنکھوں میں دھول مت جھونکو۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ جیسے ہی میں کام پر جاتا ہوں تو تم رافیل کو بلالیتی ہو یا پھر وہ خود گھر میں گھس آتا ہے۔''

''تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کر رہے ہو؟ مجھ پر تہمت مت لگاؤ۔ اس وقت صرف مسز اونیل ہیں۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم جھوٹ بول رہی ہو اور اپنی بدکاری پر پردہ ڈال رہی ہو۔'' شیفر غرانے لگا۔ اس کے لہجے میں ساری دنیا کی نفرت اور زہر بھرا ہوا تھا۔ ''تم آج تک میرے بھروسے کو ٹھیس پہنچاتی رہی ہو۔ کیا میں اس بات کو نہیں سمجھتا؟ جب سے یہ آیا ہے تب سے تم میں گرم جوشی، فیاضی اور خودسپردگی نہیں پا رہا ہوں۔ تم میں بے زاری اور بے رغبتی سی آتی جا رہی ہے۔ تم ایک سرد لاش کی طرح اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیتی ہو؟''

میں نے بڑی آہستگی سے ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔ اب اس کے مکروہ، گھناؤنے الزامات اور تہمتیں سننے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ میری پاک دامنی پر وہ کیچڑ اچھال رہا تھا۔ وہ مجھے فحش اور بے ہودہ گالیاں دیتا تو میں برداشت کرلیتی جیسا کہ کرتی چلی آرہی تھی۔ اس نے میری کردارکشی کی تو میرا دل خون کے آنسو رو دیا اور میری آنکھیں آنسوؤں کے سیلاب سے بھر گئیں اگر اونیل موجود نہ ہوتی تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔

میں باوجود کوشش اور جتن کے اپنے آنسو چھپا نہ سکی۔ میرا چہرہ اس کی طرف نہیں تھا لیکن اس نے میری رندھی ہوئی آواز سے جان لیا تھا کہ شیفر کی تلخ اور زہر میں بجھی ہوئی باتوں نے مجھے رلا دیا ہے۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے پاس آئی تو میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ اس کے شانے پر سر رکھ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے پھر اسے سسکیوں کے درمیان وہ سب کچھ بتا دیا جو بتانا نہیں چاہتی تھی اس لیے بھی کہ یہ میری ہمدرد، غمگسار اور گہری دوست تھی۔ شیفر کی حاسدانہ طبیعت، اس کا طنزیہ اور نفرت انگیز لہجہ، اس کی ننگی ننگی گالیاں، بے رحمانہ مار پیٹ، مجھے عورت نہیں حیوان سے بھی بدتر سمجھنا۔

''اب میرے لیے اس کی نفرت، غصہ اور تہمتیں ناقابل برداشت ہوگئی ہیں۔'' میں نے سسکیوں کے درمیان کہا۔ ''آخر میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ میری مجبوری اور کمزوری یہ ہے کہ میں اس سے اپنی جان نہیں چھڑا سکتی۔''

''اس وطن میں صرف تم ایک ہی نہیں بلکہ ہزاروں

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

لاکھوں عورتیں میری اور تمہاری طرح ان گنت مسائل اور دکھوں میں گھری ہوئی ہیں۔'' وہ میرے سر پر محبت بھرے انداز سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''کیا تمہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ تمہارا شوہر روزانہ اتنی دیر سے گھر کیوں آتا ہے؟'' اس نے لمحاتی توقف کے بعد کہا۔ ''میں نے ایک کہاوت سنی ہے کہ آدمی اس وقت تک یہ نہیں جان سکتا ہے کہ دروازے کے پیچھے کیا ہے، جب تک خود وہاں کھڑا ہوا نہ ہو۔''

''ہاں کبھی کبھی مجھے بھی شبہ ہوتا تھا کہ اس کے کسی دوسری عورت سے تعلقات استوار ہیں مگر میں اس کے سامنے بھی دل کی بات زبان پر لانے کا حوصلہ نہیں کر سکتی۔ اس لیے کہ جانتی ہوں کہ وہ میرا کیا حشر کرے گا۔'' میرے دل میں خلش کی جو پھانس گڑی ہوئی تھی وہ آج میں نے نکال کر اونیل کے سامنے رکھ دی۔

''اوہ...... یہ بات ہے؟'' اونیل کی شہابی پیشانی پر سوچ کی لکیریں آ گئیں اور وہ گہری ہوتی چلی گئیں جیسے وہ میرے بارے میں متفکر اور پریشان سی ہو رہی ہو اور اس کا کوئی حل سوچ رہی ہو۔ چند لمحوں کے بعد بولی۔ ''تم پریشان نہ ہو! جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس نے مجھے دلاسا دیا اور میں رومال میں اپنے آنسو جذب کرنے لگی۔

''سنو...... کیوں نہ تم میرے ساتھ ابھی اور اسی وقت چل کر مجھے بتاؤ کہ میں اپنے کچن میں کہاں اور کس رنگ کے پردے لگاؤں؟'' اس نے سرگوشی کی۔

مجھے چونکہ اس کے گھر جانے اور اندر سے دیکھنے کا ارمان و تجسس بھی تھا...... پھر اس کے شوہر کو دیکھنے اور جاننے کا بھی اشتیاق تھا۔ شیفر نے تو اپنے خیال میں اس سے میرے تعلقات بھی استوار کر دیئے تھے اور بہت کچھ سوچنے بھی لگا تھا جب کہ میں اسے آج اب تک دیکھ بھی نہیں پائی تھی۔ کیا شیفر نے اسے دیکھ رکھا تھا، شاید نہیں، دیکھا ہوتا تو بتا چکا ہوتا۔

میں نے واش بیسن میں منہ دھویا، تولیہ سے چہرہ پونچھا اور اس کے ساتھ باہر آ گئی۔ میں نے اس سے یہ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا کہ اس کا شوہر گھر پر موجود ہے یا نہیں... پھر خیال آیا کہ اگر وہ موجود ہوتا تو اونیل میرے ساتھ لنچ نہیں کرتی لیکن جب میں اس کے گھر میں داخل ہوئی تو حیران رہ گئی۔ بڑا سا بیڈ روم اور بیڈ روم میں بڑا سا بیڈ نما چوبی بکس۔ اور بکس میں بھربھری مٹی اور مٹی پر بڑا سا پودا۔

میں حیران نظروں سے پودے کو دیکھ رہی تھی کہ اونیل پودے سے بولی۔ ''یہ میری پڑوسن سنزٹیزر ہیں۔''

میری آنکھیں پھیل گئیں۔ مجھے لگا اونیل کا ذہنی توازن بگڑا ہوا ہے۔

اونیل نے کہا۔ ''اب تم ذرا میرے کچن میں چل کر بھی دیکھ لو اور بناؤ میں کیا پکاؤں؟''

معلوم نہیں میں اس کے کچن کے خانے اور کھڑکیاں ٹھیک سے دیکھ بھی سکی تھی یا نہیں۔ چند لمحوں کا موقع بھی نہیں ملا تھا کیونکہ شیفر کی گاڑی میرے گھر کی برساتی میں آ کر رکی تھی۔ وہ گھر میں گھس کر اور مجھے نہ پا کر تیر کی طرح نکلا اور اس نے اونیل کے گھر کا دروازہ پیٹ ڈالا۔ جب میں نے سرعت سے لپک کر دروازہ کھولا تو اس کی آنکھیں کسی وحشی درندے کی طرح سرخ ہو رہی تھیں اور اس کے چہرے پر ایک سفاک قاتل کی سی درندگی تھی۔ وہ کسی گینڈے کی طرح میری طرف بڑھا۔

''کیا تم نے مجھے دھوکا نہیں دیا اور جھوٹ نہیں بولا کہ تم اونیل کے ساتھ ہو؟'' وہ تڑختے لہجے میں بولا۔

مجھے صرف یہ بات یاد رہ گئی کہ میں نے اس کے گھونسے سے اپنے آپ کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کی تھی۔ مجھے دو دن تک اسپتال میں زیر علاج رہنا پڑا تھا۔ میری کئی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں اور میرے سر میں بھی شدید چوٹ آئی تھی۔ یہ چوٹ اس وقت لگی تھی جب میں شیفر کی مار پیٹ سے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی تھی۔ اونیل کے گھر کے ننگے فرش پر دہلیز کے پاس گر پڑی تھی۔

جب میں ہوش میں آئی تو میرے ذہن نے دوبارہ کام شروع کیا تو مجھے رافیل کا خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ میں نے اونیل کے ہاں جو کچھ بھی دیکھا تھا کیا وہ حقیقت ہے؟ کہیں یہ میرا واہمہ اور تخیل کی کارفرمائی تو نہیں ہے؟ میں نے اس کے بارے میں نرس یا ڈاکٹر سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ کیونکہ ڈاکٹر یقیناً اسے میرے سر کی چوٹ کا اثر کہتے اور یہ سمجھتے کہ میں پاگل ہو گئی ہوں۔

شیفر جب مجھ سے ملنے کلینک آیا تو اس کے چہرے پر ندامت تھی اور شرمندگی کا احساس اسے پانی پانی کیے دے رہا تھا۔

''ٹیزر!'' اس نے لجاجت سے کہا۔'' اونیل نے مجھے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اس بات کا یقین دلا دیا کہ تم صرف اس سے ملنے گئی تھیں۔ اونیل نے اس حادثے کے بعد مجھے اپنے گھر کا ایک ایک کونا دکھایا پلیز مجھے معاف کردو۔''

پھر اس کے ہونٹوں پر ایک مخصوص سی دلکش مسکراہٹ ابھر آئی۔ شیفر میری خاموشی سے خود ہی سمجھ گیا تھا کہ میں نے اسے معاف کردیا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ''مجھے تو اونیل پاگل ہی لگتی ہے۔ تم نے اس پاگل عورت سے دوستی کرلی۔ کیا تم نے دیکھا کوئی اپنے بیڈروم میں درخت لگاتا ہے؟''

شیفر کی اس بات سے یہ تصدیق ہوگئی کہ یہ میرا واہمہ یا تخیل نہیں بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ اب میں نے جان لیا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے؟ کیا یہ میرا فرض بنتا ہے کہ پولیس کو اطلاع دوں کہ رافیل کو کیا ہوا ہے۔

اسپتال سے واپس آنے کے بعد جب دوسرے دن شیفر کے کام پر جانے کے بعد اونیل میرے ہاں پہنچی۔

''اب تم کیسی ہو؟'' اونیل بولی۔ ''تم اس بات کا خیال نہ کرنا کہ میں تمہاری عیادت کے لیے نہ آسکی تھی؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ تم کس وجہ سے نہیں آئیں۔ تمہارے شوہر صاحب کیسے ہیں؟''

''جانتی ہو میں نے اس کے ساتھ کیا کیا؟''

میں بھونچکی سی ہوگئی۔ کہیں وہ اس دنیا سے رخصت تو نہیں ہوگئے؟ مجھ پر سکتہ سا چھا گیا۔

وہ ہنس کر بولی۔ ''آؤ میں تمہیں دکھاؤں کہ میں نے کیا کیا؟''

وہ مجھے باورچی خانے میں لے گئی پھر اس نے ایک کھڑکی کھول کر باہر مخالف سمت اشارہ کیا۔ اس کے لان کے ایک کونے میں جو میرے لان سے متصل تھا اس میں ایک خوب صورت اور ہرا بھرا درخت لگا ہوا تھا۔ وہی درخت جو اس کے بیڈروم میں تھا۔

''کیا..... کیا..... یہ تمہارے شوہر..... رافیل ہیں؟''

میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کتنا شاندار، وجیہہ اور پیارا لگ رہا ہے؟'' اونیل کے لہجے میں بڑی شگفتگی تھی۔ ''میں دو مزدوروں کو لے آئی اور ان کی مدد سے بکس کے ساتھ یہاں تک لائی اور بکس سمیت اسے وہاں لگا دیا۔ مزدوروں کی سمجھ میں نہیں آیا اور وہ سخت حیران تھے کہ میں نے اتنا بڑا درخت کمرے کے اندر کیسے لگا لیا ہے؟''

''سچی بات تو یہ ہے کہ میری سمجھ میں خود نہیں آرہا ہے۔'' میں نے ویران اور کھوکھلی آواز میں کہا۔

اس نے ایک الماری کھول کر اس میں سے ایک بوتل نکال کر میری طرف بڑھائی۔

اس بوتل پر ایک خوب صورت اور رنگین لیبل چسپاں تھا جس پر ''گرین رو'' چھپا تھا۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ تین دن کے اندر اندر زیادہ سے زیادہ سرسبز اگانے کی سو فیصد گارنٹی۔

''اگر تمہارے نزدیک شیفر ایک ایسا نازک اذیت ناک اور ناقابل برداشت مسئلہ بن چکا ہے تو میں تمہیں ایک مخلصانہ مشورہ دوں۔'' وہ کہنے لگی۔ ''میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ رافیل کیسا خبیث آدمی تھا۔ وہ اس قدر حاسد، شکی مزاج اور کمینہ خصلت تھا کہ چھ ماہ سے زیادہ کہیں رہنے نہیں دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں اپنے حسن کے جادو سے نوجوان مردوں کو ورغلا کر ان پر فیاضی سے مہربان ہوجاتی ہوں۔ وہ مجھے دن میں نہ جانے کتنی مرتبہ چیک کیا کرتا تھا اگر میں غلط عورت ہوتی تو ایک نہ ایک دن دھر لی جاتی۔ تمہارے شیفر سے کسی بھی طرح کم نہیں تھا۔'' اس نے سانس لینے کے لیے توقف کیا۔ ''وہ مجھے ایسی ایسی دھمکیاں دیتا تھا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔ رگوں میں لہو منجمد ہوجاتا... پھر ایک روز ایک دکاندار نے گرین رو کی بوتل دکھائی اور خصوصیت بتائی تو میں نے فوراً خرید لی۔ مجھے اس بات کا ذرہ برابر بھی یقین نہیں تھا کہ یہ دوا واقعی کوئی حیرت انگیز اور ناقابل یقین کارنامہ دکھا سکتی ہے مگر تم خود دیکھ لو۔ بیج کے ساتھ گرین روڈالو، پودے انتہائی سرعت سے بڑھتے ہیں۔ کسی کو یقین نہیں آئے گا کہ پودے دیکھتے ہی دیکھتے درخت بن جاتے ہیں۔ اگر مزید آسانی چاہتی ہو تو گرین رو کی کچھ مقدار تم اسے ٹرک چائے یا کافی میں ملا کر پلاؤ تو اس کا ذائقہ بالکل بھی محسوس نہیں ہوگا اور مٹی تلے سلانے میں مزید آسانی ہوجائے گی۔''

☆.....☆

یہ کوئی پانچ مہینے پہلے کی بات ہے میں اور اونیل اپنی اپنی ڈیوٹی سے واپس آنے کے بعد حسب معمول سائے دار درختوں کے نیچے بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ شیفر اور رافیل نے مل کر ہمارے لیے بے درخت احاطے میں بڑا خوب صورت سا سایہ دار کنج بنا دیا ہے۔

Wajahat Azeem
Pakistanipoint.com

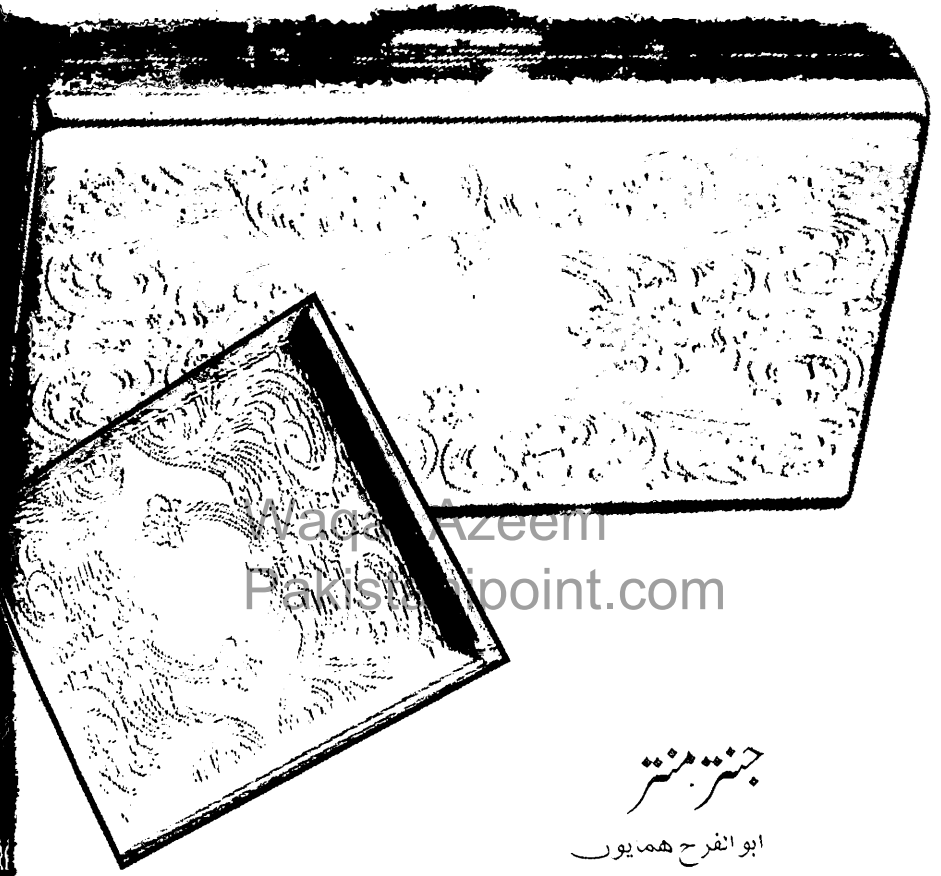

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

جنتر منتر

ابو الفرح ہمایوں

مغرب میں بھی ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جن کی توجیح ممکن نہیں۔ یہ واقعہ بھی کچھ ایسا ہے کہ اسے عقل کی کسوٹی پر پرکھنا ممکن نہیں لیکن دلچسپ ہے اس لیے پیشِ خدمت ہے۔

کیا وہ سیکریٹ کیس واقعی بدروح کی ملکیت تھا

اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران ایک وکیل کو اکثر ایسے واقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جب اس کی عقل و ذہانت جواب دے جاتی ہے اور وہ اس کشمکش و پیچ میں پڑ جاتا ہے کہ اب وہ کرے تو کیا کرے۔ اپنے کسی مؤکل کی وصیت کی تکمیل میں اسے کئی دشوار گزار راہوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ مزید طرہ یہ کہ بسا اوقات ایسی چونکا دینے والی حقیقتیں سامنے آجاتی ہیں جن کے بارے میں سوچ کر بھی آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔

موت کسی کو مہلت نہیں دیتی اور ایسے وقت میں ہی خاندانی وکیل کو اپنی ذہانت کا امتحان دینا پڑتا ہے۔ مرنے والے کی وصیت کے مطابق تمام قانونی کارروائیوں کو سلجھانا اور پھر ان پر عمل کرنا ایک ایسا دشوار گزار مرحلہ ہے جو صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس پر گزر رہی ہو۔

گزشتہ دنوں ایک ایسے ہی نہایت پیچیدہ مسئلے سے میرا واسطہ پڑا۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک شخص وانٹر ولیم کی موت واقع ہوگئی۔ اس کے ساتھ ایک انوکھی اور حیرت انگیز داستان وابستہ تھی۔ بہتر ہے کہ پہلے میں وہ داستان آپ کے گوش گزار کردوں۔ یہ داستان سننے کے بعد ہی آپ میری مشکلات کا اندازہ لگاسکیں گے۔

تقریباً پندرہ سال قبل وانٹر ولیم ہمارے گاؤں کوٹسوالڈ میں اچانک وارد ہوا تھا۔ وہ ایک نحیف ونزار ادھیڑ عمر شخص تھا لیکن مجموعی طور پر اس کی شخصیت کافی دلفریب تھی۔ اس کے ہمراہ اس کی بیوی بھی تھی جو کہ کافی فربہ اندام اور معمولی شکل و صورت کی عورت تھی۔ شاید وہ عورت کسی بیماری میں مبتلا تھی۔ دو سال کے اندر ہی اس کا انتقال ہوگیا۔ دوسرے دن ولیم ایک عجیب سی خواہش لے کر میرے پاس آیا۔ وہ اپنی تمام دولت میرے بنائے ہوئے شفاخانے کے نام منتقل کرنا چاہتا تھا۔ پچاس ہزار پاؤنڈ کی رقم کچھ نہیں ہوتی۔ شفاخانے کے گورنر کی حیثیت سے میں جانتا تھا کہ یہ خطیر رقم اگر مل جائے تو بہت سے ادھورے کام مکمل ہوسکتے ہیں۔

ولیم کی وصیت کے مطابق تمام قانونی کارروائیاں مکمل کرلی گئیں اور پھر میں اپنے فرائض کی انجام دہی میں اس قدر مصروف ہوگیا کہ ولیم سے مزید ملاقاتوں کا وقت ہی نہ ملا۔ ولیم بھی دور دور ہی رہا اور اس نے بھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ ہم دونوں ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے اور ہمارے درمیان تمام رابطے منقطع ہوچکے تھے۔

آج کئی سال کے بعد سخت زخمی حالت میں وہ میرے سامنے پڑا ہوا تھا۔ اپنے گھر میں کام کرتے ہوئے کسی اونچی جگہ سے وہ گر پڑا اور خود اسے اندازہ ہوگیا کہ اب وہ جانبر نہ ہوسکے گا۔ آخر وقت میں اس نے مجھے بلا بھیجا اور مسلسل ایک ہی بات کی رٹ لگائے جارہا تھا کہ اس کی وصیت پر پورا پورا عمل کیا جائے۔ میں نے اسے اچھی طرح تسلی دی اور بھرپور یقین دہانی کرائی کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے سب کچھ ویسا ہی ہوگا۔

ڈاکٹروں کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود دوسرے ہی دن وہ اس جہان فانی سے کوچ کرگیا۔ تدفین وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد میں اس کے گھر چلا گیا۔

وکیل ہونے کی وجہ سے شیرف کے دفتر سے گھر کی چابی مجھے بھجوادی گئی تھی۔ گھر میں موجود اشیاء کی فہرست جو بنائی تھی پھر اس کی وصیت پر عمل درآمد کرنے کے لیے مجھے چند ضروری کاغذات کی ضرورت تھی اور ولیم نے مجھے بتا رکھا تھا کہ اس نے وہ کاغذات کہاں رکھے ہیں۔ اس کی خواب گاہ میں ایک میز تھی جس کے دونوں طرف تین تین درازیں تھیں۔ میں نے پہلے دونوں طرف کی اوپر کی درازوں کو کھولا اور وہ کاغذات مجھے مل گئے۔ اس کے بعد میں نے یونہی تجسس کی خاطر نچلی درازوں کو بھی کھول لیا حیرت کی بات یہ تھی کہ تمام دراز سنہری سگریٹ کیس سے بھرے ہوئے تھے۔ میری آنکھیں خیرہ ہوکر رہ گئیں اور میرے ہوش و حواس رخصت ہونے لگے۔ چند لمحوں بعد اپنے اعصاب کو قابو میں لاتے ہوئے میں نے چند سگریٹ کیس باہر نکالے۔ ڈیزائن اور سائز میں سب بالکل ایک جیسے تھے اور بڑے ہی خوب صورت اور بالکل نئے تھے۔ یہ سگریٹ کیس اصلی سونے کے تھے اور وزن میں بے حد ہلکے تھے۔ ایک سحر زدہ سی کیفیت میں، میں نے ان کو شمار کرنا شروع کردیا۔ یہ تعداد میں دوسو چالیس تھے اور سب کے سب بالکل ایک جیسے اور ہم وزن تھے۔ سوائے ایک کے جو آخری دراز میں ایک کونے میں پڑا ہوا تھا۔ یہ سگریٹ کیس کچھ بڑا اور استعمال شدہ لگتا تھا۔ میں نے سب کے سب اسی طرح میز پر چھوڑ دیئے اور صرف ایک سگریٹ کیس لے کر مکان کو تالا لگادیا۔

دوسرے روز میں قریبی شہر میں ایک جوہری کے پاس چلا گیا جس سے میرے پرانے تعلقات تھے۔ اس نے سگریٹ کیس کو اچھی طرح کسوٹی پر پرکھا اور بتایا کہ اس کا سونا ہر قسم کی ملاوٹ اور کھوٹ سے پاک ہے اور اس کی قیمت سو پاؤنڈ سے بھی زیادہ ہے۔ میں گھر واپس آگیا اور سوچنے لگا۔ گویا کم از کم پچیس ہزار پاؤنڈ کا مزید ترکہ ہمارے شفاخانے کو ولیم کی طرف سے مل جائے گا۔ یہ حقیقت تسلیم کرتے ہوئے مجھے سخت اجنبی محسوس ہورہی تھی۔

شام کے وقت میں ڈاکٹر الفریڈ سے ملنے چلا گیا۔ ڈاکٹر الفریڈ ملک گیر بلکہ عالم گیر شہرت کے حامل تھے اور چند سال قبل ہمارے شفاخانے کے ڈائریکٹر بھی رہ چکے تھے۔ ولیم ایک بار پہلے سخت بیمار ہوگیا اور ڈاکٹر الفریڈ کی خصوصی توجہ سے ہی صحت یاب ہوسکا تھا۔ اس کے بعد دونوں کی

WaqarAzeem
Pakistanipoint.com

دوستی بڑھ گئی۔ ہوسکتا ہے کہ ولیم نے اپنی زندگی کے کچھ خفیہ راز بھی انہیں بتا دیئے ہوں۔ اسی خیال کے پیشِ نظر میں ان سے ملنا چاہتا تھا لیکن جب ان کے سامنے پہنچا تو میری زبان پر تالے پڑ گئے اور میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ ڈاکٹر الفریڈ ایک اچھے نفسیات داں بھی تھے۔ میری یہ حالت دیکھ کر انہوں نے کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں تاکہ میرا دھیان اپنی جگہ پر آجائے۔ ذرا سی دیر میں میری طبیعت بحال ہوگئی اور میں نے سگریٹ کیس والا واقعہ انہیں بتا دیا۔

لیکن خلاف توقع ڈاکٹر الفریڈ کا چہرہ سپاٹ رہا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اس عجیب وغریب واقعے کو سن کر وہ اپنی انگلیاں دانتوں تلے داب لیں گے لیکن دوسرے ہی لمحے بڑے سنجیدہ لہجے میں وہ کہنے لگے۔ ''صرف دو سگریٹ کیس؟ میرا خیال تھا کہ وہ اب تک ہزاروں سگریٹ کیس بنا چکا ہوگا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا ولیم نے تمہیں نہیں بتایا کہ وہ کیا کام کرتا تھا؟''

ڈاکٹر الفریڈ نے گہری نگاہوں سے میری طرف گھور کر دیکھا۔

''نہیں۔'' میں تھوک نگل کر رہ گیا۔

''اچھا چلو میں تمہیں اس کے بارے میں بتاتا ہوں۔'' ڈاکٹر الفریڈ نے ایک دلچسپ کہانی کا آغاز کیا۔

''ولیم ایک عظیم شعبدہ باز تھا۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ وہ اس وقت بھی مجھ سے ملنے آیا کرتا تھا جب میری رہائش ہارلے اسٹریٹ پر تھی۔ ایک دن اس نے ایک بڑی عجیب کہانی مجھے سنائی جسے اس وقت میں نے ہنس کر ٹال دیا لیکن بعد میں اس نے ثابت کر دیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ سو فیصد حقیقت ہے۔ مجھے یقین دلانے کے بعد اس نے مجھ سے یہ بھی وعدہ لیا کہ میں اس کی زندگی میں یہ راز افشا نہیں کروں گا۔ اب وہ شخص اس دنیا میں نہیں رہا لہٰذا اب راز سے پردہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں۔''

''بیس سال گزرے، والٹر ولیم ایک دوسرے نام ٹونی کی حیثیت سے کسی سرکس میں شعبدہ بازی کیا کرتا تھا۔ پچیس سال کی محنت شاقہ کے بعد اس نے شعبدہ بازی اور نظر بندی میں زبردست مہارت حاصل کر لی تھی۔ ٹونی بے حد ذہین تھا اور اسی وجہ سے اس کے تمام ہم عصر اس پر رشک کیا کرتے تھے۔ وہ اسٹیج پر آنے سے قبل خوب اچھی طرح ریہرسل کر لیتا اور یہی اس کی کامیابی کا اصل راز تھا۔ اگرچہ میں نے کبھی اسے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن مجھے اس کی عظمت سے انکار نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ جو کچھ میں نے اس کے بارے میں سنا ہے وہ یقیناً سچ ہے۔''

سرکس میں عموماً اور اپنا خاص تماشا دکھانے کے لیے وہ کسی معزز شخصیت کا انتخاب کرتا جو کہ عام طور پر کوئی خاتون ہوتی۔ وہ اس کے قریب جاتا اور گرجدار آواز میں پوچھتا۔ ''خاتون! کیا آپ ایک سنہری سگریٹ کیس لینا قبول کریں گی؟'' اس کی آواز میں ایک خاص کشش تھی جسے سن کر عورتیں سحر زدہ سی ہو جاتیں اور اثبات میں سر ہلا دیتیں۔ حاضرین سے تصدیق کے بعد وہ اپنی قمیص کی آستینیں اوپر چڑھا لیتا اور خالی ہاتھ آسمان کی جانب کھڑا کر دیتا۔ تقریباً ایک منٹ منہ ہی منہ میں کچھ بدبدانے کے بعد وہ اپنے داہنے ہاتھ کو ایک رومال سے ڈھک دیتا اور پھر دوبارہ منتر پڑھنے لگتا جو ایک منٹ جاری رہتا۔ اس کے بعد وہ خاتون کے سامنے دونوں گھٹنے ٹیک کر بیٹھ جاتا اور خاتون سے گزارش کرتا کہ وہ اپنے دستِ مبارک سے رومال اٹھائے۔ رومال اٹھاتے ہی پورا ہال زبردست تالیوں اور تعریفی کلمات کی گونج سے لرز اٹھتا کہ جادو منتر کے ذریعے ٹونی نے سنہری سگریٹ کیس پیدا کر لیا تھا۔ حاضرین کی جانب سے تعریفوں کے علاوہ نقد رقم بھی ٹونی کو انعام میں ملتی۔ وہ بھرے ہال میں سگریٹ کیس خاتون کی نذر کر دیتا لیکن پھر ہوتا یہ تھا کہ انتہائی غیر محسوس انداز میں وہ خاتون کے قریب سے گزر جاتا اور وہ سگریٹ کیس واپس اس کی جیب میں آجاتا۔

اور پھر اچانک ایسا ہوا کہ ایک دن اس کی بازی الٹ گئی۔ ایک مظاہرے کے دوران ایک لارڈ نے فرمائش کی کہ ٹونی اس کی محبوبہ کو ایک سگریٹ کیس پیش کرے۔ ٹونی نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنا عمل شروع کیا۔ عمل مکمل ہو گیا لیکن قبل اس کے کہ وہ لڑکی سے رومال اٹھانے کے لیے کہتا، اسے اپنی انگلیوں کے درمیان ایک عجیب سی کیفیت کا احساس ہوا اور اس کا اعتماد متزلزل ہونے لگا۔ اس نے سوچا شاید اس کا جادو غلط رخ اختیار کر گیا ہے۔ ڈرتے ڈرتے اور دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے دوشیزہ سے رومال اٹھانے کے لیے کہا اور تب ٹونی نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں دو سگریٹ کیس تھے۔ ایک اس کا اپنا اور ایک نیا۔ پورا ہال زبردست داد وتحسین سے گونجنے لگا۔ ٹونی نے بڑی مشکل سے اپنی چیخ ضبط کی اور نیا سگریٹ کیس دوشیزہ کے ہاتھ میں پکڑا کر لارڈ سے اچھا خاصا انعام حاصل کیا لیکن پھر اس سگریٹ کیس کا بھی وہی حشر ہوا جو ہمیشہ سے ہوتا آرہا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

تھا۔یعنی چند لمحوں بعد وہ دوبارہ ٹونی کے قبضے میں آ گیا۔

گھر واپس آ کر وہ دوبارہ اپنے کمرے میں جا گھسا اور تمام طرف سے بند کر کے دونوں سگریٹ کیسوں کا جائزہ لینے لگا۔ایک اس کا اپنا تھا جو برسوں سے اس کا ساتھ دے رہا تھا اور دوسرا اس کے جادو کی پیداوار تھا۔ یہ کہاں سے آیا؟ ٹونی سخت پریشان تھا۔اس کی انگلیاں ابھی تک کانپ رہی تھیں۔ وہ خوشی، حیرانی اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت سے دوچار تھا۔

اس واقعے نے ٹونی کے دل میں ایک خوف سا پیدا کر دیا کہ اگر آیندہ کسی موقع پر اس نے دو سگریٹ کیس بنانے کا دعویٰ کر دیا اور اس کو ثابت کرنے میں ناکام رہا تو اس کا کیا حشر ہوگا۔ وہ پوری رات سوچ بچار کرتا رہا اور بالآخر ایک خاص نتیجے پر پہنچ گیا۔ دوسرے روز ناشتے کے بعد اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''میں ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔ کیا میرا ساتھ دو گی؟'' اس کی بیوی مارگریٹ کچھ اور سمجھی۔ اس نے اپنے شوہر پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور شرارت سے بولی: ''جو جی میں آئے کر لو، میں تیار ہوں۔''

ٹونی نے اپنی آستینوں کو اوپر چڑھایا اور اپنے خاص انداز میں مارگریٹ سے اس کی پسند دریافت کی۔

''لیکن ٹونی! یہ بات تو اب پرانی ہو چکی، تم کافی تجربہ کار ہو چکے ہو۔'' مارگریٹ نے چاٹ لہجے میں کہا۔

''میں جانتا ہوں۔'' ٹونی غرایا۔ ''لیکن میں اپنی مشق جاری رکھنا چاہتا ہوں۔''

مارگریٹ نے اس کی جانب غیر یقینی انداز میں دیکھا اور ٹونی کی مسحور کن نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے غیر ارادی طور پر کہا۔ ''مجھے سونے کا ایک سگریٹ کیس چاہیے۔''

ذرا دیر بعد رومال کے نیچے ایک اضطراری حرکت ہوئی۔ خوف اور دہشت کے ملے جلے جذبات کے دوران ٹونی نے محسوس کیا کہ کوئی چیز زور لگا کر اس کے ہاتھوں میں داخل ہو رہی ہے۔ جب مارگریٹ نے رومال ہٹایا تو ٹونی کے ہاتھ میں ایک نیا اور سنہری سگریٹ کیس دبا ہوا تھا۔ دونوں میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ کیسے اور کہاں سے آیا۔

''یہ کیا ہے؟'' مارگریٹ حیرت سے چلائی اور ٹونی کے ہاتھ سے سگریٹ کیس اچک لیا۔ اس پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔

ٹونی نے اس سگریٹ کیس کو بھی بقیہ دو سگریٹ کیس کے ساتھ رکھ دیا۔ نہ جانے کیوں وہ اس غیبی صلاحیت کو اپنے لیے عذاب سمجھ رہا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اس ہنر سے نہ جانے کتنی دولت سمیٹ چکا ہوتا لیکن ٹونی پر الٹا اثر ہوا اور رفتہ رفتہ وہ دیوانگی کی طرف بڑھنے لگا۔

بہت جلد اس کی یہ غیر اختیاری صلاحیت تھیٹر یا سرکس میں اس کے لیے مشکلات پیدا کرنے لگیں۔ اس کا ایک اور خاص کرتب یہ تھا کہ وہ زور سے تالی بجاتا اور جب اس کے ہاتھ جدا ہوتے تو ایک سنہرے رنگ کی خوب صورت سی چڑیا گنگناتی ہوئی ہوا میں غائب ہو جاتی۔ وہ چڑیا ٹونی کی سدھائی ہوئی تھی چنانچہ چند منٹوں بعد واپس اپنے پنجرے میں آ جاتی اور تماش بینوں کو کچھ پتا بھی نہیں چلتا۔

ایک رات جب وہ تماش بینوں کے سامنے یہی کھیل دکھانے جا رہا تھا تو ایک حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا جس نے اس کو اور تمام تماشائیوں کو حیران و ششدر کر کے رکھ دیا۔ اس نے تالی بجائی اور جب اس کی ہتھیلیاں جدا ہوئیں تو اس کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ اس نے دیکھا کہ بالکل ایک طرح کی چھ چڑیائیں بیک وقت اس کے ہاتھوں سے نکلیں اور ہال میں چکر لگانے لگیں۔ تماشائی بے تحاشا داد کے ڈونگرے برسا رہے تھے لیکن ٹونی جانتا تھا کہ وہ اس داد کا مستحق نہیں ہے۔ ٹونی کی چڑیا تربیت یافتہ تھی۔ وہ ایک کھڑکی سے باہر نکلی اور واپس اپنی جگہ پر آ گئی لیکن باقی پانچ چڑیاؤں کے ساتھ یہ معاملہ نہیں تھا۔ ان کو سرکس سے باہر نکالنے میں بے حد دشواری پیش آئی۔ انتظامیہ اس صورتِ حال سے ناخوش تھی اور کاروباری لحاظ سے خلاف معمول باتوں کو اپنے لیے نقصان دہ سمجھتی تھی۔

اپنی پریشانیوں کو کھل کر بیان کرنے کے بعد ٹونی نے مجھ سے التجا کی کہ میں ایسی انہونی باتوں کو روکنے میں اس کی مدد کروں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اپنے فن پر کسی قدر عبور رکھتا ہے۔ اس کا چہرہ تشویش سے خوفناک ہو گیا۔

''ڈاکٹر! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم مجھے کوئی چار سو بیس اور دھوکا باز سمجھ رہے ہو۔ بہرحال میں تمہارے اطمینان کی خاطر ہی ایک عملی مظاہرہ ابھی تمہارے سامنے کروں گا۔ تم کسی ایسی چیز کی فرمائش کرو جس کے بارے میں تمہیں یقین ہو کہ میں تمہاری خواہش پوری نہ کر سکوں گا۔ ڈاکٹر! میں پاگل نہیں ہوں اور اب مجھے رومال سے ہاتھ چھپانے کی ضرورت بھی نہیں رہی۔'' ٹونی کا پارہ چڑھنے لگا۔

میں نے ہنستے ہوئے کلاکسنس اینڈ کمپنی کا تیار کردہ نبض جانچنے والے ایک ایسے آلے کی فرمائش کی جو کافی عرصے سے غائب تھا اور مجھے اس کی ضرورت تھی۔ میں نے

WaqarAzeem Pakistanipoint.com

اس آلے کی تفصیل ٹونی کو بتائی۔ اس نے بلا پس وپیش اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا دیئے اور پھر دونوں ہتھیلیوں کو رگڑنے لگا۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے سامنے ایک گہری دھندسی چھا گئی اور جب اجالا ہوا تو میرا پسندیدہ آلہ میرے سامنے موجود تھا۔ میں بے اختیار آگے بڑھا اور جھپٹ کر اسٹیتھو اسکوپ کو اپنے سینے سے لگالیا۔

''یہ تم کیسے اور کہاں سے لے آئے؟'' چند لمحوں بعد جب میری کیفیت اعتدال پر آئی تو میں نے پوچھا۔

''یہ تو خود مجھے بھی نہیں معلوم۔'' ٹونی میری کیفیت دیکھ کر مسکرایا اور پھر بغیر مجھ سے پوچھے ایک اور کارنامہ کر دکھایا۔ میرے پسندیدہ سگریٹ ایکسپریس 555 کے ڈبے میری میز پر ڈھیر ہوئے جارہے تھے اور ذرا سی دیر میں ہی میری میز سگریٹوں سے بھر گئی۔ اب مجھے اس کی خداداد صلاحیت پر ایمان لانا ہی پڑا۔

''تم یقیناً ماہر فن اور اعلیٰ شعبدہ باز ہو۔ تمہاری صلاحیتیں لازوال ہیں۔'' میں نے اس کو بھرپور داد دی۔

''لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس صلاحیت سے چھٹکارا کیوں حاصل کرنا چاہتے ہو۔ تم چاہو تو دولت کے پہاڑ کے مالک بن سکتے ہو۔ آخر تم کو کیا مصیبت آن پڑی ہے جو اس دولت کو ٹھکرانے پر تلے ہوئے ہو؟''

''ڈاکٹر! میں تمہارے پاس نصیحتیں سننے نہیں آیا۔'' اس کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہو گئے۔ ''میں اس نعمت سے جلد از جلد جان چھڑانا چاہتا ہوں، کیونکہ یہ فن نہیں غیبی کارستانی ہے۔ میں ایک فنکار ہوں اور اپنی اوقات میں ہی رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے دولت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

ٹونی کے نقطۂ نظر نے مجھے چکرا کر رکھ دیا۔ قبل اس کے کہ میں کچھ اور کہتا، خود اس نے بولنا شروع کر دیا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم تو کیا، دنیا کا بڑے سے بڑا ڈاکٹر بھی میری مدد نہیں کر سکتا۔ یہ تو کسی بدروح کی کارستانی ہے اور جس طرح یہ مجھے ملی ہے، ہوسکتا ہے اسی طرح کسی دن چھن بھی جائے۔ میں تمہیں ایک بات بتاؤں ڈاکٹر!'' اس نے بڑے پُراسرار انداز میں میری طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ''کبھی کبھار یوں ہی مشق کے طور پر میں سگریٹ کیس بھی پیدا کرنے لگا ہوں تاکہ یہ دیکھ سکوں کہ کیا کسی وقت ناکامی بھی میرا مقدر بن سکتی ہے لیکن ایسا اب تک نہیں ہوا اور جس دن ایسا ہو گیا، وہ میری زندگی کا حسین ترین دن ہوگا۔''

''میں دم بخود اس کی باتیں سنتا رہا۔ ٹونی اپنے دل کی بھڑاس نکال کر چپ چاپ رخصت ہو گیا۔ ایک ہفتے بعد ٹونی نے اسٹیج اور سرکس سے اپنا تعلق بالکل ختم کر دیا اور نہ جانے کہاں چلا گیا پھر میری اس سے آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ ہمارے شفاخانے میں داخل ہوا۔''

میں وارفتگی کے عالم میں ڈاکٹر الفریڈ کی داستان میں گم تھا اور پھر عالم خواب میں ٹونی کو دیکھنے لگا۔ الفریڈ نے جب میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو میں حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا۔ ایسی نرالی کہانی میں نے آج تک نہیں سنی تھی۔

''کاش تم اس کے کمالات خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔'' ڈاکٹر الفریڈ نے مجھے مزید تجسس میں مبتلا کر دیا۔

''یہ تو ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ وہ تمام سگریٹ کیس خرید کر جمع نہیں کر سکتا۔''

''آؤ! دوبارہ معائنہ کرتے ہیں۔'' میں نے ڈاکٹر کو دعوت دی اور ہم ٹونی کے گھر کی طرف چل پڑے۔ تمام سگریٹ کیس اسی طرح میز پر پڑے ہوئے تھے جس طرح میں انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ حیرت کے مارے ڈاکٹر الفریڈ کے منہ سے سیٹی چھوٹ گئی۔

''ایسا لگتا ہے گویا ہم سگریٹ کیس بنانے والے کارخانے میں آگئے ہیں۔ تم نے کتنی تعداد بتائی تھی؟'' ڈاکٹر الفریڈ نے اچانک پوچھا۔

''دو سو چالیس۔'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

''لیکن ہوسکتا ہے کہ مجھ سے گنتی میں غلطی ہو گئی ہو۔'' اور پھر ہماری آنکھیں حیرت سے دوچار ہو گئیں۔ ہم نے دیکھا کہ ایک سگریٹ کیس ہماری طرف یوں بڑھتا چلا آرہا ہے جیسے کہ کوئی غیر مرئی ہاتھ اس کے پیچھے ہے۔ ہمارے چہرے سفید پڑ گئے اور ہم دونوں نے سہمی ہوئی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''اُف میرے خدا! ٹونی کی روح اب بھی یہاں موجود ہے۔'' ڈاکٹر الفریڈ دہشت سے کانپنے لگا اور میں سمجھ گیا کہ اب وہ چند لمحوں کا مہمان ہے۔

میں خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔ ڈاکٹر کی موت کے بعد سگریٹ کیسوں کا یہ راز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرے سینے میں دفن ہو جائے گا۔ کوئی بھی اور کبھی بھی یہ نہ جان سکے گا کہ سونے کے دو سو اکتالیس سگریٹ کیس کبھی عالم وجود میں آئے بھی تھے یا نہیں۔ وہ بدروح جو ٹونی کو استعمال کر رہی تھی۔ اب بھی یہاں کہیں موجود ہے۔

++

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اک شہر آبدار

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

عبدالغفور کھتری

کراچی کے قدیم علاقوں کی خوبصورتی مٹتی جارہی ہے۔ کبھی یہ شہر انفرادیت کا شہکار تھا۔ یہاں قابلِ دید مقامات بھی تھے۔ انتہائی صاف ستھرا شہر تھا جو اب گندگی کا ڈھیر بنتا جارہا ہے۔

قدیم کراچی کی ایک ہلکی سی جھلک

کیسی انسانی فطرت ہے کہ، جسے کھیتوں اور باغوں کی ہریالی، چہار سو پھیلی پھولوں کی خوشبو، اُڑتے پھرتے پرندوں کی چہچہاہٹ اور بلند پہاڑوں کی موجودگی کی صورت میں فطرت کا قرب میسر ہے، اُسے اس فطری ماحول کے برعکس شہر کی ہنگامہ خیز اور مشینی زندگی میں کشش نظر آتی ہے۔ اور شہر کی تیز رفتار زندگی سے بیزار لوگ کھیتوں، باغوں اور پہاڑوں سے گھرے پُرسکون علاقوں میں راحت کے متلاشی ہوتے ہیں۔

انسانی فطرت کا یہ تضاد اسے کبھی شہروں اور کبھی ویرانوں میں لیے پھرتا ہے۔ اس تضاد کے مارے کراچی کے

''شہر گزیدہ'' لوگوں نے شہر سے تقریباً نو میل دور ''منگھو پیر'' نام کے اس علاقے کو ''گوشہ سکون'' کے طور پر چن لیا تھا۔

منگھو پیر کے نام سے یہ علاقہ اپنے دامن میں خود اپنی اور کراچی کی قدیم تاریخ سمیٹے ہوئے ہے مگر اس کے اوراق بکھرے ہوئے ہیں۔ کچھ مؤرخین کے مطابق یہ علاقہ کبھی آباد اور ہنستا بستا شہر تھا جو نامعلوم وجوہ کی بنا پر اجڑ گیا۔

سندھ کی مکران اور ایران کے ساتھ تجارت کے لیے استعمال ہونے والی قدیم ترین شاہراہ پر پہاڑی سلسلوں میں گھرا یہ مقام سات سو سال قبل ایک بزرگ ''منگھو پیر'' کے یہاں تشریف لانے پر ''منگھو پیر'' کے نام سے اب تک مشہور ہے۔ تاریخی شواہد کے مطابق یہ علاقہ اس سے قبل بھی آباد تھا، مگر اس وقت اسے کس نام سے پکارا جاتا تھا، اس بارے میں تاریخ خاموش ہے۔

منگھو پیر، کراچی کے شمال مشرق میں واقع ایک قصبہ ہے جو اسے بندر مراد کے ذریعے لسبیلہ سے ملاتا ہے۔ اس کے مقبرے، مکانات، کتبے، تالاب چشمے اور دیگر آثار تحقیق کرنے والوں کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ منگھو پیر کو اس اعتبار سے اہمیت حاصل ہے کہ یہاں سلاطین دہلی کے عہد کے ایک بزرگ حاجی سلطان المعروف بہ منگھو پیر مدفون ہیں لیکن اس کی اہمیت کی ایک اور وجہ بھی ہے، جس پر عام طور پر لوگوں کی نظر نہیں جاتی وہ یہ ہے کہ اسلام کے آغاز میں مسلمانوں کی آمد و رفت ایران اور مکران کے راستے ہوتی تھی، ان کے تجارتی قافلے اور دوسری اشیا ادھر ہی سے گزرتی تھیں۔

لسبیلہ اور اس کے گرد و نواح کے مختلف قصبوں اور شہروں میں ان کا پڑاؤ رہتا تھا۔ اس قصبے کی پہاڑی کے دامن میں پھیلی ہوئی شکستہ، ٹوٹی پھوٹی پرانی اور بوسیدہ قبریں اور ان کے آثار سے بھی ان کے عہد کا اندازہ ہوتا ہے لیکن یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ قبریں کب کی اور کس زمانے کی ہیں۔ البتہ یہ بات یقینی ہے کہ ان کا زمانہ آج سے کئی سو سال پہلے کا ہے۔

آثار قدیمہ کے ماہرین نے اس مقام کی تاریخ کو کانسی کے دور یعنی 1700 سے 2000 قبل مسیح سے زیادہ قدیم قرار دیا ہے اور یہ وہ عرصہ تھا جب وادی سندھ کی تہذیب اپنے عروج پر تھی۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ کراچی کے شہریوں کے لیے یہ مقام شہر کی گہما گہمی سے ہٹ کر کچھ گھنٹے یا کچھ دن گزارنے کے لیے ایک آئیڈیل مقام تھا۔

مگر 1925ء تک اس ''ہل اسٹیشن'' تک پہنچنے کا کوئی واضح راستہ موجود نہیں تھا۔ بس پگڈنڈیاں ہی تھیں جن پر راستہ تلاش کرنا پڑتا تھا۔ بالآخر 1925ء میں انگریز حاکم نے عوام کی سہولت کے لیے موجودہ پاک کالونی کے قریب سے منگھو پیر تک پکی سڑک بنوائی۔ گو کہ ان دنوں سواری کے لیے موٹروں اور بسوں کا رواج نہیں تھا، صرف اونٹ اور بیل گاڑیاں ہی سواری کا ذریعہ تھیں۔ پھر قیام پاکستان سے قبل لی مارکیٹ سے منگھو پیر تک بسیں چلنے لگیں تو نہ صرف درگاہ پر جانے والے زائرین کے لیے سہولت ہو گئی بلکہ راستے میں پڑنے والے گوٹھوں بشمول منگھو پیر کے لیے ایک بہتر سہولت میسر آ گئی۔ اب اشیاء ضرورت کی خریداری اور دیگر کاموں کے لیے شہر سے ان کا رابطہ آسان اور تیز تر ہو گیا۔

شروع ہی سے کراچی کے تفریحی مقامات تک عام آدمی کی رسائی میں بڑی رکاوٹ ٹرانسپورٹ رہی، اور خاندان بھر کے افراد یا دوستوں کے گروپ کے لیے کسی مقام تک پہنچنا بہت ہی دشوار تھا۔ ایسے میں اونٹ گاڑی ایسا وسیلہ تھی، جس میں بچے، بڑے، عورت، مرد سب بیٹھ کر اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتے۔

لی مارکیٹ کے بس اسٹاپ سے چلنے والی روٹ نمبر 60 کی عمر رسیدہ بس براستہ بڑا بورڈ اور اورنگی، مسافروں کو اتارتی چڑھاتی خراماں خراماں نو دس میل کا فاصلہ طے کر کے جب منگھو پیر کے آخری اسٹاپ پر اتارے گی تو آپ اپنے آپ کو ایسے مقام پر پائیں گے، جس کے ایک طرف طویل اور خوبصورت پہاڑی سلسلہ ہے، اس سلسلے کے کسی قریبی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر نظر دوڑائیں تو اردگرد چھوٹے بڑے پہاڑ اور میدانی سلسلہ بکھرا ہوا ہے۔ چہار سو ایک پُراسرار خاموشی ہے ایک اُداسی کی کیفیت ہے۔ کبھی پہاڑوں کے درمیان بنی ہوئی یہ پگڈنڈیاں مکران کے راستے ایران جانے والے قافلوں میں شامل بار بردار جانوروں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں سے گونجا کرتی تھیں۔

کبھی اس وادی میں زندگی اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ موجود تھی۔ یہاں خوشیوں کے مختلف مواقعوں پر بجنے والی شہنائیوں کے درمیان زندہ دلوں کے قہقہے تھے۔ دو محبت بھرے دلوں کے درمیان عہد و پیماں تھے۔ معصوموں کی کلکاریاں تھیں اور ساتھ ہی اقتدار کی بھوک اور انا کی تسکین کے لیے انہی میدانوں نے تلواروں کی جھنکار بھی سنی ہو گی۔ غرض کہ زندگی اپنے تمام رنگوں کے ساتھ رواں دواں تھی کہ نجانے کسی کردہ یا ناکردہ گناہ کی سزا میں زندگی کے یہ تمام رنگ

Wahar Azeem
Pakistanipoint

پھیکے پڑتے پڑتے بالآخر موہوم ہی ہو گئے۔ سب کچھ معدوم ہو گیا۔ کچھ بھی نہ بچا بس یہ ویرانی اک اُجڑے دیار کی کہانی سنا رہی ہے۔

منگھو پیر کے مقام کی تاریخی حیثیت کے بارے میں اس مختصر معلومات کے بعد اب ہم اس مقام پر موجود گرم پانی کے چشموں اور درگاہ کے قریب تالاب میں مگرمچھوں کی موجودگی پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔

یہاں آنے والوں کے لیے درگاہ حضرت منگھو پیر پر حاضری کے بعد تفریح کا ایک ایسا سلسلہ موجود ہے جو انہیں فوراً واپس نہیں جانے دیتا۔ ان میں مذکورہ پہاڑی سلسلے کا دلفریب منظر، ہرے بھرے باغات اور مگرمچھوں کی ایک بڑی تعداد کی ایک جگہ موجودگی کے علاوہ ایک منفرد شغل چشموں کے گرم پانی میں نہانا ہے۔

منگھو پیر کی درگاہ کے قریب ٹھنڈے اور گرم پانی کے دو الگ الگ چشمے ہیں اور یہاں سے آگے آدھے میل کے فاصلے پر حضرت جلیل شاہ کی درگاہ کے قریب دو اور گرم پانی کے چشمے موجود ہیں۔ ماما پارسی نے ان چشموں کے پانی کو ایک جگہ جمع کر کے اُس میں ہر خاص و عام کے نہانے کے لیے دو کشتیاں (پکے حوض) بنوائے یوں انہیں ماما باتھ بھی کہا جانے لگا۔

چشموں کے اس پانی میں گندھک و دیگر معدنی اثرات ہیں، جس سے جلدی بیماریوں کے مریضوں کو خصوصی طور پر شفا ملتی ہے۔ آسول نے اس مقررہ مقام پر ہفتہ بھر ٹھہرنے کے خواہش مند افراد کے لیے ایک لانڈھی (سرائے کو مقامی زبان میں لانڈھی کہا جاتا ہے) تعمیر کروائی، جہاں دو چار بستر اور کچھ ضروری سامان بھی موجود ہوتا۔ یہ تمام سہولتیں بلا معاوضہ ہوتیں۔ یہاں گرم چشموں کے ساتھ، سادھو ہیرا نند جذام اسپتال بھی ہے جہاں کوڑھ اور جذام کے مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے۔

یہ تھی کراچی سے نو دس میل کی طویل ڈوری پر موجود بستی ''منگھو پیر'' کی کہانی۔ جس کی اپنی ایک تاریخ تھی۔ جو زمانے کے سرد و گرم سہتے یا حادثوں کی نذر ہو کر بالکل ناپید ہو گئی۔ اب ٹرانسپورٹ کی سہولت نے فاصلے سمیٹ لیے اور طویل دوری گھنٹے بھر کی مسافت رہ گئی تو شہر کے لوگ تفریح کرنے یہاں چلے آتے ہیں۔ ان میں سے شاید کسی کو اس بستی کی تاریخ جاننے کی جستجو رہی نہ ضرورت کہ یہ تاریخی اور نادر خزانہ کسی کے لیے مادی منفعت کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

++

آسٹیوپوروسس
(osteoporosis)

ہڈیوں کی ایک بیماری کا نام۔ اس بیماری میں کیلشیم کی وجہ سے ہڈیاں پتلی اور کمزور ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ معمولی چوٹ لگنے سے ٹوٹ جاتی ہیں بلکہ بعض اوقات تو یہ معمولی سا دباؤ بھی نہیں برداشت کر سکتیں۔ یوں تو یہ بیماری مردوں اور عورتوں دونوں کو ہو سکتی ہے لیکن عورتوں میں یہ بیماری مردوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ عموماً اس میں عورتوں اور مردوں کا تناسب تقریباً 2.1 ہے لیکن جیسے ہی خواتین 50 سال کی عمر سے آگے بڑھتی ہیں تو یہ تناسب تقریباً 6.1 تک ہو جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جب خواتین 50 سال کی عمر کو پہنچتی ہیں تو ان کے جسم میں ایسٹروجن (ایک قسم کا ہارمون) کی تعداد کم ہو جاتی ہے۔ ایسٹروجن کی کمی کی وجہ سے خواتین کی ہڈیوں میں کیلشیم کے ساتھ ساتھ دوسرے مادے بھی کم ہونا شروع ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی ہڈیاں کمزور پڑ جاتی ہیں اور وہ اس بیماری کا شکار ہو جاتی ہیں۔ جدید تحقیق سے بات واضح طور پر سامنے آ گئی ہے کہ جن عوامل کی وجہ سے یہ بیماری لاحق ہوتی ہے ان میں یہ شامل ہیں۔ عمر کی زیادتی (خواتین 50 سال سے زائد اور مرد 70 سال سے زائد)، خاندانی یا موروثی شواہد کی موجودگی، معمول کی خوراک میں کیلشیم کی مقدار میں کمی، پستہ قد ہونا (وزن 50 کلو سے کم)، خواتین میں ماہواری کے نظام کا جلد (45 سال کی عمر سے پہلے) بند ہو جانا، ورزش نہ کرنا، سگریٹ نوشی، کسی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہو جانا اور پھر بستر پر ہی رہنا، زیادہ سفید رنگت کا ہونا، ایشیائی نسل سے تعلق ہونا، چائے اور کافی کا بہت زیادہ استعمال۔ یہ بیماری اس اعتبار سے بہت زیادہ خطرناک ہے کہ اس مرض کے پیدا ہونے کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوتی اور مریض بھی اس سے بے خبر ہوتا ہے مثلاً ریڑھ کی ہڈی کے مہروں کا اپنی جگہ سے ہل جانا۔ اگر اس بیماری کی وجہ سے ہڈیوں کے نمکیات کم ہو جائیں تو ضروری ہے کہ ورزش کو باقاعدہ بنایا جائے، زیادہ بھاری سامان اٹھانے سے گریز کیا جائے، سگریٹ نوشی سے مکمل پرہیز کیا جائے۔ معالج اس بیماری میں مبتلا مرض کو کیلشیم اور وٹامن ای کی گولیاں دیتے ہیں یا ٹیکے لگاتے ہیں جب کہ خواتین کو ایسٹروجن کی گولیاں استعمال کراتے ہیں۔

مرسلہ: توفیق بچہ۔ کراچی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

پانچواں حصہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

روسیاہ

عاطر شاہین

وہ ایک معصوم سا سیدھا سادا نوجوان، غربت کی گود میں پلا بڑھا، خوابوں کی دنیا ہی اس کا مسکن تھا کہ اسے سبق سکھانے کے لیے اس کی بہن کو اغوا کرلیا گیا اور تب اسے آنکھیں آبپوش کرنی پڑیں۔ مصائب کے دلدل کو پار کرتا ہوا وہ آگے بڑھا تو اس پر آشکار ہوا کہ تقدس کے ملمع چڑھے چہروں کے عقب میں مکروہ چہرے ہیں۔ وہ ان کے چہروں سے نقاب ہٹانا چاہتا تھا مگر بھول گیا تھا کہ زمینی خدا بن بیٹھے مقدس ظالمین کی قوت ناقابل شکست ہے۔

پل پل بدلتے چہروں کی طویل سرگزشت

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

کچھ روز کے بعد علی کی ایک ٹی ہوٹل پر شانی اور اس کے دوستوں کے ساتھ مڈبھیڑ ہوگئی۔لوگوں نے بیچ بچاؤ کرایا تھا۔پھر چودھری باسط نے دھوکے سے علی کو اپنے ٹھکانے پر بلالیا۔چودھری باسط نے اس سے اپنی ویڈیو کی بابت پوچھا اور اپنے کارندے اس کے گھر بھیج کر کمپیوٹر اور سیل فون منگوالیا۔پھر علی نے چودھری باسط کے کہنے پر کمپیوٹر سے اس کی ویڈیو ڈیلیٹ کردی۔چودھری باسط نے اسے زندہ چھوڑتے ہوئے کہا کہ اگر اس کے پاس اس کی ویڈیو کی کاپی ہوئی تو وہ اس کا برا حشر کرے گا۔علی اسماعیل شاہد سے ملا۔اسماعیل شاہد نے اسے اپنے دوست کے مکان کی چابی دے دی۔جب علی اسماعیل شاہد کی کوٹھی سے باہر نکلا تو اس کی ملاقات شانزے سے ہوئی۔وہ اداس تھی۔علی اپنی فیملی کے ساتھ غریب آباد نئے گھر میں شفٹ ہوگیا تھا۔چندروز کے بعد اس نے چودھری باسط سے رابطہ کرکے اس کی ویڈیو کے بارے میں بتایا تو وہ بہت غصے میں آ گیا۔پھر علی نے اس سے اس کے گھر میں ملاقات کا وقت طے کرلیا۔اسی روز علی فاروق سے مل کر گھر جارہا تھا کہ دو آدمی اس کا تعاقب کرنے لگے۔اسی رات ہی علی کو فاروق کی کال موصول ہوئی جس نے بتایا کہ اسے اغوا کرلیا گیا ہے۔اسے اغوا کرنے والا حیدر الماس تھا جو نازنین عرف ببلی کا شوہر تھا۔وہ علی سے ویڈیو حاصل کرنا چاہتا تھا۔علی نے اسے ویڈیو دینے کی ہامی بھرلی تھی اور چودھری باسط کو انکار کردیا تھا۔اگلے روز حیدر الماس نے علی کو فون کرکے بتایا تھا کہ چودھری ساجد کو اس کے ٹھکانے کا معلوم ہوگیا ہے اس لئے وہ فوری طور پر اپنی فیملی سمیت وہاں سے نکل جائے۔علی اپنی فیملی سمیت حیدر الماس کے فاروق پورہ والے مکان میں آگیا۔علی نے فلیش حیدر الماس کو دے دی۔ماں کے پوچھنے پر علی کو بالآخر بتانا پڑا کہ روزینہ اغوا ہوئی ہے۔یہ سن کر علی کی ماں بے ہوش ہوگئی۔

اب آگے پڑھیں

رات کے نو بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔میں اور مرینہ چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ساتھ ہی ساتھ چائے بھی پی رہے تھے۔امی کمرے میں دوائیوں کے زیر اثر سو رہی تھیں۔روزینہ کے اغوا کے صدمے نے ان کے دماغ پر ایک بار پھر گہرا اثر ڈالا تھا اور ہوش میں آنے کے بعد انہوں نے روزینہ کو پکار پکار کر بے حد واویلا مچایا تھا جس سے ان کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔

میں نے مرینہ کے مشورے پر امی کو سب کچھ سچ سچ بتا تو دیا تھا لیکن نہیں جانتا تھا کہ امی یہ صدمہ برداشت نہیں کر پائیں گی۔آخر سچ تو بتانا ہی تھا آج یا کل۔اب جب ان کی طبیعت ریکور ہورہی تھی تو آج پھر سچ سننے کے بعد دوبارہ ہوش وحواس کھوبیٹھیں اور چیخنے چلّانے لگیں۔چیخنے چلّانے سے ان کی طبیعت بگڑنے لگی تھی۔اماں زلیخا فوراً ڈاکٹر کو لے آئیں جس کا اس گلی کی نکڑ پر کلینک تھا۔ڈاکٹر فواد نے انہیں سکون آور انجکشن لگا دیا تھا جس سے وہ آہستہ آہستہ غنودگی میں چلی گئی تھیں۔

ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ امی کے دماغ پر کسی گہرے صدمے کا اثر ہے۔انہیں جلد از جلد کسی اسپتال میں ایڈمٹ کرانا پڑے گا ورنہ ان کی دماغی حالت بگڑ سکتی ہے۔یہاں تک کہ اگر ان کا بروقت علاج نہ کروایا گیا تو وہ ہوش وحواس کھوسکتی ہیں۔ان پر شیزوفرینیا کا بھی اٹیک ہوسکتا ہے۔

اس لمحے مجھے شانی، چودھری باسط اور چودھری ساجد پر بے انتہا غصہ آیا تھا جن کی وجہ سے میری ماں اس حالت میں پہنچی تھیں۔میں نے قسم کھالی تھی کہ میں ان تینوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ان تینوں کے ساتھ بہت برا سلوک کروں گا۔ایسا سلوک کہ وہ مرتے دم تک یاد رکھیں گے۔

مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ میں کیا کروں اور امی کو کیسے سنبھالوں۔یہ پریشانی بھی دامن گیر ہوگئی تھی کہ بقول ڈاکٹر، اگر امی کا بروقت علاج نہ کروایا گیا تو وہ شیزوفرینیا کی مریضہ بن سکتی ہیں۔امی کی حالت ٹھیک ہوتی جارہی تھی لیکن جیسے ہی وہ یہاں آئی تھیں تو انہیں روزینہ کا خیال آگیا تھا۔کاش انہیں روزینہ کا خیال ہی نہ آتا۔

بہ ظاہر میری نظریں ٹی وی پر تھیں لیکن میرا دماغ امی کے بارے میں سوچ رہا تھا پھر سوچتے سوچتے میری نظر مرینہ پر پڑی تو میں بے اختیار چونک پڑا۔وہ ساکت وجامد ٹی وی دیکھ رہی تھی۔آنکھیں بھی جھپک نہیں رہی تھیں۔اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ایسا لگتا تھا جیسے وہ پتھر کی مورتی بن گئی ہو۔اس کی یہ حالت دیکھ کر میں بھی پریشان ہوگیا۔

”مرینہ۔“ میں نے اسے آواز دی لیکن اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔وہ بدستور پتھر کی مورت بنی ٹی وی کی طرف دیکھ رہی تھی۔جب میں نے دوسری بار اسے پکارا تب وہ چونکی جیسے جاگنے کی حالت میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہو۔اس کے چہرے پر ہراسیت ابھر آئی تھی۔

”کک۔کیا ہوا بھائی! مجھ سے کچھ کہا؟“ اس کے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

لہجے میں سراسیمگی تھی۔
''تم ٹھیک تو ہو مرینہ۔'' میں نے دلگرفتگی سے استفسار کیا۔
''میں..... ہاں۔ میں ٹھیک ہوں بھائی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مجھے کچھ نہیں ہوا۔''
''لیکن مجھے تم ٹھیک دکھائی نہیں دے رہی۔'' میں نے بہ غور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔
وہ چند لمحے خاموش رہی پھر اپنے دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے بولی۔ ''بھائی! مجھے..... بہت ڈر لگ رہا ہے۔''
''ڈر..... کیوں.....؟'' میں چونکا اور اٹھ کر اس کے قریب پہنچا پھر اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔
''بھائی۔'' وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ''ہم کب تک دَر دَر بھٹکتے رہیں گے۔ کب تک آپ ہمیں دشمنوں سے چھپاتے رہیں گے۔ آخر کب تک..... بالآخر ہم ان کے نرغے میں آجائیں گے اور.....''
وہ روہانسی ہو رہی تھی اس لیے اپنی بات مکمل نہ کر پائی۔ وہ سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔ اس لمحے میرا دل بھی غم سے بھر گیا تھا۔
میں نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔ ''اللہ نے چاہا تو ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔''
وہ کچھ دیر سسکتی رہی پھر سیدھی ہوئی۔ اس کی آنکھیں متورم اور اشکبار تھیں۔
''اللہ غارت کرے ان لوگوں کو جن کی وجہ سے ہم گھر سے بے گھر ہو گئے ہیں۔'' اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے میرے دشمنوں کو بددعا دی۔
''وہ ضرور غارت ہوں گے۔'' میں نے اس کی ڈھارس بندھائی۔ ''اور میرے ہاتھوں ہی غارت ہوں گے۔''
مرینہ کا خدشہ بالکل درست تھا۔ آخر کب تک میں ان دونوں کو لے کر دَر دَر بھٹکتا رہوں گا۔ کم سے کم وہ دونوں تو محفوظ ہو کر زندگی گزاریں۔ میرا کیا ہے، میں تو اس وقت تک چین و سکون سے نہیں رہوں گا جب تک میرے دشمن کیفر کردار تک نہیں پہنچ جاتے اور روزینہ کو بھی بازیاب نہیں کرا لیتا۔ مرینہ چند لمحے میری طرف دیکھتی سسکیاں بھرتی رہی پھر بولی۔
''بھائی! میں بھی امی کی حالت کے پیش نظر پریشان ہوں۔ ڈاکٹر کی باتیں رہ رہ کر میرے دماغ میں گونج رہی ہیں۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو.....''
''انہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ان شاء اللہ۔''
''بھائی! آپ حیدر صاحب سے بات کریں۔ ان کا کوئی نہ کوئی واقف کار ڈاکٹر ہوگا۔'' مرینہ نے مشورہ دیا اور مجھے قابل عمل لگا۔
''ہم۔ میں حیدر صاحب سے بات کرتا ہوں۔'' میں نے مرینہ کو تسلی دی۔ ''اب اپنا موڈ ٹھیک کرو اور جا کر منہ ہاتھ دھو لو۔ رونے سے تمہاری شکل بگڑ کر بھوتنی کی طرح ہو گئی ہے۔''
میری بات پر مرینہ ہنس دی۔ وہ اٹھ کر جانے لگی تو میں نے کہا۔ ''مجھے اچھی سی چائے بھی بنا کر پلاؤ۔''
''اگر اچھی نہ بنی تو.....'' وہ زیر لب مسکراتے ہوئے استفسار کرنے لگی۔
''تو.....'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''پھر بھی پی لوں گا۔''
مرینہ ہنس دی۔ وہ کچن میں چلی گئی جبکہ میں ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے اسے چائے پلانے کا اس لیے کہا تھا تاکہ اس کے ذہن کا رخ مڑ جائے جو ڈر اور خوف اس کے دماغ میں جگہ بنا رہا ہے وہ رفع ہو جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد مرینہ میرے لیے چائے بنا لائی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اسے چائے کی طلب نہیں ہو رہی تھی اس لیے اس نے اپنے لیے نہیں بنائی۔ وہ امی کے کمرے میں چلی گئی اور میں چائے سپ کرنے کے ساتھ ساتھ خبرنامہ بھی دیکھنے لگا۔ رات دس بج گئے تھے لیکن چودھری باسط اور بلی کے حوالے سے نیوز نہیں چلی تھی۔ میں نے سارے چینل سرچ کر لیے تھے لیکن کسی چینل پر ایسی کوئی نیوز نہیں چل رہی تھی۔ شاید حیدر الماس نے ابھی تک یہ سنسنی خیز نیوز کسی چینل کو نہ دی ہو۔ بہرحال میں رات گیارہ بجے تک ٹی کے سامنے بیٹھا رہا پھر جب مجھے بوریت ہونے لگی تو میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں بیڈ پر لیٹا ہی تھا کہ حمیرا کا میسج آ گیا۔
اس نے پوچھا تھا کہ ہمارے ''گھر'' کے گیٹ پر تالا کیوں لگا ہوا ہے اور میں کہاں ہوں۔ میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا تو دو منٹ بعد اس کا پھر میسج آ گیا۔
''آپ جواب کیوں نہیں دے رہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔''
میں نے پھر بھی جواب نہ دیا تو دو منٹ بعد ہی اس کا

Waqas Azeem
Pakistanipoint

تیسرا میسج آ گیا۔ لکھا تھا۔ ''آپ جواب کیوں نہیں دے رہے۔ کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟''

بادلِ نخواستہ میں نے اسے جواباً میسج لکھ کر سینڈ کر دیا۔ میں نے لکھا تھا۔ ''سوری حمیرا۔ میں بزی تھا۔ ہم نے وہ گھر چھوڑ دیا ہے۔ ہم کہیں اور شفٹ ہو گئے ہیں۔''

چند ہی لمحوں میں اس کا پھر میسج آ گیا۔ اس میسج میں حیرت کا اظہار کیا گیا تھا۔ ''آپ نے وہ گھر کیوں چھوڑ دیا؟ کوئی وجہ بھی تو ہو گی؟''

میں مخمصے میں پڑ گیا تھا کہ اسے کیا جواب دوں۔ پھر ذہن میں جو بات آئی وہ لکھ کر سینڈ کر دی۔ ''مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس گھر میں جن بھوتوں کا بسیرا ہے اس لیے وہ گھر چھوڑ دیا۔''

اس کا جواب آ گیا۔ ''اوہ۔ کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟ کیا واقعی اس گھر میں جنات کا بسیرا ہے؟''

نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے ہنسی آئی۔ کہتے ہیں کہ ہنسی علاجِ غم ہے۔ شاید میں تھوڑی دیر کے لیے اپنا غم بھول گیا تھا۔ میں نے میسج لکھنا شروع کیا۔

''ہاں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ چند روز سے مجھے ایک چڑیل دکھائی دے رہی تھی جس نے ہمیں وہ گھر چھوڑنے کا حکم دیا۔ نہ چھوڑنے کی صورت میں اس نے ہمیں مارنے کی دھمکی دی تھی اس لیے ہمیں وہ گھر چھوڑنا پڑا۔'' میں نے یہ لکھ کر میسج سینڈ کر دیا۔

یہ سلسلہ جاری رہا اور میں محظوظ بھی ہو رہا تھا۔ اس بار اس نے تفتیش میں پوچھا تھا۔ ''اچھا ان باتوں کو چھوڑیں، یہ بتائیں، ہماری دوستی تو قائم رہے گی نا؟''

میں بھلا اس سے کیسے دوستی رکھ سکتا تھا۔ نہ میں اس سے مل سکتا تھا اور نہ وہ مجھ سے مل سکتی تھی۔ میں نے صرف یہی لکھا۔ ''میں اس وقت شہر سے باہر ہوں اور کافی بزی ہوں۔ فری ہو کر بات کروں گا۔''

جواب میں اس نے صرف ''او کے، آئی ول ویٹ'' لکھا تھا۔ وہ عجیب لڑکی تھی۔ شاید اسے مجھ سے محبت ہو گئی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ لڑکی میری محبت میں اپنے آپ کو خوار کرے۔ میرے پاس محبت کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اس سے زیادہ بات نہ کروں اس طرح اس کا دھیان مجھ سے ہٹ جائے گا اور بالآخر ہمارا رابطہ ختم ہو جائے گا۔ میں نے سیل فون سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور نائٹ بلب جلا کر لیٹ گیا لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ دراصل مجھے امی اور مرینہ کی فکر لاحق تھی۔ پھر نجانے کب نیند کی دیوی مجھ پر مہربان ہو گئی مجھے پتا ہی نہ چلا اور میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ صبح ناشتا کرنے کے بعد میں نے امی سے باتیں کیں۔ ان کی کیفیت رات والی نہیں تھی البتہ وہ رنجیدہ و غمگین تھیں۔ میں نے انہیں یقین دلایا تھا کہ روزینہ دنیا کے جس کونے میں بھی ہو گی میں اسے واپس لے آؤں گا۔ میں انہیں اس دلاسے کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا تھا۔ امی خاموش تھیں جیسے انہوں نے چپ کا روزہ رکھ لیا ہو۔ اچھی بات یہ تھی کہ انہوں نے خاموشی سے ناشتا کر لیا تھا اور روزینہ کو یاد کر کے واویلا نہیں مچایا تھا۔

ناشتے سے فراغت کے بعد میں نے سیل فون پر حیدر الماس صاحب سے امی کی کنڈیشن کے حوالے سے بات کی۔ انہوں نے بتایا کہ ایک ڈاکٹر ان کا جاننے والا ہے۔ وہ اس سے بات کر کے مجھے بتائیں گے پھر اسی روز انہوں نے اپنے جاننے والے ڈاکٹر سے امی کے علاج کے حوالے سے بات کر لی اور اسی روز امی کو ایک پرائیویٹ اسپتال میں ایڈمٹ کروا دیا۔ امی کے ساتھ مرینہ رہ رہی تھی۔ میں بھی وہاں رہنا چاہتا تھا لیکن حیدر الماس صاحب نے مجھے وہاں نہ رہنے دیا۔ انہیں خدشہ تھا کہ میری جان کو خطرہ ہو سکتا ہے اس لیے میں واپس آ گیا تھا البتہ حیدر صاحب نے اپنے چند کارندوں کو میری امی اور مرینہ کی حفاظت پر مامور کر دیا تھا۔

حیدر الماس نے بھی شاید اپنا ایک گینگ بنایا ہوا تھا جس میں انہوں نے کافی بندے جمع کر رکھے تھے۔ یہ گینگ کیا کام کرتا تھا مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا لیکن میرے دل میں تجسس ضرور تھا اور سوچا تھا کہ وقت آنے پر حیدر الماس سے ان کے گینگ کے بارے میں بات کروں گا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں کسی گینگ میں پھنس کر اپنے آپ کو خوار کروں۔ میں.... جس مقصد کے لیے ان کے ساتھ ملا تھا وہ پورا کرنا چاہتا تھا۔

اسپتال سے واپس آنے کے بعد میں نے مرینہ سے مسلسل رابطہ رکھا ہوا تھا۔ میں اس سے گاہے گاہے امی کی طبیعت کے حوالے سے پوچھتا رہتا تھا اور ہر بار وہ تسلی بخش جواب دیتی تھی۔ امی کو ایک علیحدہ کمرے میں ایڈمٹ کیا گیا تھا اور ان کے علاج کے سارے اخراجات حیدر الماس صاحب برداشت کر رہے تھے۔ میں نے ان سے اس بابت بات کی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ نیکی کی خاطر ایسا کر

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

رہے ہیں۔اس کے علاوہ انہیں کوئی غرض نہیں ہے۔

میں نے ان کے لہجے اور آنکھوں میں کسی قسم کی لالچ نہیں دیکھی تھی... بلکہ ان کی آنکھوں میں امی اور مرینہ کے لیے احترام دیکھا تھا۔ مرینہ نے بتایا تھا کہ حیدر الماس صاحب اسپتال میں کئی بار آچکے تھے اور وہ مرینہ کو بیٹی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

امی کا علاج شروع کر دیا گیا تھا، انہیں ایڈمٹ ہوئے تین روز گزر گئے تھے۔ تین چار بار تو میں بھی چھپ کر اسپتال گیا تھا۔ سب کچھ تسلی بخش تھا اس لیے میں مطمئن تھا۔

شام کے پانچ بجے میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا ٹی وی پر خبر نامہ دیکھ رہا تھا کہ میرے پاس اسماعیل شاہد کی کال آگئی۔ ''علی بیٹا! آج میں تم سے ملنے تمہارے گھر گیا تھا لیکن دروازے پر تالا تھا۔ خیریت تو ہے، کہاں ہو تم۔''

میں نے جواب دیا۔ ''سر! میں ایک دوست کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔''

''کیوں؟'' وہ چونکے۔

''میں آپ کو بتانا بھول گیا تھا سر۔ وہ..... دراصل چودھری ساجد کو اس گھر کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا اس لیے مجھے وہاں سے فوراً نکلنا پڑا۔'' میں نے کہا۔

''کیا۔ کیا کہہ رہے ہو؟'' ان کی حیرت میں ڈوبی آواز سنائی دی۔ ''مگر کیسے.....؟ یہ تو انتہائی خوفناک بات ہے۔''

''پتا نہیں سر، میں خود بھی حیران ہوں کہ چودھری ساجد کو کیسے آپ کے دوست کے گھر کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔ اگر مجھے تھوڑی سی بھی دیر ہو جاتی تو چودھری ساجد نے مجھے مروا دینا تھا اسی لیے مجھے فیملی سمیت وہاں سے نکلنا پڑا۔'' میں نے کہا۔ ''بہرحال اب چودھری ساجد اور چودھری باسط دونوں میری جان کے درپے ہیں۔ ان کے کارندے مجھے ہر جگہ تلاش کر رہے ہیں۔''

''اوہو۔ یہ تو تشویشناک بات ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''بہرحال میں نے تمہیں اس لیے فون کیا ہے کہ..... مجھے ایک ایسے ریکٹ کا پتا چلا ہے جو لڑکیوں کی اسمگلنگ میں ملوث ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری بہن کے اغوا میں یہی ریکٹ ملوث ہے۔ میں اپنے طور پر معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جیسے ہی کچھ معلوم ہوتا ہے تو میں تمہیں آگاہ کر دوں گا۔''

اسماعیل شاہد صاحب کی بات سن کر میں بے اختیار چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔ مجھے اندھیرے میں اُمید کی ایک کرن دکھائی دی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''سر! اس ریکٹ کا ہیڈ کون ہے اور ہیڈ کوارٹر کہاں ہے؟''

''اس ریکٹ کا ہیڈ چودھری ساجد ہی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ یہاں جتنے بھی لڑکیوں کی اسمگلنگ کرنے والے ریکٹ موجود ہیں ان سب کا ہیڈ چودھری ساجد ہی ہے۔'' اسماعیل شاہد نے بتایا۔ ''ہیڈ کوارٹر کے بارے میں تو معلوم نہیں ہو سکا لیکن اس کے ایک ٹھکانے کے بارے میں پتا چلا ہے۔''

''اوہ۔ کہاں ہے ٹھکانا؟'' میں نے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

''مانگا پل کے بارے میں جانتے ہو؟'' انہوں نے استفسار کیا تو میں چونک پڑا۔

نو بہار نہر وہاڑی چوک سے غالباً دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ اس کے عقب میں مانگا پل کی طرف جانے والی سڑک تھی جو دنیا پور کی طرف بھی جاتی تھی۔ کئی سال پہلے یہ بے آباد علاقہ تھا۔ کچی سڑکیں تھیں۔ بجلی نہیں تھی۔ سرِشام ہی ہو کا عالم طاری ہو جاتا تھا لیکن جب سے سرقیاتی کام ہوئے تھے اس علاقے کی قسمت ہی بدل گئی تھی۔ پکی سڑکیں بن گئی تھیں۔ بجلی اور گیس بھی پہنچ گئی تھی اس لیے اب یہ علاقہ کافی پُررونق ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''جی سر۔ میں جانتا ہوں۔''

''مانگا پل سے دور ایک بستی ہے وہیں کوئی ٹھکانا ہے۔ سنا ہے، اس ٹھکانے کا مالک یاور عباس ہے۔ وہ چودھری باسط کا دستِ راست ہے۔ وہاں اغوا شدہ لڑکیوں کو قید رکھا جاتا ہے۔ وہیں ان کی برین واشنگ کی جاتی ہے۔ اس کے بعد انہیں دوسرے ملک اسمگل کیا جاتا ہے۔'' اسماعیل شاہد صاحب نے کہا۔

''سر، کیا یہ پکی اطلاع ہے۔'' میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''سو فیصد۔'' اسماعیل شاہد صاحب پُریقین لہجے میں بولے۔ میرے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا کہ کہیں اسماعیل شاہد کا تعلق کسی خفیہ ایجنسی سے تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے وہ سرکس چلانے کے ساتھ ساتھ خفیہ ایجنسی کے لیے بھی کام کرتے ہوں۔ میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا لیکن پوچھتے پوچھتے رہ گیا۔ وہ مجھ سے بڑے تھے اس لیے مجھ میں ان سے پوچھنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

''سر! پھر تو ہمیں وہاں جلد سے جلد پہنچنا چاہیے۔''

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

میں نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے میری بہن روزینہ بھی وہیں موجود ہو۔''

''ہاں ہوسکتا ہے۔'' اسماعیل شاہد بولے۔ ''لیکن میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر نہیں جاسکتا۔ تمہارے لیے خطرہ ہے۔ بقول تمہارے چودھری ساجد اور چودھری باسط کے آدمی تمہیں تلاش کررہے ہیں۔ اگر تم انہیں نظر آگئے تو وہ تمہیں پکڑ لیں گے۔ بلکہ ہوسکتا ہے تمہیں ہلاک ہی نہ کر دیں۔ سوری، میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تمہاری جان چلی جائے۔''

''سر! اللہ نے چاہا تو مجھے کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''بس میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔''

''علی! تم کیوں اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہو۔'' وہ خفگی سے بولے۔ ''میں ہوں نا۔ میں وہاں جارہا ہوں۔ میں اکیلا نہیں ہوں گا۔ خفیہ ایجنسی کے چند لوگ مجھے فالو کریں گے۔ اگر یاور عباس کو اغوا کرنا پڑا تو وہ بھی کرلیں گے۔''

''سر پلیز، مجھے اپنے ساتھ لے چلیں۔'' میں نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ ''پلیز سر، میری درخواست قبول کرلیں۔''

وہ چند لمحے خاموش رہے پھر بولے۔ ''مجھے فکر ہے کہ تم جذبات میں آکر کوئی غلط قدم اٹھالو۔'' اس بار اسماعیل کے لہجے میں تفکر تھا۔

میں نے احتراماً کہا۔ ''سر! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کوئی غلط قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گا۔ بس آپ سے التماس ہے کہ آپ مجھے اپنے ساتھ وہاں لے چلیں۔''

''ہمم۔'' ہنکاری بھرنے کے بعد اسماعیل شاہد خاموش ہوگئے تھے۔ شاید وہ کچھ سوچ رہے تھے پھر کچھ دیر کے بعد بولے۔ ''دیکھو علی! مجھے تمہاری بہت فکر ہے۔ تم ایک ایمان دار اور اچھے لڑکے ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم کسی مشکل میں پھنس جاؤ اس لیے میری مانو تو ضد چھوڑ دو۔''

وہ مجھے ہر ممکن خطرے سے بچانا چاہتے تھے اس لیے وہ مجھے قائل کرنے کی حتی المقدور کوشش کررہے تھے لیکن میں بھی انہیں قائل کرنے کی بھرپور سعی کررہا تھا اس لیے میں نے پُرامید لہجے میں کہا۔ ''سر! مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ آپ میرا یقین کریں، میں کوئی غلط قدم نہیں اٹھاؤں گا۔''

''ہمم۔ لگتا ہے تم میری بات نہیں مانو گے۔'' بادلِ نخواستہ انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ''پھر ایک کام کرو۔''

''جی بتائیں۔'' میں ہمہ تن گوش ہوا۔

''تم میرے پاس آجاؤ ہم دونوں اکٹھے چلتے ہیں۔'' انہوں نے تجویز پیش کی جو مجھے قابل قبول لگی۔ ''ہم یاور عباس سے ڈائریکٹ ملیں گے۔ گو اس میں خطرہ ہے لیکن تمہاری خاطر میں ہر خطرہ مول لینے کو تیار ہوں بس تم نے وہی کرنا ہے جو میں کہوں گا۔''

اسماعیل شاہد واقعی بہت اچھے انسان تھے۔ ان کی طرح اچھے انسان دنیا میں موجود تو ہیں لیکن ہمیں خام خام ہی دکھائی دیتے ہیں یا ملتے ہیں۔ یہ اچھی بات تھی کہ وہ میری مدد کررہے تھے اور انہوں نے چودھری ساجد کا ایک ٹھکانہ تلاش کرلیا تھا۔ میں نے ممنون لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے سر۔ آپ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔ آپ بہت اچھے انسان ہیں۔''

''مکھن نہ لگاؤ یار۔'' وہ ازراہِ تفنن بولے۔

میرے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''میں مکھن نہیں لگا رہا سر، حقیقت بیان کررہا ہوں۔ آپ جیسے اچھے انسان اس دنیا میں بہت کم ہیں۔ آپ جو کچھ میرے لیے کررہے ہیں اس کا میں تو آپ کو بدلہ نہیں دے سکتا لیکن اللہ آپ کو جزا ضرور دے گا۔''

''اوکے۔ کتنی دیر میں پہنچو گے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''یہی کوئی آدھے گھنٹے تک۔'' میں نے جواباً کہا۔

''اس طرح تو بہت دیر ہوجائے گی کیونکہ میں نے آج رات کی فلائٹ سے ایک ضروری کام کے سلسلے میں ملک سے باہر جانا ہے۔'' وہ پُرسوچ لہجے میں بولے۔ ''تم اس طرح کرو، تم چوک رشید آباد پہنچ جاؤ، میں وہیں سے تمہیں پک کرلوں گا۔''

''سر! اگر آپ کہیں تو میں نوبہار نہر پر پہنچ جاؤں۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''کیونکہ میں نوبہار نہر کے قریبی علاقے میں موجود ہوں۔''

ڈبل پھاٹک سے آٹو رکشے وہاڑی چوک تک جاتے تھے اور نوبہار نہر وہاڑی چوک سے چند منٹ کی دوری پر تھی اسی لیے میں نے اسماعیل شاہد سے وہاڑی چوک پر پہنچنے کی بات کی تھی۔ انہوں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم وہاڑی چوک پر پہنچو، میں تمہیں وہیں سے پک کرلوں گا۔''

رابطہ منقطع ہونے کے بعد میں نے سیل فون جیب میں رکھا اور اماں زلیخا کو دروازہ بند کرنے کا کہہ کر گھر سے نکل کر

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ڈبل پھاٹک کی طرف بڑھ گیا۔ پانچ منٹ کے بعد میں ڈبل پھاٹک پر پہنچا تو وہاں لاری اڈے کی طرف جانے کے لیے کئی آٹو اور چنچی.... رکشے موجود تھے۔ مجھے ایک چنگ چی رکشے کی پچھلی سیٹ خالی دکھائی دی تو میں اس میں سوار ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد مزید سواریاں بھی سوار ہو گئیں تو ڈرائیور نے چنچی.... رکشا آگے بڑھا دیا۔ چنگ چی رکشا چوک شاہ عباس، ممتاز آباد اور بی سی جی چوک سے ہوتے ہوئے وہاڑی چوک پر پہنچا تو اس وقت چھ بجنے والے تھے۔ راستے میں کئی سواریاں اتری تھیں اور کئی سوار ہوئی تھیں۔ میں نے کرایہ ادا کیا اور ایک سائیڈ پر ہو کر اسماعیل شاہد کی کار کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ میں ان کی کار پہچانتا تھا اور مجھے قرب و جوار میں ان کی کار دکھائی نہ دی۔ شاید وہ ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ میں نے انہیں اطلاع دینے کی غرض سے کال کی تو انہوں نے دوسری بیل پر کال ریسیو کر لی۔

''سر! میں وہاڑی چوک پر پہنچ گیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''او کے۔ میں بھی بس پہنچنے ہی والا ہوں تم وہیں ویٹ کرو، میں آ رہا ہوں۔'' اسماعیل شاہد صاحب نے کہا۔

''دراصل کار کا ٹائر پنکچر ہو گیا ہے اور ڈرائیور وہیل تبدیل کر رہا ہے۔ دس منٹ لگ جائیں گے۔''

انہوں نے دس منٹ کا کہا تھا لیکن بیس سے پچیس منٹ گزر گئے تھے.... اسماعیل شاہد نہیں آئے تھے۔ مجھے عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ میرا واہمہ تھا یا قدرتی عمل تھا مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ میں اپنی بے چینی سمجھنے سے قاصر تھا البتہ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا میری بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ میری چھٹی حس بیدار ہو گئی تھی اور نہ جانے مجھے ایسے کیوں محسوس ہونے لگا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ کیا ہونے والا ہے میں اس سے بے خبر تھا۔ مزید دس منٹ گزر گئے تھے لیکن اسماعیل شاہد نہیں آئے تھے۔ میں اپنے اعصاب اعتدال پر رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا لیکن بے چینی تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

وہاڑی چوک پر مختلف کمپنیوں کی بسیں لاہور، کراچی، اسلام آباد اور دیگر شہروں کے لیے چلتی ہیں۔ یہاں اس وقت بھی لوگوں کا جم غفیر موجود تھا۔ کئی بسیں دیگر شہروں میں جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ میں ایک سائیڈ پر کھڑا آنے جانے والوں کو گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ عین اسی لمحے ایک آٹو رکشا میرے پاس آ کر رک گیا۔ ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا کہ کہیں جانا ہے تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ آٹو رکشے کے جاتے ہی میں نے دائیں طرف مڑ کر دیکھا تو میری نظر سڑک کنارے رکتی ایک کار پر پڑی۔ کار کی رنگت سرمئی تھی، جیسے ہی کار رکی، اس کے دروازے کھلے اور چار شہدے ٹائپ نوجوان برآمد ہوئے۔ وہ چاروں کسرتی اور مضبوط جسامت کے دکھائی دیتے تھے۔ انہیں دیکھ کر نہ جانے مجھے کیوں کھٹکا لگا تھا کہ وہ میری ہی تلاش میں وہاں آئے تھے۔ اگر وہ میری خاطر وہاں آئے تھے تو میرے ذہن میں سوال پیدا ہوا تھا کہ وہ کس کے آدمی تھے۔ چودھری ساجد یا چودھری باسط کے اور انہیں کیسے معلوم ہوا تھا کہ میں وہاڑی چوک پر موجود ہوں۔

وہ چاروں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے وہاڑی چوک کی طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ میں تیزی سے فٹ پاتھ کے کنارے جھاڑیوں میں دبک گیا۔ جھاڑیاں اتنی گھنی تھیں کہ میں ان میں آسانی سے نہ صرف چھپ گیا تھا بلکہ تھوڑی سی جھاڑیاں ہٹا کر ان چاروں کی نقل و حرکت دیکھ بھی رہا تھا۔ چاروں آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے باتیں بھی کر رہے تھے۔ مجھے خطرے کی بُو محسوس ہو گئی تھی اس لیے میں جھاڑیوں میں ہی دبکا بیٹھا رہا۔ چند لمحوں کے بعد وہ چاروں اسی طرف آ گئے جہاں میں جھاڑیوں میں موجود تھا۔ میں نے بہ غور دیکھا تو ایک شہدے کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پستول دبی ہوئی تھی۔ وہ چاروں میرے بارے میں ہی باتیں کر رہے تھے۔ ساتھ ہی مجھے مغلظات سے بھی نواز رہے تھے لیکن مجھے ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ اچانک میری جیب میں موجود میرے سیل فون کی مترنم بیل بج اٹھی تو ان چاروں کے ساتھ ساتھ میں بھی چونک پڑا۔ عین وقت پر ہی معاملہ خراب ہو گیا تھا۔

''یہ فون کس کا بج رہا ہے۔'' پستول والے نوجوان نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''میرا فون تو نہیں بج رہا۔'' اس کے ایک ساتھی نے جواب دیا۔

''میرا بھی نہیں بج رہا۔'' دوسرے ساتھی نے کہا۔

تیسرے نے بھی یہی جواب دیا جو اس کے دوسرے ساتھی دے چکے تھے۔ میں نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر سیل فون نکالا اور ایک بٹن پریس کر کے اس کی آواز بند کر دی۔ جو کہ مجھے کال کر رہا تھا۔ میں نے کال ڈسکنکٹ کر کے سیل فون جیب میں رکھ لیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ چاروں

WaqarAzeem
Pakistanipoint.com

شہدے بڑے چوکنے انداز میں چلتے ہوئے اسی طرف بڑھتے آرہے تھے جدھر میں جھاڑیوں میں دبکا بیٹھا تھا۔

میں خطرے میں گھر گیا تھا۔ موت میری طرف بڑھ رہی تھی اور میں ہونٹ بھینچے ہوئے تھا۔ میں نے دیکھا کہ پستول والے نوجوان کے دوسرے ساتھی نے بھی اپنی جیب سے پستول نکال لیا تھا۔ میرے پاس ''فرار'' کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اگر میں ان کے ہتھے چڑھ گیا تو یہ مجھے کسی صورت نہیں چھوڑیں گے۔ بادل نخواستہ میرے دماغ نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے یہاں سے ''فرار'' ہوجانا چاہیے۔ زندگی ہے تو سب کام ہو جاتے ہیں اور اگر تشنگی برقرار رہ گئی تو پچھتاوے کے علاوہ کچھ نہیں بچے گا۔ سو میں ان کی نظروں سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے جھکے جھکے انداز میں جھاڑیوں سے نکلا اور ایک طرف بڑھنے لگا۔ مجھے اُمید تھی کہ ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی ہوگی لیکن یہ میری خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔ انہوں نے مجھے مشکوک انداز میں جاتے ہوئے دیکھا تو وہ چاروں میری طرف لپکے۔

''وہ جارہا ہے۔'' ایک نوجوان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''پکڑو اسے۔''

میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ چاروں دوڑتے ہوئے میری طرف آرہے تھے۔ میں نے وہاں سے بھاگنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہ لگائی۔ سڑک کراس کرتے ہی مجھے ایک گلی دکھائی دی اور میں دوڑتا ہوا اس گلی میں داخل ہوگیا۔ میرے اندازے کے مطابق گلی پندرہ فٹ چوڑی تھی اور جا بہ جا کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ کئی جگہ تو پھسلن بھی تھی لیکن میں بے پروا دوڑتا جا رہا تھا۔ وہ چاروں بھی میرے پیچھے آرہے تھے۔ ایک شہدے نے مجھ پر گولی چلا دی تھی۔ شاید اس کے پستول پر سائلنسر لگا ہوا تھا اس لیے گولی کی آواز بھی نہیں ابھری تھی لیکن خوش بختی سے اس کا نشانہ خطا گیا تھا۔ اختتام پر گلی دو حصوں میں بٹ رہی تھی۔ یعنی دائیں اور بائیں طرف جارہی تھی۔ میں دائیں طرف مڑ گیا، عین اسی لمحے سامنے والی دیوار میں گولی پیوست ہوگئی۔ میں خالی ہاتھ تھا اس لیے ان سے مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے انہیں کئی گلیوں میں گھمایا اور بالآخر مجھے ایک پلاٹ کے گرد چار دیواری دکھائی دی تو میں جلدی سے دیوار کود گیا۔ چار دیواری گندگی اور کوڑے کرکٹ سے بھری ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے پورا محلہ وہیں کچرا پھینکتا ہے۔ کہیں کہیں گھنی جھاڑیاں بھی اُگی ہوئی تھیں۔ گلی کی طرف والی دیوار کے ساتھ ایک درخت بھی تھا جس کی شاخیں سوکھی ہوئی اور گلی کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر اپنی سانس اعتدال پر لانے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے کان باہر کی طرف لگے ہوئے تھے اور چند لمحوں کے بعد مجھے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ قدموں کی آوازوں سے یہی محسوس ہوتا تھا کہ دوڑنے والا صرف ایک شخص ہے۔ ساتھ ہی مجھے جھنجلائی ہوئی آوازیں بھی سنائی دیں۔ وہ فون پر کسی سے میرے بارے میں ہی بات کررہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے قدموں کی آہٹیں اور آوازیں دور ہوتی چلی گئیں۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ عین اسی لمحے میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی تو میں نے جلدی سے سیل فون نکال کر دیکھا۔ اسماعیل شاہد صاحب کال کررہے تھے۔

میں نے کال اٹینڈ کرلی۔ اسماعیل شاہد صاحب کی آواز سنائی دی۔ ''میں وہاڑی چوک پر موجود ہوں۔ تم کہاں ہو علی؟ مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہے۔''

میں نے مختصراً ساری صورتحال بتادی کہ میں کہاں موجود ہوں۔ وہ پریشان ہوئے۔ ''اوہ۔ تمہیں کچھ ہوا تو نہیں؟''

''نہیں سر۔ میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''آپ میرا ویٹ کریں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

''دھیان سے آنا۔'' انہوں نے مجھے تنبیہ کی۔ ''کہیں کوئی تمہیں دیکھ نہ لے۔''

''جی سر، آپ بے فکر رہیں۔'' میں نے انہیں مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

رابطہ منقطع ہوتے ہی میں نے سیل فون جیب میں رکھا اور دیوار پر چڑھ کر گلی میں جھانکا۔ مجھے ان چاروں میں سے کوئی بھی گلی میں دکھائی نہیں دیا البتہ دو بچے کتابیں اٹھائے جا رہے تھے۔ میں چند لمحے اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتا رہا پھر میں دیوار کود کر گلی میں اتر آیا۔ گلی میں اترنے کے بعد میں تیز تیز قدموں سے ایک طرف بڑھتا چلا گیا۔ انتہائی محتاط انداز سے میں دو گلیاں گھوم کر تیسری گلی میں آگیا۔ سامنے ہی مجھے گلی کی نکڑ دکھائی دی۔ وہ گلی دائیں طرف مڑ رہی تھی۔ میں جیسے ہی گلی مڑا تو مجھے ایک شہدا دکھائی دیا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اس لیے وہ بے اختیار ٹھٹک گیا۔

''یار، تم نے بہت تھکا دیا ہے بھگا بھگا کر۔'' وہ ایسے بے تکلفی سے بول رہا تھا جیسے میں اس کا لنگوٹیا یار ہوں۔ حالانکہ وہ مجھ سے عمر میں خاصا بڑا تھا۔

''اچھی بات ہے۔ دوڑ صحت کے لیے مفید ہوتی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ہے۔'' میں نے بھی بے تکلفی سے جواب دیا تو اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''اچھا اب شرافت سے چلو گے یا میں تمہیں زبردستی لے جاؤں۔'' اس نے دریافت کیا۔

''میں تمہارے ساتھ چلوں گا لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں کس نے بھیجا ہے۔'' میں نے ہامی بھرتے ہوئے کہا۔

اس نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''جب میں تمہیں چودھری صاحب کے سامنے پیش کروں گا تو تم خود ہی دیکھ لینا۔ چلو اب میرے ساتھ۔''

ساتھ ہی اس نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا تو میں نے تجسس آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''تم چودھری ساجد کی بات کر رہے ہو یا چودھری باسط کی؟''

''تم سوالات بہت کرتے ہو۔'' میری بات کا جواب دینے کی بجائے اس نے کہا۔

''میری عادت ہے۔'' میں نے شانے اچکائے۔

''ہمم۔'' اس نے ہنکاری بھرتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''مجھے بتانے کی اجازت نہیں ہے اس لیے اس مخمصے میں پڑنے کی بجائے میرے ساتھ چلو۔ شاباش۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔''

''سوری۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تو اس کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''گویا زبردستی کرنی پڑے گی؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''کر کے دیکھ لو۔'' میں بھی زیرلب مسکرایا۔

''پچھتاؤ گے تم۔'' اس نے کہا۔

''کوئی پروا نہیں۔'' اس بار میں نے شانے اچکائے۔

میری بات مکمل ہی ہوئی تھی کہ اسی لمحے میرے عقب میں ایک اور شہدا آ گیا۔ وہ اچانک ہی آیا تھا اور آتے ہی اس نے مجھے بازوؤں سے پکڑنے کی کوشش کی لیکن میں چکنی مچھلی کی طرح اس کی گرفت سے نکل گیا۔ ساتھ ہی میں نے اسے زور سے دھکا بھی دیا تھا۔ وہ نہ صرف لڑکھڑایا بلکہ زمین بوس بھی ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے غلیظ گالی سے نوازا اور اٹھنے لگا تو میں نے پاس سے گزرتے ہوئے اس کی پسلیوں پر ٹھوکر مار دی۔ وہ کراہ اٹھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے دوڑ لگا دی۔ پہلا شہدا اپنے ساتھی کی پروا کیے بغیر مجھے غلیظ گالیوں سے نوازتا ہوا میرے پیچھے دوڑا۔ اس کے دوڑنے کی رفتار قدرے تیز تھی اس لیے جلد ہی اس نے مجھے چھاپ لیا۔

''تیری.....'' اس نے مجھے گندی گالی دی۔ ''تو شرافت کی زبان سمجھتا ہی نہیں۔''

اس نے شاید مجھے ہلکا لے لیا تھا۔ میں نے یک لخت اپنے جسم کو موڑتے ہوئے اپنے بازو چھڑائے اور اس کی ناک پر زور سے مکا مارا۔ وہ نہ صرف کراہا بلکہ اس کی ناک سے خون بھی نکل آیا تھا۔ وہ ایک گھر کے باہر بنے تھلے پر بیٹھ کر اپنا ناک سہلانے لگا۔ میں نے اسے کراہتا چھوڑ کر دوڑ لگا دی۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا ورنہ وہ مجھے کور کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔ یہ میرے لیے اچھا ہی ہوا تھا ورنہ خوا مخواہ کسی مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ گلی کی نکڑ مڑنے سے پہلے میں نے مڑ کر دیکھا ناک پر مکا کھانے والا بدستور تھلے پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ اس کا ساتھی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کے پاس جا رہا تھا۔

میں نے صرف نظر کی اور مختلف گلیوں میں گھومنے لگا۔ وہ گلیاں کم غلام گردش زیادہ تھیں۔ مجھے خطرہ تھا کہ کہیں باقی شہدوں سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ اسماعیل شاہد صاحب وہاڑی چوک پہنچ چکے تھے اور میرا انتظار کر رہے تھے۔ اچھا ہوا کہ میرا باقی شہدوں سے آمنا سامنا نہیں ہوا اور میں بالآخر وہاڑی چوک پر پہنچ گیا۔ اسماعیل شاہد ایک سائیڈ پر اپنی کار کے پاس کھڑے تھے۔ میں ان کے پاس پہنچ گیا۔

وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور بولے۔ ''جلدی سے کار میں بیٹھو، کہیں کوئی تمہیں دیکھ نہ لے۔''

میں اثبات میں گردن ہلاتا ہوا پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا جبکہ اسماعیل شاہد ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکے تھے۔ چند لمحوں کے بعد کار نو بہار نہر کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

''تم نے انہیں کیسے چکمہ دیا؟''

میں نے انہیں مختصراً بتا دیا کہ میں کیسے غنڈوں کو چکر دے کر نکلا ہوں۔ انہوں نے میری بہادری کو سراہا۔ اس کے بعد ہمارے درمیان گہری خاموشی طاری ہو گئی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی۔ وہ یہ کہ اسماعیل شاہد صاحب قدرے خاموش، محتاط اور متفکر دکھائی دے رہے تھے۔ شاید میری وجہ سے ان کی یہ کیفیت ہو رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں شرمندہ بھی ہو رہا تھا کہ وہ میری وجہ سے پریشان تھے۔

میں نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ''سر! آپ کو میری وجہ سے تکلیف اٹھانی پڑ رہی ہے۔''

وہ مسکرا دیئے۔ ''کوئی بات نہیں علی بیٹا۔ تمہاری مدد کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔''

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

''شکریہ سر۔'' میرے لہجے میں ممنونیت تھی۔

''اٹس اوکے۔'' انہوں نے بے پروا انداز میں کہا۔

وہ دوبارہ مسکرائے لیکن اس بار ان کی مسکراہٹ میں عجیب سی کیفیت شامل تھی۔ نہ جانے مجھے اس لمحے کیوں اسماعیل شاہد صاحب پُراسرار سا دکھائی دیئے۔ مجھے ان کی مسکراہٹ بھی عجیب لگی تھی۔ ان کی مسکراہٹ میں کچھ تھا جو میری سمجھ سے بالاتر تھا۔

''سر! مجھے ایک بات الجھا رہی ہے۔'' میں نے تجسس آمیز لہجے میں کہا۔

''وہ کیا؟'' انہوں نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور پھر سامنے دیکھتے ہوئے محتاط ڈرائیونگ کرنے لگے۔

''مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ میرے دشمنوں کو میری وہاڑی چوک پر موجودگی کی خبر کیسے مل گئی؟'' میں نے اپنا خدشہ بیان کیا۔

وہ پُرسوچ اور پُرغور لہجے میں بولے۔ ''واقعی، یہ غور طلب بات ہے۔ شاید تمہاری نگرانی کی جارہی ہے۔''

''میری نگرانی۔'' میں چونکا۔ ''سر، اگر میری نگرانی کی جارہی ہوتی تو میرے دوست کا گھر بھی ٹریس کیا جاسکتا تھا پھر، اور شاید میں آپ کے ساتھ اب نہ ہوتا۔''

وہ میری بات پر قائل ہوگئے، بولے۔ ''ہاں، یہ بات بھی ہے لیکن سوال پھر وہی ہے کہ آخر چودھری ساجد یا چودھری باسط کو کیسے پتا چلا کہ تم وہاڑی چوک پر موجود ہو۔''

میرے پاس اس بات کا جواب نہیں تھا۔ میرا ذہن بھی الجھ گیا تھا۔ مجھے یاد تھا جب میں غریب آباد والی کوٹھی میں موجود تھا تو مجھے حیدر الماس نے اطلاع دی تھی کہ چودھری ساجد کو اس کوٹھی کے بارے میں معلوم ہوگیا ہے۔ اب بھی ویسی ہی صورتِ حال درپیش تھی۔ آخر میرے دشمنوں کو کیسے پتا چل گیا تھا کہ میں وہاڑی چوک پر موجود ہوں؟ میں اسی سوچ میں مبتلا تھا کہ عین اسی لمحے اسماعیل شاہد کے سیل فون کی مترنم بیل گنگنا اٹھی۔ ان کا سیل فون کار کے ڈیش بورڈ پر پڑا تھا۔ انہوں نے بائیں ہاتھ سے فون اٹھالیا۔

میں اسماعیل شاہد صاحب کی آواز پر سوچ کی دنیا سے باہر نکل آیا۔ ''ہاں بولو..... اوہو..... مجھے تو یاد ہی نہیں تھا۔ ٹھیک ہے، تم رات دس بجے میٹنگ رکھ لو، میں دس بجے تک پہنچ جاؤں گا۔ اوکے۔''

انہوں نے سیل فون آف کرکے ڈیش بورڈ پر رکھنے کی بجائے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر انہوں نے ایک طائرانہ نظر مجھ پر ڈالی اور سامنے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے۔ ''مجھے تو یاد نہیں تھا کہ آج میں نے ایک بزنس میٹنگ میں شرکت بھی کرنی تھی۔ خیر.....''

میں نے کوئی جواب نہ دیا صرف اثبات میں گردن ہلا دی۔ ہم نو بہار نہر کے اوپر بنے پل سے ہوتے ہوئے مانگا پل والی سڑک پر آگئے۔ شام ہورہی تھی اس لیے وہاں برگر شاپس اور ہوٹلوں پر خوب رونقیں لگی ہوئی تھیں۔ تقریباً بیس منٹ کے سفر کے بعد ہم مانگا پل پر پہنچ گئے۔ وہ ایک چھوٹی سی نہر تھی جس کے دائیں بائیں کچے اور ناہموار راستے بنے ہوئے تھے اور وہ راستے دور دراز کے دیہاتوں تک جاتے تھے۔ نہر کے پل سے تھوڑا آگے کئی دکانیں، ہوٹل اور کلینک تھے۔ اسماعیل شاہد نے نہر کے کنارے کار روک کر ہاتھ کے اشارے سے ایک نوجوان کو بلایا تو وہ آگیا۔

''سنو۔ ہم نے خیر پور گاؤں جانا ہے۔'' اسماعیل شاہد نے کہا۔

''آپ اس طرف سے چلے جائیں۔ یہ راستہ سیدھا خیر پور گاؤں جاتا ہے۔'' نوجوان نے مشرقی سمت اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا تو اسماعیل شاہد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کار کا رخ موڑا اور اسے نوجوان کے بتائے گئے راستے پر ڈال دیا۔ کار کچے اور ناہموار راستے پر ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس دوران ہمارے درمیان خاموشی چھائی رہی تھی۔ اسماعیل شاہد نے بتایا کہ انہیں خفیہ ایجنسی کے بندے فالو کریں گے لیکن مجھے تو کہیں بھی کوئی ایسی کار یا چیز دکھائی نہیں دی تھی جس پر یہ گمان ہوتا کہ اس میں خفیہ ایجنسی کے بندے سوار ہیں اور اسماعیل شاہد کو فالو کررہے ہیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد ہم خیر پور گاؤں پہنچ گئے۔ اندھیرا ابھی پھیل گیا تھا۔

گاؤں تو کافی بڑا تھا لیکن آبادی کم تھی۔ کچے پکے مکانات کی پیشانیوں پر پیلے بلب ستاروں کی مانند ٹمٹماتے ہوئے اندھیرے کو دور کرنے کی ناکام کوشش کررہے تھے۔ ہم تھوڑی ہی دور پہنچے تھے کہ ڈیش بورڈ پر پڑا اسماعیل شاہد صاحب کا سیل فون ایک بار پھر مترنم گھنٹی سے گنگنا اٹھا۔ انہوں نے کار کی رفتار ہلکی کی اور فون اٹھا کر ایک نظر اسکرین پر ڈالی اور کال ریسیو کرکے کان سے لگالیا۔ ''بولو جنید! کیا رپورٹ ہے؟''

دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد ان کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ کار روک کر وہ بولے۔ ''ویری

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

بیڈ! کیا تم نے سارا علاقہ چھان مارا ہے؟"

ان کی بات پر میں بھی بے اختیار چونک پڑا۔ دوسری طرف سے بات سننے کے بعد انہوں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔ "ہونہہ۔ کیا وہ پہنچ گئے ہیں۔ کیا یہ حتمی اطلاع ہے۔ اوہو۔ ٹھیک ہے۔ تم واپس چلے جاؤ۔ میں بھی یہاں سے نکل رہا ہوں۔" آخر میں ان کا لہجہ تشویش سے لبریز تھا پھر انہوں نے سیل فون ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔ ان کے چہرے پر تناؤ کی سی کیفیت ابھر آئی تھی۔ وہ کار اسٹارٹ کر کے موڑنے لگے تو میں نے پوچھا۔

"کیا ہوا سر؟ ہم واپس کیوں جا رہے ہیں؟"

"اطلاع فیک ثابت ہوئی ہے۔" وہ جواباً بولے۔ "یاور عباس نام کا کوئی شخص یہاں نہیں رہتا اور نہ ہی چودھری ساجد کا یہاں کوئی ریکٹ ہے۔ ہمیں بھٹکانے کے لیے غلط اطلاع دی گئی۔ تمہیں پکڑنے کے لیے انہوں نے بندے روانہ کر دیئے ہیں جو اسی طرف آ رہے ہیں۔"

میں چونکا اور الجھن آمیز لہجے میں بولا۔ "ہم سے مراد، آپ اور میں؟"

"ظاہر ہے، ہم سے مراد ہم دونوں ہی ہیں۔" انہوں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "یقیناً چودھری باسط یا چودھری ساجد دونوں میں سے کوئی یہ جانتا ہے کہ میرا اور تمہارا لنک ہے۔ ویسے بھی آج کے دور میں کسی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ انہوں نے یقیناً تمہارے بارے میں معلوم کیا ہوگا کہ تمہارا کس کس سے لنک ہے اور جب انہیں تمہارے میرے ساتھ تعلقات کے بارے میں علم ہوا تو انہوں نے ہمیں گھیرنے کے لیے یہ ڈراما رچایا اور مجھ تک غلط اطلاع پہنچائی۔ میرا خیال ہے تمہاری وہاڑی چوک پر موجودگی بھی اسی کا پیش خیمہ تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ میں تمہیں وہاڑی روڈ سے پک کروں گا اور شاید ان کا یہی پروگرام تھا کہ تم جب وہاڑی چوک پر پہنچو گے ان کے بندے تمہیں اغوا کر لیں گے لیکن تمہاری قسمت کہ تم ان کے ہاتھ نہیں لگے۔"

ان کی بات دل کو لگتی تھی۔ کسی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا واقعی کوئی مشکل کام بھی نہیں تھا؛ اور اسماعیل شاہد صاحب کی بات درست تھی۔ چودھری ساجد یا چودھری باسط نے یقیناً یہ معلومات حاصل کی ہوں گی کہ ان دنوں میرا کن لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے اور خاص کر مجھے پکڑنے کے لیے مجھے وہاڑی چوک سے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی۔ جب میں ہاتھ نہیں آیا تو انہوں نے اپنے غنڈے روانہ کر دیئے۔ میرے دماغ میں غصے اور غیظ کی لہریں الاؤ کی صورت میں بھڑکنے لگیں تاہم میں نے اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کی۔ وہ مزید بولے۔ "لیکن تم فکر مت کرو، ہم خیریت سے یہاں سے نکل جائیں گے۔ ان شاء اللہ وہ ہمارا بال تک بیکا نہیں کر سکیں گے۔"

انہوں نے مجھے تسلی دی اور میں نے انشاء اللہ کہا۔ پھر میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ "سر، کیا آپ کسی خفیہ ایجنسی کے لیے بھی کام کرتے ہیں۔"

انہوں نے ایک طائرانہ نظر مجھ پر ڈالی اور خفیف انداز میں مسکراتے ہوئے بولے۔ "ہاں۔ میں سرکس چلانے کے ساتھ ساتھ خفیہ ایجنسی کے لیے بھی کام کرتا ہوں۔ سرکس میرا پرائیویٹ بزنس ہے۔"

میرے تجسس کی تصدیق ہو گئی اس لیے ساری پریشانیاں رفع ہو گئی تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ کافی پاور فل انسان ہیں اور ان کی اوپر تک اپروچ ہے۔

تھوڑی دور جانے کے بعد نہر آ گئی اور اسماعیل شاہد نے بائیں طرف والی سڑک پر کار ڈال دی اور اس کی رفتار میں اضافہ کر دیا۔ کار ناہموار راستے پر اچھلتی کودتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ہم یہاں سے جلد سے جلد نکل جانا چاہتے تھے اس لیے اسماعیل شاہد صاحب بے پروا ہو کر کار چلا رہے تھے۔ ہم ابھی تھوڑی ہی دور پہنچے تھے کہ اچانک نہر کی دوسری طرف والی سڑک پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ گاڑی قدرے دور تھی اور انتہائی تیز رفتاری سے ناہموار راستے پر دوڑتی ہوئی آ رہی تھی۔ گاڑی کو دیکھ کر اسماعیل شاہد بھی پریشان ہو گئے۔ انہوں نے اپنے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے چودھری باسط کے کارندے ہمیں مارنے کے لیے آ گئے ہیں۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ انہوں نے ڈیش بورڈ کا خانہ کھول کر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں ان کی مطلوبہ چیز نہ ملی تو وہ جھنجلا گئے۔ "میرا ریوالور بھی گھر رہ گیا ہے۔ کیا تمہارے پاس ریوالور ہے۔"

"نہیں سر۔" میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

دونوں گاڑیاں لحہ بہ لحہ قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ اگر راستے میں نہر حائل نہ ہوتی تو شاید چودھری باسط کے کارندے ہمیں یہاں سے نکلنے بھی نہ دیتے پھر جیسے ہی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

دوسری طرف والی گاڑی قریب پہنچی تو اچانک ہماری کار پر تیز فائرنگ ہونے لگی۔ اسماعیل شاہد نے چیخ کر مجھے جھکنے کا کہا تو میں بے اختیار جھک گیا۔ وہ خود بھی جھک گئے تھے لیکن خوش بختی سے گولیاں ہمارے سروں میں نہیں بلکہ کار کی چھت میں لگیں۔ یکدم جھکنے کی وجہ سے اسماعیل شاہد کار پر کنٹرول نہیں رکھ سکے اور بائیں طرف ڈھلوان کی طرف کار اترتی چلی گئی۔ یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ اسماعیل شاہد نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے کار کا اسٹیئرنگ بائیں طرف موڑ دیا تھا۔ اگر وہ دائیں طرف موڑ دیتے تو کار ڈھلوان کی بجائے نہر میں گر چکی ہوتی۔ ہم مرنے سے بال بال بچ گئے تھے۔

کار ڈھلوان میں اتری اور ہچکولے کھاتی ہوئی اِدھر اُدھر ڈولنے لگی۔ سامنے ہی مجھے کئی درخت دکھائی دیئے اور کار کا رخ بھی اسی طرف تھا لیکن اسماعیل شاہد نے انتہائی مہارت سے کار کا نہ صرف کنٹرول سنبھال لیا تھا بلکہ جلدی سے اس کا رخ دوبارہ اونچائی کی طرف کر کے اسپیڈ بڑھا دی تھی۔ اگر انہیں کار سنبھالنے میں ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو شاید کار کسی درخت سے ٹکرا جاتی اور نجانے ہمارا کیا حشر ہو جاتا۔ کار غراتی ہوئی اونچائی پر چڑھی اور ایک بار پھر ناہموار سڑک پر دوڑنے لگی۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا تو دوسری کار مڑ رہی تھی۔ اسماعیل شاہد نے بھی بیک ویو مرر میں دیکھ لیا تھا۔ دوسری کار اب دوڑتی ہوئی آ رہی تھی۔ مانگا پل نہر پر پہنچتے ہی اسماعیل شاہد نے کار نو بہار نہر کی طرف جانے والی سڑک پر موڑی اور پھر اسے دوڑاتے چلے گئے۔ میں نے بیک اسکرین سے دیکھا تو دوسری کار ابھی تک مانگا پل نہر پر نہیں پہنچی تھی۔

اسماعیل شاہد کا چہرہ سپاٹ تھا اور ان کی توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز تھی۔ عین اسی لمحے دوسری کار کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں جو تر چھی ہو رہی تھیں یعنی کار کا رخ ہماری طرف ہی ہو رہا تھا۔

''وہ آ رہے ہیں سر۔'' میں نے اسماعیل شاہد سے مخاطب ہو کر کہا۔

''میں انہیں ڈاج دینے کی کوشش کرتا ہوں۔'' وہ بولے۔ ''ویسے بھی ہم شہری حدود میں داخل ہونے والے ہیں اس لیے اب وہ ہم تک نہیں پہنچ سکتے اور نہ ہی ہم پر حملہ کر سکتے ہیں۔''

بیس منٹ کے بعد ہم نو بہار نہر پر پہنچ گئے۔ اسماعیل شاہد نے کار کا رخ وہاڑی چوک کی طرف موڑ دیا۔ سڑک پر ٹریفک کا اژدھام تھا اس لیے دوسری کار مجھے کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ کچھ دور جانے کے بعد اسماعیل شاہد نے کار کی رفتار ہلکی کی اور پھر اسے ایک گلی میں موڑ دیا۔ گلی میں داخل ہوتے ہی انہوں نے کار روک دی اور اس کی ہیڈ لائٹس آف کر دیں پھر وہ بیک ویو مرر میں دیکھنے لگے۔ میں بھی مڑ کر بیک اسکرین سے سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کئی کاریں، ٹرک، بسیں، آٹو رکشے اور موٹر بائیکس گزر رہی تھیں لیکن مجھے مطلوبہ کار دکھائی نہیں دی تھی لیکن اسماعیل شاہد نے شاید وہ کار دیکھ لی تھی۔ ''وہ کار چلی گئی ہے۔ اب ہم خطرے سے باہر ہیں۔''

اتنا کہتے ہی انہوں نے طویل سانس لیتے ہوئے کار اسٹارٹ کی اور اسے بیک کر کے وہاڑی چوک کی طرف بڑھ گئے۔ وہاڑی چوک پر پہنچے تو میں نے کہا۔ ''سر، مجھے یہیں اتار دیں۔ میں چلا جاؤں گا۔''

''اگر کہو تو تمہارے دوست کے گھر تک ڈراپ کر سکتا ہوں۔'' انہوں نے پیش کش کی۔

''نہیں سر، میں چلا جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ۔''

''محتاط ہو کر جانا۔ تمہارے دشمنوں کے کارندے تمہارے پیچھے ہیں۔'' انہوں نے تلقین کی۔ اور سڑک کے کنارے فٹ پاتھ کے قریب کار روک دی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولے۔

''شکریہ کی کوئی بات نہیں۔ میں چودھری ساجد اور چودھری باسط، دونوں کے خفیہ ٹھکانوں کو ٹریس کرنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں۔ جیسے ہی کوئی ٹھکانا ٹریس ہوتا ہے تو میں اپنے دوست احسان اللہ سے بات کرتا ہوں۔ کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہو جائے گا۔''

''مجھے بھی ضرور بتایئے گا۔'' میں نے التماس کی۔

انہوں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ ان کے جانے کے بعد میں چنگچی رکشے میں سوار ہو کر ڈبل پھاٹک پہنچ گیا۔ میں گھر پہنچا تو رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ اماں زلیخا میرے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ فریش ہو کر میں ان کے ساتھ ہی کھانا کھانے میں مشغول ہو گیا۔ آج ہم بال بال بچے تھے۔

☆.....☆

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ مزید ایک ہفتہ گزر گیا تھا لیکن ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی تھی۔ نہ ہی حیدر الماس صاحب نے مجھے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

چودھری ساجد کے بارے میں بتایا تھا اور نہ ہی انہوں نے رابطہ کیا تھا۔ انہوں نے اپنے بارے میں یہی بتایا تھا کہ وہ محب وطن پاکستانی ہیں اور ان کا گینگ غلط مقاصد کے لیے نہیں ہے لیکن ان کا کئی کئی روز غائب رہنا اور سیل فون آف رکھنا مجھے کھٹکنے لگا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں مشکوک ہوتا جارہا تھا۔ حیدر الماس کی شخصیت پُراسرار سی تھی۔ مجھ سے بات کرنے کے بعد وہ تو گویا غائب ہی ہو گئے تھے۔ میں نے کئی بار ان کا سیل نمبر ٹرائی کیا تھا لیکن نمبر مسلسل آف جارہا تھا۔ مجھے تشویش بھی لاحق ہو رہی تھی کہ کہیں چودھری باسط نے ان کے ساتھ برا نہ کر دیا ہو۔

مکان میں اکیلے رہتے ہوئے مجھے وحشت سی ہو رہی تھی۔ یہ تو ایسے تھا کہ گویا میں قید کر دیا گیا ہوں اور میرا باہر کی دنیا سے رابطہ منقطع ہو گیا ہو۔ میرے ذہن پر ناامیدی، مایوسی اور بدگمانی نے یلغار کی ہوئی تھی۔ میں اس یلغار کو ذہن سے محو کرنے کے لیے اسپتال چلا گیا تھا۔ امی کی خیریت سے میرے دل کو تسلی ہوگئی تھی اور پھر میں رات نو بجے واپس آ گیا تھا۔

اُسی رات میں ڈنر کرنے کے بعد چینل سرچنگ میں مصروف تھا کہ ایک چینل پر بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔ ریموٹ پر میری انگلی رک گئی اور میں بریکنگ نیوز سننے لگا۔ وہ بریکنگ نیوز چودھری باسط کے متعلق تھی۔

نیوز اینکر نے نہ صرف چودھری باسط کا شجرۂ نسب بیان کیا بلکہ اس نے حیدر الماس کی بیوی نازنین عرف بلی اور چودھری باسط کی تصاویر آن ایئر کر دیں۔ اس کے بعد بار بار وہ تصاویر دکھائی جانے لگیں۔ یہ وہ تصاویر تھیں جو میں نے چودھری باسط کو بھیجی تھیں۔ میں حیران تھا کہ چینل والوں کو یہ تصاویر کس نے بھیجی ہیں۔ میں سُن ہو کر بیٹھا رہا۔

''یہ تصاویر کس نے بھیجی ہوں گی؟'' میں نے دل میں سوچا۔ حیدر الماس اگر یہ تصویریں میڈیا کو دیتے تو وہ مجھے ضرور بتاتے۔ اگر یہ تصویریں انہوں نے میڈیا کو نہیں دیں تو پھر کون ہو سکتا ہے جس نے چودھری باسط کو نیچا دکھانے کی کوشش کی ہے۔ جب مجھے کچھ سمجھ نہ آیا تو میں نے حیدر الماس کا نمبر ملایا لیکن ان کا نمبر بند جارہا تھا۔ میں نے سیل فون ٹیبل پر رکھا اور ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

چودھری باسط اور بلی کے حوالے سے خبر بار بار چل رہی تھی۔ میل نیوز اینکر بتا رہا تھا کہ ان کے نمائندے نے چودھری باسط سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا فون بند جارہا تھا۔ ظاہر ہے چودھری باسط ان تصاویر کے متعلق کیا جواب دے سکتا تھا اس لیے اس نے فون بند کر دیا ہو گا۔ اس کی پوری دنیا میں نہ صرف سبکی ہوگئی تھی بلکہ عوام کے سامنے اس کا مکروہ چہرہ بھی آ گیا تھا۔

وقت ایک سا نہیں رہتا۔ یہ عوامی نمائندے عوام کے ووٹ سے اسمبلی میں پہنچتے ہیں۔ ووٹ لینے کے لیے یہ لوگوں کے سامنے انتہائی نیک، بردبار، غم گسار، ہمدرد اور پارسا بن جاتے ہیں لیکن جب الیکشن جیت کر کامیاب ہو کر اسمبلی پہنچتے ہیں تو پھر مڑ کر اپنے ووٹر اور حلقے کی طرف نہیں دیکھتے۔ ووٹر کے دکھ سکھ میں شامل ہونے کے وعدے کر کے یہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ہماری سیاست کا یہی المیہ ہے۔ اپنے مطلب کے لیے یہ لوگ گدھے کو بھی باپ بنانے میں ایک لمحے کی دیر نہیں کرتے۔ کئی سیاستدان ایسے ہیں جن کے چہرے دامن اور ماضی سیاہ ہیں۔ جو منہ پر کچھ اور پیٹھ پیچھے کچھ ہوتے ہیں۔

چودھری باسط سے پہلے بھی کئی سیاستدانوں کے اصلی چہرے سامنے آئے ہیں۔ کسی کی اداؤں کی کرپشن سامنے آئی ہے، کسی کے کسی عورت سے تعلقات تھے، اس سے چھپ کر دوسری شادی کی ہوئی تھی لیکن بھانڈا پھوٹنے پر مانتے نہیں تھے اور انکاری ہو گئے تھے، کسی نے غریبوں کی زمینوں پر زبردستی قبضے کیے ہوئے تھے۔ غرضیکہ سیاست کے اس حمام میں تقریباً سب ہی ننگے تھے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ان سیاستدانوں نے غنڈوں کی فوج ظفر موج پال رکھی ہے۔ ان کے اشارۂ ابرو پر وہ کسی کو برباد کرنے یا کسی پر تشدد کرنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کرتے۔

میں نے ریموٹ سے چینلز بدل کر دیکھے تو چند اور چینلز پر بھی چودھری باسط اور بلی کی خبر اور ویڈیو چل رہی تھی۔ ابھی تو چودھری باسط کے خلاف صرف یہی ویڈیو وائرل ہوئی تھی اگر اس کے متعلق اینکرز کو یہ معلوم ہو جائے کہ نام نہاد سیاست دان چودھری باسط اور اس کا بیٹا شانی لڑکیوں کی اسمگلنگ کرنے والے گینگ سے منسلک ہیں تو سیاست میں ہلچل مچ جانی تھی۔ میرا دل کہتا تھا کہ ایک روز ایسا ضرور ہو گا۔ چودھری باسط کا مکروہ چہرہ عوام کے سامنے ضرور آئے گا۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ میرے سیل فون کی بیل گنگنانے لگی۔ میں نے اٹھا کر دیکھا تو اسکرین پر حیدر الماس

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کا نام تھا۔ میں نے جلدی سے کال ریسیو کر لی۔ ''السلام علیکم حیدر صاحب۔''

''وعلیکم السلام۔'' حیدر الماس کی پریشان کن آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''کیا تم نے چینل پر بریکنگ نیوز دیکھی ہے؟''

میں ان کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ ''جی ہاں.....''

''کیا تم نے میڈیا کو وہ تصویریں دی ہیں؟'' انہوں نے استفسار کیا تو میں چونک پڑا۔

''نہیں حیدر صاحب۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں نے تو کسی کو یہ نیوز نہیں دی۔'' میں حیران تھا کہ ان کا شک مجھ پر کیوں گیا ہے۔

''تو پھر کس نے دی ہوگی؟'' ان کے لہجے میں گمبھیرتا شامل تھی۔

''اوہو۔ یہ نیوز آپ نے نہیں دی؟'' میں حیران ہوا۔

''میں تو سمجھا تھا کہ آپ نے.....''

''نہیں۔'' انہوں نے میری بات قطع کی۔ ''ویڈیو میرے پاس موجود ہے۔ مجھے ایمرجنسی میں شہر سے جانا پڑا اور میں دو روز سے شہر سے باہر تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی واپس آیا ہوں تو یہ نیوز دیکھی۔ سمجھ نہیں آ رہا کہ میڈیا کو یہ نیوز مع تصاویر کس نے دی ہے۔''

وہ بھی الجھے ہوئے اور پریشان تھے حالانکہ انہیں تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ جو کام وہ کرنے جا رہے تھے وہ کسی اور نے کر دیا تھا لیکن ان کی پریشانی اور اضطراب میری سمجھ سے باہر تھا۔

''حیدر صاحب! آپ بھی تو یہی چاہتے تھے۔'' میں نے اپنے دل کی بات زبان پر لائی۔ ''آپ کریں یا کوئی اور.....اس سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے؟''

''فرق تو نہیں پڑتا لیکن.....خیر چھوڑو۔ میں پتا کروا لوں گا کہ اس سب کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔'' انہوں نے گویا بات سمیٹنے کی کوشش کی۔

''مجھے بھی بتائیے گا۔'' میں نے کہا۔

''ضرور.....'' وہ بولے۔ ''لیکن تم انتہائی محتاط رہنا اور گھر سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔ میری معلومات کے مطابق چودھری ساجد اور چودھری باسط کے کارندے تمہیں ہر جگہ تلاش کر رہے ہیں۔ شاید ان کا یہی خیال ہے کہ یہ نیوز میں نے یا تم نے میڈیا کو دی ہے۔''

''میں سمجھ گیا ہوں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''اور ہاں.....تم مجھے فون نہ کرنا۔ میں جانتا ہوں تم چودھری ساجد کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہو لیکن ابھی بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ چوہدری ساجد ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔ وہ جیسے ہی واپس آیا تو میں تمہیں فون کر دوں گا۔ اس کے بعد کوئی لائحہ عمل طے کریں گے۔''

''میں الجھن کا شکار ہوں حیدر صاحب۔'' میں نے اپنے دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے کہا۔

''کیوں الجھن کا شکار ہو؟'' حیدر الماس کے لہجے میں تجسس تھا۔

''میں آپ کے گینگ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا تو مجھے ریسیور میں سے حیدر الماس کی لمبی سانس خارج کرنے کی آواز سنائی دی۔

''ہمم۔'' پھر انہوں نے ہمکاری بھری اور بولے۔ ''میں نے تم سے اپنے گینگ کے بارے میں بات کی تھی۔ میرے گینگ کے بارے میں تمہارے ذہن میں یقیناً سوالات موجود ہوں گے اور ہونے بھی چاہئیں۔ اعتبار بہت اہم چیز ہے۔ تم نے مجھ پر اعتبار کیا ہے تمہارا شکریہ۔ میں نے اپنا گینگ غلط مقاصد کے لیے نہیں بنایا۔ میں ایک محب وطن پاکستانی ہوں اور اپنے ملک کو ناسوروں سے پاک کرنا چاہتا ہوں جو دیمک کی طرح میرے ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ چودھری ساجد اور چودھری باسط بھی ناسور ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ملک و قوم کی بیٹیوں کی اسمگلنگ کا دھندا کرتے ہیں۔ گو ان کی طرح لڑکیوں اور نوجوانوں کی اسمگلنگ کے مزید ریکٹ بھی کام کر رہے ہیں۔ ہم ان کا بھی کھوج لگانے کی کوشش کر رہے ہیں ہم اور وہ بھی ان شاء اللہ جلد قانون کی گرفت میں ہوں گے۔ تمہاری وجہ سے چودھری ساجد اور چودھری باسط کا لڑکیوں کی اسمگلنگ کا ریکٹ سامنے آیا ہے۔ اب ان لوگوں کا قلع قمع کرنے کے لیے میں بھی تمہارے ساتھ ہوں اور ان شاء اللہ ہم اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ میرے گینگ میں ایسے نوجوان ہیں جو میری طرح محب وطن ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ تمہاری شمولیت سے ہمارے گینگ کو تقویت ملے گی اور ہم جلد ہی تمہاری بہن اور دیگر لڑکیوں کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

وہ بے حد جذباتی ہو رہے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے ان کی باتوں میں سچائی جھلکتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے انہیں اپنا ساتھ ہونے کا یقین دلایا۔ ''میں آپ کے ساتھ

WaqarAzeem
Pakistanipoint

ہوں حیدر صاحب۔ مجھے آپ کے گینگ میں شامل ہو کر خوشی ہوگی۔''

''گڈ بوائے......'' ان کی ستائشی آواز سنائی دی۔''اچھا اب میں فون بند کر رہا ہوں۔ جیسا میں نے کہا ہے تم نے ویسا کرنا ہے۔ سمجھ گئے ہونا؟''

''جی حیدر صاحب۔'' میں نے جواباً کہا۔

''گڈ......''

میں نے انہیں مطمئن کر دیا کہ میں ان کی ہدایت پر عمل کروں گا۔ اس کے بعد انہوں نے امی کی طبیعت کے بارے میں دریافت کر کے کال منقطع کر دی۔ میرے ذہن پر ایک بار پھر حیدر الماس کے حوالے سے منفی سوچوں نے یلغار کر دی تھی۔ گو انہوں نے اپنے بارے میں کلیئر کر دیا تھا اور میں کسی حد تک مطمئن بھی ہو گیا تھا لیکن جب میرے ذہن میں تصاویر کا خیال آیا تو میں ایک بار پھر سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ منفی سوچیں میرے ذہن میں ڈیرہ ڈالنے لگی تھیں۔ کیا پتا میڈیا کو نیوز بمع تصاویر حیدر الماس نے دی ہوں اور میرے سامنے اقرار نہ کر رہے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنا مطلب نکل جانے پر مجھے چائے میں گری مکھی کی طرح تو نکال دیں اور میں ایک بار پھر دربدر ہونے پر مجبور ہو جاؤں۔ ''جو ہوگا دیکھا جائے گا'' یہ کہہ کر میں نے ان منفی سوچوں کو اپنے دماغ سے جھٹک دیا۔ شیطان تو دل میں وسوسے ڈالنے سے بھی باز نہیں آیا اور نہ ہی آئے گا۔ میں نے پہلے بھی حیدر الماس پر اعتبار کیا تھا اور مستقبل میں بھی کرنا تھا...کیونکہ میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

میں ریموٹ سے چینل سرچ کرنے لگا۔ اب تو سب چینلز پر چودھری باسط اور ببلی کے حوالے سے نیوز چل رہی تھی۔ آدھے گھنٹے کے بعد میں نے ٹی وی بند کیا اور اپنے کمرے میں جانے کی بجائے وہیں صوفے پر لیٹ گیا۔

صبح ناشتا کرنے کے بعد میں نے مرینہ کو کال کر کے امی کی طبیعت کے حوالے سے دریافت کیا۔ اس نے بتایا کہ امی کی طبیعت اب ٹھیک ہے لیکن وہ رنجیدہ، چپ اور غمگین تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اماں زلیخا سے پوچھا کہ کیا قریب میں کوئی بک اسٹال ہے تو انہوں نے بتایا کہ گلی کی نکڑ پر بک اسٹال موجود ہے۔ میں سر پر کیپ پہن کر گھر سے نکلا اور انتہائی محتاط انداز میں چلتا ہوا گلی کی نکڑ پر موجود بک اسٹال سے اخبار لے آیا۔

اخبار میں چودھری باسط اور ببلی کے حوالے سے نمایاں کوریج کے ساتھ خبریں شائع ہوئی تھیں۔ ان کی وہ تصویر بھی شائع ہوئی تھی جس میں چودھری باسط اور نازنین عرف ببلی نائٹ سوٹ میں ملبوس دروازے کے پاس کھڑے تھے۔ چودھری باسط کا بیان بھی شائع ہوا تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ اسے نیچا دکھانے اور الیکشن میں ہرانے کے لیے اس کے خلاف سازش کی گئی ہے۔ وہ تصویریں جعلی ہیں اور اسے پھنسانے کے لیے کمپیوٹر کی مدد سے ایڈیٹ کر کے بنائی گئی ہیں۔ اس کا بیان پڑھ کر میرے چہرے کا تلخ مسکراہٹ نے احاطہ کیا تھا۔

چودھری باسط کے بیٹے اور بیٹی کے بیانات بھی شائع ہوئے تھے، ساتھ ہی ان کی تصویریں بھی تھیں۔ شانی کے ساتھ شانزے کی تصویر دیکھ کر میں بے اختیار چونک پڑا۔ شانی اور شانزے دونوں ایک ساتھ کھڑے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ شانزے چودھری باسط کی بیٹی تھی۔ میں کئی منٹ تک ساکت و جامد حالت میں بیٹھا شانزے کی تصویر کو دیکھتا رہا۔ اس نے بھی اپنے بیان میں یہی کہا تھا کہ اس کا باپ بے قصور ہے۔ اس کے باپ کی سیاست تباہ کرنے اور اسے سیاست سے آؤٹ کرنے کے لیے سازش کی گئی ہے۔ شانی کا بھی کچھ ایسا ہی بیان تھا۔

میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شانزے، چودھری باسط کی بیٹی ہے۔ یہ انکشاف میرے لیے حیرت انگیز تھا۔ جب میں نے اسے شانی کے ساتھ دیکھا تھا تو میں یہی سمجھا تھا کہ وہ شانی کی رشتہ دار ہے۔ میرا قیاس غلط ثابت ہو گیا تھا اس لئے میرے منہ سے طویل سانس نکل گئی تھی۔

☆......☆

چودھری باسط اور نازنین عرف ببلی کے واقعہ کو تین روز گزر گئے تھے۔ ان تین دنوں میں، میں اخبار کا مطالعہ بھی دلجمعی سے کر رہا تھا۔ ساتھ ہی ٹی وی بھی دیکھ رہا تھا۔ میں ہر طرح سے باخبر رہنا چاہتا تھا۔ چودھری باسط کے متعلق ابھی تک نیوز نہ صرف متعدد نیوز چینل پر چل رہی تھی بلکہ اخبارات کی زینت بھی بن رہی تھی۔ نیوز کے مطابق اس کے خلاف انکوائری بھی ہو رہی تھی۔ انکوائری اس کے اثاثہ جات، اس کے کریکٹر اور رہن سہن کے حوالے سے ہو رہی تھی۔ ببلی کے بارے میں یہ نیوز تھی کہ وہ کہیں روپوش ہو گئی تھی۔ اس کا سیل فون بھی مسلسل آف جا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ باوجود کوشش کے اس سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ کہاں تھی

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس بارے میں حیدر الماس صاحب کا بیان بھی ایک بار اخبار میں شائع ہوا تھا۔ انہوں نے صرف یہی کہا تھا کہ وہ اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتے۔

مجھے اس سب سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مجھے اپنی بہن روزینہ کی فکر تھی۔ میں جلد از جلد چودھری ساجد تک پہنچ کر اس سے روزینہ کے بارے میں اگلوانا چاہتا تھا۔ حیدر الماس نے بتایا تھا کہ چودھری ساجد ملک سے باہر گیا ہوا ہے جیسے ہی وہ واپس آئے گا تو وہ مجھے اس کے بارے میں بتا دیں گے۔ ان کے کال نہ کرنے کی وجہ یہی تھی کہ ابھی تک چودھری ساجد ملک واپس نہیں آیا تھا۔ میں دن بہ دن بے چینی اور اضطراری کیفیت میں مبتلا ہوتا جا رہا تھا۔

اچانک میرے ذہن کے گوشے میں ایک خیال کوندے کی مانند لپکا۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں نے اسماعیل شاہد کے ساتھ مانگا پل جانا تھا تو انہوں نے بتایا تھا کہ انہوں نے اُس رات کی فلائٹ سے کسی دوسرے ملک جانا تھا۔ یہ بات کافی حد تک مماثلت رکھتی تھی۔ چودھری ساجد کا ملک سے باہر جانا، اسماعیل شاہد کا بھی ملک سے باہر جانا۔ گتھیاں سلجھنے کی بجائے اُلجھتی جا رہی تھیں۔ سوچتے سوچتے بالآخر یہ بات میرے ذہن میں پیدا ہوئی۔

''کیا اسماعیل شاہد صاحب ہی چودھری ساجد ہیں.....''

اس سے آگے میں سوچ نہ سکا۔ میں یقینی اور غیر یقینی کی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ اپنا شک دور کرنے اور خود کو پُرسکون کرنے کے لیے میں نے اسماعیل شاہد کو کال کی۔ چند سیکنڈ کے بعد ہی کمپیوٹرائزڈ آواز سنائی دی کہ آپ کا مطلوبہ نمبر بند ہے۔

اسماعیل شاہد صاحب کا نمبر بند تھا لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ ہی چودھری ساجد ہیں۔ یہ اتفاق بھی ہو سکتا تھا کہ چودھری ساجد اور اسماعیل شاہد دونوں ہی ملک سے باہر ہوں۔ میں اُلجھن میں مبتلا تھا اس لیے کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ حیدر الماس ہی مجھے اس اُلجھن سے باہر نکال سکتے تھے لیکن انہوں نے کہا تھا کہ جیسے ہی چودھری ساجد واپس آئے گا تو وہ مجھے بتائیں گے کہ وہ پُراسرار شخص کون ہے اور اس کا ٹھکانا کہاں ہے۔

ہفتے کی رات آٹھ بجے ڈنر کرنے کے بعد میں ٹی وی کے سامنے بیٹھا انٹرٹینمنٹ چینل سرچ کر رہا تھا۔ پھر جیسے ہی ..... میرے سامنے ایک نیوز چینل آیا تو اس پر بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔ میں چینل بدلنے ہی لگا تھا کہ حیدر الماس کا نام سن کر ریموٹ کا بٹن پریس کرتی میری انگلی رک گئی۔ فی میل اینکر حیدر الماس کے بارے میں بتا رہی تھی۔ ساتھ ہی بریکنگ نیوز بھی چل رہی تھی۔

''حیدر کمپنی کے اونر حیدر الماس پر قاتلانہ حملہ، گاڑی پر نامعلوم افراد کی فائرنگ، ڈرائیور جاں بحق جبکہ حیدر الماس شدید زخمی۔ ناظرین! ہم آپ کو بتاتے چلیں.....''

''اوہو۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا پھر میں توجہ سے نیوز سننے لگا۔ لیڈی نیوز اینکر بتا رہی تھی کہ حیدر الماس اپنے آفس سے گھر جا رہے تھے کہ نامعلوم افراد نے ان کی گاڑی پر فائرنگ کر دی۔ فائرنگ کے نتیجے میں ان کا ڈرائیور تو موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا جبکہ وہ خود شدید زخمی ہو گئے۔ انہیں دو گولیاں لگی ہیں۔ انہیں فوری طور پر سٹی اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔

میں پریشان سا ٹی وی کے سامنے بیٹھا تھا اور دل ہی دل میں ان کی زندگی کی دعائیں کر رہا تھا حالانکہ میرا ان سے کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ صرف انسانیت کا رشتہ تھا۔ میرے پاس ان کے کسی کارندے کا نمبر بھی نہیں تھا جس سے میں حیدر الماس کی کنڈیشن معلوم کر سکتا۔ آدھا گھنٹا گزرنے کے باوجود ٹی وی اینکر یہی بتا رہی تھی کہ ابھی تک حیدر الماس کی کنڈیشن خطرے میں ہے۔

میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ کوئی بات سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اچانک ٹہلتے ٹہلتے مجھے اماں زلیخا کا خیال آیا کہ شاید ان کے پاس حیدر الماس کے جاننے والے کا نمبر ہو۔ چناں چہ میں اماں زلیخا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

گھر میں، میں اور اماں زلیخا تھے۔ وہ مجھے باقاعدگی سے ناشتا، لنچ اور ڈنر دیا کرتی تھیں۔ وہ مجھ سے کام کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کرتی تھیں لیکن وہ دل کی بہت اچھی خاتون تھیں۔ میرا بھی بہت خیال رکھتی تھیں۔

میں نے ان کے کمرے کے دروازے پر دستک دی تو چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا اور اماں زلیخا دکھائی دیں۔

''کچھ چاہیے بیٹا؟'' انہوں نے استفسار کیا۔

''اماں! کیا آپ حیدر صاحب کے کسی قریبی عزیز کو جانتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔ کیا کوئی بات ہوئی ہے؟'' وہ متفکر ہوئیں۔

''ہاں۔ حیدر صاحب پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔'' میں نے کہا تو ان کا چہرہ فق ہو گیا۔

www.Iqbal Azeem
Pakistanipoint.com

''ہائے اللہ'' وہ سینے پر ہاتھ مارتی ہوئی پریشان کن لہجے میں بولیں۔ ''حیدر بیٹا تو ٹھیک ہے نا۔''

''مجھے نہیں معلوم۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں نے ان کی خیریت معلوم کرنی ہے لیکن میرے پاس ان کے کسی عزیز کا نمبر نہیں ہے۔ اگر آپ کے پاس.....''

''نہیں بیٹا، میرے پاس تو صرف حیدر بیٹے کا نمبر ہے۔'' وہ بولیں تو میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''ٹھیک ہے۔ آپ دروازہ بند کرلیں، میں اسپتال جارہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ٹھہرو بیٹا۔'' وہ بولیں اور مڑ کر اپنے بستر سے اپنا سیل فون اٹھا کر میرے پاس آگئیں۔ ''اس میں میرا نمبر محفوظ ہے۔ تم وہ لکھ لو۔ اسپتال جا کر حیدر بیٹا کی خیر خیریت معلوم کر کے مجھے بتا دینا۔ مجھے اس کی بہت فکر ہو رہی ہے۔''

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے ان سے سیل فون لیا اور ان کا نمبر نوٹ کر کے پھر گھر سے نکل آیا۔ اماں زلیخا، حیدر الماس کے لیے بہت فکر مند ہو رہی تھیں۔ شاید ان کا ان سے کوئی گہرا رشتہ تھا۔ میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن وقت کی قلت کے باعث یہ بات نہ پوچھ سکا۔ میں جانتا تھا کہ چودھری ساجد اور چودھری باسط کے کارندے مجھے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہے ہیں اور میں انہیں جیسے ہی کہیں نظر آگیا تو وہ مجھے چھاپ لیں گے، اسی لیے میں انتہائی احتیاط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

خون کو رگوں میں منجمد کرنے والی کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ میں نے سردی اور چودھری باسط کے کارندوں سے بچنے کے لیے اپر (Upper) پہنی ہوئی تھی اس لیے مطمئن تھا۔ میں اپر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سواری کی تاک میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھتا چلا جارہا تھا۔ سڑک پر کئی دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور کسی کسی جگہ چند لوگ بھی دکھائی دیئے جو آگ جلائے اس کے گرد دائرے کی صورت میں بیٹھے ہاتھ سینکنے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہے تھے۔ کسی نے میری طرف نہ دیکھا۔ سب اپنی اپنی دنیا میں مگن تھے۔

چوک پر مجھے ایک آٹو رکشا مل گیا۔ میں ڈرائیور کو کستی اسپتال پہنچانے کا کہہ کر سوار ہوگیا۔

آدھے گھنٹے کے اندر میں سٹی اسپتال کے باہر موجود تھا۔ آٹو رکشے سے اترنے کے بعد میں غائرانہ نظروں سے قرب و جوار کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں پولیس بھی موجود تھی اور مجھے چند ایسے افراد دکھائی دیئے جن پر گمان ہوتا تھا کہ وہ حیدر الماس کے کارندے ہیں جو انتہائی محتاط انداز میں اِدھر اُدھر پھیل کر کھڑے ہوئے تھے۔ میں مطمئن ہو کر اسپتال کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے اپر کی کیپ سر پر پہنی ہوئی تھی اس لیے میرا چہرہ تقریباً چھپ گیا تھا۔ اسپتال کے کوریڈور سے گزرتے ہوئے میں ایمرجنسی وارڈ میں داخل ہوا تو مجھے سامنے اسٹیل کے ایک بینچ پر بابر عرف جوکر بیٹھا دکھائی دیا۔ اسے وہاں دیکھ کر میں حیران ہوا۔ شاید اسپتال میں اس کا بھی کوئی عزیز داخل تھا۔ میں اس کے پاس جا کر بینچ پر بیٹھا تو اس نے بے اختیار چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرے پر کرب آمیز تاثرات چھائے ہوئے تھے۔

''بابر! تم یہاں، خیریت تو ہے نا۔'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

وہ بولا۔ ''ہاں، میرے انکل داخل ہیں یہاں۔''

''وہی انکل، جن کے پاس تم کام کرتے ہو۔''

''ہاں۔'' اس نے گردن ہلائی۔

''کیا ہوا ہے انہیں؟''

''ان پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔'' اس نے رسانیت سے کہا تو میں بے اختیار چونک پڑا۔

میرے دماغ میں فوراً حیدر الماس کا نام آگیا تاہم میں نے تصدیق کی خاطر پوچھا۔ ''کہیں تم حیدر الماس کی بات تو نہیں کر رہے؟''

اب کی بار چونکنے کی باری اس کی تھی۔ وہ حیران کن لہجے میں بولا۔ ''ہاں، کیا تم انہیں جانتے ہو؟''

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''حیدر صاحب کی کنڈیشن اب کیسی ہے؟''

''انکل ابھی ایمرجنسی میں ہیں۔'' جوکر نے جواب دیا۔ ''آدھے گھنٹے سے ان کا آپریشن ہو رہا ہے۔ ان کی سرجری بھی ہوگی۔ ڈاکٹر آئیں گے تو ان کی کنڈیشن کے بارے میں بتائیں گے۔''

''ہمم۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ان کو کتنی گولیاں لگی تھیں۔''

''ان کو دو گولیاں لگی تھیں۔ ایک گولی بازو کے اندر رہ گئی تھی جبکہ دوسری گولی ان کی گردن سے رگڑ کھا کر کار کی سیٹ میں دھنس گئی تھی اس لیے بچت ہوگئی۔''

میں دل ہی دل میں اللہ سے حیدر الماس کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگ رہا تھا۔ میں نے جوکر سے پوچھا کہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint

حیدر صاحب پر کس نے حملہ کروایا ہے لیکن اسے بھی معلوم نہیں تھا البتہ اس نے شک کا اظہار کیا تھا کہ حیدر صاحب پر حملہ چودھری باسط یا حیدر صاحب کی بیوی نازنین عرف بلی نے کروایا ہوگا کیونکہ حیدر صاحب کے ان دونوں سے اختلافات تھے۔ پولیس بھی حیدر صاحب کا بیان لینے کے لیے اسپتال میں موجود تھی۔ اخبار اور نیوز چینلز کے رپورٹرز بھی وہاں موجود تھے کیونکہ حیدر صاحب اپنے بزنس کی وجہ سے پورے ملک میں پہچانے جاتے تھے۔

کچھ دیر گزری تھی کہ ایمرجنسی کا دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر ڈاکٹر باہر آیا۔ ڈاکٹر کو دیکھ کر جوکر اور اخبارات و چینلز کے رپورٹران کی طرف بڑھے۔ میں بھی اٹھ کر اس طرف بڑھ گیا۔

سب ڈاکٹر صاحب سے حیدر صاحب کی کنڈیشن کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ حیدر صاحب کے بازو سے گولی نکال کر ان کی سرجری کر دی گئی ہے اور ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ یہ سن کر میں نے ایک طویل سانس لی۔ اللہ کا شکر ہے کہ ان کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ میں نے اماں زلیخا کو فون کر کے حیدر صاحب کی خیریت بتائی تو انہوں نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا۔

کچھ دیر کے بعد جب حیدر صاحب کو کمرے میں شفٹ کر دیا گیا۔ وہ ہوش میں تھے۔ رپورٹرز ان سے ملنا چاہتے تھے لیکن ڈاکٹر نے فی الحال ان سے زیادہ بات چیت کرنے سے منع کر دیا تھا۔ البتہ پولیس نے ان سے ان کا بیان لے لیا تھا۔ جب پولیس ان کا بیان لے رہی تھی تو میں اور جوکر بھی کمرے میں موجود تھے۔ حیدر الماس کے بازو اور گردن پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں لیکن ان کے چہرے پر کرب کا تاثر موجود نہیں تھا۔ وہ ہشاش بشاش اور مطمئن دکھائی دے رہے تھے۔ پولیس کے ایک آفیسر نے حیدر الماس سے ان کا بیان لیا کہ انہیں کس پر شک ہے تو انہوں نے صرف یہی کہا تھا کہ انہیں کچھ معلوم نہیں ہے کہ ان کی گاڑی پر کس نے فائرنگ کروائی ہے اور نہ ہی انہیں کسی پر شک ہے۔ میں حیران تھا کہ حیدر الماس نے چودھری باسط یا اپنی بیوی کے حوالے سے بات کیوں نہیں کی تھی۔ پولیس مزید چند سوالات کر کے وہاں سے چلی گئی۔ اب ان کے پاس میں اور جوکر رہ گئے تھے۔

حیدر الماس میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''علی! تم یہاں کیوں آئے ہو۔ جانتے ہو نا کہ چودھری باسط کے کارندے تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔ وہ یقیناً اسپتال کے باہر بھی موجود ہوں گے۔''

''آپ کی حالت کے بارے میں سن کر پریشان ہو گیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ چودھری باسط کا کوئی بھی کارندہ میری گرد کو نہ پا سکے گا۔''

''پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔'' انہوں نے ناصحانہ انداز میں تاکید کی۔

''آپ کے خیال کے مطابق آپ پر یہ حملہ کس نے کروایا ہوگا۔'' میں نے استفسار کیا۔ جوکر خاموش کھڑا ہماری گفتگو سن رہا تھا اور حیران بھی ہو رہا تھا۔

''دو ہی تو دشمن ہیں۔'' حیدر الماس خفیف سا مسکراتے ہوئے بولے۔ ''ہو سکتا ہے اس حملے میں دونوں ہی ملوث ہوں یا ایک بھی ہو سکتا ہے۔''

''تو آپ نے پولیس کو کیوں نہیں بتایا۔'' اچانک بابر عرف جوکر نے کہا تو حیدر الماس نے اس کی طرف دیکھا۔

''ہر کام جلد بازی میں نہیں کیا جاتا۔'' حیدر الماس ایک بار ناصحانہ انداز میں بولے۔ ''ابھی تو مجھے شک ہے، کنفرم نہیں ہوں اور نہ ہی میرے پاس کوئی ثبوت ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرا کوئی اور بھی خفیہ دشمن ہو۔''

''لیکن میرا دل کہتا ہے کہ آپ پر حملہ ان دونوں نے مل کر کرایا ہے۔'' بابر نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ جس نے بھی یہ کام کیا ہے وہ زیادہ دیر تک قانون کے شکنجے سے نہیں بچ سکے گا۔'' حیدر الماس بولے اور گفتگو کا رخ میری طرف موڑا۔ ''اس سے ملو، یہ علی ہے میرا دوست اور علی، یہ میرا بھتیجا ہے بابر۔''

''عرف جوکر۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو حیدر الماس حیران رہ گئے۔ میں نے ان کی حیرت دور کرتے ہوئے اپنی اور بابر کی دوستی کے حوالے سے بتایا تو وہ بھی مسکرا دیئے۔

''حیدر صاحب! پتا چلا کہ میڈیا کو تصویریں کس نے دی تھیں؟'' میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، لیکن جلد معلوم ہو جائے گا۔''

''آپ کو کس پر شک ہے؟'' میں ان کی رائے جاننی چاہی۔

''شک۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولے۔ ''مجھے شک ہے کہ یقیناً چودھری باسط کے کسی قریبی فرد کی حرکت ہے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اس نے اپنی پرخاش نکالنے کے لیے تصویریں میڈیا کو دی ہیں..... کیا یہ وہی تصویریں ہیں نا جو تم نے چودھری باسط کو بھجوائی تھیں؟"

"جی۔" میں نے جواباً کہا۔ میرے دل میں آیا کہ میں ان سے چودھری ساجد کے بارے میں پوچھوں اور اپنا خدشہ بھی ظاہر کروں لیکن پھر میں نے ارادہ ملتوی کر دیا... کیونکہ ابھی وہ زخمی تھے اور ان کی ٹریٹمنٹ ہو رہی تھی۔

"چودھری ساجد بھی ابھی تک ملک واپس نہیں آیا۔" حیدر الماس نے خود ہی موضوع چھیڑتے ہوئے کہا۔ شاید انہوں نے میرے دل کی بات جان لی تھی۔ "شاید اس کی آج یا کل واپسی متوقع ہے۔"

ہم باتیں کرنے میں مصروف تھے کہ ڈاکٹر نے آکر کہا کہ ہمیں مریض سے زیادہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ انہیں آرام کی ضرورت ہے۔ پھر ہم دونوں نے حیدر الماس سے اجازت چاہی اور انہیں جلد صحت یابی کی دعائیں دے کر باہر آ گئے۔ حیدر الماس نے ایک بار پھر مجھے سختی سے تلقین کی تھی کہ میں انتہائی احتیاط کے ساتھ واپس جاؤں۔

بابر عرف جوکر متجسس تھا کہ حیدر الماس نے مجھے محتاط رہنے کو کیوں کہا تھا۔ میری ان سے دوستی کیسے ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ باہر نکلتے ہی اس نے مجھ سے سوال کرنے شروع کر دیئے تھے۔ میں نے اسے صرف یہی بتایا کہ میں ان دنوں مشکلات میں گھرا ہوا ہوں اور حیدر الماس میری مدد کر رہے ہیں۔

"کیسی مشکل؟ کیا مجھے بتانا پسند نہیں کرو گے؟" جوکر تو ہاتھ منہ دھو کر میرے پیچھے ہی پڑ گیا تھا۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ اسے کیا بتاؤں۔ میں اس کے بارے میں جانتا تھا کہ جب تک اس کا تجسس دور نہیں ہوتا تھا اسے چین نہیں آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی اس عادت سے بعض اوقات میں چڑ سا جاتا تھا۔ میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ "یار بابر! مجھے دیر ہو رہی ہے اس لیے مجھے جانا ہے۔ پھر ملیں گے تو ساری اسٹوری بتا دوں گا۔"

"لیکن یار....." بابر کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"سمجھا کرو یار۔"

میں اس سے گلے ملا اور پھر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا راہداری کی طرف بڑھ گیا۔ راہداری مڑتے وقت میں نے بابر کی طرف دیکھا تو وہ دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے منہ پھاڑے حیرت بھرے انداز میں مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔

"ارے یار، میری بات تو سنو۔" اس نے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں نے ہاتھ سے اشارہ کر دیا کہ پھر ملیں گے۔

میں راہداریوں سے گزرتا ہوا ہال میں پہنچ گیا۔ ہال میں اسپتال میں داخل مریضوں کے عزیز و اقارب موجود تھے۔ اسپتال سے نکل کر پہلے میں نے قرب و جوار کا جائزہ لیا۔ ماحول پر کبیدگی چھائی ہوئی تھی۔ سب ویسے کا ویسا ہی تھا البتہ پولیس اور حیدر الماس کے کارندے موجود تھے۔ جس نے بھی مجھے دیکھا سرسری انداز میں دیکھا تھا۔ پھر میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس طرف بڑھ گیا جدھر پانچ چھ آٹو رکشے کھڑے تھے۔ چند ڈرائیور اپنے اپنے رکشوں میں بیٹھے تھے تو کچھ باہر کھڑے تھے۔ ایک آٹو رکشے کی طرف مجھے بڑھتے دیکھ کر ڈرائیور مستعد ہو گیا۔

میں نے آٹو رکشے میں سوار ہوتے ہی اسے فاروق پورہ چلنے کہا تو ڈرائیور نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی رکشا اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دیا۔ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

آٹو رکشا کچہری کے قریب ہی پہنچا تھا کہ اچانک ایک سیلون کار ہمارے رکشے کو کراس کرتی آگے جا کر سڑک کے کنارے رک گئی۔ اسی لمحے کار کے دروازے کھلے اور دو لحیم شحیم، قد آور نوجوان نکل کر سڑک پر آ گئے۔ دونوں ہاتھ بلند کر کے ڈرائیور کو رکشا روکنے کا اشارہ کرنے لگے۔ میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے غور سے دونوں شہدوں کی طرف دیکھنے کی کوشش کی لیکن مرکری بلبوں کی مدھم روشنی میں ان کے چہرے واضح دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے سامنے والے آئینے میں ڈرائیور کا چہرہ دیکھا تو وہ بھی خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔

"اوہ۔ لگتا ہے یہ ڈاکو ہیں۔" ڈرائیور نے سرسراتی آواز میں کہا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ مزید بولا۔ "اب کیا کروں؟ میں تو غریب آدمی ہوں۔ اگر انہوں نے مجھے بھی لوٹ لیا تو میں صبح بچوں کی فیس کیسے بھروں گا؟"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کیا جواب دوں۔ وہ واقعی ڈاکو تھے یا چودھری باسط کے کارندے تھے۔ چونکہ رکشا ان کے قریب پہنچ گیا تھا اس لیے بادل نخواستہ

ڈرائیور کو رکشا روکنا ہی پڑا۔

میں نے دیکھا، ایک کارندے نے سفید رنگ کی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی جبکہ دوسرا مہندی رنگ کی شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ دونوں نے سیاہ جیکٹیں بھی پہنی ہوئی تھیں۔ اپنے حلیوں سے وہ اچھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے اپنے وجود میں دوڑتے خون کی گردش تیز ہوتی محسوس ہوئی۔ ڈرائیور کی تو ویسے ہی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ وہ بدحواس ہو چکا تھا۔

وہ دونوں کارندے رکشے کے پاس آئے اور جھانک کر میری طرف دیکھنے لگے پھر ایک نے میرا بازو پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ کی گرفت قدرے سخت تھی۔ مجھے نہ ہی گھبراہٹ ہو رہی تھی اور نہ ہی ان سے کوئی خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ ان دونوں سے نمٹنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

''نیچے اتر۔'' وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے ترش سے لہجے میں بولا۔

''کیوں، کیا ہو گیا ہے؟'' میں حیران ہوا۔

''نیچے اتر، بتاتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا تو میں دوسرا سوال کیے بغیر خاموشی سے نیچے اتر آیا۔ ڈرائیور بدستور اپنی سیٹ پر براجمان تھا۔ وہ بھی ہراساں تھا۔ میرا بازو پکڑنے والے کارندے نے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔ ''چل نکل جا یہاں سے۔ جلدی کر ورنہ......''

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اس کی دھمکی پر ڈرائیور نے وہاں سے نکلنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہ کی۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ ان شہدوں کا ''ٹارگٹ'' وہ نہیں، میں تھا۔ میں نے اس کے دوسرے ساتھی کی طرف دیکھا تو وہ سیل فون کان سے لگائے کسی کو کال کر رہا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ دوسرے ساتھیوں کو بلا رہا ہے یا چودھری باسط کو خوش خبری دینا چاہتا ہے کہ اس کا مجرم دھر لیا گیا ہے۔

''کیا کوئی مسئلہ ہے؟'' میں نے نرمی سے استفسار کیا اور اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس نے میرا بازو نہ چھوڑا۔

''ہاں۔ تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔'' اس نے جواب دیا تو میں نے چونکنے کی اداکاری کی۔

''کیوں؟'' میں نے اس بار اپنے لہجے میں خوف کا عنصر شامل کیا۔ ''میں تو آپ کو جانتا تک نہیں، پھر میں آپ کے ساتھ کیوں جاؤں؟''

اس کے جواب دینے سے پہلے ہی اس کا ساتھی قریب آ گیا۔ وہ قدرے لمبے قد کا نوجوان تھا۔ وہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے بولا۔ ''چودھری صاحب کہہ رہے ہیں، اسے پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔''

''ہمم۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''چل بھئی ہمارے ساتھ۔ کار میں بیٹھ۔ چودھری صاحب تجھے یاد کر رہے ہیں۔''

پھر اس نے مجھے کھینچتے ہوئے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ''کون چودھری، میں کسی چودھری وودھری کو نہیں جانتا۔ میں کیوں جاؤں تمہارے ساتھ۔ چھوڑو میرا بازو۔''

انجان نہ بن، وہ چودھری صاحب کو اچھی طرح جانتا ہے۔'' اس کا لہجہ طنزیہ اور استفہامیہ تھا۔ یقیناً وہ چودھری باسط کی بات کر رہا ہے، پھر اس نے مجھ سے دریافت کیا۔ ''یہ بتا، تُو شرافت سے چلے گا ہمارے ساتھ یا ہم زبردستی لے چلیں؟''

میں نے اپنا بازو چھڑانے کی ایک بار پھر کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں جاؤں گا تمہارے ساتھ۔ چھوڑو میرا بازو۔''

''ٹھیک ہے۔ جیسی تیری مرضی۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''تُو شرافت کی زبان نہیں سمجھتا شاید۔ چل اب۔''

اس نے دوبارہ مجھے کھینچنے کی کوشش کی۔ میں ان کے ساتھ کسی صورت نہیں جانا چاہتا تھا۔ جانتا تھا چودھری باسط میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرے گا۔ ہو سکتا تھا وہ میری کھال اتار کر میرے زخموں پر نمک، مرچیں چھڑک دے۔ کراٹے استعمال کرنے کا وقت آن پہنچا تھا اس لیے میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کارندے کی ناک پر مکا جڑ دیا۔ اچانک ناک پر مکا لگنے کی وجہ سے وہ سنبھل نہ سکا اور اس کے حلق سے سسکاری نکل گئی۔ شاید اسے میرے اس طرح وار کرنے کی اُمید نہیں تھی۔ جیسے ہی اس نے میرا بازو چھوڑا تو میں نے اسے زور سے دھکا دے دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنے ساتھی سے ٹکرایا اور دونوں ہی زمین بوس ہو گئے۔

''آؤ لے چلو مجھے اپنے ساتھ۔ آؤ شاباش۔'' میں نے انہیں طیش دلاتے ہوئے کہا۔ ''میں دیکھتا ہوں تم مجھے کیسے اپنے ساتھ لے جاتے ہو۔''

دونوں جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے، پھر ناک پر مکا کھانے والا مجھے غلیظ گالیوں سے نوازتا ہوا وار کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ اس نے میرے چہرے پر جوابی مکا مارنے کی کوشش کی لیکن میں جھکائی دے گیا۔ اس طرح نہ صرف اس کا وار خالی گیا بلکہ میں نے اس کے پیٹ میں گھونسا جڑ بھی دیا۔ اس کے حلق سے ایک بار پھر سسکاری نکل گئی اور چہرے کی بناوٹ بھی کسی حد تک بگڑ گئی۔ وہ سیدھا ہونا ہی چاہتا تھا کہ میں نے کراٹے کا مخصوص اور بھرپور کہنی سے مارنے والا وار اس کی کمر پر کیا تو وہ ایک جھٹکے سے منہ کے بل سڑک پر گر گیا۔ میں نے اس کے دوسرے ساتھی کی طرف دیکھا تو وہ اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ کر شاید ریوالور نکال رہا تھا۔

میں جلدی سے اس کی طرف بڑھا، پھر اس نے جیسے ہی اپنا ہاتھ جیکٹ کی جیب سے باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ وہ ریوالور کا رخ میری طرف کرنے ہی والا تھا کہ میں نے پھرکی کی مانند گھومتے ہوئے اس کے ریوالور والے ہاتھ پر پیر مار دیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر اندھیرے میں کہیں جا گرا، پھر اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی میں نے اس کی ناک پر مکا جڑ دیا۔ یقیناً اس کا دماغ جھنجھنا گیا ہوگا کیونکہ اس کے حلق سے کربناک سسکاری نکل گئی تھی۔ وہ اپنے دائیں بازو کی آستین سے اپنے زخمی ناک سے نکلنے والے خون کو صاف کر رہا تھا کہ میں نے ایک اور رسید کر دی۔ کھڑی لات کھا کر وہ سڑک پر لمبا لیٹ گیا۔ شاید بے ہوش ہو چکا تھا۔

میں نے باری باری ان دونوں کو دیکھا۔ دونوں سڑک پر اِدھر اُدھر پڑے تھے۔ ان میں کون ہوش میں ہے کون بے ہوش یہ دیکھنے کی فرصت نہ تھی۔ میں نے ان دونوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اپنے چودھری کو میری طرف سے سلام دے دینا۔“

اتنا کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔ آگے چلتے ہوئے میں بار بار مڑ کر ان دونوں کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ وہ دونوں دوبارہ میرے پیچھے نہیں آئے تھے یا شاید ان میں ہمت نہیں رہی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ اگر میں نے کراٹے نہ سیکھے ہوتے تو پھر میں ان سے کیسے مقابلہ کرتا اور کیسے بچاؤ کرتا۔

میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ میں جلد از جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ چودھری باسط کے کارندے جب اسے میرے فرار کے بارے میں بتائیں گے تو وہ نہ صرف سیخ پا ہوگا بلکہ ہو سکتا ہے وہ مجھے پکڑنے کے لئے اپنے مزید کارندے بھیج دے اس لیے میرا وہاں سے نکل کر اپنے گھر پہنچنا بے حد ضروری تھا۔

فلائی اوور کے درمیان پہنچتے ہی میں نے سواری کے لیے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو مجھے فلائی اوور کے کونے میں ایک آٹو رکشا دکھائی دیا۔ میں جلدی سے اس کے پاس پہنچا۔ ڈرائیور رکشے کے اندر سیٹ پر چادر اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ میں اسے جگانا ہی چاہتا تھا کہ وہ شاید میری آہٹ پا گیا تھا اس لیے خود ہی جاگ گیا۔

”ہاں بولو۔“ ڈرائیور نے پوچھا۔

”چلو گے بھائی؟“ میں نے دریافت کیا۔

”نہیں بھائی۔“ اس نے نفی میں جواب دیا۔ ”آج سردی بہت پڑ رہی ہے اس لیے مجھے رکشا چلانے میں ہمت نہیں ہو رہی۔“

میں نے یخ بستگی سے ہونٹ بھینچ لیے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، پھر میں نے ڈرائیور سے کہا۔ ”یار، اگر چل پڑو تو میں تمہیں دگنا کرایہ دوں گا۔“

”نہیں بھائی۔ اگر تم تین گنا کرایہ بھی دے دو تو بھی میں نہیں جاؤں گا۔“ اس نے ہنوز انکار بھرے انداز میں کہا تو میں نے سوچا کہ اس سے بحث کرنا فضول ہے۔ نیند کس کو پیاری نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں کہ سولی پر بھی نیند آ جاتی ہے شاید اس لیے وہ دگنے کرائے کے لالچ میں اپنی نیند برباد نہیں کرنا چاہتا تھا چناں چہ میں نے اس سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور ایک بار پھر پیدل آگے بڑھنے لگا۔ میں نے تھوڑا سا فاصلہ ہی عبور کیا تھا کہ مجھے کسی گاڑی کی ہلکی سی آواز سنائی دی تو میں نے بے اختیار مڑ کر دیکھا تو ایک کار اس طرف آ رہی تھی۔ بے اختیار میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ شاید چودھری باسط کے کارندے ہیں جو میری تلاش میں اُسی طرف آ رہے ہیں۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر تیزی سے سڑک کراس کر کے ایک دکان کے باہر رکھے بینچ کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ کار مناسب رفتار سے دوڑتی ہوئی میرے سامنے سے گزر گئی۔ میں نے دیکھا، یہ وہی کار تھی اور اس میں چودھری باسط کے وہی کارندے سوار تھے جن کی میں نے درگت بنائی تھی۔

جب کار کافی دور جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں بینچ کی اوٹ سے نکل کر اسی طرف بڑھنے لگا جدھر کار گئی تھی۔ کلمہ چوک تک میں انتہائی محتاط ہو کر پہنچا تھا۔ اب میں ایک جگہ کھڑے ہو کر سوچ رہا تھا کہ میں اب کیا کروں اور

Waqar Azeem
Pakistanipoint

کیسے، گھر پہنچوں۔ کچھ دیر سوچنے اور کسی سواری کے نہ آنے کے بعد میں نے پیدل ہی آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ چناں چہ میں نے اللہ کا نام لیا اور پیدل ہی آگے بڑھنے لگا۔ اب اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ نواں شہر چوک پر پہنچتے ہی مجھے ایک آٹو رکشا مل گیا تھا۔

جب میں گھر پہنچا تو اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اماں زلیخا میرے انتظار میں جاگ رہی تھیں کیونکہ انہی نے دروازہ کھولا تھا۔ ان سے چند باتیں ہوئیں جو حیدر الماس کے حوالے سے تھیں۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور حیدر الماس کی صحت یابی کی دعائیں کرتی اپنے کمرے میں چلی گئیں تو میں بھی اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔

☆.....☆

اگلے روز رات نو بجے میں امی کی خیریت دریافت کرنے اسپتال میں تھا۔ امی کی ٹریٹمنٹ جاری تھی اور ڈاکٹر صاحب نے بتایا تھا کہ ابھی وہ کچھ عرصہ امی کو اسپتال میں رکھیں گے تاکہ ان کی حالت قدرے بہتر ہو جائے اور وہ نارمل زندگی گزاریں۔ میں مطمئن ہو گیا تھا کیونکہ امی کی حالت پہلے سے قدرے بہتر تھی۔ مرینہ کے ساتھ ایک میڈ بھی تھی۔ اس میڈ کا بندوبست بھی حیدر الماس نے کر دیا تھا۔ وہ خاصی عمر کی اور بھاری وجود کی عورت تھی۔ باہر کے سارے کام وہی کر رہی تھی۔ اس کا گھر کہیں پاس ہی تھا۔ صبح کا ناشتا، دوپہر اور رات کا کھانا بھی وہ اپنے گھر سے ہی پکا کر لے آتی تھی۔ جب میں جانے لگا تو مرینہ نے مجھ سے پوچھا۔

''بھائی! باجی کا کچھ پتا چلا؟''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں جواب دیا تو اس کے چہرے پر فکرمندی رینگ گئی۔

''آج بھی امی باجی کا پوچھ رہی تھیں۔'' اس نے مجھے اطلاع دی۔

''پھر..... تم نے کیا جواب دیا۔'' میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''یہی کہ آپ باجی کو تلاش کر رہے ہیں۔'' وہ بولی۔

''ہمم۔'' میں نے ہمکاری بھری اور پُریقین لہجے میں کہا۔ ''ان شاء اللہ، روزینہ کا بہت جلد پتا چل جائے گا۔ چودھری ساجد ملک سے باہر ہے۔ وہ جیسے ہی واپس آئے گا تو میں اس کے پاس پہنچ جاؤں گا اور اس سے روزینہ کے بارے میں معلوم کروں گا۔ ویسے اسماعیل شاہد بھی میری مدد کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ روزینہ کے بارے میں معلوم کر کے مجھے بتائیں گے۔''

مرینہ نے بھی ان شاء اللہ کہا پھر جیسے اچانک اسے کچھ یاد آیا تو وہ بولی۔ ''بھائی! وہ..... بڑے ماموں جان کا فون آیا تھا۔ شاید انہیں باجی کے اغوا کا پتا چل گیا ہے۔ وہ روزینہ باجی کا پوچھ رہے تھے۔''

اس کی بات پر میں بھی چونکا تھا۔ ''ہونہہ۔ بالآخر انہیں ہماری یاد آ ہی گئی۔'' میں نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔ مرینہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

میرے دو ماموں تھے۔ بڑے ماموں کا نام اسلم وحید تھا جبکہ چھوٹے ماموں کا ذیشان وحید۔ دونوں ماموں جلالپور میں رہتے تھے۔ بڑے ماموں کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بڑا بیٹا اور دونوں بیٹیاں شادی شدہ تھے جبکہ سب سے چھوٹا رئیس ابھی کنوارہ تھا۔

رئیس آوارہ گرد، بدقماش اور بری صحبت کا مارا لڑکا تھا۔ چوری اور ڈکیتی کے الزام میں وہ کئی بار جیل کی ہوا کھا چکا تھا لیکن ہر بار بچ نکلتا تھا اور اس نے کبھی ان غلط کاموں سے توبہ تائب نہیں کی تھی۔ ماموں نے اس کے لیے روزینہ کا رشتہ مانگا تھا۔ امی تو بھائی کی وجہ سے نیم رضامند تھیں لیکن میں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں اپنی بہن ایک آوارہ اور بدقماش کو سونپ دوں۔ بس اسی روز سے ماموں اسلم نے ہم سے سارے رشتے ناطے توڑ دیئے تھے اور آج دو سال گزرنے کے بعد مرینہ سے رابطہ کیا تھا۔

چھوٹے ماموں ذیشان وحید جو امی سے چار سال چھوٹے تھے وہ سعودی عرب میں ہوتے تھے۔ وہ کم گو اور کام سے کام رکھنے والے انسان تھے۔ وہ بھی شادی شدہ تھے لیکن ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ان کے سعودی عرب میں ہونے کی وجہ سے ان کی بیوی میکے میں ہی رہتی تھی۔

مرینہ مزید بولی۔ ''آپ کا فون بند تھا اس لیے انہوں نے میرے نمبر پر رابطہ کیا تھا۔ وہ..... آنا چاہ رہے تھے لیکن میں نے انہیں منع کر دیا۔ میں نے کہا کہ امی اسپتال میں داخل ہیں اور اگر بھائی اجازت دیں گے تو وہ مل سکتے ہیں۔''

''ان کا دوبارہ فون آئے تو کہہ دینا کہ وہ امی سے مل سکتے ہیں۔'' میں نے نرم خوئی سے کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ جس طرح کا رویہ انہوں نے ہمارے ساتھ روا رکھا میں بھی ایسا رویہ اختیار کروں۔ آخر ان میں اور ہم میں فرق تو ہونا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

چاہیے۔''

''ٹھیک ہے بھائی۔'' مرینہ نے اثبات میں گردن ہلا دی، پھر اس سے چند مزید باتیں کرنے کے بعد میں اسپتال سے باہر نکل آیا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے اپر پہنی ہوئی تھی اور اسپتال سے نکلنے سے پہلے میں نے اس کی کیپ سر پر پہن لی تھی تاکہ اگر میرے دشمنوں کا کوئی کارندہ مجھے تلاش کر رہا ہو تو وہ مجھے بہ آسانی پہچان نہ سکے۔

جب میں اسپتال سے نکلا تھا تو اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ سرکاری اسپتال کے علاوہ پرائیویٹ اسپتالوں اور میڈیکل اسٹورز کی بھرمار تھی۔ دکانوں پر چوبیس گھنٹے لوگوں کا جمگھٹا سا لگا رہتا تھا۔ سامنے کئی ہوٹل بھی تھے جہاں آلو کے پراٹھے بہت مشہور تھے۔ رات گئے نوجوان وہاں صرف آلو کے پراٹھے ہی کھانے کے لیے آتے تھے۔ ساتھ ہی اچار بھی ہوتا تھا جس سے پراٹھوں کا مزہ دوبالا ہو جاتا تھا۔ یہ ملتان کی خاص روایت بن چکی تھی اور قرب و جوار کے علاوہ دور دور سے بھی لوگ کھینچے چلے آتے تھے۔ میں بھی کئی بار اپنے دوستوں کے ساتھ یہاں آچکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت وہاں خاصا رش تھا۔ مجھے بھی خیال آیا کہ کیوں نہ آلو کے پراٹھے کھاؤں۔ حالانکہ میں اسپتال آنے سے پہلے ڈنر کر کے آیا تھا لیکن آلو کے پراٹھوں کا سوچ کر میرا جی بھی للچایا تھا چنانچہ میں مڑ کر ایک آلو پراٹھے والی دکان کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں جتنے بھی آلو پراٹھے بنانے والے موجود تھے ان کی باقاعدہ کوئی دکان نہیں تھی۔ ان سب نے سڑک کے کنارے ہی میڈیکل اسٹورز کے سامنے اپنی اپنی دکانیں سجائی ہوئی تھیں۔

آلو کے پراٹھے کھانے کے بعد میں آٹو رکشا میں بیٹھ کر جانے کی بجائے پیدل ہی چل پڑا۔ چوک سے پہلے ایک ہوٹل تھا۔ وہ ہوٹل کافی پرانا تھا لیکن اس کی سیٹنگ تبدیل کر دی گئی تھی۔ زمانہ طالب علمی میں، میں بھی دو بار فنکشنز کے سلسلے میں اس ہوٹل میں جا چکا تھا۔ میں اس ہوٹل سے قدرے فاصلے پر موجود تھا کہ مجھے ہوٹل کے جہازی سائز گیٹ کو کراس کرتی ایک جیپ دکھائی دی۔ وہ جیپ بلاشبہ چودھری باسط کی تھی اور شانی کے استعمال میں رہتی تھی۔ میں جلدی سے ہوٹل کی دیوار سے متصل شاپ کی آڑ میں ہو گیا۔ میں سوچنے لگا کہ اس جیپ میں کون ہو سکتا ہے۔ کیا چودھری باسط یا شانی.....

جیپ ہوٹل کی پارکنگ میں داخل ہو چکی تھی۔ چونکہ میں فاصلے پر موجود تھا اس لیے جیپ میں سوار افراد مجھے دکھائی نہیں دیئے تھے۔ عین اسی لمحے دوسری جانب کھڑی گرے کلر کی ایک کار بھی ہوٹل میں داخل ہوئی۔ میں جلدی سے شاپ کی آڑ سے نکل کر ہوٹل کے گیٹ کے قریب پہنچ کر ایک آڑ میں کھڑا ہو گیا اور پارکنگ میں دیکھنے لگا۔ جیپ کے دروازے بدستور بند تھے اور گرے کلر والی کار اس کے قریب ہی رکی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ عین اسی لمحے کار کے دروازے کھلے اور چار افراد باہر نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔ اسی لمحے جیپ کے دروازے کھلے اور سب سے پہلے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شانی بڑے طمطراق سے نیچے اترا۔ اس کے بعد پچھلا دروازہ کھلا اور جو شخص اترا اسے دیکھ کر میں حیرت سے گویا اچھل ہی پڑا۔ وہ میرے باس اسماعیل شاہد تھے۔ اسی لمحے دوسری طرف سے چودھری باسط بھی نکل کر آگیا اور وہ تینوں ایک ساتھ ہوٹل کے اندرونی حصے کی طرف بڑھتے چلے گئے جبکہ وہ چاروں مسلح افراد وہیں کھڑے رہے تھے۔

اسماعیل شاہد، چودھری باسط اور شانی تینوں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ وہ تینوں ایسے گھلے ملے ہوئے تھے جیسے ان کے پرانے مراسم ہوں۔ میں حیران بھی تھا اور پریشان بھی۔ اسماعیل شاہد کا چودھری باسط کے ساتھ دیکھا جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ دونوں پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

یہ تو میں جانتا تھا کہ اسماعیل شاہد کی بیٹی عذرا چودھری باسط کی بیٹی شانزے کی فرینڈ تھی لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ دونوں کے ڈیڈ بھی دوست تھے بلکہ بہت ہی گہرے دوست تھے۔ میرے دماغ میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ اسماعیل شاہد چودھری باسط نہیں ہیں، وہ چودھری باسط کے قریبی ہیں تو وہ یقیناً چودھری ساجد کے بارے میں بھی جانتے ہوں گے۔

گھر پہنچنے تک میرے ذہن میں یہی باتیں گونجتی رہیں۔ گھر پہنچتے ہی اپنے کمرے میں آگیا۔ بستر پر نیم دراز ہوتے ہی میری سوچوں کا محور اسماعیل شاہد اور چودھری باسط کی طرف ہو گیا۔ آخر ان دونوں میں کیا رشتہ ہے اور ان کے بارے میں کس سے معلوم ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں میں یہ سوچ کر بھی پریشان ہو گیا تھا کہ چند روز پہلے مانگا پل پر ہونے والے واقعہ کا کیا مطلب تھا۔ کیا وہ ڈراما تھا۔ کیا اسماعیل شاہد نے مجھے بہلانے کے لیے یہ ڈراما کیا تھا۔ کیا واقعی ان کا تعلق خفیہ ایجنسی سے ہے۔ میں الجھ گیا تھا۔ اچانک

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

مجھے شانزے کا خیال آیا۔ مجھے معلوم تو ہو چکا تھا کہ شانزے، چودھری باسط کی بیٹی اور شانی کی بہن ہے لیکن شانزے کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میری بہن روزینہ کے اغوا میں اس کا باپ اور بھائی ملوث ہیں۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے اٹھ کر الماری سے دوسرا سیل فون نکالا اور بیڈ پر بیٹھ کر اسے آن کر دیا۔ جیسے ہی سیل فون آن ہوا تو میسج پر میسج آنے لگے۔ کچھ میسج تو سم کمپنی کے تھے اور آٹھ دس میسج شانزے کے تھے۔ میرا سیل فون بند ہونے کی وجہ سے وہ یقیناً پریشان اور بے چین تھی اس لیے اس نے میسج کیے تھے۔ اس کے میسج پڑھ کر مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اس کے نمبر ڈائل کیے اور رابطہ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ چھٹی، ساتویں بیل پر اس نے کال ریسیو کر لی۔

''ہیلو علی۔ کیسے ہو اور اتنے دنوں سے کہاں ہو؟'' اس کا لہجہ مدھم لیکن بے چین تھا۔ ''تمہارا سیل بھی مسلسل آف جا رہا تھا۔ تم ٹھیک تو ہو نا؟''

مجھے اس کے سوالوں سے کوفت ہوئی۔ تاہم میں نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے لہجے کو خوشگوار رکھ کر جواب دیا۔ ''میں ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں لیکن.....'' وہ بولتے بولتے رک گئی۔

''لیکن کیا.....؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔

''تم سے بات نہیں ہو رہی تھی اس لیے میں اداس تھی اور پریشان تھی۔ مجھے تمہاری فکر تھی۔'' اس نے وجہ بتائی اور لاڈ بھرے لہجے میں بولی۔ ''بندہ کم سے کم ایک کال ہی کر لیتا ہے۔''

''سوری شانزے۔'' میں معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ ''دراصل میں بہت بزی تھا اس لیے.....''

''فون آف کیوں تھا؟'' اس نے میری بات کاٹی۔

مجھے کوئی بہانہ نہیں مل رہا تھا لیکن سوچتے ہوئے ایک بہانہ بالآخر میرے ذہن میں آ ہی گیا۔ ''وہ دراصل..... میرا سیل فون کہیں گر گیا تھا اس لیے فون آف تھا۔''

''اوہو۔'' وہ چونکی۔ ''کیسے گر گیا؟''

''بس گر گیا۔'' میں بیزار ہوا۔

''اٹس اوکے۔ لیکن اب اپنا فون آف مت کرنا ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔'' وہ لاڈ بھرے لہجے میں بولی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' میں نے اس کا دل رکھنے کی خاطر کہا۔ ''اور سناؤ..... کیا چل رہا ہے آج کل؟''

''کچھ خاص نہیں۔'' وہ اداس لہجے میں بولی۔

''تمہاری فرینڈ کیسی ہے؟'' میں نے عذرا کے بارے میں دریافت کیا۔

''میری فرینڈ؟ کون سی فرینڈ۔ ماریہ یا عذرا؟'' وہ حیرت سے گویا ہوئی۔

''عذرا..... میرے باس اسماعیل شاہد کی بیٹی۔'' میں نے جواب دیا۔

''وہ ٹھیک ہے۔ لیکن تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟'' اس کا لہجہ متجسس تھا لیکن لہجے میں جلن کی رمق بھی تھی۔ ''خیریت تو ہے نا.....؟''

''ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔'' میں نے جواب دیا اور اصل مدعے کی طرف آیا۔ ''کیا تمہارے ڈیڈ اور میرے باس بھی آپس میں دوست ہیں؟''

''ہاں۔'' اس نے ہاں کو لمبا کھینچتے ہوئے کہا۔ ''وہ دونوں تو بہت پرانے دوست ہیں۔ بلکہ یوں سمجھ لو کہ ہمارے ان کے ساتھ گھریلو مراسم ہیں۔''

''ہمم۔'' میں نے ہنکاری بھری۔ ''تمہارے ڈیڈ وہی ہیں نا جن پر ایک عورت سے.....''

اس نے فوراً میری بات کاٹی اور پُرجوش ہو کر بولی۔ ''یہ سب جھوٹ ہے، بکواس ہے۔ میرے پاپا ایسے ہرگز نہیں ہو سکتے۔ کسی نے ان کی جعلی تصویریں بنائی ہیں۔ انہیں بدنام کرنے کی یہ بھونڈی سازش ہے۔ ان کے مخالفین انہیں سیاست سے آؤٹ کرنا چاہتے ہیں۔ تم تو جانتے ہو گے کہ آج کل کمپیوٹر اور جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے کیا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ چہرے، جسم بدلے جا سکتے ہیں، آوازیں بدلی جا سکتی ہیں۔ میرے پاپا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔''

ظاہر ہے چودھری باسط اس کا باپ تھا۔ اس نے اپنے باپ کی سائیڈ ہی لینی تھی اور اس کے حق میں ہی بولنا تھا۔ میرا دل کیا کہ میں اسے اس کے باپ اور بھائی شانی کا سیاہ چہرہ دکھا دوں لیکن کوئی فائدہ نہیں تھا۔ شاید وہ یقین ہی نہ کرتی تاہم میں نے کہا۔ ''شانزے! ضروری نہیں ہے جو جیسا دکھتا ہو وہ اندر سے بھی ویسا ہی ہو۔''

شاید شانزے میری بات سن کر ٹھٹکی تھی، حیرت بھرے لہجے میں بولی۔ ''کیا مطلب۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو علی؟ یہی کہ میرے پاپا کی جو تصویریں چینل پر آن ایئر ہوئی ہیں، اخبارات میں شائع ہوئی ہیں وہ فیک نہیں ہیں؟''

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

میں اس کے جذباتی پن سے متاثر ہوئے بغیر بولا۔ ''میں نے یہ تو نہیں کہا۔''

''لیکن تمہاری بات کا مطلب تو یہی ہے نا۔'' شانزے رسانیت سے بولی۔ ''شاید تم بھی میرے ڈیڈ کو برا سمجھ رہے ہو۔ وہ ایسے بالکل بھی نہیں ہیں۔ وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ غریبوں کے ہمدرد، ان کا احساس کرنے والے۔''

میں اندر ہی اندر طنزیہ ہنسا اور بات سمیٹتے ہوئے بولا۔ ''شانزے! کیوں اپنا دل اور خون جلا رہی ہو۔ اس دنیا میں کئی ایسے انسان پائے جاتے ہیں جن کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ ہوتا ہے۔ تمہارے ڈیڈ کی ویڈیو فیک ہے یا نہیں، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ وقت ثابت کردے گا کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے۔ وقت بہت بڑا قانون ہے اور کبھی بے انصافی نہیں کرتا۔''

''ہاں۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' وہ متاثر کن لہجے میں بولی۔

''تصویریں کس نے میڈیا تک پہنچائی ہیں، اس بارے میں کچھ پتا چلا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے نفی میں جواب دیا۔ ''ڈیڈ اسے تلاش کررہے ہیں۔ وہ جو کوئی بھی ہے میرے ڈیڈ کے ہاتھوں سے بچ نہیں سکے گا۔ ڈیڈ کی بہت اونچی پہنچ ہے۔ وہ اسے تلاش کرہی لیں گے۔''

''ہمم۔'' میں نے ہمکاری بھری۔ ''اچھا میں فون رکھ رہا ہوں۔ ایک ضروری کال آرہی ہے۔ پھر بات کروں گا۔''

''کب؟'' وہ جلدی سے بولی۔

''جلد..... اوکے، گڈ بائے۔''

اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتی میں نے کال منقطع کردی اور سیل فون بیڈ پر پھینک کر گہری سانس لیتے ہوئے ہیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی۔ شانزے اپنے باپ کے حوالے سے بہت جذباتی ہورہی تھی۔ وہ اس کے خلاف ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی تھی۔ ظاہر ہے وہ بیٹی تھی اور کوئی بھی بیٹی اپنے باپ کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرسکتی۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب اس کے باپ اور بھائی شانی کے سیاہ چہرے اس کے سامنے آئیں گے..... یا جب اسے یہ پتا چلے گا کہ وہ لڑکیوں کی اسمگلنگ کرنے والے گینگ سے وابستہ ہیں تو اس کی کیا حالت ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے باپ اور بھائی کی شکلیں تک دیکھنا گوارا نہ کرے۔ یہ میرا قیاس تھا۔ ہوسکتا ہے وہ صرف نظر کرجائے۔

اچانک بیرونی دروازے پر زور زور سے ہونے والی دستک نے میری سوچ کو منتشر کردیا اور میں بے اختیار چونک پڑا۔ دروازہ ایسے زور زور سے دھڑ دھڑایا جارہا تھا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ مجھے یاد ہے جس روز سے میں اس گھر میں رہ رہا تھا ایک بار بھی کسی نے اس انداز میں دروازہ نہیں دھڑ دھڑایا تھا بلکہ کسی نے ہلکی سی دستک تک نہیں دی تھی۔ اماں زلیخا کے پاس تالے کی چابی ہوتی تھی۔ وہ باہر جانے اور واپس آنے کے لیے وہی استعمال کرتی تھیں۔ وہ بتاتی تھیں کہ حیدر الماس بھی کم کم ہی آتے تھے۔

یکلخت مجھے انجانے خطرے کی بُو محسوس ہونے لگی۔ میری چھٹی حس بے دار ہوگئی اور دماغ میں وسوسے سر ابھارنے لگے۔ میں اچھل کر بستر سے اترا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ مسلسل دھڑ دھڑایا جارہا تھا۔ اسی لمحے اماں زلیخا کی آواز سنائی دی تو میں دروازے پر رک گیا۔

''کون ہے کمبخت۔ کیا دروازہ توڑنا چاہتے ہو؟'' اماں زلیخا کے لہجے میں بیزاریت کے ساتھ ساتھ غیظ بھی نمایاں تھا۔

''دروازہ کھولو بڑھیا۔'' باہر سے ایک تیز مگر مردانہ آواز سنائی دی تو میرے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑنے لگی۔

''پہلے بتاؤ، کون ہو تم؟ اور کیا چاہتے ہو؟'' اماں زلیخا نے پوچھا۔ اس بار ان کے لہجے میں حیرت اور خوف کا ملا جلا عنصر شامل تھا۔

''بڑھیا! تم دروازہ کھولتی ہو یا میں توڑ دوں؟'' اس بار اس نے اماں زلیخا کو گھرکا۔

''دروازہ کیوں توڑو گے۔ کیا تمہارے باپ کا راج ہے؟'' اماں زلیخا نے دو بہ دو جواب دیتے ہوئے کہا تو پُرخطر ماحول ہونے کے باوجود میرے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''بڑھیا! تم دروازہ کھولتی ہو یا نہیں؟ آخری بار پوچھ رہا ہوں۔ ورنہ میں یہ دروازہ توڑ دوں گا۔'' اس بار تحکم اور دھمکی آمیز لہجے میں پوچھا گیا تو میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

''جب تک اپنے بارے میں نہیں بتاؤ گے دروازہ نہیں کھولوں گی۔'' اماں زلیخا بھی ضد پر آگئیں۔

''ہمم۔'' اس نے ہمکاری بھری۔ ''گویا تم دروازہ نہیں کھولو گی۔''

میرا دماغ سائیں سائیں کررہا تھا۔ یہ یقیناً چودھری باسط کے کارندے تھے جنہوں نے اس مکان میں میری

WaqarAzeem
Pakistanipoint.com

موجودگی معلوم کرلی تھی۔ لیکن کیسے؟ یہ سوچنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں نے مڑ کر جلدی سے آگے بڑھ کر اپنے سیل فون اور والٹ جیبوں میں ٹھونسے اور کمرے سے باہر نکل کر ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگا۔ اماں زلیخا اسے جواب دینے کی بجائے ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ ان کا چہرہ بھی دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں خوف سمٹا ہوا تھا۔

''بیٹا! نجانے یہ کون لوگ ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ اگر میں نے دروازہ نہ کھولا تو یہ اسے توڑ دیں گے۔'' اماں زلیخا نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ان کے لہجے میں بے بسی کا عنصر بھی شامل تھا۔

''اماں! یہ لوگ یقیناً میرے لیے آئے ہیں۔ وہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ آپ یہ بتائیں، کیا یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی خفیہ راستہ ہے؟'' میں نے جواب دیتے ہوئے پوچھا تو اماں اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔

''نہیں بیٹا۔ اس گھر میں تو کوئی خفیہ راستہ نہیں ہے۔'' اماں زلیخا نے کہا تو میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ ایک چھوٹا سا گھر تھا جسے چاروں طرف سے بند کیا گیا تھا۔ نجانے آنے والے کتنے لوگ تھے؟ ان کے کیا ارادے تھے؟ مجھے اندازہ نہیں تھا البتہ یہ بات میرے ذہن میں گردش کر رہی تھی کہ میں خطرے میں گھر گیا ہوں اور میرے فرار کے راستے مسدود ہو گئے ہیں۔ میں خود کو ایک جال میں قید محسوس کرنے لگا۔ دروازہ مسلسل دھڑ دھڑایا جا رہا تھا اور کسی بھی لمحے اسے توڑ کر وہ اندر آ سکتے تھے۔ مجھے فرار کی کوئی راہ دکھائی نہ دے رہی تھی۔

میرے دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ شاید آندھیوں نے میرے دماغ میں بسیرا کر لیا تھا۔ میرے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے میرا دماغ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے محروم ہو گیا ہو۔ وہاں سے فرار ہونے کے سارے راستے مسدود ہو چکے تھے۔ میرے پاس اسلحہ نہیں تھا کہ میں ان سے مقابلہ کرتا۔

میں ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ آخری وقت تک لڑنا چاہتا تھا اسی لیے میں ایک جھٹکے سے مڑ کر تیزی سے اپنے کمرے میں آیا اور غائرانہ نظروں سے جائزہ لینے لگا۔ کمرے کی ایک کھڑکی باہر گلی کی طرف کھلتی تھی۔ وہ کھڑکی بند تھی۔ ان دنوں میں مجھے کھڑکی کھولنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر کھڑکی کھولی تو موٹی موٹی سلاخیں دیکھ کر ہونٹ بھینچ لیے۔

میں نے کھڑکی کے پٹ بند کیے اور مڑ کر اماں زلیخا کی طرف دیکھنے لگا جو دروازے کی دہلیز پر کھڑی تھیں۔ ان کے چہرے پر بھی ہراسیت، خوف اور دہشت پھیلی ہوئی تھی۔

''بیٹا! اب کیا کرو گے؟'' اماں زلیخا نے پریشان کن لہجے میں پوچھا۔

''میں کچھ کرتا ہوں۔'' میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ دروازے پر ٹھوکریں ماری جا رہی تھیں۔ شاید وہ دروازہ توڑ رہے تھے۔

اچانک میری نظر بیڈ کی چادر پر پڑی تو ایک خیال جھماکے کی طرح میرے ذہن میں کوندا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے آگے بڑھ کر بیڈ پر بچھی چادر اٹھائی اور دوڑتا ہوا کمرے سے نکل کر چھت کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اچانک ہی میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ اگر میں چھت سے چادر کی رسی بنا کر اس کی مدد سے نیچے لٹک کر کود جاؤں تو اپنی جان بچا سکتا ہوں۔ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ ہو سکتا ہے میرا آئیڈیا کامیاب ہو جائے۔ باقی جو اللہ کو منظور۔ ہونا تو وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوگا۔ اللہ تعالیٰ بھی فرماتا ہے کہ کوشش تم کرو مدد میں کروں گا۔

چھت پر پہنچ کر میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ چھت پر ٹوٹی پھوٹی اور سانحوردہ چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک طرف اینٹوں کا ڈھیر تھا۔ دیواریں سیمنٹ اور ریت سے تعمیر کی گئی تھیں جو کافی مضبوط دکھائی دے رہی تھیں۔ دیواریں زیادہ بلند نہ تھیں اور ان میں ہوا کے گزرنے کے لیے ہر ایک فٹ کے بعد ایک ایک اینٹ کا سوراخ رکھا گیا تھا۔

میں نے دیوار سے نیچے جھانک کر دیکھا تو میرے اندازے کے مطابق چھت سے گلی کی زمین تک کا فاصلہ بیس فٹ تھا۔ اگر میں چھت سے چھلانگ لگا دیتا تو گمان تھا کہ ٹانگیں تو نہیں ٹوٹ سکتی تھیں البتہ میں زخمی ہو سکتا تھا بلکہ ممکن تھا کہ ٹانگ ٹوٹ بھی جائے۔ دروازہ توڑنے کی آوازیں چھت پر بھی مجھے سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے دانتوں کے ذریعے چادر کو پھاڑ کر تین حصوں میں تقسیم کیا اور باری باری تینوں حصوں کو گانٹھیں لگا کر ایک ''رسی'' بنالی۔ رسی کی لمبائی ستی تھی اسے ناپنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا لیکن اتنا اندازہ ضرور تھا کہ اس کی لمبائی کم از کم پندرہ، سولہ فٹ ضرور تھی پھر میں نے اس کا ایک سرا اینٹوں کے درمیان سوراخ میں باندھا اور دوسرا سرا گلی میں پھینک دیا، پھر میں نے دیوار ہلا کر اس کی مضبوطی چیک کی۔

دیوار مضبوط تھی اور مجھے اُمید تھی کہ وہ میرا وجود

Waqar Azeem
Pakistanipoint

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
ایک ادارہ، چار ماہانہ مطبوعات
بھر میں
اور مصنوعات
موثر تشہیر کے لیے
جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
عالمی ادب سے شاہکار کہانیوں، افسانوں اور معلومات کے خزانوں کا انتخاب
جنہیں ہر براعظم کے لاکھوں قارئین ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں
جاسوسی ڈائجسٹ
پاکیزہ
سرگزشت
جہاں جہاں اردو پڑھی اور سمجھی جاتی ہے وہاں یہ رسائل باقاعدگی سے پہنچتے ہیں
C-63 فیز ٹو ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
فون نمبر: 35804200, 35802552 (92-21) فیکس: 35802551 (92-21) ای میل: up@hotmall.com

برداشت کرسکتی تھی۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور اچھل کر دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف ٹانگیں لٹکا دیں۔ گو یہ انتہائی خطرناک کام تھا۔ تھوڑے سے توازن بگڑنے کی صورت میں، میں منہ کے بل گلی میں گر سکتا تھا لیکن میں نے انتہائی احتیاط کا مظاہرہ کیا۔ مجھے اپنی جان بچانا مقصود تھا۔ پھر میں نے گھومتے ہوئے اپنے پیر دیوار کے ساتھ ٹکائے اور کپڑے کی رسی پکڑے آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔ میں نے ایک انگلش موومی میں ہیرو کو ایسا سین کرتے ہوئے دیکھا تھا جب ولن کے کارندے اس کے گھر میں اسے گھیر لیتے ہیں اور فرار کے سارے راستے مسدود ہونے کے بعد وہ چھت کے ذریعے فرار ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میرے ذہن میں یہ آئیڈیا آیا تھا۔

میں انتہائی احتیاط لیکن برق رفتاری کے ساتھ دیوار سے پیر ٹکائے نیچے اتر رہا تھا اسی لمحے مجھے مردانہ آوازیں سنائی دیں۔ شاید وہ دروازہ توڑنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اب اماں زلیخا سے میرے بارے میں دریافت کر رہے تھے۔ میں بدستور چادر کی رسی کی مدد سے نیچے اتر رہا تھا اور بالآخر نیچے اترتے اترتے چادر کا سرا آ گیا تو میں نے چونک کر اور گردن موڑ کر نیچے دیکھا۔ میں زمین سے نو، دس فٹ کی بلندی پر موجود تھا۔ اتنی بلندی سے چھلانگ لگانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ جوڈو کراٹے سیکھتے وقت میں نے دس دس فٹ کی بلندی سے بھی چھلانگیں لگانے کی پریکٹس کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ چھلانگ لگاتے وقت میں نے ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کی تھی۔ پھر میں نے اپنا جسم موڑتے ہوئے زمین پر چھلانگ لگا دی۔ ہلکی سی دھپ کی آواز کے ساتھ میں پہلو کے بل گرا اور پھر میں نے سنبھل کر اٹھتے ہی ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جدھر منہ تھا اسی طرف دوڑ لگا دی۔

گلی سنسان اور ویران ہونے کے ساتھ ساتھ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ نجانے وہ گلی کس طرف جاتی تھی لیکن میں دوڑتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ ابھی میں .... گلی کی نکڑ تک ہی پہنچا تھا کہ اچانک ''ٹھاہ'' کی آواز کے ساتھ ہی فضا مرتعش ہوئی اور مجھے اپنے بازو سے دہکتا ہوا انگارہ رگڑ کر گزرتا ہوا محسوس ہوا۔ میرے حلق سے بے اختیار سسکاری سی نکل گئی۔ وہ دہکتا ہوا انگارہ گولی تھی جو خوش بختی سے میرے بازو میں گھسنے کی بجائے بازو سے رگڑ کھاتی ہوئی سامنے والی دیوار میں پیوست ہو گئی تھی۔ جس سے دیوار کا پلستر بھی اکھڑ گیا تھا جس کے چند ٹکڑے مجھ پر بھی پڑے تھے۔ میں نے بیک لخت اپنے بازو پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ میرے بازو سے خون کا فوارہ سا چھوٹ پڑا تھا جس سے میرا ہاتھ لتھڑ گیا تھا، پھر اس سے پہلے کہ مجھ پر دوبارہ فائرنگ ہوتی میں زخمی بازو پر ہاتھ رکھے دوڑتا چلا گیا۔

یہ ایک پُررونق علاقہ تھا۔ یہاں چوبیس گھنٹے چہل پہل رہتی تھی۔ رات گئے تک کئی دکانیں کھلی رہتی تھیں۔ میں گلی سے نکل کر سڑک پر پہنچا اور سوچنے لگا کہ اب کدھر کا رخ کروں۔ چودھری باسط کے کارندوں نے مجھے فرار ہوتے دیکھ لیا تھا اب لامحالہ وہ مجھے مارنے یا پکڑنے کے لیے میرے پیچھے ضرور آئیں گے۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے پیچھے آئیں، میں جلد سے جلد وہاں سے نکل کر کسی محفوظ جگہ پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ میرے لیے چھپنا بے حد ضروری تھا۔ میں بزدل نہیں تھا اور نہ ہی کبھی میں نے بزدلی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن حفظ ماتقدم کے طور پر ایسا کرنا ضروری تھا ورنہ میرا ''مشن'' ادھورا رہ جاتا۔

رات کا وقت تھا اور سڑک پر قدرے رونق تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ڈبل پھاٹک چوک کی طرف بڑھنے لگا۔ میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ بازو سے نکلنے والے خون نے میری شرٹ بھی خراب کر دی تھی لیکن میں اس سے بے پرواہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ جلد بازی میں وہاں سے فرار ہونے کی وجہ سے میں اپنی جیکٹ بھی نہیں پہن سکا تھا لیکن مجھے سردی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

تھوڑی دور جانے کے بعد میں نے غیر ارادی طور پر مڑ کر دیکھا تو مجھے تین افراد دکھائی دیئے جو انتہائی عجلت میں دوڑنے والے انداز میں ادھر ہی آ رہے تھے جدھر میں موجود تھا۔ گو وہ قدرے فاصلے پر موجود تھے لیکن ان کے انداز و اطوار دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہ چودھری باسط کے کارندے ہیں اور میری تلاش میں ہیں۔

میں نے قرب و جوار کا جائزہ لیا تو مجھے قدرے سنسان اور تاریک جگہ پر چند ریڑھیاں کھڑی دکھائی دیں۔ ان ریڑھیوں پر شاید سامان موجود تھا اس لیے ہر ریڑھی پر کپڑا ڈال کر اسے چاروں طرف سے رسی سے باندھا گیا تھا۔ اس طرف روشنی بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ میرے لیے وقتی جائے پناہ ثابت ہو سکتی تھی۔

چنانچہ میں جھکے جھکے انداز میں چلتا ہوا ان ریڑھیوں کے پیچھے جا کر چھپ گیا۔ زخم سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں جنہیں میں ضبط کیے ہوئے تھا۔ چار منٹ ہی گزرے تھے کہ چودھری باسط کے کارندے وہاں سے گزرنے لگے۔ میں ایک ریڑھی کے پہیے سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ قد و قامت میں لمبے اور

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

جسامت میں سانڈوں کی طرح پلے ہوئے تھے۔ وہ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے اور ان کی باتوں کا موضوع میں ہی تھا۔ ایک کارندہ اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا۔

''کہاں چلا گیا ہے وہ۔'' اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

''وہ یہیں کہیں ہوگا۔'' دوسرا بولا۔

پہلے نے کہا۔ ''مجو..... تم ادھر دیکھو..... فراز..... تم ادھر دیکھو اور میں ادھر دیکھتا ہوں۔ وہ زخمی ہے اور زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ اسے بچ کر نہیں جانا چاہئے ورنہ چودھری صاحب ہمارا قیمہ کردیں گے۔''

''بے فکر رہو جمیل۔ وہ ہم سے بچ کر نہیں جائے گا۔'' دوسرے نے کہا تو میں نے دانتوں پر دانت جما دیئے کیونکہ درد کی تیز لہر میرے بازو میں دوڑ رہی تھی۔

میں نے دیکھا، اس کے بعد وہ تینوں انتہائی عجلت میں اِدھر اُدھر منتشر ہوگئے۔ میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ ان میں سے کسی کی توجہ ادھر ریڑھیوں کی طرف نہیں گئی تھی۔ جب انہیں وہاں سے گئے کافی دیر ہوگئی اور مجھے ان کی وہاں غیر موجودگی اور واپس نہ آنے کا دلی اطمینان ہوگیا تو میں جھکے جھکے انداز میں ریڑھی کی آڑ سے نکلا اور محتاط نظروں سے قرب و جوار کا جائزہ لیتا ہوا سڑک پر پہنچا۔ مجھے دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے زخم سے خون رسنا تو بند ہوگیا تھا لیکن ٹیسیں بدستور اٹھ رہی تھیں۔ مجھے جلد از جلد اپنے زخمی بازو کا علاج کرنا تھا ورنہ بازو میں بارود کا زہر پھیلنے کا خطرہ تھا جس سے بازو کے ناکارہ ہونے کا خطرہ بڑھ سکتا تھا۔

میں کشمکش میں مبتلا تھا کہ اب کدھر جاؤں پھر جیسے ایک خیال آیا تو میں مڑ کر فاروق پورہ والے مکان کی طرف بڑھ گیا۔ میں اپنی طرف سے چودھری باسط کے کارندوں کو ڈاج دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ مجھے سڑک پر تلاش کرتے رہیں گے اور میں دوبارہ گھر پہنچ جاؤں گا۔ میں محتاط انداز سے چلتا ہوا گلی میں داخل ہوگیا۔ گھر کا دروازہ بند تھا لیکن اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے زبردستی توڑا گیا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دستک دی تو چند لمحوں کے بعد اماں زلیخا کی نقاہت بھری آواز سنائی دی۔ ''کون ہے؟''

''اماں جی! میں ہوں۔'' میں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

''میں کون؟'' اماں زلیخا نے تصدیق ضروری سمجھی۔

''علی۔'' میں نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔ اسی لمحے یخ سی لہر میرے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ موسم میں خنکی کافی بڑھ گئی تھی۔

''اچھا ٹھہرو، دروازہ کھولتی ہوں۔'' اماں زلیخا نے کہا۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھل گیا اور میں اماں زلیخا کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ان کی پیشانی پر گومڑ سا بنا ہوا تھا جس پر نیل پڑ گیا تھا۔ میری تشویش بڑھی۔

''اوہ۔ اماں، کیا ہوا ہے آپ کو؟'' میں نے بے چین لہجے میں پوچھا۔

''بیٹا! پہلے اندر آجاؤ۔ وہ بدبخت تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔'' اماں نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا تو میں جلدی سے اندر آگیا۔

دروازے کے ایک پٹ کے دو قبضے ٹوٹ گئے تھے البتہ تیسرا نہیں ٹوٹا تھا اور وہ پٹ اسی کے سہارے کھڑا تھا۔ اماں زلیخا نے دونوں دروازوں کو جوڑ کر بند کیا اور کنڈی لگا دی۔ اس کے بعد انہوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر قریبی دیوار کے ساتھ پڑی ایک بھاری سی میز دھکیل کر دروازے کے ساتھ لگانے لگیں تو میں نے آگے بڑھ کر ان کی مدد کی۔ میز کے دروازے سے لگانے سے اب باہر سے آنے والا دروازہ آسانی سے کھول نہیں سکتا تھا۔

''اماں جی! آپ کو کیا ہوا ہے؟ کیا ان لوگوں نے آپ کو مارا ہے؟'' میں نے بے چین سے لہجے میں پوچھا۔ اماں زلیخا کو زخمی حالت میں دیکھ کر میں حقیقتاً بے چین ہوگیا تھا۔ اماں زلیخا نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولیں۔

''بتاتی ہوں بیٹا۔ اندر کمرے میں چلو، کوئی تمہاری آواز سن نہ لے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔''

اماں زلیخا کی بات درست تھی۔ تاہم میں نے کہا۔ ''وہ اب نہیں آئیں گے۔ وہ مجھے تلاش کرتے ہوئے کہیں دور نکل گئے ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔''

''پھر بھی احتیاط ضروری ہے بیٹا۔ مصیبت بتا کر نہیں آتی۔'' وہ جہاندیدہ لہجے میں بولیں تو میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے اپنی طرف سے چودھری باسط کے کارندوں کو چکمہ تو دے دیا تھا لیکن وہ میری تلاش میں دوبارہ اس طرف آسکتے تھے۔ اس کا امکان تو تھا لیکن کم تھا یا زیادہ، یہ میں آنے والے وقت اور حالات پر چھوڑ دیا تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں انہیں چکمہ دے کر واپس اسی مکان میں آ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

گیا ہوں جہاں وہ مجھے مارنے آئے تھے۔

میں اماں زلیخا کو سہارا دے کر کمرے میں لے آیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ دروازہ نہیں کھول رہی تھیں اور انہوں نے حیدر الماس کو بھی کال کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ان کا فون بند جا رہا تھا۔ بالآخر وہ تینوں دروازہ توڑ کر اندر آ گئے تھے۔ ایک نے ان کے سر پر ریوالور کا بٹ مارا تھا جس سے وہ زخمی ہو گئیں جبکہ باقی دو کار رندے چھت پر چلے گئے تھے۔ غم و غصے کی ایک تیز لہر میرے وجود میں دوڑ گئی۔ میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ میں زخمی ہوں مگر اماں زلیخا کی نظر جب میرے زخمی بازو پر پڑی تو وہ پریشان ہو گئیں۔ ان کے پوچھنے پر میں نے انہیں بتایا کہ گولی میرے بازو کو چھو کر گزر گئی ہے اس لیے میں معمولی سا زخمی ہو گیا ہوں۔

''بیٹا! گولی کا زخم معمولی نہیں ہوتا۔'' وہ ناصحانہ انداز میں بولیں۔ ''میں ڈاکٹر کو بلا لاتی ہوں۔''

''نہیں اماں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''پر بیٹا.....'' وہ کہنا چاہتی تھیں لیکن میں نے ان کی بات کاٹ دی۔

''اماں! کیا کوئی دوائی وغیرہ پڑی ہے؟ میں وہی لگا لیتا ہوں۔ زخم ٹھیک ہو جائے گا۔''

''دوائی؟ اچھا میں دیکھتی ہوں۔'' اماں زلیخا نے کہا اور پھر وہ کمرے سے چلی گئیں جبکہ میں بستر پر بیٹھ کر اپنے زخم کا جائزہ لینے لگا۔ گولی کے چھونے سے بازو کی جلد چھل گئی تھی اور گہرا زخم پڑ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے بدستور ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور میں ضبط کیے ہوئے تھا۔

اماں زلیخا نے کچھ دوائیاں، اسپرٹ اور پٹیاں لا دیں۔ میں نے دوائیوں کے نام پڑھے تو وہ زخموں پر لگانے والی تھیں اور ایکسپائر ہونے میں ایک سال پڑا تھا۔ میں نے پہلے اسپرٹ سے اپنا زخم صاف کیا پھر اس پر دوائی لگا کر پٹی باندھ دی۔ دوائی لگانے سے مجھے سکون کا احساس ہوا تھا۔ اماں زلیخا نے فوراً ہلدی ملا دودھ کا ایک گلاس بھی لا دیا تھا جسے پیتے ہی مجھے اپنے جسم میں توانائی سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''اور کچھ چاہیے بیٹا؟''

''نہیں اماں..... آپ کا بہت شکریہ۔''

''اچھا بیٹا! میں چلتی ہوں۔ تم اب آرام کر لو۔'' اماں زلیخا نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے مرینہ کو فون کیا اور امی کی خیریت دریافت کی۔ مرینہ نے بتایا کہ امی کی طبیعت قدرے بہتر ہے اور ان کا علاج جاری ہے۔ ماموں اسلم بھی آئے ہوئے ہیں۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتے تھے؟ پھر میں نے ماموں اسلم سے بات کی تو انہوں نے گلے شکوے کرتے ہوئے کہا کہ میں نے امی کی حالت اور روزینہ کے اغوا کے بارے انہیں کیوں نہیں بتایا۔ پھر انہوں نے مجھے تسلی دی کہ جو کچھ ان سے ہو سکا وہ کریں گے۔ وہ اپنے تعلقات استعمال کریں گے۔ انہوں نے مجھ سے استفسار بھی کیا تھا کہ میں کہاں ہوں، امی کے پاس کیوں نہیں ہوں تو میں نے انہیں یہی بتایا کہ میں روزینہ کی تلاش کرتا پھر رہا ہوں لیکن اسپتال کے چکر لگاتا رہتا ہوں۔

کچھ دیر بات چیت کے بعد ان سے رابطہ منقطع ہو گیا تو میں نے فون بند کر کے لائٹ آف کی اور سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ایک بار پھر میری آنکھوں کے سامنے روزینہ کا دھندلا چہرہ ابھر آیا اور میں ماضی کی یاد میں کھو گیا۔

وہ میرے بچپن کی یادگار جب میں بارہ سال کا تھا اور روزینہ نو سال کی تھی۔ امی کہا کرتی تھیں کہ میں بچپن میں بہت شرارتی ہوا کرتا تھا۔ روزینہ کو تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔

اس روز روزینہ اسکول سے آنے کے بعد ہوم ورک کر رہی تھی کہ میں اس سے پینسل چھین کر صحن میں بھاگ گیا تھا اور وہ شور مچاتی ہوئی میرے پیچھے دوڑی چلی آئی تھی۔ ہمارے ابو اور امی صحن میں بیٹھے تھے جبکہ مرینہ امی کی گود میں بیٹھی کھیل رہی تھی۔

''ابو..... ابو دیکھیں بھائی کو۔ میری پینسل چھین آئے ہیں۔'' روزینہ چلاتی ہوئی ابو سے مخاطب تھی اور میں نے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ابو! یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ میں نے اس کی پینسل نہیں چھینی۔''

''ابو! بھائی جھوٹ بول رہے ہیں پینسل ان کے پاس ہی ہے۔'' روزینہ معصومیت سے بولی تو ابو نے گھور کر پیار بھری نظروں سے دیکھا۔

''علی! بہت غلط بات ہے۔ شاباش، اس کی پینسل اسے واپس کرو۔'' ابو نے ڈپٹنے والے انداز میں کہا تو میں ہنس دیا تھا۔

''ایک شرط پر پینسل واپس کروں گا۔'' میں نے شرط رکھی تھی۔

WaqarAzeem
Pakistanipoint.com

''کیا شرط ہے؟'' ابو بولے۔

''آپ نے اسے چاکلیٹ لے کر دی ہے مجھے بھی آدھی کھلائے گی۔'' میں نے شرط بتائی تو ابو اور امی مسکرا دیئے۔

''کیوں کیوں۔ میں آپ کو چاکلیٹ کیوں کھلاؤں۔ آپ کو بھی تو ابو نے لے دی تھی اور وہ آپ نے کھالی ہے۔'' روزینہ جلدی سے بولی۔

''سوچ لو۔'' میں نے وارن کیا تو وہ رو دینے والے انداز میں ابو اور امی کی طرف دیکھنے لگی۔

''ابو!'' اس کا انداز رو دینے والا تھا۔ میں قہقہہ مار کر ہنس دیا۔

''علی! بہن کو تنگ مت کرو۔ دو اسے چینسل۔'' اس بار امی نے ڈپٹنے والے انداز میں کہا تو میں نے چینسل روزینہ کو واپس کردی اور وہ دوڑ کر کمرے میں چلی گئی۔

''بیٹا! چھوٹی بہنوں کو تنگ نہیں کیا کرتے۔'' ابو نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''ابو! روزینہ کو تنگ کر کے مجھے بہت مزہ آتا ہے۔'' میں نے جواب دیا تو سب ہنس پڑے۔ اچانک دھند لاہٹ ختم ہوگئی اور ساتھ ہی منظر بھی غائب ہوگیا۔ البتہ میری آنکھوں میں نمی ضرور آگئی تھی۔ میں نے ضبط کرتے ہوئے آنکھیں میچ لیں تو دو قطرے میری آنکھوں سے نکل کر میرے رخسار سے پھسلتے ہوئے تکیے میں جذب ہوگئے۔ آج مجھے پھر روزینہ شدت سے یاد آرہی تھی۔ نجانے وہ کہاں اور کس حال میں ہوگی اور میں اسے کب تلاش کر پاؤں گا۔

☆.....☆

اگلے روز منگل تھا۔ اماں زلیخا نے صبح ہی اپنے بھتیجے کو بلا کر دروازے کی مرمت کروادی تھی۔ ان کے بھتیجے کا نام مراد تھا اور وہ بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ اب دروازہ پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہوگیا تھا۔ میں اس دوران کمرے میں ہی رہا تھا اس لیے اماں نے میرے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔

صبح سے شام ہوگئی تھی لیکن چودھری باسط کے کارندے دوبارہ اس طرف نہیں آئے تھے اور یہ میرے حق میں بہت اچھی بات تھی۔ میں نے اپنے زخمی بازو کی پٹی دوبارہ کرلی تھی۔ دوائی لگانے سے ٹیسوں میں کمی آگئی تھی۔ اسی شام باہر عرف جوکر کے ذریعے مجھے حیدر الماس صاحب کی صحت کے بارے میں پتا چلا تھا۔ ان کی حالت قدرے بہتر تھی لیکن ڈاکٹرز نے انہیں مکمل ریسٹ کرنے کا مشورہ دیا تھا اس لیے اب وہ اپنی کوٹھی پر آرام کررہے تھے۔ میں ان سے بات کرنا چاہتا تھا کہ کیا چودھری ساجد واپس آگیا ہے یا نہیں لیکن باہر نے بتایا تھا کہ وہ آرام کررہے ہیں تو میں نے اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ اگر انہیں کچھ ہوجاتا تو میں نہ صرف ایک بار پھر تہی دامن ہوجاتا بلکہ میرے لیے چودھری ساجد تک پہنچنا مشکل ہوجاتا۔ اب وہی مجھے چودھری ساجد تک پہنچا سکتے تھے اس لیے میں نے ضبط کرتے ہوئے انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ یہ اذیت ناک لمحات میں کیسے گزار رہا تھا میں ہی جانتا تھا۔ میری ہر رات اور ہر دن کانٹوں پر بسر ہو رہا تھا۔

اگلے روز میں گھر پر ہی تھا۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ اماں زلیخا کچن میں میرے لیے سوپ بنا رہی تھیں اور میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا اخبار کا مطالعہ کررہا تھا۔ میری حالت قدرے بہتر تھی اور نیسیں بھی ختم ہوگئی تھیں۔ اسی دوران میز پر پڑے میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی تو میں نے چونک کر سیل فون کی طرف دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر اٹھالیا۔ اسکرین پر اسماعیل شاہد کا نام جگمگا رہا تھا۔ جب سے میں نے انہیں چودھری باسط اور شانی کے ساتھ دیکھا تھا میرے دل میں شکوک وشبہات جڑ پکڑتے جارہے تھے۔ میں نے کال اٹینڈ کرنے کے بعد سیل فون کان سے لگالیا۔

سلام ودعا کے بعد میں نے پوچھا۔ ''سر! چودھری باسط کے کسی ٹھکانے کے بارے میں کچھ پتا چلا؟'' یہ بات میں نے جان بوجھ کر پوچھی تھی۔

''نہیں۔'' ان کی نفی میں آواز سنائی دی۔ ''اس دن والے واقعے کے بعد سے میں محتاط ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ذریعے تمہیں ٹریس کیا جائے اس لیے میں پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہا ہوں۔ تم بے فکر رہو۔ میں جلد ہی اس ریکٹ کو ٹریس کرلوں گا۔''

وہ کتنی آسانی اور مطمئن ہوکر جھوٹ بول رہے تھے۔ میں دل ہی دل میں انہیں داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ واقعی بہت بڑے فنکار تھے۔ ظاہر ہے وہ سرکس چلاتے تھے۔ انہیں ہر طرح کا فن آتا تھا۔

وہ دوبارہ بولے تو ان کے لہجے میں کھوجنے کا عنصر شامل تھا۔ ''علی! کیا چودھری باسط کی تصویریں تم نے میڈیا کو دی ہیں؟''

''نہیں سر۔'' میں نے برجستہ جواب دیا۔

''تو پھر کس نے میڈیا کو دی ہیں؟'' وہ الجھے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

''پتا نہیں سر۔'' میں نے جواباً کہا۔

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ چودھری باسط تصویریں میڈیا کو دینے والے کو تلاش کر رہا ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''اس کا شک یقیناً تم پر ہی ہوگا۔''

''سر! کیا آپ کی چودھری باسط سے دوستی ہے؟'' میں نے اچانک ہی یہ سوال کر ڈالا۔

''میری۔'' اسماعیل شاہد صاحب بے ساختہ بولے تھے تو میرے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ ان کی آواز میں کھوکھلاپن بھی شامل تھا۔ ''کیا مطلب؟''

''سر! مطلب واضح ہے۔'' میں نے لہجے کو حتی المقدور نرم رکھتے ہوئے کہا۔ ''چودھری باسط آپ کا دوست ہے۔ میں نے اس بات کی تصدیق کر لی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ..... وہ آپ کا دوست ہے اور آپ نے مجھے بتانا تک گوارا نہیں کیا۔ اس کے بیٹے نے میری بہن اغوا کر لی اور آپ جانتے بوجھتے مجھے چھپاتے رہے۔ آپ جانتے بھی ہیں کہ اس گھٹیا انسان اور اس کے بیٹے نے میرے ساتھ کیا کیا ظلم و ستم کیے ہیں۔ انہی دونوں باپ بیٹے کی وجہ سے میری بہن آج نجانے کہاں اور کس حال میں ہے۔''

''بیٹا! تم یہ کیا کہہ رہے ہو..... کس نے کہا ہے کہ چودھری باسط میرا دوست ہے؟'' ان کا لہجہ بدستور کھوکھلا تھا۔

''اس بات کو چھوڑیں کہ مجھے کس نے کہا ہے۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''البتہ میں نے آپ کو سند باد ہوٹل میں چودھری باسط اور شانی کے ساتھ دیکھا ہے۔ اگر آپ کو میں خود نہ دیکھتا تو شاید کبھی بھی اس بارے میں بات نہ کرتا اور نہ ہی یقین کرتا۔ مجھے بے حد افسوس ہے سر، آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔''

میرے لہجے میں دکھ سمٹ آیا تھا۔ دوسری طرف بھی گہرا سناٹا چھا گیا تھا۔ جیسے اسماعیل شاہد صاحب کو سانپ نے سونگھ لیا ہو۔ تقریباً بیس سیکنڈ خاموشی کے بعد وہ ہمکاری بھرتے ہوئے بولے۔ ''ہمم۔ علی بیٹا! آئی ایم سوری..... میں تمہیں چودھری باسط کے بارے میں بتانا چاہتا تھا لیکن شاید میں اس لیے رک گیا کہ کہیں تم..... یہ نہ سمجھ لو کہ میں اس کی طرف داری کر رہا ہوں، اور اسے بچانا چاہتا ہوں۔''

''سر! برا نہ مانیے گا، نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ آپ یہ جانتے ہیں کہ چودھری باسط اور اس کا بیٹا لڑکیوں کی اسمگلنگ والے گینگ سے وابستہ ہیں اور آپ بھی.....'' میں نے کہا۔

وہ میری بات سمجھ گئے تھے، اس لیے میری بات درمیان میں ہی اچک لی اور صفائی دینے لگے۔ ''نہیں علی بیٹا، جو کچھ تم سوچ رہے ہو ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں اس بارے میں نہیں جانتا تھا۔ میرا یقین کرو۔ مجھے تو تمہاری زبانی ہی معلوم ہوا تھا کہ چودھری باسط ایسا گھناؤنا دھندا کرتا ہے۔''

میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ ان کے لہجے کا کھوکھلاپن اس بات کا غماز تھا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں لیکن ان سے صحیح طرح سے جھوٹ بولا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے کہا۔ ''سر! آپ کو چودھری باسط کے گھٹیا بزنس کا پتا تو چل ہی گیا ہے، پھر تو آپ چودھری ساجد کو بھی جانتے ہوں گے۔ وہ بھی چودھری باسط کے ساتھ کام کرتا ہے۔''

''نہیں۔'' مجھے لگا، وہ اس بار ڈھٹائی سے بولے تھے۔ ''چودھری ساجد کے بارے میں، میں نہیں جانتا البتہ اگر تم مجھے کچھ وقت دو تو میں چودھری باسط سے معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''اگر ایسا ہو جائے تو آپ کی مہربانی ہوگی۔'' میں نے گویا انہیں باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ میں ان کا احسان مند ہوں گا۔

''مہربانی کی کوئی بات نہیں علی۔'' انہوں نے کہا۔ ''جو کچھ مجھ سے ہو سکا میں کروں گا۔ اچھا میں فون رکھتا ہوں۔ ایک ضروری کال آ رہی ہے۔ تم اپنا فون آن رکھنا۔ میں پھر بات کروں گا۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' میں نے کہا۔ ''میں آپ کی کال کا انتظار کر رہا ہوں۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا تو میں نے سیل فون میز پر رکھ دیا۔ نجانے میرا دل کیوں چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اسماعیل شاہد، چودھری ساجد کے بارے میں بھی جانتے ہیں۔ جس طرح انہوں نے میرے سامنے چودھری باسط کا دوست ہونے کا ذکر نہیں کیا تھا اسی طرح وہ چودھری ساجد کے بارے میں جاننے کے باوجود انتہائی صفائی سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ بہرحال اب مجھے ان کی کال کا انتظار تھا۔ ان کا فون آنے کی خاطر میں نے اپنا فون بھی آن رکھا تھا۔ میں اس بات سے بے خبر تھا کہ میں گھاگ شکاریوں کے گھیرے میں تھا اور وہ میرے گرد گھیرا تنگ کرتے جا رہے ہیں۔

میں یہ بات بھول ہی گیا تھا کہ آج جدید ٹیکنالوجی کی بدولت فون منٹوں میں ٹریس ہو جاتے ہیں۔ یہ ممکن بھی تھا کہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

میرا فون ٹریس ہو چکا ہو لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی تھی۔ میرے اندر جوش و ولولہ ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ میرے ذہن پر چودھری ساجد، چودھری باسط، شانی اور اب اسماعیل شاہد سوار تھے۔ اسماعیل شاہد کی ہدایت کے مطابق میں نے فون آف نہیں کیا تھا۔

اپنے باس کی کال کا انتظار کرتے ہوئے نہ صرف رات بیت گئی بلکہ دوسرے روز سہ پہر ہو گئی۔ میری بے چینی ہنوز برقرار تھی۔ اماں زلیخا کچن میں رات کا کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔ صبح ہی مریبہ سے بات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ امی کی حالت بہتر ہے۔ امی، بڑے ماموں کے سینے سے لگ کر خوب روئی تھیں۔ وہ بار بار روزینہ کو پکار رہی تھیں اور ماموں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ جس حد تک ہو سکا وہ روزینہ کی تلاش میں مدد کریں گے۔

میں چشم تصور میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ بے حد جذباتی منظر ہوگا۔ اگر میں بھی وہاں موجود ہوتا تو شاید میں بھی خود پر قابو نہ رکھ پاتا۔ کہتے ہیں کہ مرد نہیں روتے۔ مرد آخر کیوں نہیں روتے۔ کیا ان کے سینوں میں دل نہیں ہوتے؟ یا وہ پتھر کے انسان ہوتے ہیں۔ مرد بھی روتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنا درد، غم اور کرب کسی کے سامنے ظاہر نہیں کرتے لیکن ان کی اندرونی کیفیت بہت دردناک ہوتی ہے۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ مجھے حیدر الماس سے بات کرنی چاہئے اور ان سے چودھری ساجد کے حوالے سے اپ ڈیٹ لینے کے ساتھ ساتھ انہیں اسماعیل شاہد کی کال کے بارے میں بھی بتا دوں۔ اسی غرض سے میں ان کا نمبر پنچ کر رہا تھا کہ اسی لمحے میرے سیل فون پر اسماعیل شاہد کی کال آ گئی۔ ان کا نام اسکرین پر دیکھ کر میری آنکھوں میں چمک ابھر آئی اور میرے دل میں خیال آیا کہ یقیناً انہوں نے چودھری ساجد کے بارے میں معلوم کر لیا ہے۔ میں نے حیدر الماس صاحب کو کال کرنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے کال ریسیو کر لی۔

سلام و دعا کے بعد انہوں نے کہا۔ ''علی! جلدی سے میری کوٹھی پر پہنچ جاؤ۔''

''کیا آپ نے چودھری ساجد کے بارے میں معلوم کر لیا ہے؟'' میں نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ پُرمسرت لہجے میں بولے۔ ''تم میرے پاس پہنچو، ہم دونوں ہی چودھری ساجد کے پاس چلتے ہیں۔ آج میں اس سے تمہاری بہن کے بارے میں معلوم کر کے ہی رہوں گا۔''

میں خوش ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے سر، میں آ رہا ہوں۔''

اسماعیل شاہد نے رابطہ منقطع کر دیا تو میں نے سیل فون آف کر کے جیب میں رکھا اور دوسرے فون سے حیدر الماس صاحب کو کال کرنے لگا۔ میں انہیں اسماعیل شاہد کی کال کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔ سلام و دعا کے بعد انہوں نے استفسار کیا۔

''علی! مجھے اماں زلیخا نے بتایا تھا کہ کچھ غنڈوں نے گھر پر دھاوا بول دیا تھا اور تم زخمی بھی ہو گئے ہو۔''

''جی جناب۔'' میں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ ''زیادہ نہیں، ہلکا زخمی ہوا ہوں لیکن اب ٹھیک ہو چکا ہوں۔''

''تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا؟'' وہ خفگی سے بولے تو مجھے افسوس ہوا کہ واقعی انہیں نہ بتا کر میں نے غلطی کی ہے۔

''میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ہمم۔'' وہ ہنکاری بھرتے ہوئے بولے۔ ''اللہ کا شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ چودھری باسط کو تمہاری وہاں موجودگی کا علم کیسے ہوا؟ وہ تو انتہائی خفیہ جگہ تھی۔''

''یہی کچھ میں نے بھی سوچا ہے۔'' میں نے بتایا۔

''مجھے لگتا ہے میرے کسی آدمی نے غداری کی ہے۔'' حیدر الماس صاحب بولے۔ ''ورنہ اس گھر کے بارے میں کسی کو بھی معلوم نہیں ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں جرائم کی دنیا میں نا تجربہ کار تھا اس لیے میں کیا کہہ سکتا تھا لیکن ان کا خدشہ یقیناً صحیح تھا۔ ان کے گینگ میں کوئی ایسا تھا جس نے غداری کی تھی۔

''علی! تم نے چودھری باسط کے شہدوں کو ڈاج تو دے دیا ہے لیکن وہ دوبارہ بھی وہاں آ سکتے ہیں۔'' حیدر الماس نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔ ''تم فوراً وہاں سے نکلو اور زکریا ٹاؤن والے ٹھکانے پر پہنچ جاؤ۔ وہ تمہارے لیے محفوظ جائے پناہ ہو گی۔ میرے آدمی بھی وہاں موجود ہیں۔''

''جی ٹھیک ہے۔ میں آج پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''فی الحال میں اپنے باس اسماعیل شاہد سے ملنے جا رہا ہوں۔''

''اسماعیل شاہد.....'' یک لخت ان کی حیرت میں ڈوبی آواز سنائی دی تو میں بھی ان کے غیر معمولی رویے پر ٹھٹک گیا۔

''کیا تم اسماعیل شاہد کے ملازم ہو؟''

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

''جی ہاں..... کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟'' اس بار چونکنے کی باری میری تھی۔

''اور ان کا بزنس کیا ہے؟''

''ان کی مختلف شہروں میں سرکس چلتی ہے۔''

''ہمم۔'' انہوں نے ہنکاری بھری۔ ''کیا تم اب اس سے ملنے جارہے ہو؟''

''جی ہاں۔''

''اس سے ملنے نہ جاؤ۔''

''کیوں؟'' میں حیران رہ گیا۔

''ابھی تمہارے لیے خطرہ ہے۔ یہ بات میں تمہاری بھلائی اور بہتری کے لیے کہہ رہا ہوں۔'' حیدر الماس نے کہا۔ ''مجھے خطرے کی بُو محسوس ہو رہی ہے اس لیے میں تمہیں یہی نصیحت کروں گا۔ میں نے تمہیں کیوں روکا ہے اس بارے میں بھی بتا دوں گا۔''

کوئی تو خاص بات تھی جس کی وجہ سے حیدر الماس مجھے اسماعیل شاہد سے ملنے سے منع کر رہے تھے۔ یہ میرا واہمہ بھی ہو سکتا تھا تاہم میں نے کہا۔

''لیکن اگر وہ مجھ سے پوچھیں کہ میں کیوں نہیں آیا تو..... میں ان سے کیا کہوں۔ ان کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ انہوں نے مجھے سپورٹ کیا ہے۔''

''احسان اپنی جگہ..... جو میں کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو ورنہ نقصان میں رہو گے۔'' حیدر الماس نے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم زکریا ٹاؤن پہنچو، میں بھی آ رہا ہوں پھر میں تمہیں ایک بہت بڑا سرپرائز دوں گا۔''

''سرپرائز..... کیسا سرپرائز؟'' میں یکلخت چونکا۔

''ہے سرپرائز۔'' حیدر الماس نے جواب دیا۔ ''تھوڑا انتظار کرو، اور فوراً وہاں سے نکلو۔''

میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ ظاہر ہے اس کے علاوہ میں کیا کر سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے جناب۔''

انہوں نے مزید دریافت کیا۔ ''یہ بتاؤ، کیا تم نے اپنے باس کو اپنی ماں اور بہن کے بارے میں تو نہیں بتایا؟''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''اچھا کیا۔'' وہ بولے۔ ''اسے کچھ بتانا بھی نہیں۔''

ان کی گفتگو بے حد پُراسرار تھی۔ میرا تجسس مزید بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے کہنا چاہا لیکن انہوں نے مجھے بولنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ''مجھے انہیں کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچانا ہوگا۔ تم اس طرح کرو کہ تم پہلے اسپتال پہنچ جاؤ۔ میں قیصر کو بھیجتا ہوں۔ وہ تمہیں اور تمہاری فیملی کو لے کر محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دے گا جہاں تمہاری فیملی اطمینان اور سکون سے رہے گی۔''

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ حیدر الماس صاحب کیا کرنا چاہ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا وہ مزید بولے۔

''اور ہاں، میری آخری بات سن لو۔''

''جی کہیں۔'' میں نے کہا۔

وہ بولے۔ ''اپنا سیل فون آف کر دو۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ..... تم جس کمپنی کا نمبر استعمال کر رہے ہو چودھری باسط نے تمہیں ٹریس کرنے کے لیے، تمہاری لوکیشن معلوم کرنے کے لیے اس کمپنی سے رابطہ کیا ہے' اس لیے اب تم اپنا نمبر آف کر دو۔ اگر چودھری باسط کو تمہاری لوکیشن معلوم ہوگئی تو وہ بلا تاخیر وہاں ''ریڈ'' کر دے گا۔''

عین اسی لمحے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی تو میں بے اختیار چونک پڑا۔ دستک دینے کا انداز عام سا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''کوئی آیا ہے۔'' میں نے مدھم آواز میں حیدر الماس کو بتایا۔

''اوہ۔ کون ہو سکتا ہے اس وقت۔'' انہوں نے استفسار کیا۔

''پتہ نہیں۔'' میں نے جواب دیا

''تم جلدی سے کہیں چھپ جاؤ۔ جو کوئی بھی ہو سامنے مت آنا۔'' حیدر الماس نے جلدی سے کہا۔ ''اس کے جاتے ہی تم فوراً وہاں سے نکل جاؤ۔''

ایک بار پھر دستک ہوئی۔ میں نے حیدر الماس کو ہاں میں جواب دینے کے بعد کال کاٹ دی۔ اسی لمحے اماں زلیخا بھی کچن سے نکل آئی تھیں۔

''کون ہو سکتا ہے؟'' میں نے ہلکی آواز میں پوچھا۔

''شاید میرا بھتیجا ہو۔'' اماں زلیخا نے جواب دیا۔ ''تم کمرے میں چلے جاؤ۔''

میں جلدی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں جاتے ہی میں نے دروازہ بند نہ کیا بلکہ ایک پٹ کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں غیر معمولی انداز میں تیزی آ گئی تھی۔

''کون ہے؟'' مجھے اماں زلیخا کی آواز سنائی دی۔

''پھپھو! میں ہوں..... مراد۔'' باہر سے ایک مردانہ آواز سنائی دی تو میں نے ایک طویل سانس لیا۔ وہ اماں زلیخا کا بھتیجا تھا۔ وہ اچانک اس وقت یہاں کیا کرنے آیا تھا۔ میں

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

نے سوچا۔ اماں زلیخا نے دروازہ کھول دیا تھا اور وہ اندر آ گیا۔

''کیا کام ہے بیٹا؟'' اماں زلیخا کی آواز سنائی دی۔

''پھپھو! پوچھنے آیا تھا کہ دروازہ تو ٹھیک ہے نا۔ دوبارہ ٹوٹ تو نہیں گیا۔'' مراد نے کہا۔

''ہاں بیٹا۔'' اماں زلیخا بولیں۔ ''تو بہت بڑا کاریگر ہے۔ تیرا بنایا ہوا دروازہ دوبارہ کیسے ٹوٹ سکتا ہے۔''

میں نے دروازے کی جھری سے دیکھا تو وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا پھر کھوجتے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگا۔

''پھپھو! کیا یہاں کوئی آیا ہوا ہے؟''

اماں زلیخا نے جواب دیا۔ ''نہیں بیٹا۔ یہاں کون آ سکتا ہے۔''

''میز پر اخبار پڑا ہے نا، اس لیے پوچھ لیا، کیونکہ حیدر صاحب اکثر یہاں آتے رہتے ہیں نا۔'' مراد نے جواب دیا۔

اماں زلیخا نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بیٹا، میں صبح سبزی لینے گئی تھی تو یہ اخبار مجھے گلی میں پڑا ملا تھا تو میں اسے اٹھا کر لے آئی۔''

''اچھا پھپھو، میں چلتا ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔'' اس نے کہا اور واپس مڑ گیا۔

مراد تو واپس چلا گیا لیکن نہ جانے میرے ذہن میں کیوں وسوسے سر ابھار چکے تھے۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ میری چھٹی حس پھر بے دار ہو چکی تھی۔ اماں زلیخا دروازہ بند کر کے واپس کچن میں چلی گئی تھیں۔ مراد نے جس طرح میز پر پڑے اخبار کو دیکھ کر بات کی تھی اس سے میں ٹھٹک گیا تھا۔ گو اماں زلیخا نے تو بہانہ بنا کر بات کر لی تھی لیکن میں نے دیکھا تھا کہ مراد مطمئن نہیں ہوا تھا۔ میں چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر میں نے اپنی ضروری چیزیں اٹھا کر جیکٹ کی جیب میں منتقل کیں اور اماں زلیخا کو جانے کا بتانے کے لیے کچن میں آ گیا۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔ ''بیٹا! کیا کہیں جا رہے ہو؟''

''جی اماں۔'' میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''حیدر صاحب نے بلایا ہے۔ آپ کا بے حد شکریہ کہ..... آپ نے میری خدمت کی۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو بیٹا۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''تم میرے بیٹے ہو۔ جانتے ہو میرا کوئی بیٹا نہیں ہے اس لیے تم اور حیدر دونوں میرے بیٹے ہو۔ کھانا تو کھاتے جاؤ۔''

''حیدر صاحب کے ساتھ ہی کھا لوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''انہوں نے فوری طور پر مجھے پہنچنے کا کہا ہے۔''

اماں زلیخا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر میں نے آگے بڑھ کر اماں زلیخا کے ہاتھ تھام کر انہیں اپنی آنکھوں سے لگایا تو انہوں نے مجھے ڈھیروں دعائیں دیں، پھر میں انہیں اللہ حافظ کہہ کر گھر سے نکل آیا۔

گلی میں ہلکی پھلکی چہل پہل تھی۔ کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی تھی۔ میں نے دروازہ بند کیا اور گلی سے نکل کر قرب وجوار میں دیکھتا تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ایک طرف بڑھنے لگا۔ میں گلی مڑا تو ایک گھر کے دروازے پر ایک لڑکی کھڑی تانک جھانک کر رہی تھی۔ وہ دوپٹے سے عاری تھی اور اس کے لمبے سیاہ بال ایک سائیڈ پر جھول رہے تھے پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی تو دوسرے ہی لمحے مجھے دیکھتے ہی وہ بجلی کی سی تیزی سے پیچھے ہو گئی اور کھٹ سے دروازہ بند کر دیا۔ شاید میں اچھے موڈ میں ہوتا تو میری ہنسی نکل جاتی لیکن اس وقت مجھے صرف اپنا ہوش تھا۔ میرے پاس مفلر تھا جس سے میں نے اپنا سر اور چہرہ چھپا لیا تھا۔

سڑک پر پہنچ کر بھی میں نے محتاط نظروں سے گرد و پیش میں دیکھا۔ پھر اطمینان کر لینے کے بعد آگے بڑھ گیا۔ فلائی اوور کے نیچے کئی آٹو رکشے موجود تھے۔ میں نے ایک آٹو رکشے میں سوار ہوتے ہی ڈرائیور کو زکریا ٹاؤن چلنے کا کہا۔ ڈرائیور نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بھائی! دو سو کرایہ لوں گا کیونکہ زکریا ٹاؤن یہاں سے بہت دور ہے۔''

میں نے اثبات میں گردن ہلا کر ہامی بھر لی تو ڈرائیور نے آٹو رکشا اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دیا۔ رکشے کا سائلنسر پھٹا ہوا تھا جس سے اس کی آواز دور دور تک جا رہی تھی۔ میں غائرانہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا لیکن ابھی تک مجھے کوئی ایسا شخص دکھائی نہ دیا تھا جس پر مجھے شک ہوتا کہ وہ چودھری باسط کا کارندہ ہے۔

آٹو رکشا اپنی مخصوص آواز اور رفتار سے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ چوک پر پہنچتے ہی ڈرائیور نے آٹو رکشا پل کی طرف موڑا اور اس کی اسپیڈ میں اضافہ کر دیا۔ ابھی آٹو رکشا نے آدھا پل ہی کراس کیا تھا کہ اچانک ایک کار، آٹو رکشا کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگی۔ کار کی رنگت بلیو تھی اور اس میں دو افراد سوار تھے۔ اچانک میں بے اختیار چونک پڑا۔ کار کی لیفٹ سائیڈ ڈور کی کھڑکی کھلی اور مجھے ایک شہدا ٹائپ شخص کی شکل دکھائی دی جس کے ہاتھ میں ایک ریوالور دبا ہوا تھا..... اور اس ریوالور کا رخ میری طرف تھا۔

(لمحہ بہ لمحہ بدلتے واقعات پر مشتمل داستان جاری ہے)

Waqar Azeem
Pakistanipoint

دوہری خوشی

جناب مدیر اعلیٰ
سلام مسنون!
میں نے پہلی بار کہانی لکھی ہے اور یہ میری اپنی کہانی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اسے کئی بار لکھا اور پڑھا ہے پھر بھی مجھے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی غلطی رہ گئی ہوگی۔ پلیز اسے درست کرکے شائع ضرور کیجئے گا تاکہ میری زندگی سے لوگ سبق حاصل کریں۔

زرینہ شاکر
(لاہور)

میں نے کھانا نکال کر شاکر کے سامنے رکھا اور اس کے لیے پانی لینے چلی گئی۔ جب پانی کی بوتل اور گلاس لے کر واپس آئی تو اس نے کھانا شروع نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور سوچنے لگی کہ کہیں دفتر کی کوئی پریشانی ہے لیکن مجھے ایسی کوئی علامت نظر نہیں آئی۔

میں چائے بنانے لگی تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔ ''تم نے کھانا کھالیا؟''

''ہاں'' میں نے منہ پھیر کر جواب دیا اور آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''جھوٹ مت بولو'' اس نے میری ٹھوڑی پکڑ کر کہا۔ ''تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم ابھی تک بھوکی ہو بلکہ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ تم نے دوپہر میں بھی کچھ نہیں کھایا۔''

میں اسے صحیح صورتِ حال بتا کر پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ واقعی میں نے دوپہر میں کھانا نہیں بنایا تھا۔ پکانے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ گھر میں دو آلو رکھے ہوئے تھے وہ میں نے شام کے لیے رکھ دیے کہ شاکر آئے گا تو اس کے لیے آلو کا بھرتہ بنا دوں گی۔ رات کی بچی ہوئی آدھی روٹی رکھی ہوئی تھی وہ میں نے چٹنی کے ساتھ کھالی اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ایسا اکثر ہوتا تھا کیونکہ شاکر گھر کے خرچ کے لیے جو پیسے دیتا وہ بیس بائیس تاریخ تک ہی ختم ہوجاتے۔ اس کے بعد میں بڑی مشکل سے کھینچ تان کر مہینا پورا کرتی اسی لیے مجھے اکثر دوپہر کے کھانے کا خاتمہ کرنا پڑتا یا پھر رات کی بچی ہوئی روٹی اور چٹنی پر گزارہ کر لیتی تھی۔

شاکر سے کچھ کہنا بے کار تھا۔ اسے ان حالات کا بخوبی علم تھا لیکن وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی تنخواہ بہت کم تھی اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کے سبب اس میں گزارہ کرنا بہت مشکل ہوگیا تھا۔ وہ ایک سرکاری محکمے میں معمولی سا دفتری تھا اور یہ نوکری اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی تھی کئی عوامل ایسے تھے جن کی وجہ سے وہ اسے چھوڑ کر دوسری جگہ ملازمت کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

گھر کے حالات ایسے تھے کہ وہ میٹرک کے بعد اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ اس کے والد اسی محکمے میں کام کرتے تھے۔ انہوں نے بھی ساری عمر تنگی ترشی میں بسر کی، وہ اور ان کی بیگم قناعت پسند تھے اس لیے روکھی سوکھی میں بھی گزارہ کرلیا لیکن وہ بچوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو کنٹرول نہ کرسکے جس کی وجہ سے اخراجات بڑھتے گئے اور ان کے لیے اپنی قلیل تنخواہ میں مہینا پورا کرنا مشکل ہوگیا چنانچہ انہوں نے بڑے بیٹے شاکر کو اپنے ہی دفتر میں دفتری بھرتی کروادیا اور اس سے کہا کہ وہ انٹر کا امتحان پرائیویٹ دینے کی تیاری کرے۔

شاکر خود بھی گھر کے حالات دیکھ کر کڑھتا تھا چنانچہ وہ بخوشی یہ قربانی دینے پر تیار ہوگیا تاکہ کم از کم اس کے بہن بھائیوں کا مستقبل سنور جائے۔ اس سے چھوٹے تین بھائی اور چار بہنیں تھیں۔ اس زمانہ میں پرائیویٹ اسکولوں کا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

رواج نہیں تھا اور سب بہن بھائی سرکاری اسکولوں میں پڑھ رہے تھے۔ شاکر کی والدہ کو لڑکیوں کی پڑھائی سے زیادہ ان کی شادی میں دلچسپی تھی۔ انہوں نے کسی لڑکی کی تعلیم مکمل ہونے کا انتظار نہیں کیا اور جیسے ہی کوئی رشتہ آیا اس کی شادی کردی۔

شاکر نے انٹر کرنے کے بعد بی کام میں رجسٹریشن کروالی کیونکہ اگلے گریڈ میں ترقی کے لیے اس کا گریجویٹ ہونا ضروری تھا اور اگر اپنے محکمے میں ترقی نہ ہوتی تو بھی بی کام کرنے کے بعد اسے کسی بینک یا پرائیویٹ فرم میں اچھی جاب مل سکتی تھی لیکن انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ شاکر کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس نے بی کام پارٹ ون کا امتحان دیا ہی تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہوگیا اور گھر کی پوری ذمے داری اس پر آگئی۔

انہی دنوں میری اور شاکر کی لو اسٹوری کا آغاز ہوا۔ میں ان کے پڑوس میں رہتی تھی۔ میرے ابو شاکر کے والد کے ساتھ کام کرتے تھے لیکن ہم لوگ ان کے مقابلے میں نسبتاً خوش حال تھے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ مجھ سے بڑے تین بھائی تھے۔ بڑے بھائی مرچنٹ نیوی میں چلے گئے اور چھوٹے بھائی کو ایئر فورس میں کمیشن مل گیا۔

میں ان دنوں انٹر میں پڑھ رہی تھی۔ ابو تو مجھے مزید تعلیم دلوانا چاہ رہے تھے لیکن میرا پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا۔ بچپن سے ہی مجھے ناولوں اور فلموں کا چسکا لگ گیا تھا۔ فلم دیکھنے کا موقع تو کم ہی ملتا تھا۔ البتہ کسی بچے کو بھیج کر محلے کی لائبریری سے ناول منگوا لیتی تھی۔ ان دنوں آنہ لائبریری کا رواج تھا، جہاں سے ایک آنہ روز کرائے پر ناول ملتے تھے۔ جب میں کالج میں تھی تو لائبریریاں تقریباً ختم ہوچکی تھیں چنانچہ میں نے ڈائجسٹوں سے دل لگالیا۔ گھر سے جو جیب خرچ ملتا اس میں سے پیسے بچا کر ہر مہینے ایک دو خواتین کے ڈائجسٹ خرید لیا کرتی تھی اور کورس کی کتابوں میں چھپا کر پڑھا کرتی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انٹر میں میرے بہت کم نمبر آئے۔ میں خاموش ہوکر بیٹھ گئی کہ چلو اس بہانے پڑھائی سے جان چھوٹی۔۔۔ لیکن ابو نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

شاکر مجھے شروع سے ہی اچھا لگتا تھا۔ لمبا قد، گورا رنگ، سلیقے سے جمے ہوئے بال اور مسکراتا ہوا چہرہ، نہ جانے کتنی لڑکیاں اس پر مرتی ہوں گی لیکن غم روزگار نے اسے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ کسی کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھتا۔ وہ جب صبح تیار ہوکر دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلتا تو میں اپنی کھڑکی میں کھڑے ہوکر اسے دیکھا کرتی۔ ہمارے گھر میں کوئی اچھی چیز مثلاً نہاری، پائے، بریانی یا کڑھی وغیرہ پکتی تو میں اس کے لیے ضرور لے کر جاتی مجھے معلوم تھا کہ اسے میٹھا پسند ہے چنانچہ ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ کھیر یا کسٹرڈ وغیرہ ضرور بناتی۔

اس کے والد کے انتقال پر ہمارا اس کے گھر آنا جانا بڑھ گیا۔ ہر جمعرات کو قرآن خوانی ہوتی جس میں ہم سب گھر والے باقاعدگی سے جاتے۔ اس کے علاوہ بھی اس کی والدہ اور بہنوں کی دل جوئی کے لیے میں زیادہ وقت ان کے ساتھ ہی گزارتی۔ اس کی ایک بہن کا رشتہ والد کی زندگی میں ہی طے ہوگیا تھا ان کے چالیسویں کے بعد لڑکے والوں نے شادی کے لیے تقاضا شروع کردیا۔ شاکر کے چچا اور ماموؤں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ اچھا ہے اس فرض سے فارغ ہوجائیں۔

ان کے خاندان میں ایک اچھی بات یہ تھی کہ سب لوگ جہیز کی تیاری میں حصہ ڈالتے تھے۔ ایک چچا نے فرنیچر کا انتظام کردیا تو دوسرے نے برات کے کھانے کی ذمے داری لے لی۔ شاکر کے چار ماموں اور چار خالائیں تھیں۔ ان سب نے مل کر کپڑوں، زیور اور بقیہ سامان کا انتظام کردیا اور کچھ لوگوں نے شادی سے پہلے ہی نقد رقم دے دی تاکہ دیگر اخراجات پورے ہوسکیں۔ اس طرح شاکر اور اس کی والدہ کا بوجھ کافی کم ہوگیا۔

شادی کی تیاریوں میں، میں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ میں رات کو دیر تک شاکر کی والدہ کے ساتھ بیٹھ کر مختلف کام کرواتی۔ دوپٹوں پر بیل لگانا، جوڑوں کی پیکنگ اور ایسے ہی مختلف نوعیت کے کام کروائے۔ اس کے علاوہ کچن کا کام بھی سنبھال رکھا تھا۔ شاکر بھی کافی مصروف تھا، وہ جب تھکا ہارا گھر آتا تو میں اسے چائے بنا کر دیتی اور وہ جب اپنی دلفریب مسکراہٹ چہرے پر سجا کر میرا شکریہ ادا کرتا تو میرا انگ انگ خوشی سے جھوم اٹھتا۔

رفتہ رفتہ ہم غیر محسوس طریقے سے ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ یہ پتا ہی نہیں چلا کہ کیوپڈ نے کب تیر چلایا اور ہم دونوں گھائل ہوگئے۔ میں نے محسوس کیا کہ شاکر مجھ سے قریب ہونے اور بات کرنے کے بہانے ڈھونڈنے لگا ہے۔ میں نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی اور چند ہی دنوں میں ہم ایک جان دو قالب ہوگئے چونکہ اس نے کھل کر اظہار نہیں کیا لیکن میں جان چکی تھی کہ وہ مجھ سے محبت کرنے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

لگا ہے۔

شادی کی مصروفیت میں اسے محبت کا اظہار کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن بہن کو رخصت کرنے کے بعد اس نے ایک دن اپنے دل کا حال کہہ دیا۔

اس روز بارش ہو رہی تھی۔ میں نے پکوڑے بنائے اور چائے کے ساتھ شاکر کے سامنے رکھ دیئے۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی دفتر سے آیا تھا۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس وقت میرا دل پکوڑے کھانے کو چاہ رہا تھا۔''

''میں نے ٹیلی پیتھی سیکھ رکھی ہے۔'' میں نے شوخ لہجے میں کہا۔ ''دلوں کا حال میں جانتی ہوں۔''

''اچھا بتاؤ۔ میرے دل میں اور کیا چل رہا ہے؟''

''اگر سب کچھ میں نے بتا دیا تو تمہارے پاس کہنے کے لیے کیا رہ جائے گا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''کچھ تم بھی تو کہو۔''

''اچھا تو سنو'' اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''تم میرے اتنے قریب آ چکی ہو کہ اب دوری کا تصور بھی محال ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ تھوڑا بہت فاصلہ بھی ختم ہو جائے۔ کیا تم میری شریک سفر بننا پسند کرو گی؟''

''مجھے نہیں معلوم'' میں نے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھتے ہوئے کہا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جسے میں دل ہی دل میں چاہتی ہوں وہ مجھے اتنی آسانی سے مل جائے گا۔ بظاہر مجھے اس ملن میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاکر کی امی سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ سیدھی سادی خاتون تھیں اور میں جانتی تھی کہ وہ بیٹے کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کریں گی البتہ مجھے اپنے ابو کی طرف سے ڈر تھا۔ ہر باپ کی طرح ان کی بھی خواہش تھی کہ میری شادی کسی کھاتے پیتے گھرانے میں ہو اور میں ایک خوش حال زندگی گزاروں۔ شاکر کسی طرح بھی ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ وہ اپنی تعلیم مکمل نہیں کر سکا اور اس کی ملازمت بھی بہت معمولی تھی۔ اوپر سے ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمے داری۔ میرے لیے اس کے پاس کیا بچتا۔

لیکن مجھ پر تو عشق کا بھوت سوار تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر کسی نے بھی شاکر کی مخالفت کی تو میں ساری زندگی شادی نہیں کروں گی۔ شاکر نہیں تو کوئی نہیں۔ اب مجھے انتظار تھا کہ شاکر اپنی ماں کو کب بھیجتا ہے۔ اس کے بعد ہی

مینٹگمری برنارڈ لاء
(1887ء۔1976ء)

برطانوی فوجی افسر۔ 1908ء میں وردک شائر رجمنٹ میں شامل ہوئے۔ پہلی جنگ عظیم میں فرانس کے محاذ پر خدمات انجام دیں۔ دوسری جنگ عظیم میں شمالی افریقا میں اتحادیوں کی آٹھویں فوج کی کمان سنبھالی اور اکتوبر 1942ء میں العلمین کے محاذ پر جرمن فوجوں کو شکست فاش دی۔ 1944ء میں نارمنڈی (شمالی مغربی فرانس) پر حملہ کرنے والی اتحادی افواج کے کمانڈر مقرر ہوئے۔ 1945ء میں ہالینڈ، بیلجیم، ڈنمارک کے بعد شمالی جرمنی کا علاقہ فتح کر لیا، اسی سال فیڈ ریشن کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1946ء میں وائی کاؤنٹ بنائے گئے۔ 1948ء میں مغربی یورپ کی رفاعی کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ 1951ء تا 1958ء نیٹو کی افواج کے ڈپٹی سپریم کمانڈر رہے۔

منجنیق

عربی لفظ گوپھی۔ انگریزی Catapult جو لاطینی Catapalta سے ماخوذ ہے۔ ایک قدیم جنگی مشین جس کی دو قسمیں مروج تھیں۔ چھوٹی منجنیق سے تیر و آتش اور بڑی سے بھاری پتھر اور کھولتے ہوئے تیل کے پیپے پھینک جاتے تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں غالباً سب سے پہلے محمد بن قاسم نے یہ مشین استعمال کی۔ اس کا نام عروسک تھا اور اس سے عربوں نے دیبل کا قلعہ ڈھایا تھا۔ چودھویں صدی عیسوی میں توپ کی ایجاد سے منجنیقوں کا استعمال متروک ہو گیا۔

منجھ روپ

انڈے سے باہر آنے کے بعد ہر کیڑا مختلف حالتوں سے گزرتا ہے۔ پہلی حالت کو پہلا روپ اور دوسری حالت کو پوپا یا منجھ روپ کہتے ہیں۔ پہلا روپ ختم ہونے پر کیڑا کسی چیز سے چمٹ جاتا ہے یا اپنے اوپر ایک خول چڑھا لیتا ہے اور کچھ مدت کے لیے سو جاتا ہے۔ اس نیند کے دوران اس کے جسم میں نمایاں تبدیلی ہوتی ہے۔ جب وہ جاگتا ہے تو پورا پر دار کیڑا بن چکا ہوتا ہے اور یہ اس کی آخری حالت ہوتی ہے۔

مرسلہ: زہرہ جبیں۔ سکھر

میں کوئی قدم اٹھاتی۔

شاکر کے والد کے انتقال کو چھ ماہ ہونے والے تھے اور قانون کے مطابق ان کی فیملی کو سرکاری مکان خالی کرنا تھا جب انہیں نوٹس ملا تو سب پریشان ہوگئے۔ کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ اگر کوشش کی جائے تو یہی مکان شاکر کے نام الاٹ ہوسکتا ہے۔ شاکر کو بھی یہی تجویز پسند آئی۔ اس کا خیال تھا کہ آئندہ دو تین سالوں میں اس کے دونوں چھوٹے بھائی تعلیم مکمل کرکے برسرروزگار ہوجائیں گے تو وہ لوگ کرائے کے مکان میں شفٹ ہوسکتے ہیں۔ اس طرح شاکر کی مجبوری بھی ختم ہوجائے گی اور وہ کوئی بہتر ملازمت تلاش کرسکے گا۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ مکان شاکر کے نام الاٹ ہوگیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنا بی کام مکمل کرے تاکہ اس کے لیے آگے بڑھنے کا راستہ ہموار ہوسکے۔ اس نے میری بات مان لی اور پوری سنجیدگی کے ساتھ امتحان کی تیاری کرنے لگا۔ مجھے پوری اُمید تھی کہ بی کام کرنے کے بعد اسے کسی بینک یا پرائیویٹ فرم میں اچھی ملازمت مل جائے گی تب تک اس کا دوسرا بھائی بھی کام پر لگ جائے گا اور دونوں مل کر کوئی بڑا مکان لے لیں گے پھر شاید ابو کو کوئی اعتراض نہ ہو۔ یہ میری ہی پلاننگ تھی کہ جب شاکر کے دونوں بھائی برسرروزگار ہوجائیں گے اور اس کی بہنوں کی شادیاں ہوجائیں گی تو اس پر کوئی ذمے داری نہیں رہے گی اور ہم آرام سے زندگی بسر کرسکیں گے۔

میری ساری پلاننگ اس وقت دھری کی دھری رہ گئی جب ایک دن پھوپی اچانک ہمارے گھر آئیں اور اپنے بیٹے سہیل کے لیے میرا رشتہ مانگا۔ ابو نے پہلے تو میری پڑھائی کا بہانہ بنا کر ٹالنا چاہا لیکن وہ بضد تھیں کہ فی الحال رشتہ طے کردیا جائے شادی میرے امتحانوں کے بعد ہوگی۔ ابو اس پر تیار نہ ہوئے، دراصل وہ خود بھی سہیل کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ صرف میٹرک پاس تھا اور باپ کے پیسے پر عیش کررہا تھا۔ پھوپا کا پراپرٹی اور کنسٹرکشن کا کاروبار تھا اور وہ دونوں ہاتھوں سے کمارہے تھے۔ سہیل سارا دن دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا اور شام کو کچھ دیر کے لیے باپ کی ایجنسی میں جاکر بیٹھ جاتا۔

ابو نے اس وقت تو پھوپی کو ٹال دیا لیکن میں جانتی تھی کہ وہ اتنی آسانی سے ماننے والی نہیں۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر انہوں نے زیادہ اصرار کیا تو ابو کہیں بہن کی محبت میں آکر اس رشتہ کے لیے ہاں نہ کردیں، لہٰذا میں نے فوری طور پر یہ بات شاکر کو بتائی اور اس سے کہا کہ وہ اپنی والدہ کو ہمارے گھر بھیج دے۔ شاکر ڈر رہا تھا کہ کہیں اس کی کم حیثیت اور ذمے داریوں کو دیکھتے ہوئے ابو انکار نہ کردیں لیکن میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنی والدہ کو بھیج دے، باقی سب میں سنبھال لوں گی۔

ابو نے اس کی والدہ کو صاف انکار تو نہیں کیا لیکن یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ میری امی اور بھائیوں سے مشورہ کرکے جواب دیں گے۔ میں نے امی سے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر میری شادی شاکر سے نہیں ہوئی تو کسی سے بھی نہیں ہوگی۔ میں نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ ہر لحاظ سے سہیل سے بہتر ہے۔ سہیل صرف میٹرک پاس ہے اور شاکر بی کام کا امتحان دے رہا ہے پھر اسے کوئی اچھی نوکری مل جائے گی اس کے علاوہ بھائیوں کے برسرروزگار اور بہنوں کی شادیاں ہونے کے بعد اس پر سے ذمے داریوں کا بوجھ بھی کم ہوجائے گا۔ شکل وصورت کے معاملہ میں بھی وہ سہیل سے بدرجہ بہتر ہے۔ سہیل کا قد چھوٹا' بدن بھاری اور رنگ گہرا سانولا تھا، اس کے مقابلے میں شاکر دراز قد، چھریرا بدن اور گورے رنگ کا مالک تھا۔ امی بھی سہیل کو پسند نہیں کرتی تھیں انہوں نے ابو کو نہ جانے کیا پٹی پڑھائی کہ وہ شاکر سے میری شادی کرنے پر تیار ہوگئے۔

میری شادی بڑی سادگی سے ہوئی، شاکر کی والدہ نے بہت معمولی بری بنائی تھی لیکن ابو نے جہیز دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ایکس جوڑے، سونے کا ایک سیٹ اور ضرورت کی ہر چیز انہوں نے دی۔ میری نظر میں جہیز اور بری کی کوئی اہمیت نہیں تھی بلکہ مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ میرے دل کی مراد پوری ہوئی اور شاکر مجھے مل گیا۔

شادی کے ابتدائی چند ماہ سکون سے گزر گئے اور مجھے کسی کمی کا احساس نہیں ہوا لیکن رفتہ رفتہ بہت سی تلخ حقیقتیں سامنے آنے لگیں۔ اس گھر میں دو ہی کمرے تھے جن میں سے ایک مجھے دے دیا گیا، دوسرے کمرے میں میری ساس اور نندیں سوتی تھیں، جبکہ دونوں دیور رات کو برآمدے میں بستر لگا لیتے تھے۔ میرے جہیز کا بہت سامان ابھی تک ڈبوں میں بند تھا۔ اس کے رکھنے کے لیے گھر میں کوئی جگہ نہیں تھی اگر کوئی مہمان آجاتا تو اسے بھی میں اپنے کمرے میں بٹھاتی کیونکہ اس گھر میں کوئی تیسرا کمرا نہیں تھا جسے ڈرائنگ روم بنایا جاتا۔ مجھے وہ گھر چھوٹا لگنے لگا، میں چاہتی تھی کہ جلد از

Waqar Azeem
Pakistanipoint

جلد کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ ہم کوئی بڑا مکان کرائے پر لے سکیں۔

میری شادی کے چھ ماہ بعد شاکر کے چھوٹے بھائی ناصر کو ایک ایئر لائن میں جاب مل گئی، میرا خیال تھا کہ اب گھر کے حالات بہتر ہو جائیں گے اور ہمیں کچھ سکون ملے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ناصر فلائٹ اسٹیورڈ تھا اس لیے اس کی فلائٹس لگتی رہتی تھیں، ہر دوسرے تیسرے روز اسے فلائٹ پر جانا پڑتا اور اس کی واپسی ہفتہ دس دن میں ہوتی تھی۔ وہ تھوڑا سا بے وقوف اور فضول خرچ انسان تھا، جس کسی نے بھی کوئی فرمائش کی وہ ضرور پوری کرتا، اس کے علاوہ ہر فلائٹ سے واپسی پر اس کے بیگ میں پرفیوم کی تھیلیاں، چاکلیٹ اور بسکٹوں کے ڈبے اور نہ جانے کیا کیا بھرا ہوتا۔ اس سامان کو وہ بڑی فراخ دلی سے بھائی بہنوں اور رشتہ داروں میں تقسیم کر دیتا۔ اس کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان تلوں میں تیل نہیں اور ہم نے اس سے جو توقعات وابستہ کر رکھی ہیں وہ شاید کبھی پوری نہ ہوں۔

میرا اندازہ درست نکلا، اس کی ملازمت کو ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ وہ اپنی ماموں زاد بہن تہمینہ کو دل دے بیٹھا، اس کے ماموں بڑے چالاک اور شاطر انسان تھے اور بیٹی بھی باپ پر گئی تھی، انہوں نے ناصر کی سادگی سے فائدہ اٹھایا اور اسے پوری طرح اپنے جال میں پھانس لیا، پہلے تو انہوں نے ناصر سے خوب تحفے بٹورے، پھر تہمینہ نے اس پر شادی کے لیے زور دینا شروع کر دیا اور کہا کہ ابا دل کے مریض ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی زندگی میں ہی میری شادی ہو جائے۔

ناصر اس کی باتوں میں آ گیا اور اس نے ماں سے کہا کہ وہ تہمینہ کا رشتہ مانگنے ماموں کے گھر چلی جائیں، میری ساس یہ سن کر سناٹے میں آ گئیں، ان کا خیال تھا کہ وہ کم از کم دو بیٹیوں کو رخصت کرنے کے بعد ناصر کی شادی کریں گی۔ ویسے بھی انہیں تہمینہ پسند نہیں تھی، ان کے خیال میں وہ بہت درجہ کی چالاک، مغرور اور بدمزاج لڑکی تھی۔ وہ ناصر کی شادی اپنی بہن کی بیٹی سے کرنا چاہ رہی تھیں، لہٰذا انہوں نے تہمینہ کا رشتہ مانگنے سے انکار کر دیا اور ناصر کو بھی سمجھایا کہ وہ اس کا خیال دل سے نکال دے وہ لڑکی اس گھر کی بہو بننے کے قابل نہیں ہے۔

ناصر پر اس نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوا، وہ یہی سمجھا کہ ماں کو اس کی خوشی عزیز نہیں ہے، چنانچہ اس نے خفیہ طور پر تہمینہ سے شادی کر لی، نکاح ماموں کے گھر ہوا اور اس میں صرف تہمینہ کے بہن بھائی شریک ہوئے، اس کے علاوہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی، اگلے روز ناصر اپنی بیوی کو لے کر اسلام آباد چلا گیا اور اس نے وہاں سے شاکر کو فون کر کے اپنی شادی کی خبر سنائی۔

میری ساس کے قدموں تلے زمین نکل گئی، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ ناصر ان کی مرضی کے خلاف اتنا بڑا فیصلہ کر لے گا۔ وہ شدید غصہ میں تھیں شاکر نے انہیں سمجھایا کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا، بہتر یہی ہے کہ وہ حقیقت کو قبول کر لیں لیکن انہوں نے فیصلہ سنا دیا کہ ان کے جیتے جی تہمینہ اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ناصر نے اسلام آباد سے واپس آنے کے بعد تہمینہ کو اس کے میکہ میں چھوڑا اور خود فلائٹ پر چلا گیا۔

چھ ماہ تک یونہی چلتا رہا، ناصر ایک دو دن کے لیے آتا اور تہمینہ کے ساتھ وقت گزار کر دوبارہ فلائٹ پر چلا جاتا پھر جب تہمینہ کے چھوٹے بھائی کی شادی ہونے لگی تو اس نے ماموں کے قریب میں ہی ایک گھر کرایہ پر لے لیا اور تہمینہ کو لے کر وہاں شفٹ ہو گیا۔ اسی دوران شاکر کی ایک اور بہن کا رشتہ طے پا گیا تو میری ساس نے مصلحتاً ناصر کو معاف کر دیا کیونکہ اس موقع پر انہیں ناصر کی مدد کی ضرورت تھی، اس بہانے ناصر ماں سے ملنے آنے لگا۔

اگلے پانچ سالوں میں بہت سی تبدیلیاں آئیں لیکن ہمارے حالات جوں کے توں رہے بلکہ تنگدستی میں کچھ اور اضافہ ہوا۔ جو کچھ میں نے اور شاکر نے سوچا تھا وہ سراب نکلا، شاکر کے دونوں چھوٹے بھائی پڑھ لکھ کر برسر روزگار ہو گئے، انہوں نے اپنی پسند سے شادیاں کیں اور بیویوں کو لے کر الگ ہو گئے اس میں کچھ قصور میری ساس کا بھی تھا، میرے علاوہ ان کی کسی بہو سے نہیں بنی، وہ ان کے معاملات میں حد درجہ مداخلت کرتی تھیں جسے آج کل کوئی بھی لڑکی برداشت نہیں کرتی۔

میرے ساتھ ان کا رویہ کچھ بہتر تھا شاید اس لیے کہ میں ان کے کہنے پر چلتی تھی، دوسرے انہیں شاکر کی قربانی کا بھی احساس تھا جو انہوں نے اپنے بہن بھائیوں اور اس گھر کے لیے دی تھیں وہ شاکر کو کسی قیمت پر بھی اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتی تھیں، اب وہی ان کے بڑھاپے کا سہارا تھا، وہ ڈرتی تھیں کہ اگر شاکر بھی الگ ہو گیا تو وہ اپنی بیٹیوں کو لے کر کہاں جائیں گی۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint

کچھ وقت اور گزرا، میری بقیہ دو نندوں کی بھی شادیاں ہوگئیں، شاید میری ساس کے پاس اتنی ہی مہلت تھی، سب سے چھوٹی بیٹی کی شادی کے ایک ماہ بعد وہ بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں اور اس گھر میں صرف ہم دو میاں بیوی رہ گئے، وہ گھر جو پہلے مجھے بہت چھوٹا لگتا تھا، اب بھائیں بھائیں کرنے لگا، ہماری پلاننگ مکمل طور پر ناکام ہوچکی تھی، شاکر کے بھائی ایک ایک کر کے الگ ہوگئے، ان تینوں نے اپنی دنیا بسالی۔ اب شاکر کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا کہ وہ نئی ملازمت ڈھونڈنے کی بجائی اسی دفتر میں کام کرتا رہے ورنہ اسے مکان سے ہاتھ دھونا پڑ جائے گا کیونکہ مکانوں کے کرائے اتنے زیادہ ہوگئے تھے کہ اچھی ملازمت ملنے کے باوجود وہ یہ کرایہ نہیں دے سکتا تھا۔ اس کی آدھی تنخواہ اسی میں نکل جاتی، اگر بھائی ساتھ رہ رہے ہوتے تو اسے اتنی مشکل پیش نہ آتی۔

میرے سارے خواب چکنا چور ہوگئے تھے، عرصہ ہوا میں نے اپنے لیے کوئی نیا سوٹ نہیں بنوایا تھا، اسی لیے شادیوں اور دیگر تقریبات میں جانا چھوڑ دیا۔ کب تک میں اپنی شادی کے پرانے جوڑے پہنتی، وہ سب آؤٹ آف فیشن ہوچکے تھے، شاکر کا بھی یہی حال تھا۔ وہ پرانے کپڑے پہن کر دفتر جاتا، اس کی قمیصوں کے کالر گھس چکے تھے اور پتلونیں اپنی عمر پوری کر چکی تھیں لیکن ہم دونوں ہی نئے کپڑے بنوانے کی پوزیشن میں نہیں تھے، شاکر کی محدود تنخواہ میں کچن کا خرچ ہی مشکل سے چل رہا تھا، کپڑے کہاں سے بنتے۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ مہنگائی بڑھتی جارہی تھی اور دو وقت کی روٹی کا انتظام کرنا مشکل ہو رہا تھا، ہم نے اپنے اخراجات بہت کم کردیئے تھے اور صرف انتہائی ضروری چیزیں خریدتے تھے، بکرے کا گوشت تو دور کی بات اب تو گائے کا گوشت بھی ہماری دسترس سے باہر تھا بلکہ دالیں اور سبزیاں بھی ہماری پہنچ سے باہر ہوتی جارہی تھیں۔ میں نے دودھ پتی اور چینی کا خرچ بچانے کے لیے شام کی چائے چھوڑ دی تھی صرف شاکر کے لیے ایک کپ بناتی تھی پھر میں نے ایک وقت کھانا بنانا شروع کردیا، میں دوپہر میں رات کی بچی ہوئی روٹی اور سالن سے گزارہ کرلیتی تھی۔

ایک دن شاکر کا ایک دوست اپنی بیوی کے ہمراہ ہمارے گھر آیا۔ وہ شاکر کے ساتھ ہی کام کرتا تھا، دونوں کا عہدہ اور تنخواہ ایک ہی تھی لیکن وہ شاکر کے مقابلہ میں بہت زیادہ مطمئن اور خوش حال نظر آرہا تھا۔ اس نے کلف لگا ہوا کاٹن کا شلوار سوٹ اور قیمتی سینڈل پہنے ہوئے تھے، اس کی بیوی بھی بڑی خوبصورت اور اسمارٹ تھی اس نے برانڈڈ سوٹ پہن رکھا تھا۔ گلے اور کانوں میں بیش قیمت ایمی ٹیشن جیولری تھی، اس کے چہرے سے بھی بے فکری اور اطمینان جھلک رہا تھا۔

ان کے جانے کے بعد میں نے شاکر سے پوچھا۔

''کیا تمہارے دوست کی اوپر کی آمدنی بھی ہے؟''

''نہیں، ہمارے دفتر میں اوپر کی آمدنی کا کوئی تصور نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''حیرت ہے'' میں نے کہا۔ ''اس کی تنخواہ بھی تمہارے برابر ہی ہے لیکن ان کی ظاہری حالت، ہم سے بدرجہ بہتر ہے۔''

''دراصل اسے اپنی بیوی کی سپورٹ ہے، وہ کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کرتی ہے اور اس کی تنخواہ اپنے شوہر سے تقریباً دگنی ہے۔''

شاکر کی بات سن کر میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا کہ میں بھی اگر ملازمت کرلوں تو ہمارے حالات کچھ بہتر ہوسکتے ہیں۔ میں نے جب شاکر سے بات کی تو وہ بولا۔

''تمہیں کوئی ڈھنگ کی ملازمت نہیں مل سکتی کیونکہ تم گریجویٹ بھی نہیں ہو۔''

مجھے پچھتاوے کا شدید احساس ہونے لگا، دراصل جب شاکر سے میرا رشتہ طے ہوا اس وقت میں انٹر میں تھی۔ نجمہ پھوپی سے جان چھڑانے اور شاکر سے شادی کرنے کی مجھے اتنی جلدی تھی کہ میں نے اپنی تعلیم مکمل کرنے پر توجہ نہیں دی۔ یہ مجھ جیسی کئی لڑکیوں کا مسئلہ ہے جن کے نزدیک پڑھائی سے زیادہ شادی کی اہمیت ہے۔ وہ صرف شادی کے انتظار میں وقت گزاری کے لیے پڑھتی رہتی ہیں اور رشتہ طے ہوتے ہی ان کی توجہ پڑھائی سے ہٹ جاتی ہے اور وہ آئندہ زندگی کے سہانے سپنے دیکھنے لگتی ہیں۔

میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ مجھے یہ خیال ہی نہ رہا کہ شادی سے پہلے اپنی تعلیم مکمل کرلوں دراصل مجھے نجمہ پھوپی سے خطرہ تھا، ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی نئی چال چل دیں اور ابو ان کی باتوں میں آکر اپنا فیصلہ بدل دیں اس لیے جب میری شادی کی تاریخ طے ہوئی تو میں نے تعلیم کے بارے میں بالکل نہیں سوچا حالانکہ اگر میں ابو اور شاکر سے کہتی تو میری شادی امتحانوں کے بعد بھی ہوسکتی تھی۔

Wadan Azeem
Pakistanipoint

شاکر کے احساس دلانے پر مجھے یہ خیال آیا کہ میں صرف انٹر پاس ہوں اور اس معمولی قابلیت کے بل بوتے پر کوئی ڈھنگ کی ملازمت ملنا بے حد مشکل ہے، اس کے باوجود میں نے ملازمت کی تلاش شروع کردی۔ میرا خیال تھا کہ کسی پرائیویٹ اسکول میں مجھے جونیئر ٹیچر کی جاب مل سکتی ہے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ہم سرکاری کالونی میں رہتے تھے اور وہاں دور دور تک کوئی پرائیویٹ اسکول نہیں تھا۔ اس کے لیے مجھے کسی دوسرے علاقہ میں جانا پڑتا اور میری آدھی سے زیادہ تنخواہ کرائے میں ہی خرچ ہوجاتی۔

اس کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری اور مختلف اسکولوں کے چکر لگانا شروع کردیئے۔ وہ سب میرے گھر سے کئی میل کے فاصلے پر تھے، کئی جگہوں پر بس بھی نہیں جاتی تھی، وہاں جانے کے لیے رکشا کرنا پڑتا تھا۔ میری یہ ساری محنت اکارت گئی کیونکہ ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ فی الحال کوئی جگہ نہیں ہے، اس کے علاوہ ان کے یہاں ٹیچر کے لیے کم از کم تعلیمی قابلیت گریجویشن تھی۔

ایک اسکول میں بات بنتی نظر آئی، انہوں نے مجھے ایڈمنسٹریشن میں کلرک کی جاب آفر کی لیکن تنخواہ اتنی کم تھی کہ میں نے معذرت کرلی پھر وہ اسکول ایک ایسے علاقہ میں تھا جہاں بسیں نہیں جاتی تھیں، اس کے لیے مجھے گاڑی لگانا پڑتی۔ چھ میں سے چار ہزار اس گاڑی والے کو دیتی تو مجھے کیا بچتا اس لیے مایوس ہوکر ملازمت کی تلاش ترک کردی۔

شادی کو چھ سات سال ہوگئے لیکن میری گود ابھی تک ہری نہیں ہوئی تھی، اب میرے کانوں میں ایسی آوازیں پڑنے لگی تھیں کہ شاکر کو دوسری شادی کرلینی چاہیے ان میں میری دیورانی تہمینہ پیش پیش تھی۔ اس کی شادی مجھ سے بعد میں ہوئی تھی لیکن اس کے یہاں دو بچے ہوچکے تھے۔ شاکر کے سبھی بہن بھائی صاحب اولاد تھے، اس لیے اسے بھی محرومی کا احساس ہونے لگا گو کہ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن میں جانتی تھی کہ اسے اولاد نہ ہونے کا دکھ ہے۔

میں محسوس کررہی تھی کہ اس کی بے رخی بڑھتی جارہی ہے، رشتہ داروں اور ملنے جلنے والوں کی باتیں سن کر وہ بھی ہی سوچتا ہوگا کہ بچہ پیدا نہ ہونے میں سارا قصور میرا ہے۔ یک دن تو حد ہی ہوگئی، تہمینہ کے بیٹے کا عقیقہ تھا، شاکر کے سب بہن بھائی جمع تھے۔ ان کے بچوں کی وجہ سے اچھی خاصی رونق ہوگئی تھی، تبھی تہمینہ کی ماں نے کہا ''شاکر میاں، ہم کب تک تمہارے وارث کا انتظار کرتے رہیں گے۔''

شاکر کچھ شرمندہ سا ہوگیا۔ وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ممانی، میری کون سی لمبی چوڑی جایداد ہے جس کے لیے وارث کی تمنا کروں۔''

''اے ہے، یہ تم نے خوب کہی، کیا غریبوں کے یہاں بچے نہیں ہوتے۔ میاں، اولاد سے ہی نسل چلتی ہے ورنہ کوئی تمہاری قبر پر فاتحہ پڑھنے والا نہ ہوگا میری مانو تو دوسری شادی کرلو۔''

میں نے دیکھا کہ شاکر کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ اس کی نظریں بے اختیار میری جانب اٹھ گئیں پھر وہ جلدی سے بولا۔ ''چھوڑیں بھی ممانی جان، آپ بھی کیا قصہ لے بیٹھیں، اس مہنگائی کے زمانہ میں مجھ سے ایک نہیں سنبھل رہی، دوسری کو کہاں سے کھلاؤں گا۔''

''ارے میاں، تم ایک دفعہ ہاں تو کرو، تمہاری شادی ایسی جگہ کراؤں گی کہ سارے دلدر دور ہوجائیں گے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اب تمہاری شادی کسی ایسی لڑکی سے ہونی چاہیے جو تم پر بوجھ بننے کے بجائے تمہارا سہارا بنے۔''

''میں اب بھی نہیں سمجھا ممانی جان۔''

''ارے میاں، تم تو سدا کے کوڑھ مغز ہو۔ اتنی سیدھی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ تمہاری شادی اس لڑکی سے ہونی چاہیے جو ملازمت کرتی ہو۔''

''وہ لڑکی مجھ سے کیوں شادی کرے گی۔ کیا اسے کوئی کنوارا نہیں مل رہا۔''

''یونہی سمجھ لو، بہت سی لڑکیوں کی کسی وجہ سے شادی نہیں ہوتی اور ان کی عمر زیادہ ہوجاتی ہے یوں ان کے لیے کنوارے لڑکوں کے رشتے آنا بند ہوجاتے ہیں کیونکہ آج کل ہر لڑکا کم عمر اور خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ چاہے وہ خود موٹا، گنجا، بدصورت اور پچاس سال کا ہو۔''

''ممانی، مجھے تو معاف ہی رکھیں۔'' شاکر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں دو کشتیوں میں سوار ہوکر اپنی اچھی خاصی پُرسکون زندگی کو جہنم نہیں بنانا چاہتا۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' ممانی نے بے زاری سے کہا۔ ''میں نے تو تمہارے فائدے کے لیے ہی کہا تھا۔''

وہ سب باتیں میری موجودگی میں کررہی تھیں۔ انہیں

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

یہ خیال بھی نہیں آیا کہ شاکر کی دوسری شادی کا سن کر میرے دل پر کیا گزرے گی۔ جی میں آیا کہ انہیں ایسا کرارا جواب دوں کہ ان کی طبیعت صاف ہوجائے۔ ان سے یہی کہتی کہ اگر تمہیں بھی میری طرح بے اولاد ہوتی تو کیا آپ اپنے داماد کو بھی یہی مشورہ دیتیں لیکن ان کی تجویز نے میرے ذہن میں سوچ کا ایک نیا دروازہ کھول دیا۔ ان کی تجویز حقیقت پسندانہ تھی اور اس پر عمل کر کے ہماری مشکلات میں کمی ہوسکتی ہے۔

گھر آنے کے بعد شاکر نے لباس تبدیل کیا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گیا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ وہ جب بھی پریشان یا کسی سوچ میں غرق ہوتا تو اسی طرح آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر لیٹ جاتا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ ممانی کی تجویز نے اس کے دماغ میں ہلچل مچادی ہے اور وہ اسی کے بارے میں سوچ رہا ہے۔

میں نے اس وقت اس سے بات کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن اگلے روز جب وہ دفتر سے واپس آیا تو میں ایک فیصلہ کرچکی تھی، جب وہ کھانا کھا چکا تو میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''شاکر۔ تم نے ممانی کی تجویز کے بارے میں کیا سوچا؟''

''ایسی بے ہودہ تجویز کے بارے میں کیا سوچنا؟''

''میرا خیال ہے کہ انہوں نے کوئی ایسی غلط بات نہیں کی، اگر تم ٹھنڈے دل سے سوچو تو اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے۔''

''یہ۔ یہ تم کہہ رہی ہو زرینہ'' وہ حیرت سے بولا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ کوئی عورت سوکن کا وجود برداشت کرسکتی ہے۔''

''تم نے ٹھیک کہا۔ واقعی کوئی عورت سوکن کا وجود برداشت نہیں کرسکتی لیکن یہ ہماری مجبوری ہے اس لیے میں یہ کڑوا گھونٹ پینے کے لیے تیار ہوں۔''

''ایسی کیا مجبوری ہے جس کی وجہ سے میں دوسری شادی کرلوں۔''

''دیکھو شاکر۔ ہماری شادی کو اتنا عرصہ ہوگیا لیکن ہم ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہیں۔ تم زبان سے کچھ نہیں کہتے لیکن تمہیں اولاد نہ ہونے کا دکھ ہے اور تم احساس محرومی میں مبتلا ہوگئے ہو۔ لوگ اولاد کی خاطر دوسری شادی کرتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔''

''اور اگر اس سے بھی اولاد نہ ہوئی تو؟''

''پھر خدا کی مرضی۔ ہم تقدیر سے نہیں لڑ سکتے؟''

''میں اپنی قسمت پر شاکر ہوں۔ اگر میرے مقدر میں اولاد کی خوشی ہے تو وہ تم بھی دے سکتی ہو۔ اس کے لیے دوسری شادی کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی، تم دیکھ رہے ہو کہ ہمارے مالی حالات دن بہ دن خراب ہوتے جارہے ہیں۔ تمہاری تنخواہ سے کچن کا خرچ بھی پورا نہیں ہوتا۔ مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ ایک وقت روٹی کھانا بھی مشکل ہوگیا ہے۔ ممانی ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں کہ کسی ملازمت پیشہ لڑکی سے شادی کرلو گے تو ہمارے دلدر دور ہوجائیں گے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ غرایا۔ ''اب میں بیوی کی کمائی کھاؤں گا۔''

''یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں ہوگی۔ آج کل ہر جگہ یہی ہورہا ہے، صرف ایک کمائی سے گھر نہیں چلتا۔ ایک اچھی اور خوش حال زندگی گزارنے کے لیے گھر کے ہر فرد کو کام کرنا پڑتا ہے، اسی لیے آج کل کے لڑکے ملازمت پیشہ لڑکیوں کو ترجیح دیتے ہیں تاکہ انہیں بیوی کی طرف سے سپورٹ مل سکے۔ تم اپنے دوست کی مثال لے لو جو تمہارے ساتھ دفتر میں کام کرتا ہے۔ اس کی بیوی ملازمت کرتی ہے، تم نے دیکھا نہیں کہ ان کی ظاہری حالت ہم سے بدرجہ بہتر تھی۔''

''میری سمجھ میں تمہاری کوئی بات نہیں آرہی۔ تم نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ کیا یہ سب اتنا ہی آسان ہے جس طرح تم کہہ رہی ہو۔''

''تمہارے تصور سے بھی زیادہ آسان۔ تم ایک بار اس بارے میں سوچو تو سہی۔''

جائز طریقے سے ایک دوسری عورت کا قرب، مالی خوشحالی اور اولاد کی آرزو۔ یہ تینوں ایسے پُرکشش عوامل تھے کہ شاکر زیادہ دیر مزاحمت نہ کرسکا۔ سب سے بڑھ کر اسے یہ اطمینان تھا کہ میں اسے دوسری شادی کے لیے قائل کررہی تھی ورنہ عام طور پر کوئی عورت سوکن کو برداشت نہیں کرسکتی اور اگر مرد دوسری شادی کی خواہش کرے تو رونا پیٹنا ڈال دیتی ہے۔ یہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا میں اپنے شوہر کو دوسری شادی کے لیے مجبور کررہی تھی۔

''اچھی طرح سوچ لو'' شاکر نے پسپائی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر بعد میں جھگڑے ہوئے تو میں ذمے دار نہیں ہوں گا۔''

''میں اس کی نوبت ہی نہیں آنے دوں گی۔ اگر میری

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

طرف سے کوئی بات ہوئی تو اس سے معافی مانگ لوں گی اور اس کی غلطی ہوئی تو اسے معاف کردوں گی۔''

''کیا تم اپنی محبت کا بٹوارہ برداشت کرلوگی؟''

''ایک خوش حال زندگی اور تمہارے بچے کی خاطر میں سب کچھ برداشت کرلوں گی۔ بس تم ہاں کردو.....''

شاکر کی رضامندی جان لینے کے بعد میں اس کی ممانی کے پاس گئی اور انہیں بتایا کہ شاکر دوسری شادی کرنے کے لیے تیار ہوگیا ہے۔ اب وہ اس کے لیے کوئی ملازمت پیشہ لڑکی تلاش کریں۔ وہ یہ سن کر حیران رہ گئیں۔ شاید انہیں یہ توقع نہیں تھی کہ میں اتنی آسانی سے شاکر کو دوسری شادی کی اجازت دے دوں گی۔ بلکہ اس کے لیے لڑکی بھی تلاش کروں گی۔ انہوں نے مجھے غور سے دیکھا اور بولیں۔

''اچھی طرح سوچ لو۔ سوکن کے ساتھ گزارہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔''

''میں نے سوچ لیا ہے۔ مجھ سے شاکر کی اداسی نہیں دیکھی جاتی۔ اسے اولاد نہ ہونے کا دکھ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دوسری شادی کرکے اس کی یہ محرومی دور ہوجائے۔''

ممانی کے ملنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ انہوں نے شاکر کے لیے مطلوبہ معیار کی لڑکی تلاش کرنا شروع کی اور بہت جلد انہیں کامیابی ہوگئی۔ عذرا' ان کی کسی سہیلی کی رشتہ دار تھی۔ اس کے توسط سے ان کی عذرا کے گھر والوں تک رسائی ہوئی۔ اس لڑکی کی عمر تیس کے قریب تھی۔ وہ طلاق یافتہ تھی اور کسی بینک میں سینئر گریڈ آفیسر کے طور پر کام کررہی تھی۔ ممانی نے بتایا کہ بہت جلد وہ برانچ منیجر بننے والی ہے۔

میرے لیے سب سے زیادہ اطمینان کی بات اس کا طلاق یافتہ ہونا تھا ایسی لڑکیاں دوسری شادی کے بعد شوہر اور سسرال والوں سے دب کر رہتی ہیں۔ ممانی اس کی تصویر بھی لے کر آئی تھیں۔ ناک نقشہ اچھا تھا لیکن شکل سے ہی وہ کچھ مغرور اور بدمزاج لگ رہی تھی لیکن میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ ہوسکتا ہے کہ میری نظریں دھوکا کھا رہی ہوں۔ وہ ایسی نہ ہو جیسا کہ تصویر میں نظر آرہی ہیں۔

ممانی نے انہیں شاکر کی حیثیت اور معمولی تنخواہ کے بارے میں بتادیا تھا جس میں عذرا کے گھر والوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ شاید انہیں یہ اطمینان تھا کہ عذرا اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے علاوہ شاکر کو بھی سپورٹ کرسکتی ہے۔ انہیں صرف اس کی شادی سے دلچسپی تھی۔ وہ اپنی

> ''میس کی ایک کھڑکی سے جھانکو تو چھالیہ کے کشیدہ و قامت پیڑوں کے جھنڈ آپس میں سرگوشیاں کرتے نظر آتے تھے۔ دوسری طرف بالکنی کے باہر چینی چیری کا ایک تناور درخت بانہیں پھیلائے کھڑا تھا۔ پشت کو اٹھی ہوئی پہاڑی کی پیشانی پر ایک عرب رئیس کا بنگلا تھا جس کے زمردیں لان اوپر سے لڑھکتے پھسلتے ہمارے میس کے حاشیے پر آکر رکتے تھے۔ ذرا ہٹ کر ناریل کے پیڑ ایک دوسرے پر جھکے ہوئے تھے۔ جن کا منظر چاندنی راتوں میں بڑا فسوں خیز ہوتا تھا۔ مرشد (چراغ حسن حسرت) فرمایا کرتے چانسری لین کے مناظر جس شخص کے ذوق کی تسکین نہیں کرسکتے اس گدھے کو سارے سوئیزرلینڈ میں گھما لائیے تو بھی اس کے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔''
>
> اقتباس: سنگاپور کا میجر حسرت۔ از: ضمیر جعفری

طلاق یافتہ بیٹی کو زیادہ دیر گھر نہیں بٹھا سکتے تھے اس لیے انہوں نے شاکر کا رشتہ منظور کرلیا۔

شاکر اور عذرا کی شادی بڑی سادگی سے ہوئی۔ نکاح میں چند قریبی رشتہ داروں کے علاوہ کوئی موجود نہ تھا۔ عذرا کے گھر والوں نے بھی کوئی دھوم دھڑکا نہیں کیا اور گھر پر ہی مہمانوں کو کھانا کھلا کر بیٹی کو رخصت کردیا۔ میں نے عذرا کے لیے ایک کمرا تیار کردیا تھا اور خود اپنے لیے دوسرے کمرے میں بستر لگالیا۔ وہ رات میں نے کانٹوں پر گزاری۔ مجھے رہ رہ کر یہ احساس ستا رہا تھا کہ میرا شوہر کسی دوسری عورت کے پہلو میں ہے۔ میں اپنے دل کو سمجھاتی رہی کہ شاکر مجھ سے دور نہیں گیا اور نہ ہی اس نے مجھے زندگی سے نکالا ہے بلکہ وہ اور میں ایک ہی چھت کے نیچے ہیں۔ وہ میرا ہے اور میرا ہی رہے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے مجھ سے دور نہیں کرسکتی۔ میں نے اس کے سکھ کی خاطر یہ قربانی دی ہے جو رائیگاں نہیں جائے گی۔

رات بھر میں انہی طفل تسلیوں سے دل کو بہلاتی رہی۔ صبح اٹھ کر نماز پڑھی اور خدا سے دعا مانگی کہ وہ مجھے اس

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

صدمے کو برداشت کرنے کی ہمت اور طاقت عطا فرمائے پھر کچن میں جا کر دلہا اور دلہن کے لیے ناشتا تیار کیا۔ دروازہ پر دستک دی اور شاکر کو ناشتے کی ٹرے پکڑا کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

آنسوؤں کا سیلاب تھا جو رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ سوکن کو برداشت کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ میرے شوہر نے رات کسی دوسری عورت کے ساتھ گزاری اور میں تنہائی کی آگ میں جلتی رہی۔ کیا اب یہی میرا مقدر ہے کہ روز جیوں اور روز مروں۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔ یہ شادی نہیں ہونی چاہیے تھی لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اب پچھتانے سے کیا حاصل۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ پر آہٹ ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ وہاں شاکر کھڑا ہوا تھا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور چہرے پر شرمندگی کے آثار تھے۔ میں نے کہا ''رک کیوں گئے! اندر آ جاؤ، یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔''

وہ جھجکتا ہوا آگے بڑھا لیکن مجھ سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا پھر وہ آہستہ سے بولا۔ ''میں بہت شرمندہ ہوں۔ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے، یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں شاکر۔ تقدیر میں جو لکھا تھا وہ ہو گیا۔ تم اپنی بیوی کے پاس جاؤ۔ اسے تمہاری ضرورت ہے۔''

ابھی میری بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ عذرا آ گئی اور دروازہ میں کھڑے کھڑے بولی۔ ''شاکر، میں امی کے جا رہی ہوں۔ اگر تم چلنا چاہو تو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔''

''تم چلی جاؤ میں شام کو تمہیں لینے آ جاؤں گا۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' اس نے کہا اور چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کہا۔ ''تمہیں اس کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔ ایک دن کی دلہن اکیلے جاتے ہوئے اچھی نہیں لگے گی۔''

''اس نے مجھے پہلے نہیں بتایا اور نہ ہی مجھ سے پوچھا پھر میں کیوں اس کی مرضی پر چلوں۔''

مجھے بھی عذرا کا یہ انداز کچھ عجیب سا لگا۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ شاکر سے پوچھ کر میکے جاتی۔ اس کے علاوہ اس نے مجھے بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ سلام کرنا تو درکنار اس نے میری طرف دیکھا تک نہیں۔ جیسے میں وہاں موجود ہی نہیں تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آنے والے دنوں میں مجھے کیا کچھ دیکھنے کو ملے گا۔

شام کو شاکر جا کر اسے لے آیا۔ وہ لوگ کھانا کھا کر آئے تھے۔ وہ میری ازدواجی زندگی میں پہلا موقع تھا جب میں نے شاکر کے بغیر کھانا کھایا۔ اس کے بعد یہ تقریباً روز کا معمول بن گیا۔ وہ شام کو چھ بجے کے قریب بینک سے واپس آتی اور اپنے کمرے میں بند ہو جاتی۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد وہ تیار ہو کر باہر نکلتی اور شاکر کو لے کر باہر نکل جاتی رات کا کھانا وہ عموماً اپنے میکے یا کسی ریستوران میں کھاتی۔ وہ گھر میں ہوتی تب بھی کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتی۔ گھر چلانے کی ساری ذمے داری میری تھی اور وہ ایک مہمان کی طرح رہ رہی تھی۔

شاکر نے بھی اس بات کو محسوس کیا۔ کھانا پکانا، برتن اور کپڑے دھونا، گھر کی صفائی اور بازار سے سودا سلف لانا، سب کچھ مجھے ہی کرنا پڑ رہا تھا۔ بالآخر شاکر نے ایک دن کہہ دیا کہ اسے گھر کے کام کاج میں دلچسپی لینی چاہیے۔ سارا کام زرینہ کو ہی کرنا پڑتا ہے۔ اس نے تنک کر جواب دیا۔

''پھر کیا ہوا، وہ پہلے بھی تو کام کرتی تھیں اب کیا نئی بات ہو گئی؟''

''اب تم جو آ گئی ہو، تمہیں بھی اس کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔''

''معاف کرنا شاکر مجھے گھر کا کام کرنے کی عادت نہیں ہے۔ اپنے گھر میں بھی میں نے کبھی کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا۔ بینک سے آنے کے بعد اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ کوئی کام کروں۔''

رفتہ رفتہ عذرا کے جوہر کھلتے گئے۔ وہ حد درجہ بد دماغ اور مغرور تھی۔ مجھے تو وہ کسی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس نے مجھے ہمیشہ حقیر سمجھا، مجھ سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کی اچھی خاصی معقول تنخواہ ہے۔ وہ گھر کے خرچ میں اپنا حصہ ڈالے گی تو ہماری تنگی بھی دور ہو جائے گی لیکن ایسا بھی نہیں ہوا۔ وہ صرف اپنی ذات پر خرچ کرتی تھی۔ اس کی باقی تنخواہ بینک میں جمع ہو رہی تھی۔

میں نے کئی دفعہ سوچا کہ اس سے اس موضوع پر بات کروں لیکن شاکر نے مجھے منع کر دیا اور کہا کہ اگر اسے کوئی احساس نہیں ہے تو تم کیوں اپنے آپ کو اس کی نظروں میں گرانا چاہتی ہو۔

اتفاق سے انہی دنوں عذرا کی پروموشن ہو گئی۔ اسے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

بینک سے گاڑی بھی ملی تھی، اسے یہ مکان چھوٹا لگنے لگا، اس نے شاکر سے کہا کہ ہم کسی اچھے علاقے میں بڑا مکان لے لیتے ہیں لیکن شاکر نے صاف انکار کردیا اور کہا کہ وہ کرایہ کا مکان افورڈ نہیں کرسکتا لیکن عذرا کو تو بڑے مکان میں جانے کا شوق ہورہا تھا۔ اس نے شیخی میں آکر کہہ دیا کہ مکان کا کرایہ وہ دے دیا کرے گی۔ اس طرح ہم چند ہی دنوں میں دوسری جگہ شفٹ ہوگئے۔

پہلے شاکر سرکاری مکان کی وجہ سے وہ معمولی ملازمت کرنے پر مجبور تھا لیکن اب وہ مجبوری ختم ہوگئی تو اس نے دوسری ملازمت کی تلاش شروع کردی اور تھوڑے دنوں بعد ہی اسے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں تقریباً دگنی تنخواہ پر جاب مل گئی۔ میں نے خدا کا شکریہ ادا کیا اور دعا مانگی کہ جلدی سے عذرا کی گود ہری ہوجائے تاکہ شاکر کی محرومی ختم ہو اور وہ ایک بچے کا باپ بن جائے۔

اللہ نے میری سن لی اور بہت جلد مجھے خوش خبری مل گئی لیکن ذرا مختلف انداز میں۔ ہوا یوں کہ ایک روز مجھے ناشتے کے بعد متلی سی محسوس ہوئی۔ میں جلدی سے باتھ روم میں گئی اور ابھی میں واش بیسن تک پہنچی ہی تھی کہ مجھے بہت زور کی الٹی ہوئی اور میرا سر چکرانے لگا۔ میں کلی کرکے واپس آئی اور سوچنے لگی کہ کیا ایسا ممکن ہے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ متلی اور قے، حاملہ ہونے کی علامت ہے لیکن مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ شام کو شاکر گھر آیا تو میں نے اسے یہ بات بتائی، وہ مجھے ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا اور اس نے مجھے ماں بننے کی خوش خبری سنائی۔

شاکر تو یہ سنتے ہی خوشی سے پاگل ہوگیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ وہیں مجھے گود میں اٹھا کر ناچنا شروع کردے۔ گھر آکر جب اس نے عذرا کو یہ خبر سنائی تو اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے مجھے یا شاکر کو مبارکباد تک نہیں دی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ مجھ سے حسد محسوس کررہی ہے کیونکہ وہ شادی کے ایک سال بعد بھی شاکر کو یہ خوش خبری نہیں دے سکی تھی۔

اس دن کے بعد میرے اور اس کے درمیان سرد جنگ شروع ہوگئی، بعض اوقات اس کا رویہ انتہائی توہین آمیز ہوتا تھا۔ وہ بات بات پر میری بے عزتی کرتی اور موقع بہ موقع مجھ سے الجھنے لگی۔ دراصل اسے ساری جلن اس بات کی تھی کہ شاکر دفتر سے آنے کے بعد اب زیادہ وقت میرے ساتھ گزارنے لگا تھا۔ وہ میری غذا اور آرام کا خیال رکھتا اور ہر وقت مجھے خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔ اب عذرا اسے لے کر کہیں گھومنے نہیں جاسکتی تھی اور نہ ہی شاکر اس کے کمرے میں جاتا۔

عذرا کا رویہ دن بہ دن خراب ہوتا جارہا تھا، میں تو خیر کسی گنتی میں ہی نہ تھی، اس نے شاکر سے بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑنا شروع کردیا۔ وہ ہر بار لڑائی کے بعد میکے چلی جاتی اور تین چار دن بعد واپس آتی۔ شاکر سے بھی اس کا تعلق برائے نام رہ گیا تھا اسے بھی عذرا کی کوئی پروا نہیں تھی اور نہ ہی اس نے کبھی اسے روکنے کی کوشش کی بلکہ اس کی غیر موجودگی میں وہ کافی پرسکون ہوجاتا اور پوری توجہ سے میری دیکھ بھال کرتا۔

بالآخر وہ دن بھی آگیا جس کا مجھے برسوں سے انتظار تھا۔ اللہ نے میری دعائیں سن لی تھیں۔ میں نے ایک خوبصورت گول مٹول بچے کو جنم دیا۔ اپنے شوہر کے سکھ کی خاطر میں نے جو قربانی دی تھی وہ قبول ہوگئی۔ ان دنوں عذرا اپنے معمول کے مطابق میکے میں تھی۔ شاکر نے اسے فون پر بچے کی پیدائش کی اطلاع دی تب بھی وہ نہیں آئی۔ وہ اسے لینے گیا تو اس نے ایک عجیب مطالبہ کردیا۔ وہ شاکر سے طلاق لینا چاہ رہی تھی۔ شاکر نے وجہ جاننا چاہی تو وہ بولی۔

”تم نے اپنی غرض کے لیے مجھ سے شادی کی تھی، تمہیں اولاد چاہیے تھی وہ میں نہیں دے سکی لیکن تمہیں اپنی پہلی بیوی سے یہ خوشی مل گئی۔ اسی طرح اب میری سپورٹ کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ تمہیں ایک بہتر ملازمت مل گئی ہے، میں نے محسوس کیا ہے کہ تم آج بھی زرینہ سے پہلے کی طرح محبت کرتے ہو اور مجھ سے برائے نام تعلق نبھا رہے ہو۔ اب میری حیثیت تمہارے گھر میں ایک فالتو پرزہ کی سی ہے جو مجھے قبول نہیں۔ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں اس لیے بہتر ہے کہ مجھے طلاق دے دو۔ ویسے بھی میری اپنے پہلے شوہر سے صلح ہوگئی ہے اور وہ مجھ سے دوبارہ شادی کرنے کے لیے تیار ہے۔ تم سے نکاح کرکے میں نے حلالہ کی شرط پوری کردی ہے۔ اب میرے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔“

شاکر نے اسے وہیں کھڑے کھڑے طلاق دی اور گھر آگیا۔ مجھے اس خبر سے خوشی نہیں ہوئی۔ البتہ یہ اطمینان ضرور ہوا کہ میری قربانی رائیگاں نہیں گئی۔ اس کا صلہ مجھے اولاد کی صورت میں مل گیا اور سوکن کا کانٹا بھی نکل گیا۔ سچ کہا ہے کہ کسی نے جو اچھا سوچتا ہے اس کے ساتھ اچھا ہی ہوتا ہے۔

++

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

رونگ نمبر

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!
ایک دلچسپ سچ بیانی ارسال کررہا ہوں۔ ایک ایسے تباہ کن آلے کی یہ روداد ہے جو ہر گھر میں موجود ہے اور کب کس کا گھر تباہ کردے کوئی کہہ نہیں سکتا۔ آپ بھی اس آلے سے ہوشیار رہیں۔

مظہر مشتاق
(کراچی)

افشاں دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ خدا نے حسن کے ساتھ اسے خوب صورت آواز سے بھی نوازا تھا۔ باپ تو بچپن میں ہی فوت ہوگیا تھا۔ بڑے بھائی نے ہی ان کے بعد سب سنبھالا، خوب محنت کی اور پولیس انسپکٹر سے ڈی ایس پی کے عہدے تک جا پہنچا۔ چھوٹا بھائی ایک گارمنٹ فیکٹری میں فلور انچارج تھا اور ماں اسکول ٹیچر۔

ڈی ایس پی منہاج دیانتدار اور قابل پولیس آفیسر تھا جب کہ دوسرا بھائی سبحان بھی محنتی اور شریف تھا، دونوں شادی شدہ تھے۔

آج کل گھر میں افشاں کی شادی کے سلسلے میں کہا سنی تھی۔

''میں نے اسکول سے چھٹیاں لے لیں ہیں، اب تم دونوں بھی چھٹیاں لے لو، دن ہی کتنے رہ گئے ہیں افشاں کی شادی میں۔'' ثمینہ اسحاق نے اسکول سے آتے ہی دونوں بیٹوں پر حکم صادر فرمایا۔ ''ارے امی آپ ٹینشن کیوں لیتی ہیں اس بات کا ہمیں بھی ادراک ہے۔'' دونوں نے اثبات میں جواب دیا اور ثمینہ بی بی مسکراتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

دن تیزی سے گزرتے گئے اور بالآخر افشاں کے پیا گھر جانے کا دن بھی آن پہنچا اور وہ شادی کر کے اپنے گھر کی ہوگئی۔ اس کا شوہر امتیاز بینک میں ملازمت کرتا تھا۔ وہ اپنے گھر ہنسی خوشی رہنے لگی۔

شادی کے بعد افشاں پہلی بار اپنے گھر آئی تو سبحان نے اپنی بہن کو موبائل گفٹ کیا۔ ''ارے بھائی یہ تو بہت مہنگا ہے اس کی کیا ضرورت تھی اور پھر مجھے بیچ موبائل ٹھیک سے استعمال کرنا بھی نہیں آتا۔'' افشاں نے موبائل کا بخوشی جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''چند روز استعمال کرو گی تو آ ہی جائے گا کون سا مشکل ہے آج کل بچوں کے پاس بھی اس سے اچھے اچھے موبائل ہیں اور ہاں میں نے اس میں سب کے نمبر سیف کردیے ہیں۔''

سبحان نے بہن کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

رات کے کھانے پر منہاج بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے بھی کئی چیزیں بہن کی نذر کیں۔ ثمینہ بی بی بھی بہت خوش تھیں۔ باتیں کرتے کرتے سنجیدہ سی ہوگئیں۔ ان کی آنکھیں نم ہوگئیں تو تینوں بہن بھائیوں میں تذبذب کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ ''ارے امی جان! آپ کی آنکھوں میں آنسو؟''

''ہاں آج تمہارے ابا زندہ ہوتے تو کتنا خوش ہوتے کہ بچوں کے فرائض سے سرخرو ہوگئے ہیں؟'' آنسو جو اب تک پلکوں نے روک رکھے تھے وہ آنکھوں سے چھلک کر رخساروں پر بہنے لگے اور تینوں بچے ماں سے لپٹ کر اسے تسلیاں دینے لگے۔

افشاں دو دن بعد اپنے گھر چلی گئی اور ثمینہ بی بی پھر سے تنہا ہوگئیں۔ سبحان رات کو دیر سے گھر آتا تھا اور منہاج کے وقت کا تو کچھ پتا ہی نہ تھا۔ پولیس کی نوکری ہی ایسی ہوتی ہے۔

''ارے فون اٹھاؤ..... ارے اٹھا بھی لو.....'' (یہ ڈائل ٹیون تھی جو افشاں کے موبائل پر صدا لگا رہی تھی)۔ افشاں نے موبائل اٹھا کر کال ریسیو کی۔ ''ہیلو'' تو دوسری جانب سے کوئی اجنبی سی آواز تھی۔ ''آپ کون؟ کس سے بات کرنا ہے؟'' افشاں کے استفسار پر دوسری آواز آئی۔

''اتنی خوب صورت آواز سن کر کس سے بات کریں گے، آپ ہی بات کرلیں۔''

''مگر آپ ہیں کون؟'' افشاں کے سوال کرنے پر فون کرنے والا اجنبی تو جیسے فری ہوگیا۔

''ارے سمجھو ہم آپ کے ہی ہیں۔''

افشاں نے رونگ نمبر کہہ کر رابطہ منقطع کردیا مگر اس کے بعد کئی مرتبہ کال آئی جو افشاں نے بغیر ریسیو کیے منقطع کردی۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اب یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔

ایک روز افشاں نے کال ریسیو کی اور اسے بتایا کہ وہ شادی شدہ اور شریف لڑکی ہے۔ ازراہ کرم وہ آئندہ کال نہ کرے مگر وہ ہٹ دھرمی پر قائم رہا۔ افشاں نے انجانے خوف سے اس بات کا تذکرہ کسی سے نہ کیا۔

''ارے فون اٹھاؤ..... ارے اٹھا بھی لو.....'' افشاں کا موبائل بج رہا تھا مگر وہ نہا رہی تھی۔ اسی دوران اس کی ساس کا گزر کمرے کے سامنے سے ہوا۔ افشاں کی غیر موجودگی میں موبائل ٹیون بج رہی تھی۔ انہوں نے کمرے میں داخل ہو کر چپکے سے موبائل اٹھایا اور کال ریسیو کی۔

''ارے جان کیوں ہماری جان کی دشمن ہوگئی ہو۔ مجھے پتا تھا تم ضرور اٹھاؤ گی جان تمہاری آواز اتنی حسین ہے تو خود تم کتنی حسین ہوگی؟'' اجنبی فون پر بولے جا رہا تھا اور افشاں کی ساس خاموشی سے اس کی گفتگو سنے جا رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں تھے۔ وہ اجنبی کو بغیر کچھ بولے کال منقطع کر کے کمرے سے دبے پاؤں تیزی سے باہر نکل گئیں۔

رات افشاں کا شوہر آیا تو افشاں کی ساس نے کھانے کی میز پر ہنگامہ برپا کر دیا۔ ''امتیاز تمہاری بیوی کے پھن اچھے نہیں ہیں مجھے تو پہلے ہی شک تھا مگر میں اپنی عزت کو لیے خاموش تھی۔''

امتیاز کے ہاتھ کھانے سے رک گئے وہ گویا ہوا۔ ''آخر بات کیا ہے۔ امی کھل کر بتائیں۔''

افشاں بھی حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ''اپنی بیگم صاحبہ کا موبائل لے کر چیک کر لو تمہیں خود پتا چل جائے گا کہ کس نمبر سے سب سے زیادہ کالیں آتی ہیں اور تمہارے جانے کے بعد موصوفہ کیا گل کھلاتی ہیں۔'' افشاں کی ساس نے آگ لگادی۔

امتیاز نے افشاں سے موبائل مانگا تو وہ ہڑبڑا گئی۔

''جی..... جی وہ رونگ نمبر ہے پتا نہیں کون ہے، تنگ کر رہا ہے میں تو جانتی بھی نہیں.....''

''بکواس بند کرو اپنا موبائل دو۔'' امتیاز دہاڑا تو افشاں نے موبائل شوہر کے حوالے کر دیا۔

''جانتی نہیں ہے تب یہ حال ہے کہ وہ اس پر اس قدر فریفتہ ہے۔'' ساس نے مزید سلگتی پر تیل ڈالا۔ امتیاز نے چیک کیا اور وہ نمبر نکال لیا جس سے کالیں آ رہی تھیں۔ اس نے نمبر ڈائل کیا اور خاموشی سے موبائل کان پر لگائے انتظار کرنے لگا۔ اجنبی نے کال اٹینڈ کرتے ہی بولنا شروع کیا۔ ''جان مجھے پتا تھا تم کال ضرور کرو گی۔ تم نے میری زندگی میں ہلچل مچا دی ہے۔ تمہاری آواز میں جادو ہے جادو..... یار اب تو بتا دو کہاں ملیں؟''

امتیاز نے موبائل ایک طرف پھینکا اور افشاں پر ٹوٹ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

پڑا۔ ”بدچلن، آوارہ تجھ جیسی عورت کو رکھنا بھی گناہ ہے۔“ وہ اور نہ جانے کیا کیا بکتا رہا اور زدوکوب کرتا رہا۔

”اس کے گھر والوں کو ابھی بلاؤ اور بتاؤ اس کے لچھن۔“ ساس مسلسل آگ لگانے کا کام کررہی تھی۔ امتیاز نے افشاں کے گھر فون ملایا اور انہیں فوری اپنے گھر آنے کا کہا۔ وہ انتہائی غصے کے عالم میں تھا اور اوپر سے ماں کی جلی کٹی باتیں اسے مزید بھڑکا رہی تھیں۔

”اللہ خیر کرے اتنی رات کو داماد کا فون وہ بھی اس قدر غصے میں۔“ ثمینہ بی بی نے پریشان ہوکر بیٹے کو فون ملایا جو اسی شہر میں ڈی ایس پی کے عہدے پر تھا۔

”امی پریشان نہ ہوں میں ابھی پہنچتا ہوں۔“ منہاج کے آنے تک سجان کو بھی تمام بات کا علم ہوچکا تھا کہ بہن کے سسرال سے امتیاز کا غصے میں فون آیا ہے، اس نے گھر بلایا ہے۔ منہاج جلد گھر پہنچ گیا اور تینوں فوراً... افشاں کے سسرال روانہ ہوگئے۔

افشاں کے سسرال میں جیسے ہی تینوں ماں بیٹے پہنچے تو ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ افشاں ایک طرف بیٹھی رو رہی تھی۔ صاف ظاہر ہورہا تھا کہ اس پر تشدد ہوا ہے۔

”کیا ہوا میری بیٹی کو؟“ ثمینہ بی بی نے تڑپ کر سوال کیا تو دوسرے کمرے سے نکلتی ہوئی افشاں کی ساس نے گویا آگ لگادی۔ ”یہ پوچھو ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ تمہاری بیٹی کے معاشقے چل رہے تھے اور تم نے اسے ہمارے گھر دھکیل کر ہماری بھی عزت کی دھجیاں اڑادیں۔“

”کیا بکواس ہے؟“ منہاج غصے میں چنگھاڑا۔

”بکواس نہیں یہ موبائل تمہیں سب بتادے گا۔“ اس کے شوہر نے افشاں کا موبائل منہاج کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اب یہ عورت اس قابل نہیں کہ اسے گھر رکھا جاسکے لہٰذا میں افشاں کو طلاق دیتا ہوں، میں افشاں کو طلاق دیتا ہوں، میں افشاں کو طلاق دیتا ہوں۔“ تین جملوں میں اس نے افشاں کی زندگی کا فیصلہ کردیا۔ ظاہر ہے مرد کو یہی تو ایک اختیار ہے، سوچ سمجھ کر استعمال کرے یا غصے میں یہ تین الفاظ دو زندگیوں کا فیصلہ کردیتے ہیں۔ اس اچانک فیصلے پر ثمینہ بی بی زور سے چیخیں اور بے ہوش ہوگئیں۔ تینوں بہن بھائی روتے ہوئے ماں کی طرف لپکے مگر یہ کیا ان کی روح شاید بیٹی کا یہ دکھ برداشت نہ کرتے ہوئے جسم سے پرواز کرچکی تھی۔ تینوں ماں سے لپٹ کر رونے لگے۔

”چلو اب یہاں تماشا نہ بناؤ لوگ جمع ہوں گے تو ہم کس کس کو جواب دیں گے۔ تم بے غیرتوں کی تو عزت ہے نہیں ہماری بھی عزت جائے گی، اسے اٹھاؤ اور اپنے گھر جاکر ماتم کرو۔“ افشاں کی ساس نے تو حد ہی کردی تھی۔

سجان اچانک اٹھا اور امتیاز پر لپکا۔ ”کمینے تو نے میری معصوم بہن کی زندگی برباد کردی اور ہماری ماں کی جان لے لی، میں تیری جان لے لوں گا۔“ اس نے امتیاز کی گردن دبوچ لی۔ منہاج نے اپنی سی پوری کوشش کرلی مگر وہ سجان کی گرفت سے امتیاز کی گردن آزاد کرانے میں ناکام رہا اور بالآخر امتیاز ساکت ہوتا چلا گیا اور وہ بھی زندگی سے آزاد ہوگیا۔

افشاں کے سسرال میں پولیس موجود تھی اور باہر کافی لوگ جمع تھے۔ منہاج نے سجان کو پولیس کے حوالے کیا۔ موقع پر شواہد جمع کرکے پولیس سجان کو ہمراہ لے گئی اور ثمینہ بی بی کی لاش ایمبولینس میں رکھی گئی۔ اس دوران افشاں کی حالت غیر ہو رہی تھی اسے بھی اسپتال روانہ کیا گیا۔

افشاں کے گھر سے امتیاز کا جنازہ نکلا اور منہاج کے گھر سے ثمینہ کا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی کہ کیسے ایک رونگ نمبر نے پل میں کئی گھر اجاڑ دیئے۔

آج ثمینہ بی بی کا سوئم تھا۔ افشاں کو بھی اسپتال سے گھر لایا گیا۔ وہ برباد ہوکر آج کس حالت میں گھر لوٹی تھی کہ نہ اپنا پتا اور نہ گھر کا ہوش نہ کسی کی خیر خبر، ہنس مکھ، ملنسار اور پاک دامن افشاں یہ سارے دھچکے نہ جھیل سکی وہ پاگل ہوچکی تھی اسے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ گھر میں قرآن کیوں پڑھا جارہا ہے۔ چنے کس کے پڑھے جارہے ہیں کتنے غم ایک ساتھ سر پر آن پڑے تھے۔

کچھ پیشیوں کے بعد سجان کو بھی سزا سنادی گئی۔ منہاج نے بہت کوشش کی مگر وہ بھائی کو سزا سے نہ بچاسکا۔ مطلوبہ نمبر پر بھی کافی تحقیق کی مگر وہ مجرم تک پہنچنے میں ناکام رہا کیونکہ اس وقت تک سم رجسٹریشن میں اتنی سختی نہ تھی۔ کوئی بھی کہیں سے سم خرید لیتا۔ یہ خبر اخبارات کے ذریعے ہر طرف پھیل گئی تھی۔ شاید اس ڈرسے فون کرنے والے نے اس سم کو نکال پھینکا تھا۔

آج اس بات کو اتنے سال گزر چکے ہیں۔ منہاج ہی سجان کی بیوی اور بچے کا خرچ اٹھاتا ہے۔

موبائل کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ بلاوجہ کسی کو تنگ کرو۔ اتفاقاً کسی لڑکی کا نمبر لگ جائے تو بس پھر مذاق بنالو اور لگ جاؤ اسے تنگ کرنے، کبھی کبھی ایک رونگ نمبر کتنے گھر برباد کردیتا ہے یہ کوئی سوچتا ہے؟ ذرا سوچو جو منہاج کے خاندان پر گزری، کوئی رونگ نمبر تمہارے گھر کا بھی ایسے ہی سکون غارت کرسکتا ہے۔

++

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اے پتر.....

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
ایک سچ بیانی ارسال کررہی ہوں یہ سچ بیانی ہے میجر شجاع کی اسے پڑھ کر کوئی سبق حاصل کرلے تو میں سمجھوں گی کہ میری محنت وصول ہوگئی۔

سعدیہ خان
(لاہور)

کیپٹن وسیم نے میجر شجاع کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔
''یار بہت مبارک ہو تمہیں۔''
میجر شجاع جو ابھی آیا تھا حیران کن کیفیت میں پوچھا۔
''کس بات کی مبارک؟''

''آپ کے گھر ننھی سی پری آئی ہے، میں چاچو بن گیا ہوں۔'' کیپٹن وسیم نے جوش سے بتایا۔
''اور بیٹیلی.....؟ کب؟ تمہیں کس نے بتایا؟'' میجر شجاع نے ایک ساتھ بہت سے سوال کرڈالے۔

''تمہارا فون آف ہے، کل بھابی کی طبیعت خراب تھی وہ آپ سے بات کرنا چاہتی تھیں مگر بات نہیں ہو سکی، تبھی آپ کی اماں نے مجھے کال کی تھی اور آج یہ خوشخبری بھی دی۔ بھابی ابھی بھی اسپتال میں ہیں، بات کر لیجیے وہ منتظر ہوں گیں آپ کی کال کی۔'' کیپٹن وسیم نے شجاع کو دوبارہ گلے لگاتے ہوئے کہا۔

میجر شجاع نے جلدی سے موبائل آن کیا اور حائمہ کے میسجز چیک کرنے لگا، آخری وائس میسج تھا۔ اس نے پلے کیا حائمہ کی رندھی ہوئی آواز ابھری۔ ''دیکھا میجر شجاع! ہمیشہ کی طرح اس بار بھی آپ اپنے عہد کو پورا کرنے میں ناکام رہے۔ زندگی میں جب جب آپ نے وعدہ کیا میں آپ سے کہہ دیتی تھی کہ یہ وعدہ بھی محض وعدہ ہی رہے گا لیکن اس بار جب آپ نے وعدہ کیا تو پتا نہیں کیوں دل نے اعتبار کر کے اُمید باندھ لی تھی، کہ اس بار آپ اپنا وعدہ ضرور نبھائیں گے۔ کیونکہ آپ کہتے ہیں نا کہ انسان کی سب سے بڑی کمزوری اولاد ہوتی ہے، خاص کر بیٹیاں جو انسان کا دل بدل دیتی ہیں۔ بس آپ کی اسی بات پہ تسلی تھی کہ ایک آرمی آفیسر کو میری محبت کی ڈور تو نہیں کھینچ پائی کبھی، نہ جکڑ پائی اپنی محبت کی زنجیر میں، پر اس بار اولاد کی محبت ضرور آپ کو کھینچ لائے گی، لیکن خود کو تنہا دیکھ کر میری تمام خوش فہمیاں دور ہو گئی ہیں۔ آپ نے ثابت کر دیا کہ ایک فوجی کی زندگی میں سب سے اہم اس کا وطن اور وردی کی لاج رکھنا ہوتا ہے۔ چلیے میں خوش ہوں کہ آپ اپنی وردی اپنے وطن سے کیے ہر عہد کو پوری ایمانداری سے نبھا رہے ہیں۔ ہاں آخری بات سن لیجیے بہت برے ہیں آپ..... سن لیا نا.....؟ بہت برے۔''

شجاع کی آنکھوں میں نمی کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں کہے اس کے آخری الفاظ پہ مسکراہٹ آ گئی۔ وہ ایسی ہی ہے سب سے منفرد، محبت کا الگ انداز لیے ہوئے۔

حائمہ! سے اس نے بہت چاؤ اور محبت سے رشتہ جوڑا تھا، لیکن شادی کے بعد کوشش کے باوجود بھی وہ اسے زیادہ ٹائم نہیں دے پایا۔

حائمہ کی آواز ماضی کے پردے ہٹا کر اس کی سماعتوں سے ٹکرائی:

''شیبی! سن لیجیے میں ماما بابا کے ساتھ نہیں جاؤں گی اس بار فنکشن میں۔''

''حائمہ! کیا ہے یار، سب ہوں گے وہاں۔'' شجاع نے اسے منانے کی کوشش کی۔

''لیکن ان سب میں آپ تو نہیں ہوں گے نا؟'' حائمہ نے اداسی سے اس کی طرف دیکھا۔

''حائمہ! یہ کیا نئی ضد لگائے بیٹھی ہو اس بار؟ کیا فرق پڑتا ہے میں ساتھ ہوں یا نہیں۔'' شجاع خفگی سے بولا۔

حائمہ جو ایک ہی بات سن سن کے اکتا گئی تھی بیزاری سے بولی۔ ''آپ کے ساتھ ہونے نہ ہونے سے کسی کو فرق پڑتا ہے یا نہیں، آپ کو پڑتا ہے یا نہیں یہ اہم نہیں ہے، اہم یہ ہے کہ مجھے فرق پڑتا ہے۔ چار سال ہونے کو ہیں ہماری شادی کو، کوئی ایک فنکشن ایسا بتا دیجیے جب آپ ساتھ گئے ہوں؟ سب باری باری جب پوچھتے ہیں کہ شجاع نہیں آیا ساتھ؟ تب مجھے لگتا ہے پورے فنکشن میں سب سے مسکین میں ہی ہوں۔''

''اچھا سوری تم جانتی ہو نا چھٹی کا مسئلہ ہے، اس بار چلی جانا وعدہ رہا ان شاء اللہ اگلی بار جو بھی فنکشن آیا میں چلوں گا ساتھ، اب خوش؟'' شجاع نے اس کے معصومیت لیے چہرے کو اپنی نگاہوں کے حصار میں لے کر پوچھا۔

☆☆☆

ذہن میں پھر ایک نیا در کھلا اور ایک نیا منظر سامنے آیا۔

''شیبی! آپ نے تو کہا تھا کہ عید تک آپ اِدھر ہی ہیں؟'' حائمہ نے شجاع کو اچانک یوں رات 12 بجے تیاری کرتے دیکھ کر حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں چھٹی تو عید تک کی ہی تھی لیکن کشمیر کے حالات بہت خراب ہیں، لائن آف کنٹرول پہ کشیدگی بڑھ گئی ہے۔ دھرتی ماں نے پکارا ہے اپنے بیٹوں کو۔'' وہ آنکھوں میں وطن کی محبت کی چمک لیے حائمہ کے پاس بیٹھ گیا۔ ''حائمہ! پلیز اداس نہ ہو پھر دھیان تمہاری طرف لگا رہتا ہے، اسپتال میں جوڈیٹ تمہیں ملی ہے تب تک میں آ جاؤں گا اور اگر اس دوران شہید ہو گیا تو فخر کرنا کہ تم ایک شہید کی بیوہ ہو اور گواہ رہنا کہ میں نے اپنے وطن سے محبت ہر چیز سے بڑھ کر کی ہے۔''

حائمہ نے اس کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کر مزید بولنے سے روک دیا۔ ''یہ کیا فضول باتیں ہیں؟ میں نہ تو اتنی بہادر ہوں اور نہ ہی افواج کے دوسرے جوانوں کے گھر والوں کی طرح حوصلہ مند، جو شہادت کی مبارکباد وصول کرتے ہوئے درد کی شدت میں بہتے اپنے آنسوؤں کو خوشی کے آنسوؤں کا نام دے سکوں۔ مجھے اپنا شیبی ویسا ہی واپس چاہیے جیسا میں بھیج رہی ہوں..... سن لیا نا آپ نے؟''

شجاع کو حائمہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی،

Waqar Azeem
Pakistanipoint

اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ ایسی حالت میں اسے حائمہ سے یہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔

"اچھا چھوڑو! یہ بات تم بس اپنا خیال رکھنا، میں اپنے وعدے کے مطابق تمہارے ساتھ جاؤں گا ان شاء اللہ۔" شجاع نے اسے یقین دلایا۔

"شجاع! کیا ہوا تم ایسے کیوں بیٹھے ہو بیٹی کی خوشی نہیں ہوئی تمہیں؟" وسیم کی آواز پہ وہ چونکا اور ماضی سے حال میں آ گیا۔

"نہیں یار بہت خوش ہوں، بس یقین نہیں ہو رہا کہ چار سال بعد اللہ نے مجھے اتنی بڑی خوشی سے نوازا ہے۔" شجاع نے فخریہ انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"چلو پھر جلدی سے بھابی سے بات کر کے مبارکباد دو۔" وسیم کے لہجے میں شرارت تھی۔

"نہیں یار! حائمہ کی آواز اور باتیں مجھے کمزور کر دیتی ہیں اور کسی کمزور لمحے کی زد میں آ کر میں اپنے جذبہ شہادت کو سرد نہیں پڑنے دینا چاہتا، ہمارے وطن اور ہمارے کشمیر کو ہماری زیادہ ضرورت ہے ابھی۔ بارڈرز پہ لگی افواج اور جنگی حالات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ قابض کافر کشمیر میں خون کی ہولی کھیل رہے ہیں...... وہ کشمیریوں پہ ظلم و بربریت کی انتہا کر کے ہماری غیرت کو للکار رہے ہیں...... کشمیر ہمارا ہے اس کی آزادی کے لیے ہم خون کے آخری قطرے تک لڑیں گے ان شاء اللہ۔" پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "وسیم! تم میرے دوست کم بھائی زیادہ ہو اگر اللہ نے اس محاذ پہ میری شہادت قبول فرمالی تو میری خواہش ہے کہ جب وطن کے پرچم میں لپٹا میرا جسد خاکی گھر لے کے جائیں تو تم بھی ساتھ جانا۔ کچھ چیزیں ہیں وہ اپنی بھابی کے حوالے کرنا...... میری پری کو میری طرف سے پیار کر کے ساتھ سوری بھی کہہ لینا، اُسے بتانا کہ کشمیر کی بیٹیوں کو اُس کے بابا کی زیادہ ضرورت تھی۔" میجر شجاع! کی آنکھوں میں بیٹی کے نام پہ آئی اداسی وسیم نے واضح محسوس کی۔

"اگر اللہ نے میری شہادت پہلے قبول کر لی تو؟" کیپٹن وسیم نے شہادت کے جذبے سے سرشار لہجے میں پوچھا۔

"چلو جو رب کو منظور ہوا۔" یہ کہتے ہوئے شجاع مسکرا دیا۔

☆☆☆

آج 9 دن بعد کیپٹن وسیم، میجر شجاع سے کیے وعدے

قوانین ہائے بے جا دیکھتا ہوں

یہ دنیا بہت مزے کی ہے۔ آپ ذرا دنیا کا ایک چکر تو لگا کر دیکھیں۔ ایسے ایسے مناظر اور واقعات دکھائی دیں گے کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔ کیا نہیں ہے اس دنیا میں۔ کتنے ممالک ہیں اور ان ممالک کے قوانین ہیں۔ قوانین کیوں بنائے جاتے ہیں۔ نظم و نسق برقرار رکھنے کے لیے۔ مجرموں کو سزائیں دینے کے لیے' لیکن دنیا کے بہت سے ملکوں میں! ایسے بھی قوانین ہیں جن کے بارے میں جان کر آپ کو حیرت ہوگی۔ آپ سوچتے ہی رہ جائیں گے کہ کیا ایسا بھی ہوتا ہے۔ ہم نے ایسے ہی کچھ قوانین کا جائزہ لیا ہے۔ ملاحظہ کریں:

☆ لوگ اپنے کتوں کو بہت عزیز رکھتے ہیں لیکن آپ نے یہ کہیں نہیں سنا ہوگا کہ کتوں کی عزت نفس کو اگر ٹھیس پہنچائی جائے تو یہ جرم ہے۔ اوکلاہاما میں اگر آپ اپنے کتے کو منہ چڑائیں تو آپ کو گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ آپ کتے کے سامنے الٹی سیدھی شکلیں بھی نہیں بنا سکتے کیوں کہ ان کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے۔

☆ اوٹاہ کی ایک کاؤنٹی ہے جسے سالٹ لیک کاؤنٹی کا نام دیا گیا ہے۔ وہاں آپ اپنے وائلین کو کاغذ میں لپیٹ کر چل نہیں سکتے۔ یہ وہاں جرم تصور کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ہوشیار رہیں اگر آپ کے پاس وائلین ہے تو یوں ہی اٹھائے جائیں۔

☆ سان فرانسسکو میں آپ اپنے گھوڑے کے چارے کے بغیر گھوڑے کو پھونک سے اونچا نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا کر لیا تو آپ کا گھوڑا حکومت ضبط کر لے گی۔

☆ ڈیون (ٹیکساس کا ایک شہر) وہاں ایک عجیب وغریب قانون ہے۔ وہاں اگر کوئی بڑھئی یہ چاہے کہ اپنے گھر میں یا کسی بھی جگہ کپڑے اتار کر فرنیچر بنائے تو اس کو گرفتار کر لیا جاتا ہے۔

☆ مونٹانا۔ یہاں کوئی شخص اپنے گھر کے پچھلے صحن میں شام کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا (ہاں البتہ مکان کے اگلے حصے میں بیٹھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے)

☆ کیلیفورنیا میں کوئی گاڑی اگر ساٹھ میل کی رفتار سے بغیر ڈرائیور کے چل رہی ہو تو یہ جرم ہے۔ (سوال یہ ہے کہ خدا کے بندو۔ گاڑی بغیر ڈرائیور کے کیسے چلے گی۔ فرض کرو کسی طرح چل بھی رہی ہو تو کیا ضروری ہے کہ جب وہ ساٹھ میل رفتار کی حد تجاوز کر جائے تب ہی جرم ہے چلو اگر ایسا ہی ہے تو کس کو پکڑو گے۔ ڈرائیور تو ہے نہیں۔ اسی کو کہا جاتا ہے۔ "ناطقہ سربہ گریباں ہے اسے کیا کہیے")۔

☆ فلوریڈا میں کوئی شخص اگر گاؤن پہنے گھوم رہا ہو اور اس نے گاؤن کے فیتے نہیں باندھے ہوں تو اس پر جرمانہ کر دیا جاتا ہے۔

مرسلہ: انیس گردیزی۔ ملتان

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

کے مطابق اس کے جسد خاکی کو لے کے جا رہا تھا۔ اس دن میجر شجاع! نے وعدہ نہ لیا ہوتا تو شاید وہ نہیں آ پاتا۔ بہت مشکل تھا میجر شجاع کی 10، 11 دن کی ننھی پری کا سامنے کرنا..... وہ شجاع کے بوڑھے والدین کو اُن کے اکلوتے بیٹے کی شہادت کی خبر کیسے سنائے گا اور شجاع کی مسز جو اس دن شجاع سے بات کرنے کے لیے تڑپ رہی تھیں کیسے ان سے سامنا کرے گا؟ یا اللہ! مجھے ہمت دے..... کیپٹن وسیم! نے اپنے پاس پرچم میں لپٹے جان سے عزیز دوست کو نم ہوتی آنکھوں سے دیکھ کر دعا کی۔

''کبھی ہم پرچم میں لپٹے ہیں کبھی ہم غازی ہوتے ہیں
جو ہو جائے ماں راضی تو بیٹے راضی ہوتے ہیں''

☆☆☆

میجر شجاع! کے گیٹ پر بے وقت بجنے والی بیل پہ گھر کے مکین ہڑبڑا کر اٹھے۔ حیات خان نے کلاک کی طرف دیکھا رات کے 11 بج رہے تھے۔ خدا خیر کرے رات کے اس پہر کون آ گیا، وہ چشمہ لگاتے ہوئے باہر نکلے اور گیٹ کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی آواز دی۔ ''کون؟''

''سر! میں کیپٹن وسیم۔'' باہر سے جو تعارف کروایا گیا وہ سنتے ہی حیات خان کے دل نے اسے کسی انہونی کی اطلاع دی۔ حیات خان نے گیٹ کھولا تو کیپٹن وسیم نے انہیں احتراماً سیلوٹ کیا اور میجر شجاع کی وردی ان کی طرف بڑھاتے ہوئے روایتی انداز میں کہا۔ ''سر مبارک ہو آپ کا بیٹا میجر شجاع خان لائن آف کنٹرول پہ بھارتی جھڑپ کے دوران بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گیا ہے۔''

ان کے پیچھے تھوڑے فاصلے پہ کھڑی حائمہ یہ منظر دیکھ کر لڑکھڑاتی ہوئی پیچھے ہٹی۔ مسز حیات نے اس کی بوکھلائی ہوئی شکل دیکھ کر تھام لیا۔ ''حائمہ! کیا ہوا بیٹا کون تھا باہر؟''

''ماما! ش..... شجا!!!..... ع۔'' حائمہ حواس باختہ تھی۔

مسز حیات کی نظریں حائمہ سے ہٹ کر باہر کی طرف گئیں تو ان کا دل بھی دہل گیا۔ سب سمجھنے میں ایک لمحہ لگا، پاک فوج کے جوان سبز ہلالی پرچم میں لپٹا جسد خاکی اٹھائے حویلی کے احاطے میں داخل ہوئے۔ پورے گاؤں کی فضا سوگوار تھی وطن کے اس سپوت کی شہادت پر۔

☆☆☆

حویلی کے لان میں پاک فوج کے جوان، میجر شجاع کے جسد خاکی کو اٹھانے کے لیے تیار کھڑے تھے، کیپٹن وسیم، میجر شجاع کی بیٹی کو گود میں لیے شجاع کے پاس آیا تو باپ بیٹی کے اس ملاپ پر ہر آنکھ اشکبار تھی۔

کیپٹن وسیم جو کب سے ضبط کیے تھا اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر پری کے چہرے پہ جا گرے اور اس نے آنکھیں کھول لیں، کیپٹن وسیم خود کلامی کے انداز میں ننھی کلی سے مخاطب تھا۔ ''پری! کوئی اور وقت ہوتا تو پہلی بار دیکھنے پہ آپ کے لیے کوئی تحفہ لے کے آتا، اپنے چاچو کو معاف کر دینا آپ کو دینے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے، بالکل خالی ہاتھ ہوں آج۔ اپنے بابا کو دیکھ رہی ہیں نا یہ بہت پیار کرتے ہیں اپنی پری سے..... آپ کے بابا میجر شجاع خان پاکستانی پرچم میں لپٹے اس بات کا ثبوت ہیں کہ اللہ تعالیٰ بھی ان سے بہت محبت کرتے ہیں..... تبھی تو میرے رب نے انہیں چن لیا..... بڑی ہو کے آپ بھی فخر کرنا کہ آپ شہید کی بیٹی ہیں..... یہ پرچم ہمیں ہماری جان سے زیادہ عزیز ہے۔ مجھے یقین ہے اس کی قدر آپ کو ہم سے بھی زیادہ ہو گی، کیونکہ اس پرچم کی سربلندی کی خاطر آپ نے اپنے بابا کو کھویا ہے۔''

☆☆☆

حائمہ رات کو بیڈ روم میں آئی تو بری طرح ٹوٹی ہوئی تھی رونے کے باوجود دل میں دہکتی آگ کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ ٹھنڈے ٹھار فرش پہ بیٹھ گئی بیڈ سے ٹیک لگائے۔ ''شیمی! میں نے آپ کو ایسے تو نہیں بھیجا تھا نا جیسے آئے تھے آپ؟ ایک لمحے کے لیے بھی یقین نہیں ہوا کہ آپ گھر آئے تھے۔ یقین ہو بھی کیسے.....؟ جب میں آپ کو چھو کر محسوس نہیں کر سکی..... آپ کے وجود پہ لگے زخم نہیں دیکھ سکی..... آخری دیدار بھی بس لکڑی کے تابوت میں لگے چھوٹے سے شیشے سے کیا..... میں تو اتنی بے بس تھی کہ آپ کے اور اپنے درمیان لکڑی کے تختے سے بنا ہوا 2 فٹ کا فاصلہ عبور نہیں کر سکتی تھی۔ بتائیے نا پھر کیسے یقین کر لوں کہ آپ آئے تھے گھر.....؟ اور..... اور ہماری پری! جس کا طویل عرصے سے انتظار تھا اب اس سے ملے، اسے دیکھے بنا کیسے چلے گئے؟ ایسے کیسے ہمیں یوں بیچ منجدھار میں چھوڑ گئے؟ اور ماما بابا! ان کا کیا؟ بولیے نا بولتے کیوں نہیں؟ جواب دیجیے..... آپ کو پتا ہے جب کوئی اچانک آ کر کہہ دے کہ تمہارا وہ اپنا نہیں رہا تو دھڑکنیں تھم جاتی ہیں..... وہ لمحہ جیسے لمحہ ہو قیامت کا..... اُسے کسی بھی طرح سکون نہیں آ رہا تھا۔ اچانک کچھ یاد آنے پہ اس نے اٹھ کر الماری میں سے وہ لفافہ نکالا جو کیپٹن وسیم نے شجاع کی باقی چیزوں کے ساتھ دیا تھا، کپکپاتے ہاتھوں سے کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint

''پیاری حائمہ شجاع!

ارے یہ کیا آنسو؟ رونا نہیں تم جانتی ہو نا تمہاری آنکھوں میں آئی نمی مجھے تکلیف دیتی ہے۔ جب تم میرا خط پڑھ رہی ہوگی تو میں تم سے بہت دور ہوں گا، اتنی دور کہ تمہاری آنکھوں میں آئے آنسوؤں تک میرا ہاتھ نہیں پہنچ پائے گا۔ میں اپنی حائمہ سے معافی کا طلبگار ہوں، ہمیشہ کی طرح پری کی پیدائش والے دن بھی اسپتال پہنچنے والا وعدہ پورا نہیں کر پایا۔ لیکن وعدہ پورا نہ ہونے یہ مجھ سے بدگمان نہیں ہونا تم، فوجی اپنے وعدے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹا کرتے۔ تمہاری طرح میرا ایک وعدہ میرے وطن سے بھی تھا جو ہر فوجی وردی پہنتے ہوئے حلف اٹھا کر اپنی وردی اور وطن سے کرتا ہے کہ اگر ضرورت پڑی تو وطن کے دفاع کی خاطر اپنی جان دینے سے دریغ نہیں کریں گے اور جب بات آجائے اپنے وطن سے وعدے کی تو وطن کے بیٹے ہمیشہ اپنے وطن کو ہی ترجیح دیا کرتے ہیں۔ تب وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں، اپنی خوشیاں، اپنے جذبات۔ یاد رہتا ہے تو بس ایک ہی رشتہ جو دھرتی ماں سے ہے..... یاد ہوتا ہے تو بس یہ کہ وہ فوجی ہے اور ایک فوجی کے لیے سب سے اہم ہوتا ہے اس کا وطن، میں نے بھی وطن کو چن لیا ہے۔ موت کا ذائقہ تو سب نے ہی چکھنا ہے اور موت اگر شہادت کے روپ میں آئے تو اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہو سکتی ہے بھلا؟ تم گواہ رہنا کہ میں نے وطن سے محبت ہر رشتے سے بڑھ کر کی ہے، وطن سے کیا وعدہ اور اپنا فرض اچھے سے نبھایا ہے۔ باقی رہا تمہارا اور میرا معاملہ تو مجھے اُمید ہے تم مجھے معاف کر دو گی۔

میرے بعد تم کمزور نہیں پڑنا، اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے بھی کچھ بہتر سوچ رکھا ہے..... تبھی تو 4 سال بعد جنت تمہارے قدموں تلے رکھ کر ایک اہم ذمے داری تمہارے ذمے لگا دی، مجھے یقین ہے تم بیٹی کی ذمے داری کو اچھے سے نبھاؤ گی۔ مجھے فخر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں میری شریکِ حیات بنایا، میری خواہش ہے کہ تم میری بیٹی کو بالکل اپنے جیسی بنانا، اسے دینی تربیت کے ساتھ وطن اور وطن کے پرچم سے محبت بھی سکھانا۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن پھر بھی دل کی تسلی کے لیے کہوں گا کہ میرے بعد ننھی پری کے ساتھ ساتھ میرے اماں بابا بھی اب تمہاری ذمے داری ہیں، انہیں اتنے ہی لاڈ سے رکھنا جتنا میری زندگی میں رکھا ہے۔ اس کے لیے میں تم سے کوئی وعدہ نہیں لوں گا، میں جانتا ہوں میری حائمہ رشتوں کو مان دینا جانتی ہے۔ اب اجازت چاہوں گا۔ میری پری کو میری طرف سے ڈھیر سارا پیار کرنا، جب وہ بڑی ہو جائے تو اسے میری ڈائری ضرور دینا پڑھنے کے لیے تاکہ وہ جان لے کہ اس کے بابا کتنی شدت سے اپنی پری کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔

اماں بابا کو سلام اور اپنا بہت سارا خیال رکھنا۔ اللہ تم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین)

نیک خواہشات کے ساتھ شجاع خان۔''

''شجاع! آپ بہت برے ہیں..... سن لیا نا آپ نے.....؟ بہت برے ہیں۔ دیکھا ناں تمام ذمے داریاں کتنی آسانی سے مجھے سونپ گئے، مجھے پوچھے میری مرضی جانے بغیر..... شیطی! کتنی آسانی سے آپ نے یہ سب لکھ دیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں آپ جیسی بہادر نہیں ہوں۔

کاش! آپ وطن کے ان لوگوں کے نام بھی ایک میسج چھوڑ جاتے جو کہتے ہیں کہ افواج احسان نہیں کرتیں ''80%'' بجٹ بھی تو کھاتی ہیں۔ ''90%'' بجٹ وہ لے لیں بس میری پری! کے بابا اسے لوٹا سکتے ہیں تو لوٹا دیں..... جن کے ہاتھوں کے لمس اور محبت کو وہ کبھی محسوس نہیں کر پائے گی۔

شجاع! کاش ہر فوجی..... گھر والوں کے علاوہ عوام کو بھی اپنی صفائی دینے کے لیے ڈائری لکھ جایا کرے۔ عوام کو بتایا کرے کہ اس نے وطن کی حفاظت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اپنا فرض نبھایا ہے ہر محاذ پر۔ چاہے وہ سرحدیں ہوں، سیلاب کی تباہ کاریاں ہوں یا زلزلے کی، ہر جگہ ہر مشکل حالات میں فوجی جوان عوام کے دکھ درد میں ان کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں خود سے جڑے رشتوں کی خوشیوں کی پروا کیے بنا۔ پاک افواج کے بہادر سپاہی یہ بھی عوام کو بتا جایا کریں ناں کہ ہم بھی باقی عوام کی طرح جذبات رکھتے ہیں۔ فوج کا کوئی بڑا آفیسر ہو یا کوئی چھوٹا سپاہی سب بہت قیمتی ہوتے ہیں اپنی فیملیز کے لیے، ان کے گھر والوں کی سانسوں اور خوشیوں کی ڈور بھی ان سے جڑی ہوتی ہے اور جب یہ شہید ہوتے ہیں تو صرف یہ ہی نہیں ان سے رشتوں کی ڈور میں بندھے بہت سے لوگ بھی زندہ درگور ہو جاتے ہیں۔ اُن کی خوشیاں، جذبات، احساسات اور امیدیں بھی ان بہادر بیٹوں کے ساتھ ہی دفن ہو جاتی ہیں.....''

''شیطی بتایئے نا! کیوں بتا کے نہیں جاتے عوام کو بھی یہ سب؟'' حائمہ میجر شجاع کی خون آلود وردی کو ساتھ لگائے درد کی شدت سے رو پڑی۔

++

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

بندھن

محترم مدیر
السلام علیکم!
ایک اور سچ بیانی بھیج رہا ہوں۔ یہ سوفیصد سچی کہانی ہے۔ ساجد اور اقبال میرے والد محترم کے ساتھ ایک ہی مدرسے میں پڑھتے تھے۔ اُمید ہے یہ سچ بیانی قارئین کو پسند آئے گی

سلمان بشیر
(بہاولنگر)

ہر انسان کو اس دنیا میں پہلی سانس لیتے ہی، کچھ پیدائشی رشتے مل جاتے ہیں۔ وہ تمام رشتے اسے قبول کرتے ہیں ان تمام رشتوں کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ یہ سبھی خون کے رشتے اس کی کمزوری ہوتے ہیں۔ کبھی تو وہ رشتے اس کی ہمت بن جاتے ہیں اور کبھی وہی رشتے اس کا ڈر ثابت ہوتے ہیں۔ ان رشتوں سے راہ فرار اختیار کر لینا قطعی ممکن نہیں ہوتا اور اگر ایسا ہو بھی جائے تو زمانے والے اسے تاعمر کوستے رہتے ہیں۔

ہر انسان کی کامیابی و ناکامی کے پیچھے ان رشتوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔

انسان بھی کیسا مطلبی ہوتا ہے۔ وہ بھی وہاں عزت دیتا ہے جہاں سے اسے کسی نفع کی اُمید ہوتی ہے۔

لیکن کچھ رشتے اس نفع و نقصان کی تجارت سے سوا ہوتے ہیں۔ ایسے رشتے انسان کو خود بنانا پڑتے ہیں۔

خود ساختہ بنائے گئے رشتوں کی بھی مختلف اسٹیجز ہوتی ہیں۔ اسکول و کالجز میں بننے والے دوست اسکول و کالجز کی حد تک ہی دوست رہ پاتے ہیں۔ بہت کم ایسا دیکھنے کو ملتا ہے کہ اسکول و کالجز کے دوست تعلیم مکمل ہونے کے بعد بھی ویسی ہی دوستی برقرار رکھ پائے ہوں۔

بچپن کے یارانے بھی اکثر وقت کی دھول مٹی میں دب کر نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن کچھ تعلق آخری سانس تک قائم رہتے ہیں۔

لاہور جامعہ نظامیہ رضویہ میں سن انیس سو تہتر کی وہ ایک گرم دوپہر تھی۔ ماحول پر گرمی کی چادر کچھ یوں لپٹی تھی کہ اس سے آزادی حاصل کرنا بہت کٹھن تھا۔ ہر ذی روح اپنی اپنی حیثیت کے مطابق خود پر کسی نہ کسی طرح کا سائبان لیے ہوئے تھی۔

جامعہ کے تمام طالب علم ایک ہال نما کمرے میں بیٹھے ہوئے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ ہال کے ایک کونے میں خانساماں بیٹھا ہوا طالب علموں کو روٹیاں اور سالن پروسنے کا کام کر رہا تھا۔ ہر طالب علم پوری دلجمعی سے پیٹ کی آگ ٹھنڈی کر رہا تھا۔

وہیں خانساماں کے دائیں جانب، باقی طالب علموں کی بھیڑ سے پرے لیکن خانساماں کی نظروں کے بالکل سامنے دو طالب علم بیٹھے ہوئے سانجھا کھانا کھا رہے تھے۔

کرم دین (خانساماں) نے ہمیشہ کی طرح اس جوڑی پر نگاہ محبت ڈالی اور دل میں دو چار دعائیں دیتے ہوئے ان سے گویا ہوا۔ ''سالن یا روٹی اور چاہیے بیٹا؟'' سوال ہمیشہ کی طرح محبت سے کیا گیا تھا۔ ''نہیں چچا۔ آپ نے پہلے سے ہی بہت سالن دے دیا ہے۔ بہت بہت شکریہ۔'' جواب بھی ہمیشہ کی طرح محبت و احترام سے دیا گیا۔

''ٹھیک ہے بیٹا۔ پھر بھی اگر کوئی اور چیز چاہیے ہو تو مانگ لینا۔''

کرم دین کو وہ دو طالب علم بہت پیارے تھے۔ معصوم سے خوش شکل حفاظ کرام۔

بائیس سال پہلے اگر کرم دین کے گھر کے واحد کمرے کی خستہ حال چھت تیز بارش کی بدولت نہ گرتی اور اس چھت کے ملبے تلے دفن ہو جانے والے اس کے جڑواں بیٹے اللہ کو پیارے نہ ہو گئے ہوتے تو آج وہ بھی ان دونوں کی طرح ہوتے۔

کرم دین کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ چھت کے ملبے تلے دب کر جہاں اس کے جگر کے ٹکڑے دفن ہوئے تھے وہیں اس کی شفیق اور محبت کرنے والی بیوی بھی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ حافظ ساجد اور حافظ اقبال کی شکل میں اسے اپنے بیٹے نظر آنے لگے۔

ساجد اور اقبال کھانا کھا چکے تھے۔

اب ایک گھنٹا تمام طلباء کے لیے آرام کا تھا۔ کرم دین برتن سمیٹ کر ہال کے ساتھ منسلک باورچی خانہ میں لے جا کر انہیں دھونے بیٹھ گیا۔

اسی وقت ساجد اور اقبال باورچی خانے میں داخل ہوئے اور برتنوں کے اردگرد بیٹھ کر انہیں صاف کرنے لگے۔ کرم دین ان کو بہت منع کرتا کہ وہ یہ کام مت کیا کریں لیکن وہ یک زبان ہو کر کہتے ''چچا ہمیں مدرسے کے برتن دھونا اچھا لگتا ہے۔''

کرم دین اس جوڑی کا رٹا رٹایا جملہ سن کر ہلکے سے مسکرا دیتا۔ حالانکہ وہ یہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ ساجد اور اقبال صرف اس کی مدد کرنے کی خاطر برتن دھوتے تھے لیکن وہ دونوں یہ بات کرم دین کو بتاتے بھی نہیں تھے۔

برتن دھل چکے تو کرم دین ان دونوں کو تھوڑا آرام کرنے کا کہہ کر اپنے گھر چلا گیا۔

ساجد اور اقبال اس ہال نما کمرے میں آ کر اپنے بستر سے کمر ٹکا کر بیٹھ گئے۔

وہ دونوں چار سال پہلے اسی مدرسے میں پہلی بار ملے تھے۔ دونوں ایک ہی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ قد کاٹھی اور عمر سے وہ دونوں جڑواں بھائی لگتے تھے لیکن ان کا آپس میں کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ وہ دونوں مختلف شہروں سے اس مدرسہ میں حافظ بننے آئے تھے۔

آہستہ آہستہ دونوں میں شناسائی بڑھتی گئی اور وہ اچھے دوست بن گئے۔ ایسے دوست جن کی مثال سارا مدرسہ دیتا تھا۔

دونوں ایک ہی برتن میں کھانا کھاتے۔ ایک جیسے کپڑے پہنتے۔ سر پر ٹوپی، شانے پر رومال، پاؤں میں جوتے بھی ایک ہی طرح کے ہوتے۔ یہاں تک کہ ان کے بستر بھی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ایک ہی رنگ کے تھے۔

سبھی لوگ ان کو جڑواں بھائی ہی سمجھتے تھے۔

''یار ساجد تو جانتا ہے ناں کہ اس رمضان کے بعد ہم فارغ التحصیل ہو جائیں گے۔ پھر ہم ایک دوسرے سے کیسے ملا کریں گے؟'' اقبال نے دکھ اور تفکر کی ملی جلی کیفیت کا اظہار کیا۔

اقبال کی بات سن کر ایک پل کے لیے ساجد بھی افسردہ سا ہو گیا۔ اس نے تو آج تک یہ بات سوچی ہی نہیں تھی کہ ایک دن ان دونوں کو یہ جگہ چھوڑ دینی پڑے گی اور پھر اپنے اپنے شہر کی راہ لینی ہوگی۔

''یار اقبال میں نے تو آج تک یہ بات سوچی ہی نہیں۔ تیرے دماغ میں یہ بات کیسے آ گئی؟'' ساجد نے حیرت کا اظہار کیا۔

''وہ مولوی صاحب ہی بتا رہے تھے کہ اس رمضان میں ہمارے مدرسے سے دو سو چالیس طلباء فارغ التحصیل ہوں گے اور اس میں ہماری کلاس بھی شامل ہے۔'' اقبال نے مولوی صاحب کی باتیں جوں کی توں بتا دیں۔

''پھر ہم کیا کریں گے اقبال؟''

''مجھے کیا خبر؟''

''پھر بھی بتا ناں یار۔ جب ہم یہاں سے چلے جائیں گے تو کیسے ملا کریں گے؟''

ساجد مستقبل کے بارے میں خاصا متفکر ہو گیا تھا۔ دراصل اسے اپنے جان سے عزیز دوست سے دوری کا سوچ کر ہی رونا آ رہا تھا۔

''مجھے خود معلوم نہیں ساجد۔ میں تو یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ ہمیں ایک دوسرے کے بغیر کھانا کیسے ہضم ہوگا۔''

اقبال ساجد سے بھی زیادہ دکھی لگ رہا تھا۔

''جہاں محبتیں شدید ہوتی ہیں وہاں امتحان اور آزمائشیں بھی شدید تر ہوتی ہیں۔''

''اچھا اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔ ابھی چل وضو کر آتے ہیں پڑھائی شروع ہونے والی ہے۔''

ساجد نے وقتی طور پر اس دکھ بھرے ماحول کو بدلنے کی کوشش کی لیکن ''جدائی'' کا خوف اس کے دل میں گھر کر چکا تھا۔ اقبال کے دل کی کیفیت بھی ساجد کے دل کی کیفیت سے الگ نہیں تھی۔

☆.....☆

عشاء کی نماز کے بعد سبھی طالب علم آدھا گھنٹا پڑھائی کر کے اپنے اپنے بستروں میں دبک گئے۔ ساجد اور اقبال بھی باقی طلباء کی طرح خود کو نرم بستر کے سپرد کر چکے تھے مگر وہ سوئے نہیں۔

ساجد اور اقبال پھر دوپہر والا موضوع چھیڑ بیٹھے۔

''یار ساجد تم نے کیا سوچا ہے پھر؟'' اقبال نے تمہید باندھی۔

''یار اقبال مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ سوچ سوچ کر دماغ شل ہو رہا ہے۔ دماغ کے گھوڑے لاکھ دوڑائے اس کے باوجود نتیجہ صفر ہے۔''

ساجد نے اقبال کو دکھ میں گھرا دیکھ کر اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

''ساجد اگر ہمیں ایک دوسرے سے الگ رہنا پڑا تو ہمارا کیا ہوگا؟'' اقبال نے بمشکل اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روکتے ہوئے کہا۔

''مقبرہ بنے گا اور کیا بننا۔''

ساجد نے غمگین لہجے میں تقریباً تیکھی آواز میں جواب دیا۔

دونوں کے چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ کھلا آسمان ان دوستوں کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔

زندگی میں کچھ لمحے ایسے بھی ہوتے ہیں جب دنیا آپ کو فقط سن ہی سکتی ہے۔ دلاسہ دینا اس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ شاید اس دنیا کا کردار فقط ''تماشائی'' کے سوا کچھ نہیں۔

ساجد اور اقبال زندگی کی دوڑ میں خود کو گھسیٹتے چلے جا رہے تھے۔ شاید ان دونوں کا اس دوڑ سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ فقط اسی لیے ہی خود کو اس دوڑ میں شامل کیے ہوئے تھے کہ دنیا ان کو ایک ''کھلاڑی'' کے لقب سے یاد رکھے۔

☆.....☆

ساجد اور اقبال کرم دین کے سامنے متشکر و ممنون کھڑے تھے۔ کرم دین کی آنکھوں میں ان دونوں بچوں کے لیے ڈھیر ساری محبت و اپنائیت نظر آ رہی تھی۔

مدرسے کے خارجی دروازے کے بالکل پاس لگا ہوا شہتوت کا درخت ہوا کے دوش پر ہلکا ہلکا جھوم رہا تھا۔ مدرسے کی دیوار پر بیٹھے ہمسائیوں کے کبوتر غٹرغوں کا ورد کر رہے تھے۔

''چچا آپ کیوں اتنی تکلیف کرتے ہیں؟''

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

''ہاں چچا آپ ہر بار ہی ہمارے لاکھ منع کرنے کے باوجود اتنا سب کیوں کرتے ہیں؟''

ساجد اور اقبال نے بالترتیب اپنی مصنوعی ناراضگی کے اظہار کے ساتھ شکوہ کیا۔

دراصل کرم دین برابر ساجد اور اقبال کے لیے ایک ایک نیا سوٹ بنوا کر لاتا تھا۔ ایک ایک سفید رومال اور دو عطر کی شیشیاں۔

کرم دین کی ساجد اور اقبال سے محبت کھلے بارے میں مدرسے کا ہر فرد جانتا تھا۔ کچھ طلباء اور یہاں تک کہ کچھ اساتذہ کو بھی ساجد اور اقبال پہ رشک آتا۔ کرم دین کی بے لوث محبت کا ہر کوئی قائل تھا۔

ساجد اور اقبال کے اس معصوم سوال کے بعد اب کرم دین کی آنکھوں کا چھلکنا باقی تھا اور پھر پانچ سیکنڈ سے بھی کم وقت میں کرم دین نے یہ مرحلہ بھی طے کر لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گرتے دیکھ کر ساجد اور اقبال جھٹ سے کرم دین کے گلے لگ گئے۔

''ہمیں معاف کر دیں چچا۔ ہم آپ کو آیندہ کبھی نہیں رلائیں گے۔''

دونوں بچوں کی باتیں سن کر کرم دین کی آنکھوں میں خوشی اور اطمینان چھا گیا۔ اس نے دونوں بچوں کی پیشانی چومی اور گویا ہوا۔ ''بیٹا تمہارے چچا کی طرف سے شاید یہ آخری تحفہ ہو۔'' کرم دین کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔

''کیونکہ پانچ دن بعد ماہ رمضان کا آغاز ہو جائے گا۔ تم دونوں قرآن سناؤ گے اور پھر جیسے ہی یہ مہینا اختتام کو پہنچے گا ویسے ہی تم دونوں بھی اس جگہ کو چھوڑ کر چلے جاؤ گے لیکن میں.... تمہارے لیے نئے کپڑے ضرور بنوایا کروں گا۔ تم دونوں ہر مہینے کی پانچ تاریخ کو آجایا کرنا۔ اپنے کپڑے لینے کے بہانے اپنے چچا سے بھی مل لیا کرنا۔ آؤ گے ناں؟''

کرم دین کی آنکھوں میں التجائیہ سوال تھا، کرب تھا، رنج تھا، دکھ تھا اور ٹوٹ پھوٹ تھی۔

ساجد اور اقبال کرم دین چچا کو یوں بے بس دیکھ کر رو دیے۔

ساجد اور اقبال کے استاد محترم قریب مصلے پر بیٹھے ہوئے وہ دکھی منظر دیکھ رہے تھے۔ اس نے ان کی نظروں میں کرم دین کا مقام اور اونچا کر دیا۔

''ہاں چچا ہم ضرور آیا کریں گے۔ آپ کے ہاتھ سے بنا کھانا بھی کھائیں گے اور آپ کے ساتھ مدرسے کے بھی دھویا کریں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے آپ سے۔''

معصوم روحیں ایک بوڑھے سے مضبوط عہد کر رہی تھیں۔

کرم دین نے ثابت کر دیا تھا کہ رشتے صرف خون کے نہیں ہوتے۔ رشتے ہوتے ہیں احساس کے، محبت وفاداری اور خلوص کے۔

ساجد اور اقبال نے بھی ثابت کر دیا تھا کہ محبت بڑھ کر کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ خلوص ہر تعلق کی بنیاد ہوتا احساس ہر رشتے کو برابری کا حق دیتا ہے۔

کاش ہر انسان اپنی قسمت کا خود کاتب ہوتا۔ کا لفظ کاش وجود میں ہی نہ آیا ہوتا۔ کاش آہوں کے بد وفاؤں کا تبادلہ ہوتا۔

☆.....☆

''ماشاء اللہ۔ مبارک ہو بچوں عید کا چاند نظر آ ہے۔'' امام مسجد نے نیلگوں فلک پر اندھیرے کی ہلکی سی میں باریک سے نئے چاند کی جھلک دیکھ کر طلباء کو مبار دی۔

''خیر مبارک۔''

''مبارک ہو۔''

''خیر مبارک۔''

ہر طرف سے ''مبارک ہو'' اور ''خیر مبارک'' صدائیں گونج اٹھیں۔

کرم دین نے ساجد اور اقبال کے گلے میں پھولو کے ہار پہنا کر انہیں اعتکاف سے اٹھایا۔ تینوں ایک دوسر کے گلے لگ کر ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے۔

کچھ طلباء اور اساتذہ کرام بھی وہاں آ گئے۔ ساجد اقبال کو اعتکاف اور عید کے چاند کی مبارک باد دی۔ کرم د کو ہر سال کی طرح ہر استاد محترم سے نقد عیدی ملی۔

ساجد اور اقبال اس وقت سے فارغ التحصیل ہو چ تھے۔ دونوں حفاظ بن گئے تھے۔ ختم قرآن کے موقع پر دونو کے پاس اچھے خاصے پیسے، کپڑے اور جوتے جمع ہو گ تھے۔

اعتکاف سے اٹھنے والے اور فارغ التحصیل ہو والے طلباء اپنا ساز و سامان سمیٹ کر اس مدرسے کو الوداع کہہ کر جا رہے تھے۔

کرم دین کے ساتھ ساتھ ساجد اور اقبال بھی رنجید

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

حالت میں کھڑے ہوئے تھے... کیونکہ ان تینوں کو ہی علم تھا کہ اب وقتِ جدائی آ پہنچا ہے۔ اب رونے دھونے اور گڑگڑانے سے بھی حقیقت بدل نہیں سکے گی۔

یہ وقت بھی کتنا ظالم ہوتا ہے ناں؟

گزرنے کا کام بڑی ایمانداری سے کرتا ہے۔ اپنے اس کام میں یہ کوئی ڈنڈی نہیں مارتا کوئی سستی نہیں دکھاتا۔

لیکن اس ظالم کی ایک خوبی بھی ہے وہ یہ کہ یہ کسی کی حالت پر، کسی کی آواز پر کان نہیں دھرتا۔ خوشی ہو یا غمی یہ کسی بھی مقام پر نہیں رکتا۔ نہ ہی روتے ہوؤں کو دلاسے دیتا ہے اور نہ ہی مسکراتے چہروں پہ ناچتا گاتا ہے۔ بس گزرتا چلا جاتا ہے۔

☆.....☆

''اپنا خیال رکھنا میرے بچوں۔''

کرم دین ریلوے اسٹیشن کے باہر کھڑا ساجد اور اقبال کو نصیحت کر رہا تھا۔ دونوں ریل کی ٹکٹیں خرید چکے تھے۔ اپنی برتھ پر سامان رکھ کر وہ ریل کے ڈبے سے باہر آ گئے جہاں کرم دین ان دونوں سے الوداعی ملاقات کرنے کے لیے کھڑا تھا۔

شام کے سائے ڈھل گئے تھے۔ ساتھ ہی ان تینوں کی زندگیاں بھی وقتی طور پر اندھیر ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ ریل کی سیٹی بجتے ہی دونوں دوست کرم دین کے گلے لگ گئے۔ ان کی آنکھیں بے اختیار بہہ رہی تھیں۔ بس ایک روتی آواز کی کمی تھی وہ بھی کرم دین کی ہچکی بندھنے پر پوری ہوگئی۔ ساجد اور اقبال اب زار و قطار روئے جا رہے تھے۔ کرم دین بھی آنسو بہا کر اپنے دکھ اور اکیلے پن کا اظہار کر رہا تھا۔

ریل نے پٹری چھوڑنے کی کوشش کی تو ساجد اور اقبال نہ چاہتے ہوئے بھی کرم دین کی چھاتی سے الگ ہو کر ریل میں سوار ہو گئے۔ وہ دونوں ریل کے دروازے کے پاس کھڑے کرم دین کو ایسے دور ہوتا دیکھ رہے تھے جیسے زندگی ان سے دور جا رہی ہو۔

یہ سچ ہی تو تھا کہ کرم دین اور اس جگہ میں ان کی جان بستی تھی۔ اس جگہ سے ہجرت کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ مہاجر کو ہجرت کرنا ہی ہوتی ہے۔ کبھی جگہ سے، کبھی دل سے تو کبھی یادوں سے۔

''جاؤ بچوں تمہارا رب وارث۔''

کرم دین ریل کو نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھ کر نم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے دعائیہ الفاظ کہہ کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ ساجد اور اقبال کے جاتے ہی کرم دین کی دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ اسے ایسا لگا جیسے اس نے دوسری بار اپنی اولاد کھو دی ہو۔

ریلوے اسٹیشن اب ویران ہو گیا تھا۔ مسافروں کو الوداع کہنے والے بھی اس ریلوے اسٹیشن کو الوداع کہہ کر اپنی اپنی منزل کو ہو لیے تھے۔ اب وہاں فقط ہوائیں تھیں، پیڑ پودے تھے اور ریلوے اسٹیشن کی خستہ عمارت تھی جو جانے والوں کی خوشبو کو اپنے اندر بسائے ہوئے تھی۔

☆.....☆

راجن پور کا ریلوے اسٹیشن آ گیا تھا۔ ریل گاڑی وہاں پندرہ منٹ کے لیے رکی تھی۔ پرانے مسافروں کی یہ منزل تھی اور نئے مسافروں کے لیے الوداعی اسٹیشن۔

اب ایک اور الوداع وقوع پذیر ہونے والا تھا۔ ساجد اپنا بوریا بستر اٹھا کر ریل کے ڈبے سے باہر آ گیا۔ اقبال بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آیا۔ ساجد اپنا سامان وہیں پلیٹ فارم پر رکھ کر اقبال کے روبرو آ کھڑا ہوا۔ اقبال کی حالت تو ایسے تھی جیسے کاٹو تو لہو نہیں۔ ساجد بھی ویسی ہی کیفیت میں مبتلا تھا۔

''گلے نہیں ملے گا یار؟'' ساجد نے اقبال کی جانب استفہامیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اقبال ساجد سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جب وہ ساجد کی طرف دیکھے گا تو ایک بار پھر سے پھوٹ پھوٹ کر رو دے گا اور پھر ایسا ہی ہوا۔

ساجد نے اقبال کا ہاتھ پکڑا تو اقبال نے ساجد کی جانب دیکھا۔ وہ لمحہ ان دونوں کی زندگی کا سب سے غمگین لمحہ تھا۔ ساجد کی آنکھیں پانی کے زور سے بھاری ہونے کے باعث چھلک پڑیں۔ اقبال نے جب ساجد کی بہتی ہوئی آنکھیں دیکھیں تو جھٹکا دے کر ساجد کو اپنی جانب کھینچ کر گلے سے لگا لیا۔

اب وہاں آنسوؤں کا سیلاب تھا۔

''مت جا نہاں یار۔ رک جا۔ کیوں مجھے چھوڑ کر جا رہا ہے؟'' اقبال نے روتے ہوئے کہا۔

''میں کون سا خوش ہو کر جا رہا ہوں۔ جتنا دکھ تجھے ہے اتنا دکھ مجھے بھی ہے۔ شاید خدا کو ہمارا ساتھ اتنا ہی منظور تھا۔'' ساجد نے بھی اپنی دلی کیفیت بیان کی۔

''دیکھ ناں کل عید ہے اور ہم اس عید پر ایک ساتھ نہیں ہوں گے۔ پہلی بار مجھے عید کے آنے کا دکھ ہو رہا ہے۔'' اقبال

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اپنا دکھڑا سنا رہا تھا۔

''جانتا ہوں یار۔ مجھے بھی یہ عید ایسے لگ رہی ہے جیسے لوگوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے کی خاطر نہیں بلکہ توڑنے کی خاطر آئی ہے مگر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ یہ زندگی کا دستور ہے۔ ہم اپنا ایک دور پورا کر چکے ہیں اب اگلا دور جینا ہے۔ نہ جانے اگلے دور میں کیا کیا دیکھنا اور سہنا پڑے۔'' ساجد اقبال کو چپ کرواتے ہوئے بول رہا تھا۔

تبھی ریل کی سیٹی بجی اور اقبال نے ساجد کو ایسے دیکھا جیسے یہ جدائی اسے وقت سے پہلے مار ڈالے گی۔

''ایسا مت سوچ یار۔ ہم ایک دوسرے سے ملتے رہیں گے۔ حالات چاہے جو بھی ہوں ہمارا یہ رشتہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ یہی میرا وعدہ ہے۔'' ساجد نے اقبال کی آنکھیں پڑھتے ہوئے دلاسا دیا۔

''جا میرے یار رب دے حوالے۔'' ساجد نے اقبال کو آخری بار گلے لگا کر ریل کے ڈبے میں داخل کیا اور خود وہیں آ کر کھڑا ہو گیا۔

ریل نے پٹڑی پر چلنا شروع کر دیا۔ دونوں دوست تب تک ایک دوسرے کو دیکھ کر ہاتھ ہلاتے رہے جب تک وہ دونوں ایک دوسرے کو نظر آتے رہے۔

☆.....☆

''بیٹا کچھ کھا لے۔ پتا نہیں کل بھی کھانا کھا کر آئے ہو یا نہیں۔ کھا لے بیٹا کھا لے۔''

ساجد عید کی نماز پڑھ کر آیا تو اس کی اماں نے اسے کھانے کا کہا مگر ساجد نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا اور جا کر اپنے کمرے میں لیٹ گیا۔

ماں بیٹے کے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئی۔ ''اداس مت ہو بیٹا۔ کھانا کھا لے۔''

''کیسے کھاؤں اماں۔ اقبال نے پتا نہیں کھایا بھی ہو گا یا نہیں۔'' ساجد نے اداسی میں ڈوب کر کہا تو ماں نے بیٹے کا ماتھا چوم لیا۔

''اس نے بھی نہیں کھایا ہو گا لیکن بیٹا اس طرح بھوکے رہنے سے کیا حاصل ہو گا۔ اچھے بچے بنو۔ کھانا نہیں کھاؤ گے تو بیمار ہو جاؤ گے۔''

عین اسی وقت یہی الفاظ اقبال کی ماں اقبال سے بول رہی تھی۔ دونوں ماؤں نے اپنے بیٹوں کو کھانا کھلا کر ہی دم لیا۔

تیسری جانب کرم دین نے بھی مشکل سے روٹی کے چند نوالے اپنے حلق سے نیچے اتارے۔

یہ کیسا رشتہ ہے جو تین لوگوں کو دور ہونے کے باوجود ایک ہی ڈور سے باندھے ہوئے ہے۔ خلوص کے رشتوں میں قول، فعل اور عمل مشترک ہو جاتے ہیں۔

☆.....☆

''اماں مجھے ساجد سے ملنا ہے۔ مجھے اس کی بہت یاد آتی ہے۔ اسے دیکھے ہوئے دو ماہ گزر گئے ہیں اماں۔ پتا نہیں وہ کیسا ہو گا۔ مجھے اس سے ملنا ہے اماں۔''

اس دن اقبال کی حالت کسی مجنوں سے کم نہیں تھی۔ اس کے صبر کا بند دو ماہ کے بعد اچانک ٹوٹ گیا تھا۔ وہ صبح سے ہی ساجد سے ملنے کی منتیں کیے جا رہا تھا۔

اس کی ماں اسے دلاسے اور تسلیاں دے رہی تھیں مگر اقبال پر ان کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

''آپ سب لوگ مجھے ساجد سے ملنے کیوں نہیں جانے دے رہے ہیں؟ کیوں مجھے دکھی کر کے رکھا ہوا ہے۔ مجھے جانے دیں میں شام سے پہلے واپس آ جاؤں گا۔'' اقبال کبھی غصہ کرتا تو کبھی منتیں۔ دراصل وہ ساجد سے اتنے دنوں سے نہ ملنے کی وجہ سے تھوڑا چڑچڑا ہو گیا تھا۔

''بیٹا ابھی تمہارا بخار نہیں اترا۔ پہلے بخار اتر جائے پھر چلے جانا۔'' ماں نے بیٹے کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے پیار سے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ کوئی بخار نہیں ہے مجھے۔ دیکھو میرے ماتھے پر ہاتھ لگا کر دیکھو۔ بخار نہیں ہے ناں؟''

اقبال نے معصومیت سے اماں کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ماتھے پر رکھا تو اماں کا ہاتھ دہکتی ہوئی پیشانی کی وجہ سے جل اٹھا۔ بیٹے کی دوست کے لیے تڑپ اور معصومیت دیکھ کر ماں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''اقبال پتر دیکھ تو کون آیا ہے۔''

حافظ محمد علی (اقبال کے والد محترم) نے گھر میں داخل ہو کر اقبال کو مخاطب کیا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

محمد علی کی دائیں جانب ایک عورت کھڑی تھی۔ اقبال انہیں اچھی طرح سے جانتا تھا۔ کئی بار ان سے مل بھی چکا تھا۔ وہ ساجد کی اماں تھی لیکن ساجد کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

''اماں میرا یار کدھر ہے؟''

اقبال نے اماں سے سلام و دعا بھی نہیں کی۔ یقیناً وہ انہیں دیکھ کر تھوڑا جذباتی ہو گیا تھا ورنہ وہ جب بھی ان سے ملتا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

تو سگے بیٹے کی طرح ان کا پیار لیتا، ان کو گلے سے لگاتا، ان سے دعائیں لیتا۔

اقبال بھی ساجد کی اماں کو اماں کہہ کر ہی مخاطب کرتا تھا۔ اپنے دوست کی اماں کو دیکھ کر اقبال کا دل بھر آیا تھا۔ دو موٹے موٹے آنسو بھی اس کے گالوں پر پھسل گئے جب اس نے اپنے یار کا پوچھا تھا۔

''ساجد کہتا ہے میں اقبال سے ملنے نہیں جاؤں گا۔ وہ کہتا ہے کہ اقبال کون سا اس سے ملنے آیا ہے جو میں جاؤں ملنے۔'' ساجد کی ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

محمد علی بھی پاس کھڑا دل میں ہنس رہا تھا جب کہ اقبال کا دل کر رہا تھا کہ وہ پھٹ پڑے۔ وہ جلدی سے چارپائی سے نیچے اترا۔ پاؤں میں چپل پہننے کا خیال ہی نہیں آیا۔ وہ اماں کی طرف بڑھ رہا تھا جو ابھی تک دروازے کے پاس کھڑی ہوئی تھیں۔

''میرا یار ایسا بول ہی نہیں سکتا اماں۔ وہ ایسا نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں۔ ہم دونوں کے درمیان ضد کا رشتہ تو کبھی تھا ہی نہیں اور نہ ہی کبھی ہوگا۔''

اقبال بات کرتے کرتے اماں کے پاس پہنچ گیا۔ تبھی اقبال کی نظر اپنے ابا کے پیچھے چھپ کر کھڑے ہوئے اپنے یار پر پڑی۔ ساجد نے جب محسوس کیا کہ اقبال نے اس کی چوری پکڑ لی ہے تو وہ محمد علی کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔

دونوں دوست اب ایک دوسرے کے سامنے تھے۔

نظریں ملیں، دل زور سے دھڑکے اور فضا میں عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ گھر کی در و دیوار پر بیٹھے ہوئے چڑیاں شور کر رہے تھے لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بھی بہرے ہوں۔ ان چڑیوں کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ گھر میں لگے ہوئے درختوں کی ٹہنیاں بظاہر تو ہل رہی تھیں، پتے بھی کپکپا رہے تھے لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے ہوا کا وہاں سے گزر ہی نہ ہوا ہو۔

''ساجد میرے یار۔''

اقبال نے اپنے دوست کو اس کے نام سے مخاطب کیا تو اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں پانی بھر آیا اور تبھی ساجد نے آگے بڑھ کر اقبال کو گلے سے لگا لیا۔ دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے کے گلے لگے رہے۔ ایک دوسرے سے معصومانہ شکوے شکایتیں کرنے لگے پھر وہ ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو اقبال نے ساجد کی نم آنکھوں کو صاف کیا۔

ساجد نے بھی اقبال کے آنسو اپنی ہتھیلی پر دھر لیے۔

''تجھے دیکھ کر سکون مل گیا ہے یار۔ کتنے دن ہو گئے ہیں تجھے دیکھے ہوئے اور دیکھ تو کمزور بھی لگ رہا ہے۔ کھانا نہیں کھاتا کیا؟'' اقبال ماں کی طرح ساجد سے شکایت کر رہا تھا۔

''میں کمزور ہو گیا ہوں تو تم کون سا پہلوان بن گئے ہو۔ خود کو دیکھو تو سہی، رنگ پیلا پڑ گیا ہے روٹی نہیں کھاتے ہو کیا؟'' ساجد نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دے کر اقبال کو لاجواب کر دیا۔

''کھاتا تو کھاتا ہوں یار لیکن وہ مزہ کہاں جو تیرے ساتھ کھانے میں آتا تھا۔ ایک ہی برتن میں سالن اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھانا کھانا۔ سچ یار تجھے بہت یاد کیا ہے میں نے۔'' اقبال اپنے دل کا حال بیان کر رہا تھا۔

''میں نے بھی تجھے بہت یاد کیا ہے یار۔ جب بھی ماں کھانا کھانے کو کہتی تو سب سے پہلے تیرا ہی خیال آتا کہ پتا نہیں تم نے کھانا کھایا ہوگا یا نہیں۔ میں ہر وقت گھر میں اداس اداس سا پھرتا رہتا۔ بہت کہا کہ مجھے اقبال کے پاس لے جاؤ لیکن بخار ہونے کی وجہ سے مجھے کوئی بھی نہیں لاتا۔ جیسے ہی بخار اترا تو میں تم سے ملنے چلا آیا۔''

ساجد نے اقبال کو ساری روداد سنائی تو اقبال نے ساجد کو ایک بار پھر سے گلے لگا لیا۔ دونوں اس بات سے بے خبر تھے کہ ان کے والدین صحن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے ان کو ہی دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

''اللہ پاک ہمارے بچوں کی دوستی کو ہر بری نظر سے محفوظ رکھے۔'' اقبال کی اماں نے آسمان کی جانب دیکھ کر کہا تو محمد علی اور ساجد کی اماں نے بیک وقت آمین کہا۔

''اقبال کے ابا دیکھیں ناں اب کیسے بھلا چنگا ہو گیا ہے ہمارا بیٹا۔'' اقبال کی اماں نے اپنے خاوند کو مخاطب کیا۔

''ٹھیک کہتی ہو اقبال کی اماں۔ اپنے دوست سے مل کر پوری طرح ٹھیک ہو گیا ہے۔ ایسے لگ ہی نہیں رہا کہ اسے پچھلے ایک ماہ سے بخار ہو۔''

''بھائی صاحب میرا بیٹا ساجد بھی بہت بیمار ہو گیا تھا۔ ہر وقت بس یہی ضد لگائے رکھتا کہ مجھے اقبال سے ملوا دو۔ کل ہی اس کا بخار اترا ہے اسی لیے میں اسے لے کر یہاں آ گئی۔'' ساجد کی اماں نے ساجد کا احوال بیان کیا۔

''بہن جی ہم خوش قسمت ہیں جو ہمیں ایسی محبت کرنے والی اولاد ملی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ جوڑی دور رہی

Wajid Azeem
Pakistanipoint.com

تو ہمیشہ پریشان رہے گی۔ ان کی محبت دیکھ کر تو کبھی میں ڈر ہی جاتا ہوں کہ اللہ نہ کرے اگر ایک کو کچھ ہو گیا تو دوسرا خود کو یونہی برباد کر لے گا۔'' محمد علی نے اپنی اولاد کی تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ڈر کا بھی اظہار کیا۔

''اللہ نہ کرے اقبال کے ابا۔'' اقبال کی اماں نے جھٹ سے اپنے خاوند کو ٹوک دیا۔

☆.....☆

زندگی وقت کے ساتھ ساتھ دوڑتی رہی۔

اقبال اور ساجد جو اپنی بیماری کی وجہ سے کرم دین سے ملنے نہیں جا پائے تھے ایک دن اپنے اس محسن سے ملنے چلے گئے۔

کرم دین نے دونوں کو دیکھ کر گلے سے لگا لیا اور خوب پیار دیا۔ دیر سے آنے کے شکوے بھی کیے مگر جب اسے دونوں کی بیماری کا علم ہوا تو اس نے اپنے شکوے سمیٹ کر کوڑا دان کی نظر کر دیے۔

وہ سارا دن دونوں دوست کرم دین کے ساتھ ہی رہے۔ اپنے مدرسے بھی گئے۔ اپنے اساتذہ سے ملے۔ کچھ پرانے طلباء بھی انہیں دیکھ کر ان سے ملنے آ گئے۔

کھانے کے وقت دونوں نے مل کر مدرسے کا کھانا کھایا۔ برتن دھونے میں کرم دین کی مدد کی اور پرانی یادوں کو زندہ کیا۔

ان کو ایسا لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ فارغ التحصیل ہو گئے ہیں بلکہ وہاں واپس آ کر انہیں پہلے والا ہی احساس ہو رہا تھا۔ وہی طالب علمی کا زمانہ، وہی موج مستی، وہی لنگر خانہ۔

وقت کچھ مخصوص یادوں کو مخصوص مقامات کے ساتھ باندھ لیتا ہے۔ جب ہم ان مخصوص مقامات کے پاس سے بھی گزرتے ہیں تو ماضی کی ہوا ان مخصوص یادوں کی مہک ہمارے انگ انگ میں اتار دیتی ہے پھر وہاں وہ سب ہوتا ہے جو ماضی کا حصہ رہا ہوتا ہے۔ وہی باتیں، وہی جذبے، وہی محبت اور وہی احساس۔

کرم دین سے رخصت لینے کا وقت آیا تو کرم دین نے اپنے کمرے میں رکھے ہوئے سیاہی مائل صندوق سے چھ سلے ہوئے سوٹ، چھ عطر کی شیشیاں چھ جوتوں کے جوڑے اور چھ رومال ساجد اور اقبال کو سونپ دیے۔

''بیٹا یہ تمہاری چیزیں ہیں۔ تین ماہ سے سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں۔'' کرم دین نے محبت سے دونوں بچوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''چچا۔ آپ کیوں.....؟''

''نہیں بیٹا۔ یہ کرنا مجھے تکلیف نہیں دیتا بلکہ سکون دیتا ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں میں یہ سکون حاصل کرتا رہوں گا لیکن اصل راحت تب ملا کرے گی جب تم دونوں مجھ سے ملنے آؤ گے اور اپنا یہ سامان اپنے ساتھ لے جایا کرو گے۔''

''چچا آپ ہمارے لیے اتنا سب کچھ کرتے ہیں اور ایک ہم نالائق ہیں جو آپ کے لیے کبھی کچھ نہیں کر پائے۔'' ساجد نے خود پر افسوس کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں بیٹا ایسا مت سوچو۔ تم کیا جانو کہ تم دونوں کو دیکھ لینے سے ہی مجھے کائنات کی ساری دولت مل جاتی ہے۔ تم دونوں میرے بیٹوں کی طرح نہیں بلکہ میرے بیٹے ہی ہو' اور باپ کو اولاد سے کچھ نہیں چاہیے ہوتا۔ وہ تو بس اپنی اولاد کو خوش دیکھنا چاہتا ہے، ان کو کامیاب دیکھنا چاہتا ہے اور ان کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتا ہے۔

بیٹا تم دونوں کبھی ایک دوسرے سے الگ مت ہونا اگر کبھی کسی ایک کو دوسرے کی بات بری لگ جائے تو غصہ مت کرنا بلکہ اس کا ہاتھ تھام کر کہنا۔ ''مجھے معاف کر دو۔ بیٹا تم دونوں دوستی کی بہت بڑی مثال ہو۔ مدرسے میں ابھی تک سب لوگ تم دونوں کی محبت کی مثال دیتے ہیں۔ زندگی میں چاہے کچھ بھی ہو جائے لیکن تم دونوں اس رشتے کو ٹوٹنے مت دینا۔ بس میں یہی کہنا چاہتا تھا۔''

کرم دین نے دونوں بچوں کو نصیحتیں کیں۔ ساجد اور اقبال نے کرم دین کی باتوں کو دل میں قید کر لیا۔

شام کے وقت ساجد اور اقبال کرم دین کو الوداع کہہ کر ریل میں بیٹھے اپنے گھر کی جانب سفر کر رہے تھے۔

☆.....☆

وقت نے تھوڑی تیزی دکھائی اور ماہ و سال کا عرصہ گزرنے لگا۔ ساجد اور اقبال دونوں بہاولنگر شہر میں آ کر بس گئے۔ دراصل ساجد کو ایک مدرسے میں امامت کی نوکری مل گئی تھی۔ جب ساجد بہاولنگر شہر آیا تو اقبال بھی اس کے ساتھ تھا۔ دونوں کے والدین اس بات پر راضی ہو گئے کہ دونوں دوست دوسرے شہر جا سکتے ہیں اور ساتھ رہ سکتے ہیں۔

ساجد جس مدرسے کا امام تھا اس کے ساتھ ہی ایک کرائے کا گھر تھا جسے انہوں نے کرائے پر لے لیا۔ ساجد کا زیادہ تر وقت مدرسے میں ہی گزرتا۔ وہ امامت کے ساتھ ساتھ وہاں بچوں کو قرآن پاک بھی پڑھاتا تھا۔ جب کہ اقبال گھر رہ کر کھانے پینے کا بندوبست کرتا، دونوں کے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

دنیا جہان کی ہر چیز مہیا کریں گے۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دیں گے۔''

تبھی اقبال بولا۔ ''بس یہ درخواست سمجھ لیں، منت یا پھر التجا کہ ہم دوستوں کے بیچ دیوار مت کھینچیے گا۔''

انہوں نے اپنی بیگم اور بھائی پر ہر چیز واضح کردی۔ ان کو محتاط کردیا تاکہ وہ چاہ کر بھی کوئی غیر متوقع عمل نہ کرسکیں۔

ان دونوں بہنوں نے بھی ان کی لاج رکھی۔ ہمیشہ ہنسی خوشی زندگی بسر کی۔ ساجد اور اقبال کو شکایت کا کبھی موقع ہی نہیں دیا۔

وقت گزرتا چلا گیا اور وہ دونوں باپ بھی بن گئے۔

مزید وقت گزرا ساجد دو بچوں کا باپ بن گیا۔ سلیم ساجد اور عفت ساجد۔

اقبال کے تین بچے تھے۔ دو جڑواں بیٹیاں اور ان سے چھوٹا بیٹا تھا۔

ان دونوں کی زندگیوں میں ہر طرف خوشی ہی خوشی تھی۔ ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔

کاش خوشی اور مسرت کے لمحے ہمیشہ قائم رہ سکتے۔

لیکن ایسا ناممکن ہے کیونکہ خوشی اور غم کا دورانیہ نہایت ہی کم ہوتا ہے، یہ موسموں کی طرح تبدیل ہوتا رہتا ہے۔

☆.....☆

وہ ایک سرد شام تھی۔

دھند میں لپٹی ہوئی دسمبر کی آخری شام۔ چرند پرند اپنے اپنے آشیانوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ تیز ہوائیں سردی کی شدت میں اضافے کا سبب بنی ہوئی تھی۔

اقبال اپنے گھر میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اقبال کی بیگم اس کے لیے دودھ گرم کررہی تھی۔ بچے کھانا کھا کر سو چکے تھے۔

ساجد کی بیگم اپنے بچوں کو کھانا کھلانے کے بعد کچن میں کھڑی برتن دھو رہی تھی۔ ساجد مسجد میں تھا۔ اس کی واپسی عشاء کے بعد ہوتی تھی۔

اقبال کی بیگم کپ میں دودھ لے کر اپنے خاوند کی طرف چلی گئی۔ ساجد کی بیگم آخری برتن دھو ہی رہی تھی کہ اپنی بہن کی تیز چیخ کی آواز سن کر لرز گئی۔ اسٹیل کا برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا اس کی گونج دور تک گئی۔

سعدیہ بھاگ کر کچن سے باہر نکلی اور بہن کے کمرے کی جانب بھاگی۔

رابعہ فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں پھیل کر چوڑی ہوگئی تھیں۔ وہ کسی صدمے کا شکار لگ رہی تھی۔

سعدیہ اپنی بہن کو اس حالت میں دیکھ کر روتے ہوئے اور اسے جھنجھوڑنے لگی لیکن رابعہ پر سکتے کی کیفیت طاری رہی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ چارپائی پر لیٹے ہوئے اقبال بھائی نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ ان کی جانب بڑھی لیکن وہاں چڑیاں کھیت چگ کر جا چکی تھیں۔

حافظ اقبال ولد محمد علی اس جہان کو خیر آباد کہہ چکا تھا۔

سعدیہ کی حالت اس عورت کی طرح تھی جس کے سامنے اس کا گھر جل کر راکھ ہوگیا ہو اور وہ کچھ نہ کرسکی ہو۔

رابعہ بیہوش ہو کر اس دکھ کی کیفیت سے وقتی طور پر چھٹکارا پا گئی لیکن سعدیہ ہوش میں تھی اور اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اسے اس دنیا و جہاں کا کوئی ہوش نہ ہو۔

اقبال اور ساجد کے بچے اس ساری صورتِ حال سے ڈر گئے تھے اور اپنی ماؤں کے پاس کھڑے رو رہے تھے۔

تبھی ساجد عشاء کی نماز پڑھا کر گھر میں داخل ہوا۔

تو اسے بچوں کے رونے کی آواز سنائی دی۔

''یا اللہ رحم!'' کہتے ہوئے وہ برآمدے کی جانب بھاگا اور اپنی بیوی کو آنسو بہاتا دیکھ کر مزید گھبرا گیا تبھی اس کی نظر زمین پر بے ہوش پڑی اپنی بھابی پر پڑی۔ بیگم کو چھوڑ کر وہ بھابی کی جانب بڑھا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کا دوست چارپائی پر لیٹا ہوا ہے اور کوئی حرکت بھی نہیں کررہا۔

بیوی اور بھابی کا خیال پل بھر میں غائب ہوگیا اور وہ اپنے یار کے پاس پہنچا۔

اقبال بغیر کوئی حرکت کیے لیٹا ہوا تھا۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھوں میں منجمد آنسو تھے۔ ''اقبال، اقبال کیا ہوا تجھے یار۔''

ساجد اقبال کو ہلا رہا تھا مگر اقبال کی جانب سے کوئی جواب نہیں ملا۔

''اٹھ یار کیا ہوگیا تجھے۔ تو کچھ بولتا کیوں نہیں۔ اٹھ میرے یار۔'' ساجد زار و قطار روتے ہوئے اپنے دوست کو جھنجھوڑ رہا تھا۔

ساجد نے اقبال کی حرکت قلب دیکھی۔ وہ بند ہو چکی تھی۔ نبض پکڑی، ناک پر انگلی رکھ کر سانس چیک کی۔

جب ساجد کو یقین ہوگیا کہ اقبال نہیں رہا تو اس کی سانسیں بند ہونے لگیں اور وہ روتے روتے زمین پر گر گیا۔

اس کے بیٹے نے بھاگ کر پانی کا گلاس اٹھایا اور اپنے ابا کے چہرے پر پانی کی چھینٹیں مارنے لگا۔ تب تک سعدیہ کے حواس قابو میں آچکے تھے اور وہ بھی اپنے خاوند کو اٹھانے کی کوشش کررہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد ساجد کو ہوش آگیا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

رابعہ دوبارہ ہوش میں آکر بے ہوش ہو چکی تھی۔

گھر میں قیامت برپا ہو چکی تھی۔ رونے کی آوازیں سن کر محلے والے بھی ساجد کے گھر جمع ہو گئے۔

مرد حضرات ساجد کو اقبال سے الگ کرنے کی کوشش کرنے لگے لیکن ساجد اقبال سے دور ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وہ رو رو کر آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھا۔

''اقبال نہیں مر سکتا۔ میرا یار اس طرح مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ ہم دونوں نے وعدہ کیا تھا کہ جئیں گے تو ایک ساتھ اور مریں گے بھی ایک ساتھ۔ تو مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ تو وعدہ خلافی نہیں کر سکتا۔'' ''ابھی تو ہم نے جینا شروع ہی کیا ہے اور تو ابھی سے ساتھ چھوڑ رہا ہے۔''

ساجد کی باتیں سن کر وہاں موجود ہر شخص آبدیدہ تھا۔

وقت کی تیز آندھیاں محبتوں کے سرسبز پیڑ کو خزاں رسیدہ کرنے میں ذرا بھی عار محسوس نہیں کرتیں۔

☆.....☆

اقبال کی میت کو جنازہ گاہ لایا جا چکا تھا۔

ہر آنکھ اشکبار تھی۔ ساجد کی تو دنیا ہی اجڑ گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بھی مر گیا ہو۔

ساجد کے والد محترم، بڑا بھائی، اقبال کے والد محترم اور بڑے دونوں بھائی پہلی صفوں میں مردوں کی حالت میں کھڑے ہوئے تھے۔ سب کی آنکھیں چھم چھم برس رہی تھیں۔

تبھی ساجد صف سے باہر نکلا اور اقبال کی میت کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مائیک پکڑ کر ضروری اعلان کیا۔ ''میرے بھائیو اگر کسی کا بھی میرے بھائی حافظ اقبال کے ساتھ کوئی لین دین ہے تو وہ مجھ سے مطالبہ کر سکتا ہے۔ اگر میرے بھائی نے کسی سے کچھ لینا ہے تو وہ اس شخص پر معاف ہے۔ بس دل سے ایک بار میرے بھائی کی مغفرت کی دعا کر دیجیے گا۔'' پھر وہ بے اختیار رونے لگا پھر رونا بند کر کے بولا۔ ''اگر کسی نے میرے بھائی حافظ اقبال سے کچھ لینا ہے تو وہ صرف اور صرف مجھ سے مطالبہ کر سکتا ہے۔ حافظ اقبال کے بڑے بھائیوں اور والد محترم سے نہیں کیونکہ اس کا دعوے میرے اوپر ہے۔''

ساجد اعلان ختم کر چکا تو اسی نے اپنے دوست کی نمازِ جنازہ ادا کروائی۔ ہر تکبیر پر اس کی آنکھوں سے آنسو سیلاب کی طرح بہنے لگ جاتے۔

نماز جنازہ کے بعد اقبال کو اس کے آخری گھر کی جانب لے جایا گیا۔ سارے رستے ساجد کی چیخیں گونجتی رہیں۔ اس سے خود پر ضبط ہی نہیں ہو رہا تھا۔

ساجد کی حالت دیکھ کر لوگوں کو اس پر ترس آ رہا تھا۔ اقبال کے بھائی اور والد صاحب بھی رو رہے تھے مگر ساجد پر جو بیت رہی تھی وہ صرف ساجد جانتا تھا یا اس کا خدا۔

☆.....☆

''اچھا بیٹا اب ہم واپس گاؤں جا رہے ہیں۔ ہو سکے تو تم بھی کچھ دنوں کے لیے سب بچوں کو لے کر گاؤں آ جاؤ۔''

اقبال کے سوئم کے بعد اقبال کے والد ساجد سے بولے۔ اقبال کے دونوں بھائی گاؤں واپس جا چکے تھے کیونکہ فصل تیار کھڑی تھی اور گھر میں بھی کوئی نہیں تھا۔

ساجد کے والد اور اماں ساجد کے ساتھ ہی تھے۔

اقبال کی اماں کو اقبال کی موت کا صدمہ یوں گزرا کہ وہ بات چیت کرنا ہی چھوڑ چکی تھیں۔ ساجد کی اماں ان کو تسلیاں دیتی رہتیں۔

رابعہ کی زندگی تو اقبال کے جانے کے بعد جیسے ختم ہی ہو گئی تھی۔

گھر کے ہر فرد کا دکھ کم ہونے کی بجائے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ ون کس کو سنبھالتا؟ یہاں تو سبھی اقبال کے غم میں مبتلا تھے۔

سوئم کے بعد اقبال کے والد گاؤں جانے لگے تو انہوں نے ساجد کو بھی کہا کہ وہ بچوں کے ساتھ کچھ دن کے لیے گاؤں آ جائے تاکہ اس دکھ بھرے ماحول سے کچھ دنوں کے لیے آزادی مل سکے لیکن ساجد کوئی جواب نہیں دے سکا۔

سب جانتے تھے کہ ساجد اندر سے ٹوٹ چکا تھا۔ اقبال کو قبر میں اتارتے وقت وہ جس قدر رویا تھا وہ بیان سے باہر تھا۔

اسی دن اقبال کے گھر والے واپس گاؤں لوٹ گئے۔ ساجد کا بھائی، والد اور اماں بھی ان کے ساتھ واپس لوٹ گئے۔

اب وہاں کوئی نہیں تھا سوائے اس گھر کے مکینوں کے۔

☆.....☆

اقبال کو اس جہان سے گئے ہوئے ایک ماہ گزر گیا تھا۔

سب لوگ بظاہر تو ٹھیک نظر آ رہے تھے لیکن وہ ٹھیک نہیں تھے۔ اقبال کی کمی ہر جگہ محسوس ہوتی تھی۔

رابعہ بس چپ چاپ خلاؤں میں گھورتی رہتی۔ سعدیہ گھر کا سارا کام خود کرتی تھی۔ بچوں کو کھانا بھی وہی کھلاتی تھی۔

ساجد کی بھوک پیاس تو جیسے ختم ہی ہو گئی تھی۔

اقبال کی دودھ دہی کی دکان پر اس کا رکھا ہوا ملازم کام

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کر رہا تھا۔ ساجد اس سے سارا حساب کتاب کرتا رہتا تھا۔ جنرل اسٹور بند کر دیا گیا۔

ساجد کا زیادہ تر وقت مسجد میں ہی گزرتا تھا۔

ہر نماز کے بعد وہ اپنے رب سے رو رو کر اپنے دوست کی مغفرت کی دعا مانگتا اور اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے صبر مانگتا۔

''دیکھیں جی آپ کو صبر کرنا ہوگا۔ اس گھر کے ہر فرد کو آپ کی ضرورت ہے۔'' اس شام سعدیہ اپنے خاوند سے گفتگو کر رہی تھی۔ ساجد گم صم بیٹھا ہوا تھا۔

''صبر ہی تو نہیں آتا بیگم۔ اللہ سے بہت زیادہ صبر مانگتا ہوں مگر لگتا ہے کہ مجھے کبھی صبر نہیں آئے گا۔ زندگی کا مقصد ہی جیسے ختم ہو گیا ہے۔ اقبال تھا تو اس کا سہارا تھا مجھے۔ اس کو دیکھ کر دن بھر کی ساری تھکان ختم ہو جاتی تھی۔ اس کے ہاتھ سے ایک ہی نوالہ کھا کر ساری بھوک مٹ جاتی تھی... مگر اب تو جیسے جسم ناکارہ ہو گیا ہے۔ نہ ہی تھکان ختم ہوتی ہے اور نہ ہی بھوک لگتی ہے۔'' ساجد بے بسی سے آنسو بہاتے ہوئے اپنی بیگم سے کہہ رہا تھا۔

''زندگی کا مقصد ختم نہیں ہوا، بلکہ مقصد تو ابھی ملا ہے آپ کو۔ اقبال بھائی کے بعد اب ان کی بیگم کی ذمے داری آپ پر ہے۔ ان کے بچوں کے بہتر مستقبل کا آپ نے سوچنا ہے اگر آپ ہی ہمت ہار گئے تو ان سب کا کیا ہوگا؟''

سعدیہ بہت بڑی بات کہہ گئی تھی۔ ساجد نے حیرت سے اپنی بیگم کو دیکھا۔ ''میرے تو ذہن میں بھی نہیں تھا کہ اب بھابی اور ان کے بچوں کی ساری ذمے داری مجھ پر ہے۔ مجھے یاد دلانے کا بہت شکریہ بیگم۔ اگر میں بھابی اور ان کے بچوں کی ذمے داریاں ٹھیک سے ادا نہ کر پایا تو اپنے یار کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ یہ سچ ہے کہ اقبال کے جانے کے بعد میرا جینے کا من نہیں ہے لیکن اب جینا ہوگا۔ اس گھر کے ہر فرد کو سنبھالنا ہوگا۔ آج سے میں ہر ذمے داری احسن طریقے سے ادا کروں گا۔''

ساجد کا نیک ارادہ جان کر سعدیہ نے سکون کا سانس لیا اور اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

ساجد نے جا کر اپنی بھابی سے ان کی صحت کے بارے میں پوچھا۔ ان کو امید دلائی کہ ان کا یہ بھائی ہمیشہ ان کے ساتھ ہے۔ اقبال کے بچوں کو پیار دیا اور پھر گھر سے باہر نکل کر قبرستان کی طرف بڑھ گیا۔

☆.....☆

ساجد اقبال کی قبر کے سرہانے بیٹھا ہوا فاتحہ خوانی کر رہا تھا۔ دعا کے بعد اس نے اقبال کی قبر کی مٹی برابر کی اور اس مٹی کے ڈھیر سے باتیں کرنے لگا۔ ''یار تو تو بڑا وعدہ فراموش نکلا۔ ساتھ جینے مرنے کے وعدے کر کے اکیلے ہی چلا گیا۔ تو نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ میرا کیا بنے گا۔ میں کیسے جیوں گا تیرے بغیر۔ بڑا جلد باز نکلا تو تو۔ آخری بار گلے سے بھی نہیں لگا کر گیا۔''

ساجد کے رونے کی آوازیں قبرستان میں گونج رہی تھیں۔ ''دیکھ ناں کہ اب میری حالت کیا ہو گئی ہے۔ دیکھ تیرا پار تیرے بغیر مر رہا ہے۔ تیرے بغیر تیرا یار جینے کا سوچ بھی نہیں سکتا لیکن میں ابھی مرنا بھی نہیں چاہتا... کیونکہ میرے اوپر بھابی اور بچوں کی ذمے داری ہے۔ ہمارے گھر کے ہر ایک فرد کو ایک دوسرے کے ساتھ محبت کے ساتھ باندھے رکھنے کی ذمے داری ہے۔ میرے یار تیرے بغیر زندگی کا ہر منظر پھیکا پڑ گیا ہے۔ بہاریں یہاں کا رستہ بھول گئی ہیں۔ لیکن مجھے بہاروں کو واپس لانا ہے۔ خزاں سے چھٹکارا پانا ہے۔ ابھی مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔ اپنی ذمے داریاں نبھالوں پھر تیرے پاس چلا آؤں گا۔ میرا انتظار کرنا میرے یار۔ میرا انتظار کرنا۔''

ساجد نے اقبال کی قبر سے مٹی اٹھا کر چوم لی اور زار و قطار روتے ہوئے قبرستان سے باہر نکل آیا۔

اب اس کے سامنے ذمے داریوں اور فرائض کی ایک لمبی فہرست تھی۔ ساجد نے اللہ پاک سے ثابت قدم رہنے کی دعا کی اور مسجد کی جانب بڑھ گیا۔

☆.....☆

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ اقبال اور ساجد کے بچے جوان ہوتے رہے۔ ساجد اور اقبال کی بیویاں بھی ساجد کے انتقال کے بعد یکے بعد دیگرے یہ دنیا چھوڑ گئیں۔ اب دونوں گھروں پر بچوں کا راج ہے۔ گھر تو ویسے ہی سر اٹھائے کھڑے ہیں مگر ایک واضح فرق آ چکا ہے۔ دونوں گھروں کے درمیان جو دروازہ ہے وہ بند ہو چکا ہے۔ ان کے بچے اب عید بقرعید پر بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے کیونکہ ساجد کے بچے اسلامی تعلیمات کو چھوڑ کر سرکاری محکموں میں جاب کر رہے ہیں اور اقبال کے بچے کاروباری بن چکے ہیں۔ وقت نے اس گھرانے سے اخلاص و محبت چھین لی ہے۔ مفاد پرستی ہی انہیں زندگی لگنے لگی ہے۔

++

Waqar Azeem
Pakistanipoint

رمضان پر جوانی کی آمد کے ابتدائی دن تھے۔ یہ عمر سہانے خوابوں میں گزرنے کے تھے۔ نت نئے انداز میں خود کو پیش کرنے کے تھے۔ رائج فیشن کو اپنانے کے تھے مگر اس کے دن ننگے بدن صرف آدھی ٹانگوں پر کھینچوں چادر باندھے، ٹھیلا کھیتے ہوئے گزر رہے تھے۔ کاروبار زندگی کی ریس میں پہلا دن ہی اس کی پڑھائی چھوٹنے کا دن تھا، جو اس پر صدمہ جانکاہ کی بجائے نوید مسرت ثابت ہوا تھا۔ سارا دن ٹھیلا کھیتے رہنے کے بعد گو کہ وہ کچھ زیادہ پیسے نہ کما پایا تھا پھر بھی اس کے ابا

بھرم

مکرمی مدیر
السلام علیکم!
یہ سچ بیانی رمضان اور آصف کی ہے بلکہ ہمارے آس پاس جتنے بھی لوگ ہیں ان سب کی ہے۔ رمضان کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا یہ ہمارے معاشرے میں عام ہے۔ آصف نے بھی جو کچھ کیا یہ خاص لوگوں کی پہچان ہے۔ اُمید ہے قارئین بھی پسند کریں گے۔

علی مان آفاقی
(احمد پور شرقیہ)

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اجمل نے بیس روپے والا ٹافیوں کا پیکٹ محلے کے بچوں میں بانٹ دیا تھا پھر باقی بچنے والے دس روپے حاتم طائی کی سخاوت جیسی شان سے.... رمضان کو ہی انعام کے طور پر دے دیے تھے۔

رمضان کے لیے وہ روپے خزانے جیسے تھے اس رات نیند بہت دیر تک اس پر حاوی نہ ہو سکی تھی۔ دس روپے خرچ کرنے کے انوکھے مصارف اور مزید روپے کمانے کی سوچیں گرداب میں لے رہی تھیں نیند آنے تک وہ سوچتا ہی رہا تھا۔ سوچوں کا شیخ چلی آج تو گویا نوٹوں کے بستر پر سو رہا تھا۔ نیند میں بھی خوابوں کی راہگزر میں اسے گرداگرد افشانی کاغذ اڑتے بکھرے نظر آتے رہے تھے۔

اگلی صبح اس کے بیدار ہونے سے پہلے ہی اس کا ٹھیلا اشیائے خورونوش اور روزمرہ کے استعمال کی چیزوں سے بھرا گویا اس کے انتظار میں تھا۔ ابا اس دن خلاف توقع ہمیشہ کی طرح ''مالوف'' گانے کی بجائے کوئی گیت گنگنا رہا تھا۔ آج پہلی بار رمضان کی سماعت ابا کی شوخ آواز سے آشنا ہوئی تھی۔ شاید اجمل کے ہونٹ بھی اس گیت کو لے کر پہلی بار چٹک رہے تھے کہ گیت گاتے وہ احتیاط سے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ مبادا ابھی تک بستر میں پڑی ''سکھاں'' اس کی کارروائی ملاحظہ نہ کر لے۔ اسے اپنی بیوی کی شرم لاج کا خیال رہتا تھا۔

مگر روز دیر سے اٹھنے والا رمضان آج بہت جلد اٹھ گیا تھا اور اس نے ابا کی یہ خوشگوار تبدیلی ملاحظہ کر لی تھی...... جانے خوشی کا کون سا ریلا اس کے وجود میں پھوٹ رہا تھا کہ جذبات پر اس کا اختیار نہ رہا تھا۔

شاید بیٹے کی پہلی کمائی کی خوشی اس کے قدم زمین پر ٹکنے نہ دے رہی تھی۔ رمضان نے بھی اسے چھیڑنا اور قریب جانا مناسب نہ سمجھا اور سورج کی آنکھ کو آسمان کے چہرے پر واضح نہ پا کر پھر سے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے بھی باپ کے وقار کی لاج رکھ لی تھی۔

آج ٹھیلا لگا کر چلتے ہوئے جوں جوں دن گزرتا گیا اس کی جیب بھاری ہوتی گئی۔ ابا سے ملا دس روپے کا نوٹ جیب میں آئی ''ریزگاری'' کے بے ہنگم اضافے میں چرمر ہو گیا اور اسے خرچ کرنے کی ترکیبیں مزید رقم آنے کی چاہ میں کہیں رفوچکر ہو گئیں۔ اس دن سے ہی پیسا کمانے کی لگن اور خرچ کرنے کی ناپسندیدگی اس کی طبیعت میں رچ بس گئی تھی۔ سارا دن کما کر ابا کے پاس لا دھرتا اور اپنے انعام کے دس روپے علیحدہ سے مٹی کی گولک، جس پر اس نے نرم بانس کی ترشی لکڑی سے ''انٹرنیشنل بینک'' لکھا ہوا تھا، میں ڈیپازٹ کر دیتا۔ اس کی دولت کا خانہ گزرتے وقت کے ساتھ اپنا خلا چھوٹا کرنے لگا۔ گولک بھرنے تک اس کی حیثیت بھی عزت افزا ہو گئی تھی۔ جو لڑکے غریب جان کر اس کے ساتھ کھیلنا بھی پسند نہ کرتے تھے اب رمضان کا نام لیتے نہ تھکتے تھے۔ پیسے کی کشش نے ہی محلے کی لڑکیوں کو اس کی طرف متوجہ کیا تھا ورنہ کسرتی بدن تو پہلے سے ہی نمایاں تھا۔ لڑکے بالے بھی دھوتی سے اوپری جسم چاندی کی طرح چمکتا دیکھ کر مرعوب ہوتے اور بسا اوقات اسے غصے میں دیکھ کر یوں بھاگ کھڑے ہوتے جیسے ''شرر شرار'' دیکھ لیا ہو۔

اپنی کم گو طبیعت کی وجہ سے رمضان کسی کو اپنا دوست نہیں بنا پایا تھا۔ ایک آصف تھا جس کے ساتھ اس نے بچپن کا عہد گزارا تھا۔ آصف خود بھی بہت سنجیدہ طبیعت کا لڑکا تھا۔ دونوں ساتھ اسکول جاتے رہے تھے۔ ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تو چوبیس گھنٹے رہتا تھا۔ اب بھی صبح سویرے ملاقات ہو جاتی تھی لیکن رمضان گزرے دنوں کو یاد نہیں کرتا تھا۔ آصف کو شکوہ تھا کہ اس نے اتنی جلدی پڑھائی کیوں چھوڑ دی؟ ٹھیلا لگانے کے پہلے دن دونوں کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ آصف سارا دن پریشان رہا تھا۔ کئی بار گھر کے چکر لگائے تھے۔ لیکن پیسے کے پیچھے بھاگنے کا پہلا دن ہی رمضان کے لیے اس قدر دلچسپی کا حامل رہا تھا کہ وہ اپنے جگری دوست کو بھول گیا تھا۔ دوسرے دن عین ٹھیلا گھر سے نکالتے ہی آصف کی رمضان سے ملاقات ہوئی۔ گزشتہ روز کی پریشانی کے ذکر پر رمضان کچھ خجل سا ہو گیا لیکن جب آصف نے رمضان سے اسکول نہ آنے کا شکوہ کیا تو سدا سے کم گو رہنے والے رمضان نے وہ باتیں کیں کہ آصف دنگ رہ گیا تھا۔ اس نے پیسے کو ہی زندگی کی بنیادی ضرورت قرار دے دیا تھا...... اور اس ضرورت کی تکمیل کے لیے پڑھائی چھوڑ دینا اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ آگ برساتی دوپہروں میں پیسے کے پیچھے بھاگتے اور پرچھائیوں میں لپٹی سہ پہروں میں مزید پیسا آنے کی سوچوں میں ماہ و سال کا سفر جاری رہا۔ رمضان کے روزی لائق ہوتے ہی پتا نہیں کیسے اجمل کا کام دھندا چھوٹ گیا تھا۔ بان کی کھٹیا پر لیٹ کر گولڈ لیف کے کش لیتے لیتے اتنا وقت گزر گیا کہ اجمل کی کمر پر مونج کے نشان پکے ہو گئے تھے۔ سارے گھر میں بچوں کی چیخ پکار اور سکھاں کی خاموشی کے درمیان اجمل کے گولڈ لیف کی مہکتی خوشبو کا رشتہ تھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

رات میں ہر سو خاموشی جب ہوتی تو سب سو جاتے اور پھر سارے دن کا آرام کے لیے ترسا رمضان گھر میں قدم رکھتا۔ اس دوران اجمل کا جاگنا معمول تھا، وہ دن بھر کی کمائی کا حساب رمضان سے لیتا تھا۔ بعض اوقات تو پیسا حاصل کرنے کے اتنے منصوبے بتاتا کہ رمضان کا کھانا ٹھنڈا ہو جاتا تھا لیکن وہ اپنے ابا کی ہر بات توجہ سے سنتا تھا۔ پائی پائی کا حساب دیتے ہوئے مجال ہے کبھی جھنجلایا ہو۔ وہ فرمانبرداری کی آخری حد تک چلا گیا تھا۔ والدین کو عطیہ خداوندی اور زیست کی رہگزر پر راہنما سمجھنا اس کی فطرت میں شامل ہو گیا تھا۔ اس میں تربیت کا اثر تھا یا پھر زمانہ ماضی میں اجمل کی طرف سے کی گئی کسی نیکی کا صلہ تھا کہ وہ اس کی کسی بات کو ٹالتا نہیں تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ گھر میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں، خوشحالی ہو، ترقی ہو، غربت کا نشان تک نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ سارا دن گھر سے باہر رہنے اور صبح منہ اندھیرے ہی نکل کھڑے ہونے کی وجہ سے بتدریج آباد ہوتے محلے میں وہ اجنبی کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ عورتوں کو تو اس کی شکل بھی بھولتی جا رہی تھی۔

جب سے اجمل نے کام دھندا چھوڑا تھا، پہلے پہل تو رمضان نے جان جوکھم میں اس لیے ہی ڈالے رکھی تھی کہ پیسے تک اس کی رسائی آسان ہو جائے، لیکن کچھ سال ہی گزرنے پر مہنگائی اتنی زیادہ ہو گئی کہ اس کا ذہن ہی بدل گیا تھا۔ انسانی ضرورتوں کے اوّل مرحلے کے طور پر صرف پیٹ پوجا کا خیال ہی اس کی کھوپڑی میں سما کر رہ گیا تھا اور وہ اس کے لیے ہی جتن کرتے کرتے پورا ہو جاتا۔ بچت کا خیال تو اب اسے چھو کر بھی نہیں گزرتا تھا۔ ابا روزانہ کے خرچ کے علاوہ بقیہ ساری کمائی مشکل وقت میں کام آنے کے لیے اس سے لے لیتا تھا، جس میں سے تین حصے تو گولڈ لیف کا مہکتا دھواں نگل لیتا۔ بقیہ تہائی حصہ وہ اپنی صدری کے انتہائی خفیہ مقام میں نجانے کب سے بوسیدہ ہونے کے لیے چھوڑتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

وقت نہایت تیزی سے گزرتا رہا۔ رمضان کی طرح آصف کے قد و قامت میں تبدیلی آئی گئی۔ آصف کے لیے اگر یہ کہا جائے کہ وہ خدا سے اپنی مرضی کی قسمت لکھوا کر لایا تھا تو غلط نہ ہوگا۔ آصف کا شمار محلے کے ان لڑکوں میں ہوتا تھا جن کے والدین غریب ہونے کے باوجود اپنی اولاد کو پڑھا لکھا رہے تھے۔ ان کو والدین کی طرف سے احساس تحفظ ورثے میں ملا تھا۔ آصف کے والدین اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر اس کے تعلیمی اخراجات پورے کر رہے تھے۔ اس کے ماں باپ چاہے جتنی بھی مشقت کرتے، مگر اس کے لیے آسانیاں ہی آسانیاں تھیں۔ کوئی غم نہیں تھا کچھ پریشانی نہیں تھی۔ ایک احساس تھا، جو بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ اس کے دل و دماغ میں پروان چڑھتا جا رہا تھا۔ والدین کی محنت و مشقت کا احساس..... وہ لگن سے تعلیم حاصل کرنے لگا تھا۔ وہ اپنے والدین کے اس احسان کا قرض دار تھا اور جلد سے جلد پڑھ لکھ کر اس قرض کو چکانا چاہتا تھا۔

لمحوں کا وجود وقت کی ہتھیلی پر راکھ ہوتا رہا اور آصف ڈاکٹر بن گیا۔ اس کے باپ نے اب بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو اسپیشلائزیشن کے لیے بیرونِ ملک بھجوانا چاہتا تھا اور اس نے اسے امریکا بھجوا کر ہی دم لیا۔ آصف کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے حکومت کی طرف سے اس کے لیے وظیفہ تو پہلے ہی مقرر تھا، اب اس کی قابلیت کو جلا بخشنے کے لیے مزید اخراجات کے طور پر گرانٹ بھی گورنمنٹ کی طرف سے مہیا کی گئی تھی۔ آصف اور رمضان کے گھر ہم دیوار تھے۔ دونوں گھروں کا کھانا پینا سانجھا تھا۔ دکھ درد بھی سانجھے تھے۔ گئے دور میں جو جمیلہ اپنے بیٹے کے تعلیمی اخراجات کا رونا سکھاں کے سامنے روتی رہتی تھی اب بیٹے کے ڈاکٹر بن جانے پر اس کے قدم زمین پر ٹکتے ہی نہیں تھے۔ سکھاں جو تعلیم کی اہمیت سے ناواقف تھی اور ہر وقت پیسے کی اہمیت کو لے کر جمیلہ سے مناقشے گاٹھے کھڑی رہتی، اب اس کا تن تنہا کہیں کھو گیا تھا۔ نمرہ کی شادی سر پر تھی۔ موسم گرما سے پہلے ہی اسے پیا دیس سدھار جانا تھا۔ اپنی بہن کو اچھے سے وداع کرنے کی ذمے داری کا بوجھ رمضان کے کندھوں پر ہی تھا۔ ابا کی صدری سے چند بوسیدہ نوٹوں کے علاوہ کچھ نہ نکلا تھا۔ خوامخواہ کی عادتیں بے پرواہی اور لاابالی پن کو جنم دیتی ہیں۔ ابا کی بے تحاشہ برانڈڈ سگریٹ پھونکنے کی عادت نے مستقبل کے لیے پلان کرنے کی سوچ اپنی اشتہا میں چھپالی تھی۔ بدقسمتی سے ان دنوں کاروبارِ زندگی ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا۔

اوائل مارچ کے دن تھے۔ صبحیں روشن، سہ پہریں نرم اور راتیں سرد تھیں لیکن رمضان کے دل و دماغ میں اداسی کا موسم آ کر ٹھہر سا گیا تھا۔ آمدن کچھ خاص نہ ہونے کی وجہ سے گھر کے اخراجات گزشتہ چند ماہ سے جس انداز میں پورے ہو رہے تھے وہ ہی بخوبی جانتا تھا۔ اجمل کے اپنی عادت کو

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

سجدے پھر بھی قضا نہ ہوئے اور وہ فرض سمجھ کر گھر کی ذمے دار فضا میں دھواں اگلتا رہا۔ شادی میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ جہیز کا سامان سوچے ہوئے پلان کے مطابق آدھا بھی نہیں خریدا گیا تھا۔ رمضان حالات سے گھبرانے والا نہیں تھا لیکن اجمل کی طرف سے بندھی اُمید کے ٹوٹنے نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مشکل وقت میں آسانی کے لیے اس سے گھر کے اخراجات کے علاوہ پائی پائی کا حساب لینے والا باپ ساری رقم دھویں میں اڑا دے گا۔ شادی سے محض ایک ہفتے کی دوری نے اس کے ہمیشہ سے شرارہ تن و توش میں سستی، کاہلی اور اکتاہٹ نما تھکاوٹ پیدا کر دی تھی۔ وہ زندگی کی تلخی کو خندہ پیشانی سے قبول نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ دنوں میں کمزور ہوتا چلا گیا۔

اکثر اوقات جب معاشرے میں فعال فرسودہ روایات کی وجہ سے انسانیت کا فقدان ہو جائے، تو ایسی صورت میں انسانی ذہن میں بہت سے نئے راستے وجود میں آنے لگتے ہیں۔ خودکشی بھی انہی راستوں میں سے ایک ہے۔ واضح ہو کر نظر آتا یہ راستہ اسے اکثر اب سکون و چین کا سراب دکھتا تھا، لیکن اپنے گھر والوں کی بقیہ زندگی کے بارے میں سوچ کر وہ کانپ جاتا تھا کہ میرے بغیر وہ ان کی زندگی کیسے گزرے گی؟

احساس کمتری کا خیال بھی ہر وقت اسے ستاتا رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ راہ چلتے اکثر وہ بڑی بڑی گاڑیوں اور ہنستے بولتے خوشحال لوگوں کو حسرت سے دیکھتا رہتا تھا۔ دنیا میں پھیلی زر پرستی اور بڑے لوگوں کے حق میں کامیابیوں کی بہتات اس کے احساس کمتری کو مزید بڑھانے لگتی تھی۔ وہ بھی اپنے اس احساس سے باہر نہ آ سکا۔ یہاں تک کہ بے خبری میں چلتے ہوئے ایک بڑی گاڑی اسے ٹکر مار کر گزر گئی۔ اسے اسپتال تک پہنچنا بھی نصیب نہ ہوا۔ جائے وقوعہ پر سراسیمگی پھیل گئی تھی۔

سراسیمگی، جو اکثر کہرام کا باعث بنتی ہے۔ یہاں پھیلی سراسیمگی سے بھی کہرام مچنے والا تھا..... رمضان کی جدائی میں اس کے گھر میں مچنے والا گریہ زاری کا کہرام۔

☆☆☆

آج آصف امریکا سے کامیاب ہو کر لوٹا تھا۔ محلے بھر میں مٹھائی بانٹی گئی تھی۔ آصف گھر جانے کی بجائے سیدھا رمضان کے گھر گیا تھا۔ سکھاں کے گلے لگ کر وہ رویا کہ اس کے کندھے بھیگ گئے۔ سکھاں اس کی کمر پر ممتا کا لمس نچھاور کرتی خاموشی سے گولڈ لیف کے رسیا کو دیکھتی رہی تھی، جس کے سیاہ ہونٹوں پر پپڑی جم گئی تھی۔ آنکھیں بنجر اور سراپا اجاڑ ہو گیا تھا۔ تینوں بیٹیاں گھر کے کسی کونے میں شاید دبکی بیٹھی تھیں۔ اس نے سکھاں سے الگ ہو کر نمدیدہ انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ لاابالی پن کی بھولی بسری یادیں خوشبو بن کر اس کے احساس میں در آئیں۔ ایک خاموش چہرہ سنجیدہ ہنسی لیے اس کے تصور میں آیا تو سکھاں کا سہارا لیے لیے اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ اس تصوراتی سنجیدہ ہنسی میں کیا کیا نہیں تھا۔

''قسمت میں لکھا کون ٹال سکتا ہے بیٹا! وہ اتنی ہی عمر لکھوا کر لایا تھا۔'' سکھاں کی آواز بھرائی ہوئی لیکن کھوکھلی تھی۔ آنکھیں خشک بنجر..... ان آنکھوں کے راستے ہی تو اس کی ذات خالی ہوئی تھی۔

''نہیں خالہ! اکثر حالات بھی قسمت کا دھارا موڑ دیتے ہیں۔ آپ کے بیٹے کے قاتل اس کے حالات تھے۔ حالات ان شاء اللہ اب بھی بدلیں گے۔ آپ کے سامنے آصف نہیں رمضان کھڑا ہے۔ اس رمضان میں اور پہلے والے رمضان میں بہت فرق ہے۔ اب حالات پلٹا کھائیں گے کیونکہ آپ کے اس بیٹے کے پاس اس کے والدین کا دیا ہوا احساس تحفظ ہے۔ وہ مضبوط بنیاد ہے جو خون جلانے کے بعد قائم ہوتی ہے۔ میں خود اپنی بہنوں کی شادی کروں گا۔''

وہ تسلی سے بول رہا تھا۔ یہ صرف دلاسہ نہیں تھا۔ اس کے اندرون میں بسی بچپن کے یارانے کی سچائی بول رہی تھی۔

سکھاں کو لگا جیسے کھینچویں چادر باندھے گلی گلی صدا لگاتے رمضان نے اچانک سفید کوٹ پہن لیا ہو۔ وہ خالی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

''اپنی اولاد سے توقعات وابستہ ضرور رکھو لیکن اس قدر نہیں کہ اسے ان توقعات کا بھرم رکھنے کے لیے اپنی جان سے گزرنا پڑے۔''

یہ رمضان کے ابا کی آواز تھی۔ تخت پر بیٹھا وہ گھٹنوں پر دھرے اپنے استخوانی ہاتھوں کو دیکھتے دیکھتے ہانپ رہا تھا۔

''یہی ایک بات ہی ہے جو یہ کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں بولتا۔ خاموش ہی رہتا ہے۔ اور.....'' سکھاں بے خودی میں جانے کیا کیا کہتی رہی لیکن آصف نکل آیا تھا۔ اس گھر کے در و دیوار سے لپٹی خاموشی کے مہرے اسے اپنے ارادوں سے توڑنے تھے۔

++

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

برادری

مکرمی مدیر
السلام علیکم!
پہلی بار ایک تحریر بھیج رہا ہوں، گو کہ یہ تحریر بیس سال پر محیط ہے مگر اسے مختصراً بیان کررہا ہوں تاکہ وہ لوگ سبق حاصل کریں جو ذات برادری کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔

محمد احتشام رضا
(سرگودھا)

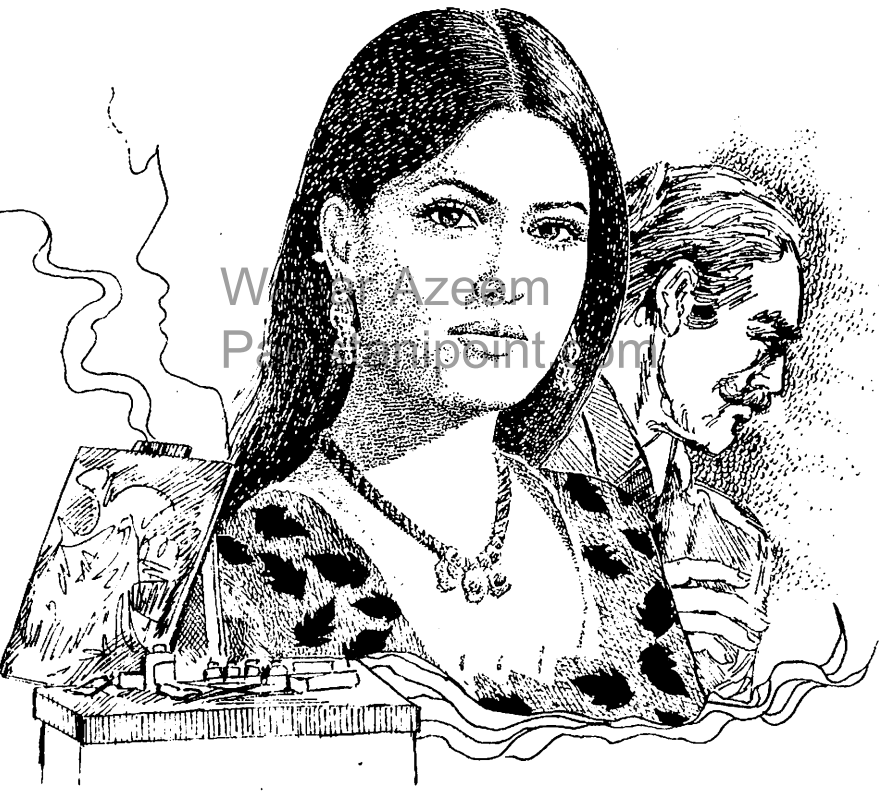

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

مجھے صرف اتنا پتا تھا کہ چودھری صاحب نے میری بیٹی کے لیے اپنے دوست کے بیٹے کا رشتہ بھیجا ہے۔ بیٹی کے بڑھتے قد سے میں پہلے ہی پریشان تھی۔ دیکھ رہی تھی کہ شہر کے لوگ کس قماش کے ہیں۔ گاؤں میں پرائی عورتوں کو دیکھ کر لوگ سر جھکا لیا کرتے تھے مگر یہاں تو ایسا لگتا ہے کہ پرائی عورت کا آنکھوں سے آپریشن کرنا ضروری ہے۔ میں شہر بھی نہ آتی اگر مولوی قدرت اللہ..... یعنی میرے ابا کا انتقال نہ ہوتا۔ ان کے انتقال سے پہلا اثر چولہے پر پڑا تھا۔ کئی کئی

وقت کے بعد چولہا جلتا تھا۔ چودھری صاحب جب کچھ بھیج دیتے تو گھر میں عید ہو جاتی، ہم ماں بیٹی پیٹ بھر کر کھانا کھاتے پھر ایک روز چودھری صاحب ہی نے مشورہ دیا کہ میں شہر چلی جاؤں۔ وہاں کپڑوں کی سلائی کے بہت سے کارخانے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک میں نوکری مل جائے گی۔ سارا انتظام بھی انہوں نے ہی کیا تھا۔ اپنے ایک عزیز کے ہاں مجھے ایک کمرا بھی دلایا تھا تاکہ میں اپنی بیٹی کے ساتھ رہ سکوں۔ کرایہ وہ لوگ لے نہیں رہے تھے اس کے بدلے صبح شام کام میں ان کا ہاتھ بٹا دیا کرتی پھر انہوں نے ہی میری نوکری کا بندوبست کرا دیا تھا۔ وہاں رہ کر میں نے بیٹی کی تعلیم کا راستہ بھی ڈھونڈ لیا تھا کہ اچھے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ اچھے لوگوں کی مدد سے ہی آج یہ ممکن ہوا تھا کہ میری بیٹی عزت کے ساتھ رخصت ہو رہی تھی۔

زیادہ تر مہمان کھانا کھا کر رخصت ہو چکے تھے، جو بچے تھے وہ اسٹیج پر بیٹھے رخصتی سے پہلے کی رسمیں پوری کرنے میں مصروف تھے اور کچھ نئے جوڑے کے ساتھ فوٹو سیشن کروا رہے تھے۔ اچانک ہال والوں نے آدھی لائٹیں آف کر دیں۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ بس اب آپ کا ٹائم ختم ہو گیا ہے۔ قرآن کے سائے میں دلہن اسٹیج سے اتری اور پھولوں سے سجی گاڑی کی طرف چل پڑی۔ میرا دل جہاں آج بیٹی کی رخصتی کی وجہ سے پریشان تھا وہیں پر ایک خوشی کا احساس بھی تھا کہ آج بیٹی کے فرض سے اللہ تعالیٰ نے سرخرو کر دیا۔ آج ثناء اپنے گھر کی ہو گئی۔

دلہن کے لیے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا گیا اور میں نے سینے سے لگا کر اسے اندر بٹھایا اور پھر جیسے ہی میں سیدھی کھڑی ہوئی کہ نظریں دروازہ کھولنے والے سے چار ہوئیں اسی لمحے دماغ میں بجلیاں سی چمکیں اور منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ''رفیع اللہ تم.....؟''

☆.....☆

آج بھی کڑاکے کی سردی تھی۔ ابا عشاء کی جماعت کروا کر جیسے ہی گھر آئے تو سردی کی شدت سے وہ کانپ رہے تھے۔ گھر آتے ہی سیدھے چولہے کی طرف گئے جہاں میں ان کے لیے روٹی توے پر ڈال رہی تھی۔ ابا کی برسوں سے یہ عادت تھی کہ چاہے گرمی ہو یا سردی ہمیشہ رات کا کھانا عشاء کی نماز کے بعد چولہے کے پاس بیٹھ کر کھاتے تھے اور میں دروازے پر آہٹ سنتے ہی چولہا سنبھال لیتی تھی۔ ماں کو فوت ہوئے دس سال گزر گئے تھے۔ تب میں صرف سات سال کی تھی۔ چھوٹی سی عمر میں ہی اماں نے مجھے گھر کے کاموں کا عادی بنا دیا تھا۔ شاید انہیں پتا تھا کہ وہ بہت تھوڑی عمر لکھوا کے لائی ہیں۔ مجھے یاد ہے، ایسا ہی جاڑے کا ایک دن تھا جب اماں کو نمونیا ہوا تھا۔ ساری زندگی کسی نامحرم کی شکل نہ دیکھی تھی تو آج بھی اللہ تعالیٰ کو پردہ ہی مقصود تھا۔

اس سے پہلے کہ ابا کسی کو بلاتے، دکھاتے، اماں چپکے سے منہ رضائی میں لے کر لیٹ گئیں۔ شام کو میرے ہلانے جلانے پر بھی جب جواب نہ آیا تو پتا چلا کہ جانے کب روح جسم کو چھوڑ کر جا چکی۔

پھر یوں ہی وقت گزرتا گیا۔ ابا بڑے سخت آدمی تھے۔ ذات پات کے قائل۔ مسجد کے حجرے میں ہی ان کا زیادہ وقت گزرتا۔ انہیں کوئی بھی نام سے مخاطب نہ کرتا بلکہ حضرت صاحب، پیر صاحب، شاہ جی، سید، بادشاہ جیسے القاب سے وہ پکارے جاتے تھے۔ مسجد بھی گھر سے چند مکانوں کے ہی فاصلے پر تھی۔ شام کے وقت مسجد میں بہت سے بچے قرآن اور دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ کبھی کبھی ابا مسجد کے امور میں بہت مصروف ہوتے تھے تو رات کے کھانے کے لیے سبزی دال گوشت وغیرہ کسی شاگرد کے ہاتھ گھر بھیج دیا کرتے تھے۔ میں سارا دن گھر میں رہتی۔ فجر کے وقت اٹھتی۔ ابا کے لیے چائے پراٹھا بناتی پھر نماز ادا کرتی، قرآن پڑھتی اور سو جاتی۔ کوئی دس بجے اٹھ کر گھر کی صفائی ستھرائی کرتی اور اس کے بعد نہا دھو کر حدیث فقہ کی کوئی کتاب پڑھتی۔ تب تک ظہر کا وقت ہو جاتا۔ ابا ظہر کی جماعت کروانے کے بعد گھر آ کر کھانا کھاتے تھے۔ ان کے لیے پھلکے توے پر ڈالتی اور پھر دونوں باپ بیٹی مل کر دوپہر کا کھانا کھاتے۔ ابا عصر تک اپنے کمرے میں آرام کرتے اور میں اپنے کمرے میں۔ عصر کے وقت ہم اٹھتے۔ میں نل سے پانی کا گھڑا بھرتی، آنگن میں بنی کیاری میں پانی وغیرہ دیتی اور ابا عصر کی جماعت کروانے کے لیے مسجد چلے جاتے اس دوران کوئی لڑکا مولوی صاحب کا بھیجا ہوا سامان لے کر آ جاتا اور میں رات کا کھانا چولہے پر چڑھا دیتی۔ برسوں سے یہ معمول چل رہا تھا کہ مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد کھانا تیار کرتی اور عشاء کے بعد ہم باپ بیٹی کھا لیتے۔

مگر کچھ دنوں سے میں اپنے اندر بے قراری سی محسوس کر رہی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ہو کیا رہا ہے۔ کافی دنوں سے عصر کے وقت ایک ہی لڑکا سبزی لے کر آ رہا تھا۔ موٹی موٹی آنکھوں والا، سیدھی مانگ سر میں نکالے پراتا مگر

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

صاف ستھرا جوڑا پہنے آنکھوں میں سرمہ لگائے دھیرے سے دروازہ بجاتا اور اندر سے آواز لگانے پر بتاتا کہ میں رفیع اللہ.....مولوی صاحب نے سودا بھیجا ہے۔

مجھے احساس تھا کہ یہ لڑکا بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھتا ہے۔ اس کا یوں دیکھنا مجھے اچھا لگتا تھا۔ گویا اس کا آنا جانا مجھے زندگی میں بہار کا جھونکا محسوس ہوا۔ زندگی جو مدت سے ایک مخصوص ٹریک پر چل رہی تھی وہ یکسر تبدیل ہوگئی۔ آنکھیں تو کب کی ملی ہوئی تھیں اب دل بھی مل گئے تھے۔

رفیع اللہ کے خیالوں میں کھوئی میں اتنی گہری نیند سوتی کہ صبح ابا۔ دروازہ بجا بجا کر جگاتے۔ تو میں اٹھتی اور جلدی جلدی توے پر روٹی ڈالنے لگتی۔ کبھی کبھی روٹی ڈالتے ہوئے میں رفیع کے خیال سے پلٹنا ہی بھول جاتی، پتا تو تب چلتا جب ابا چلاتے۔ ''ارے بیٹا.....'' اور تب تک روٹی جل چکی ہوتی۔

رفیع اللہ کا باپ علاقے کا مشہور و معروف موچی تھا۔ گھر میں چھوٹا سا کارخانہ بھی بنا رکھا تھا جہاں پر وہ چند کاریگروں کے ساتھ مل کر جوتے تیار کرتا جسے شہر کی دکانوں میں پہنچا آتا۔ غرض گھر میں خاصی خوشحالی تھی۔

ذات کے موچی ضرور تھے مگر گاؤں میں خوب عزت تھی۔ اسی لیے رفیع اللہ نے میری طرف قدم بڑھائے تھے۔ اسے مزید سے مزید قریب آتا دیکھ کر میں نے ایک بار کہہ دیا۔ ''میں سید زادی ہوں، فضول عشق محبت میں اپنا اور اپنے باپ دادا کا نام خراب نہیں کرنا چاہتی بہتر ہے کہ تم طریقے سے رشتہ بھیجو ورنہ ہمارے راستے جدا جدا۔''

رفیع اللہ نے جا کر اپنی اماں کو بتایا کہ میں مولوی صاحب کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ شام کو رفیع اللہ کے باپ ہدایت اللہ کے علم میں یہ معاملہ آیا اور اس نے بیٹے کی خوشی کی خاطر فیصلہ کیا کہ وہ مولوی صاحب سے رشتے کا سوال کرنے ضرور جائے گا۔ آنے والے جمعے کو ہدایت اللہ اپنے دو بھائیوں، ایک سالے اور رفیع کی اماں کے ساتھ ہمارے گھر پہنچا۔ ساتھ میں مٹھائی کا ٹوکرا بھی تھا۔ ابا جمعہ کی امامت کروانے کے بعد گھر پر آرام فرما رہے تھے۔ دروازے پر دستک کی آواز سن کر باہر گئے تو اتنے سارے مہمان دیکھ کر حیران ہوگئے۔ چار و ناچار انہیں اندر لائے۔ گھر میں دو ہی کمرے تھے۔ ایک میں، میں سوتی تھی اور دوسرا ابا کے زیر استعمال تھا۔ مہمانوں کو باہر صحن میں کھڑا کر کے اندر اپنے کمرے سے چارپائی باہر لا کر برآمدے میں بچھائی اور ان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ رفیع اللہ کی اماں بے چاری شرم سے کھڑی رہی کہ وہ دیور جیٹھوں کے ساتھ کیسے ایک ہی چارپائی پر بیٹھے پھر خود ہی چلتی ہوئی ساتھ والے کمرے میں داخل ہوگئی جس کی کھڑکی سے لگی میں باہر کا منظر دیکھ رہی تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔

ابا نے ہدایت اللہ سے آنے کا سبب پوچھا۔ اس وقت ہدایت اللہ مٹھائی کی ٹوکری کو کہیں رکھنے کے لیے دائیں بائیں جگہ دیکھ رہا تھا ایک چارپائی پر وہ چار افراد بیٹھتے یا پھر مٹھائی رکھتے۔

حافظ ولی اللہ

لاہور کے ایک نابینا حافظ اور زبردست مناظر تھے۔ عیسائی پادری ان کا نام سن کر ہی شہر چھوڑ کر بھاگ جایا کرتے تھے۔ سکھ دور میں ان کے والد اپنے بچے کو لے کر پنجاب میں وارد ہوئے اور لاہور میں قیام کیا۔ پانچ سال کی عمر میں چیچک کی بیماری نے انہیں ہمیشہ کے لیے بصارت سے محروم کر دیا۔ مولوی غلام رسول صاحب نے انہیں قرآن حفظ کروانے کے بعد دیگر دینی علوم سے روشناس کروایا۔ حافظ ولی اللہ حیرت انگیز قوت حافظہ کے مالک تھے۔ جس کتاب کو ایک بار سن لیتے، وہ حفظ ہو جاتی تھی۔ عربی زبان میں بے حد مہارت تھی۔ عرب سیاح لاہور آتے تو آپ سے بلا تکلف عربی میں گفتگو کرتے۔ آپ انجیل کے بھی عالم تھے۔ مناظروں میں قرآن کریم کے علاوہ انجیل کے صفحات تک کے بھی حوالے دیتے تھے۔ مباحثہ دینی، صیانۃ الانسان عن وسوسۃ الشیطان اور الحاث ان کی تصانیف ہیں۔ آپ بادشاہی مسجد کے نائب خطیب بھی رہے۔ وزیر خاں کی مسجد میں بھی خطابت کی۔ آپ نے 24 جمادی الاولیٰ 1294ھ کو وفات پائی۔ احاطہ شاہ ابوالمعالی میں دفن ہوئے۔ یہ سارا قبرستان اب مکانات کی نظر ہوگیا ہے۔ آپ کا مزار فلیمنگ روڈ کے کنارے ایک مختصر سے احاطے میں ہے جہاں بعض صاحب دل حضرات ہر سال عرس کروا دیتے ہیں۔

مرسلہ: رانا شفیق الرحمٰن، ملتان

Waqar Azeem
Pakistani Point

ابا غصے میں نظر آرہے تھے۔ انہوں نے دوبارہ سے آنے کا سبب پوچھا۔

ہدایت اللہ نے گلا صاف کیا اور مدعا بیان کیا۔ یہ سننے کی دیر تھی کہ ابا مارے غصے کے کانپنے لگے اور بولے۔ ''تمہاری جرأت کیسے ہوئی بدذات نیچ، موچی۔ کہاں میرا رتبہ، میرا مقام، میرا حسب نسب اور کہاں تم.....! لوگوں کے ٹوٹے ہوئے جوتے مرمت کرنے والے، دفع ہو جاؤ میرے گھر سے۔''

ہدایت اللہ اور اس کے بھائیوں نے مولوی صاحب کے منہ سے جب یہ باتیں سنیں تو انہیں بہت دکھ ہوا اور وہ بولے۔ ''آپ ہم سے زیادہ دین کا علم رکھتے ہیں۔ ہمارے رسولؐ نے آج سے چودہ سو سال پہلے یہ ذات پات حسب نسب کے فرق کو ختم کر دیا تھا۔ فرمایا تھا کہ کسی کالے کو گورے پر، کسی گورے کو کالے پر کوئی فوقیت نہیں ہے۔ ہاں اللہ کے نزدیک اگر کسی کا رتبہ بلند ہے تو اس کا جس کا تقویٰ بلند ہے۔ ہمارا موچی ہونا کوئی شرعی عیب نہیں۔ موچی ہونے سے ہمارا ایمان نامکمل تو نہیں ہو جاتا۔ ہمارے رسولؐ نے اپنے ہاتھوں سے اپنے ٹوٹے ہوئے جوتے مرمت کیے۔ اپنے کپڑوں کا پیوند لگایا۔ اپنا جانور خود ذبح کیا۔ اپنا ہر کام خود کر کے امت کے لیے مثال قائم کی۔ کیا کوئی کپڑے دھونے سے دھوبی بن جاتا ہے اور وہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے؟ مگر ابا یہ سب کیسے سننے والے تھے۔ بے عزت کر کے انہیں گھر سے نکال دیا۔

رفیع اللہ کے گھر والے مزاجاً شریف تھے۔ زیادہ کچھ بولے نہیں۔ خاموشی سے لوٹ گئے۔ ان کے جاتے ہی ابا گھر سے نکل گئے۔ رات دیر گئے لوٹے۔ آتے ہی بولے۔ ''بیٹا! میں نے جو خواب دیکھا تھا ویسی تعبیر تو نہیں نکلی پھر بھی بساط بھر کوشش کی ہے۔ کل برابر والے گاؤں کے امام نقیب شاہ اپنے بیٹے کی برأت لے کر آرہے ہیں۔ بیٹی میری پگ جھکنے نہ دینا۔''

نہایت عجلت میں میری شادی ہوئی اور میں بیاہ کے شیر گڑھ آگئی۔

نسیم شاہ ایک پیار کرنے والا ہمسفر ثابت ہوا۔ اس نے میرا خوب خیال رکھا۔ وقت تیزی سے گزرتا گیا۔ پہلے ابا کا انتقال ہوا پھر نسیم کے ابا کا۔ اپنے ابا کی جگہ اب نسیم امامت کرا رہے تھے۔ میں نسیم شاہ کے دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ بچے پڑھ رہے تھے۔ گاؤں کی مسجد کی امامت سے جو ملتا تھا اس سے گھر کا خرچ پورا نہیں ہوتا تھا۔ نسیم کے ایک دوست نے دوڑ بھاگ کر کے لاہور کی ایک بڑی مسجد میں اسے لگوا دیا تو زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دس سال گزر گئے۔ ایک دن میں بازار سے سودا سلف لے کر آرہی تھی کہ میری نظر ایک بہت بڑی دکان پر پڑی۔ وہ اتنی چمچماتی دکان تھی کہ میں اندر جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ باہر سے شوکیسوں میں سجے جوتوں کو دیکھتی آگے بڑھ رہی تھی کہ دکان سے نکلتے ہوئے ایک شخص پر نظریں ٹھہر گئیں۔ وہ کوئی اور نہیں، ہمارے گاؤں کا چودھری تھا جس کے مشورے پر میں لاہور آئی تھی۔ اس کے بالوں میں بھی سفیدی آگئی تھی۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ میرے قریب آکر حال احوال پوچھا پھر ایک دو بار میرے گھر بھی آیا۔ گھر میں پاؤں پسارے بیٹھی غربت پر اس نے افسوس بھی کیا۔ جاتے ہوئے اس نے میری بیٹی کے ہاتھ پر ہزار ہزار کے دو نوٹ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک تمہارا ایک تمہارے بھائی کا ہے۔''

نسیم بھی اس سے مل کر بہت خوش ہوا تھا۔ اس دن کے بعد سے دونوں ہر روز ملنے لگے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اگلے ہی ماہ میری بیٹی کی شادی ٹھہر گئی۔ میں گھبرائی ہوئی تھی کہ گھر میں ایک پھوٹی کوڑی نہیں، بیٹی کو رخصت کیسے کروں گی مگر اللہ مسبب الاسباب ہے۔ کسی نے کچھ دیا کسی نے کچھ، چودھری صاحب نے ہال اور کھانے کا انتظام کرا دیا اور یہ بھی کہا کہ لڑکے والے جہیز کے نام پر صرف دو کپڑے لیں گے۔ لڑکے کی شہر میں کئی دکانیں تھیں۔ خاصا امیر گھرانا تھا۔ ان کی ضمانت چودھری صاحب نے لی تھی اس لیے میں راضی ہو گئی تھی۔

مہمان کھانے کے بعد جانا شروع ہو گئے تھے کہ رخصتی کا غلغلہ مچا اور میں قرآن کے سائے میں بیٹی کو لیے آگے بڑھی۔ سجی سجائی کار میں دولہا کے برابر اسے بٹھانا تھا کہ کار کا دروازہ کھولنے والے کو دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ وہ رفیع اللہ تھا۔ اس نے باہر آکر سرگوشی میں کہا۔ ''ہم نہ مل سکے تو کیا ہوا ہمارے بچے تو مل رہے ہیں۔''

پہلے میں گھبرائی۔ رفیع اللہ کی عیاری اور پھر محبت کہ میں ایک لفظ نہ بول پائی۔ دماغ میں یہ صدا گونج کر رہ گئی۔ ''مجھے خوش ہونا چاہیے کہ میری بیٹی غربت کا دکھ نہیں جھیلے گی۔''

++

Waqar Azeem
Pakistanipoint

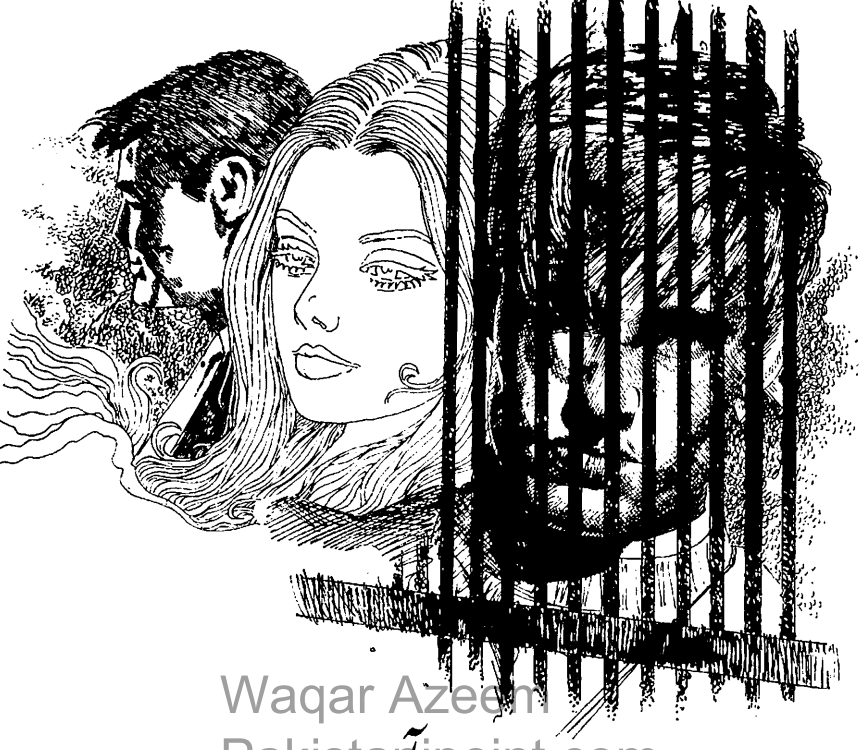

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

دیر آید

معزز و مکرم مدیر
السلام علیکم!
شاید یہ سچ بیانی آپ کو عجیب لگے کیونکہ میں نے مقام بدل دیے ہیں۔ واقعات میں بھی کہانیت لانے کے لیے تبدیلی کی ہے۔ بس میری خواہش یہی ہے کہ لوگ ایسے غلط کام کرتے ہوئے گھڑی بھر یہ ضرور سوچیں کہ اگر صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو چیونٹی بھی ہاتھی کو گراسکتی ہے۔

ایم شیخ
(کراچی)

اس لڑکی کو میرے سامنے لاکر کھڑا کردیا گیا تھا۔
ہمارے آدمیوں نے ایک شیشہ ہوٹل پر چھاپہ مارا تھا جہاں سے اور لڑکے لڑکیوں کے علاوہ اس لڑکی کو بھی پکڑا گیا تھا۔

حالانکہ یہ کوئی اتنا بڑا جرم نہیں ہے کہ کسی لڑکی کو اٹھا کر تھانے پہنچا دیا جائے لیکن میرا مزاج کچھ اور رہا تھا۔ شروع سے۔ میں ہمیشہ ایسے موقع کی تلاش میں رہا ہوں، جب کہیں سے کوئی پیسے بنانے والی واردات سامنے آجائے۔

مجھے یہ اعتراف کرنا ہے کہ میں نے اس لائن میں بہت پیسے بنائے۔ اتفاق سے میرا عہدہ بھی بڑا تھا۔ یعنی انسپکٹر۔ میری بے رحمی اور کچل دینے کی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے اعلیٰ حکام نے مجھے فری ہینڈ دے دیا تھا۔

میرا علاقہ بھی ایسا ہی تھا۔ ایک ایسا علاقہ جہاں عام طور پر متوسط طبقے کے افراد تھے۔ سفید پوش قسم کے۔ یہ بھی میرا تجربہ ہے کہ اگر پیسا بنانا ہو تو ایسے ہی علاقوں کا انتخاب کرو۔

پوش علاقوں میں پیسے تو بہت ہوتے ہیں لیکن پرابلم یہ ہوتی ہے کہ وہاں ہر شخص کسی نہ کسی اعلیٰ شخصیت کا رشتہ دار نکل آتا ہے۔ جبکہ ایسے عام سے علاقے والوں کو ایک تو اپنی عزت کی بھی بہت فکر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس سفارش وغیرہ بھی نہیں ہوتی اسی لیے ذرا سی دھمکی سے وہ کچھ نہ کچھ دے ہی جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ میں کبھی کبھی out of the way بھی جا کر کام کرتا ہوں۔ یعنی جو لوگ قابو میں نہ آرہے ہوں ان کو پولیس مقابلے میں راستے سے ہٹا دیا کرتا ہوں۔ یہ ایک آسان طریقہ ہے۔

یہاں یہ وضاحت بھی کرتا چلوں کہ ان کو اس لیے نہیں ہٹایا جاتا کہ وہ پولیس اور عوام کو پریشان کرنے لگے تھے یا ان کی وجہ سے جرائم میں اضافہ ہو گیا تھا۔ نہیں۔ بلکہ قابو میں نہیں آنے کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے پیسے دینے سے انکار کر دیا تھا یا وہ بہت کم دینے لگے تھے۔ ایسے لوگوں کے لیے میرے پاس صرف ایک ہی علاج تھا کہ خس کم جہاں پاک۔ نہ رہے گا بانس۔ نہ بجے گی بانسری۔

ایسی بات نہیں ہے کہ عملے کے دوسرے لوگوں کو میری اس حرکت کا علم نہ ہو لیکن میرا اصول یہ رہا ہے کہ اگر ایسے کام کرتے ہو تو سب کو خوش رکھو۔ جو پیسے سے قابو نہ آئیں اور بڑے افسران تک شکایت پہنچانے کی کوشش کریں تو ان سے کسی اور طریقے سے نمٹو۔ اسی لیے میری رپورٹ ہمیشہ اچھی جاتی رہی ہے۔

شیشہ ہوٹل پر چھاپے کا مقصد بھی یہی تھا کہ بڑی تعداد میں لڑکے اور لڑکیاں ہاتھ آجائیں۔ ان سے اچھی خاصی وصولی کا امکان تھا۔ بقیہ سے تو وصولی ہو چکی تھی لیکن بس یہ لڑکی رہ گئی تھی جس کو میرے سامنے لا کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ ایک طرحدار قسم کی لڑکی تھی۔ اس میں بے پناہ کشش تھی۔ اس کا لباس یہ بتا رہا تھا کہ وہ کسی پوش فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ کھاتے پیتے گھرانے کی ہے۔

''سارہ۔'' اس نے بتایا۔

''سارہ۔ تم ایک اچھی لڑکی معلوم ہوتی ہو پھر اس قسم کا شوق کیوں پال رکھا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ شیشہ ہوٹلوں پر پابندی ہے۔''

''جانتی ہوں میں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن مجھے اس کی عادت پڑ گئی ہے۔ شہر میں اس قسم کے سارے ہوٹل بند ہو گئے ہیں، اسی لیے میں یہاں آئی تھی۔''

''کون لایا تھا تم کو؟''

''میری ایک دوست۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن وہ آپ کے چھاپے سے پہلے چلی گئی تھی۔''

''اوہ'' میں مسکرا دیا۔ ''چلو کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''نہ جانے کیوں مجھے تم پر رحم سا آرہا ہے۔ تم کسی اچھی فیملی سے تعلق رکھتی ہو اسی لیے تمہیں جانے کی اجازت دے رہا ہوں۔ حالانکہ یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔ اب جاؤ۔ لیکن اس وعدے کے ساتھ کہ تم آئندہ سے اس قسم کی گھٹیا جگہوں پر نہیں جایا کرو گی۔''

میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے چلے جانے کے بعد میرے ایک خاص ماتحت نے حیرت ظاہر کی۔ ''سر جی۔ آپ نے اس کو جانے کی کیوں اجازت دے دی؟ میرا مطلب ہے سر جی کہ یہ تو آپ کے مزاج کے خلاف بات ہو گئی۔''

''ہاں نبی بخش، ہے تو میرے اصول کے خلاف لیکن کبھی کبھی اصول بدلنے بھی پڑتے ہیں۔ اچھا۔ تم ایک کام کرو۔ اس لڑکی کا ایڈریس تو لے لیا ہو گا۔''

''ہاں سر جی۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑتا۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''اب یہ کام تمہیں کرنا ہے کہ اس کے محلے میں جا کر بہت ہوشیاری سے ذرا اس کے بارے میں معلوم کرو۔''

''میں سمجھ گیا سر جی۔'' وہ مسکرا دیا۔

''ہاں نبی بخش۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''اب میں اکیلا رہتے رہتے اکتا چکا ہوں۔ انسان بھی تو ہوں نا۔ دل چاہتا ہے کہ گھر بسا لوں۔ ایک اچھی سی بیوی مل جائے تو اس کے ساتھ زندگی گزر جائے۔''

Wadat Azeem
Pakistanipoint.com

''اتنا بڑا ارادہ ہے سر؟ لیکن کیا معلوم یہ لڑکی کیسی ہو گی؟''

''بہت اچھی ہوگی۔ پولیس کی اتنے برسوں کی نوکری میں اگر بندے کی پہچان نہ ہو سکے تو کیا فائدہ ایسی نوکری کا۔'' میں نے کہا۔

''یہ تو ہے سر۔ مجھے بھی وہ لڑکی ٹھیک معلوم ہو رہی تھی۔''

''اب تمہارا کام ہے کہ اس کے بارے میں معلوم کر کے بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

دوسرے ہی دن نبی بخش نے پوری تفصیل بتا دی۔ وہ لڑکی پی آئی بی کالونی میں رہتی تھی۔ اس نے پولیس کو بھی یہی بتایا تھا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی تھی۔ والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے والد ریٹائیر ہو چکے تھے۔ کسی اسکول کے پرنسپل رہ چکے تھے۔ اس لڑکی کے بارے میں کبھی کوئی غلط بات سننے میں نہیں آئی تھی۔ غرض کہ وہ ایک صاف ستھری لڑکی تھی۔

''نبی بخش۔ اس لڑکی کے بارے میں کچھ اور پتا چلا؟'' ... میں نے پوچھا۔

''سمجھ گیا سر۔ نہیں اس لڑکی کی کسی لڑکے سے کوئی دوستی نہیں ہے۔ اس محلے میں اپنا فیاض خان ہے۔ اس سے زیادہ کون بتا سکتا ہے آپ تو جانتے ہیں سر کہ وہ بندہ اڑتی چڑیا کو بھی شک کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔''

میں ہنس پڑا۔ یعنی اس لڑکی کے بارے میں میرے جو خیالات تھے وہ درست ہی تھے۔ وہ ایک اچھی لڑکی تھی اب سوال یہ تھا کہ اسے کس طرح شادی کے لیے آمادہ کیا جائے۔ کس طرح اسے یقین دلایا جائے کہ پولیس آفس میں میرا جو روپ ہوتا ہے وہ مجبوراً ہوتا ہے۔ بہرحال میں نے سوچ لیا تھا کہ اس کو حاصل کرنے کی ایک کوشش ضرور کروں گا۔

کچھ دنوں کے بعد میں اس علاقے کی طرف چلا گیا۔ یہ میرا جانا پہچانا علاقہ تھا۔ بہت پہلے میں یہاں رہ چکا تھا اسی لیے یہاں کی گلیاں اور راستے میرے جانے پہچانے تھے۔

میں سادہ لباس میں وہاں گیا تھا۔ میں نے اپنی گاڑی دور کھڑی کی تھی۔ کچھ دکاندار میری جان پہچان کے تھے جو ابھی تک اپنا کاروبار کر رہے تھے۔ میں ان کی دکانوں سے کتراتا ہوا ایک طرف بڑھتا چلا گیا۔ میرا رخ اسی گلی کی طرف تھا جس میں وہ لڑکی رہتی تھی۔

پڑھنے والوں کو حیرت ہو رہی ہوگی کہ آخر کیوں؟ کیوں میں اس کے پیچھے پڑ گیا تھا؟ اس کی بظاہر کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس کے علاوہ کہ وہ لڑکی میرے دل میں اتر گئی تھی ورنہ لڑکیاں تو میرے قریب آتی ہی رہتی تھیں۔ مجبوراً یا خوشی سے۔ میں ایک بار پھر یہ کہہ دوں کہ میں نے اپنے عہدے کا پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ میں ان میں سے نہیں تھا جو اصول، دیانت، اور فرض شناسی وغیرہ کی بات کرتے ہیں۔ لہٰذا میں صرف ایک بات جانتا تھا کہ اس جاب میں جتنا بھی وقت ملا ہے اس سے جلد از جلد جتنا فائدہ اٹھا لو بہتر ہے۔

اسی لیے میں نے کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔

وہ لڑکی کچھ اس طرح مجھے بھا گئی تھی کہ میں نے اس کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں یہ سب کچھ اپنی فطرت کے خلاف کر رہا تھا۔ نہ جانے کیوں۔ زندگی میں شاید مجبوری کا ایسا بھی لمحہ آیا کرتا ہے۔

اس گلی سے باہر دو چار دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک کولڈ ڈرنک لی اور وہیں کھڑے ہو کر پینے لگا۔ میری نگاہیں گلی کی طرف تھیں۔

شاید وہ دن دعا کی قبولیت کا تھا کہ اچانک وہ لڑکی دکھائی دے گئی۔ وہ گلی سے نکل کر دکانوں ہی کی طرف آ رہی تھی۔ میرا دل دھڑکنے سا لگا تھا۔ یہ بھی ایک انہونی سی بات تھی۔ مجھ جیسا انسان۔ اور دل کی دھڑکن۔ کسی لڑکی کا انتظار۔ کسی کی نگاہِ کرم کی امید۔ کیا ہو گیا تھا مجھے۔ لاحول ولا..... میں نے اسی وقت وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کیا کہ اچانک وہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

''سر آپ یہاں۔'' اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کی آواز میں ہیجان تھا۔ ''سر میں نے تو آپ کو گلی سے باہر آتے ہی دیکھ لیا تھا۔ میں حیران رہ گئی تھی کہ آپ یہاں کھڑے ہیں۔''

''ہاں۔ میں کسی کام سے آیا تھا۔ پیاس لگی تو کولڈ ڈرنک پینے کے لیے رک گیا۔ کیا تم یہاں رہتی ہو؟''

''جی ہاں۔ سامنے گلی میں۔'' اس نے اشارہ کیا۔

''چلو ٹھیک ہے۔'' میں نے گردن ہلائی۔ ''اچھا۔ تم اپنا کام کرو۔ میں جا رہا ہوں۔''

''ارے اس طرح کہاں جا رہے ہیں۔'' وہ بے تکلفی سے بولی۔ ''آپ کو تو میرے گھر چلنا ہوگا۔''

''تمہارے گھر؟'' میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں میرے گھر۔ میں اپنے والد سے آپ کی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

تعریف کرتی رہتی ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''میں نے کہا ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں ایسا پولیس آفیسر نہیں دیکھا اور نہ ہی سنا ہے۔ اس دن آپ نے میرے ساتھ جو حسنِ سلوک کیا تھا وہ میرے والد... کو بہت اچھا لگا ہے۔ وہ..... آپ سے ملنا چاہتے ہیں..... میرے والد ایک استادرہ چکے ہیں اور معاشرے کی خرابیوں کے خلاف جہاد کرتے رہتے ہیں۔ چلیں نا پلیز۔''

شاید قدرت ہی کی طرف سے مجھے ایسا موقع مل رہا تھا اسی لیے میں نے فوراً کولڈ ڈرنک کے پیسے دیئے اور اس لڑکی کے ساتھ اس کے گھر ہولیا۔ سامنے ہی گلی میں اس کا گھر تھا۔

مجھے ایک منٹ انتظار کا کہہ کر وہ اندر چلی گئی۔ اسے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ باہر کا دروازہ میرے لیے کھول دیا گیا۔

دروازہ کھولنے والا ایک بوڑھا مہذب اور شریف سا انسان تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہی اس کا باپ ہو سکتا ہے۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا تھا۔ ''آؤ میاں۔ سارہ نے تمہاری بہت تعریف کی تھی۔ آؤ۔ اندر آجاؤ۔''

وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ سلیقے سے سجا ہوا کمرا حسنِ ذوق کی علامت تھا۔ اس کے علاوہ دو الماریاں بھی تھیں جن میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ میں اس کے کہنے پر ایک طرف بیٹھ گیا۔ سچ یہ ہے کہ وہاں آکر اور وہاں بیٹھ کر بہت سکون سا محسوس کر رہا تھا ورنہ میں جس شعبے میں تھا وہاں عام طور پر منحوس صورت مجرموں ہی سے واسطہ پڑا کرتا تھا۔

''میاں۔ میں نے سارہ سے کہا تھا کہ وہ کسی دن تمہیں بلا کر لائے۔'' اس نے بات شروع کی۔

''جناب۔ آپ کے بارے میں پتا چلا ہے کہ آپ استادرہ چکے ہیں۔''

''دیکھو بھائی۔ استاد ہمیشہ استاد ہی رہتا ہے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''علم اس کی رگوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ ویسے یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ تمہارے محکمے میں ابھی انسانیت زندہ ہے۔ تم نے جس انداز سے سارہ کو سمجھایا اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک کیا تھا وہ میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔''

اس دوران سارہ ایک ٹرے میں چائے وغیرہ لے کر آگئی۔ بالکل وہ گھریلو ماحول تھا جو مجھے کبھی نہیں ملا۔ کیسا سکون تھا یہاں۔ اس کے والد میری تعریف کر رہے تھے اور میں دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہا تھا۔ اگر ان کو معلوم ہو جاتا کہ میں کیسا ہوں تو پھر ساری کہانی ہی ختم ہو جاتی۔

سارہ نے بھی باتیں شروع کر دیں۔ اس کی باتوں سے یہ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے متاثر ہو گئی ہے اور میرے قریب آنا چاہتی ہے۔ خدا جانے اس کے دل میں کیا تھا۔ ویسے تو وہ مجھے جس روپ میں دیکھ چکی تھی اس کے بعد تو اسے میرے سائے سے بھی بھاگنا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس اس نے اپنے والد کی نگاہوں میں مجھے ایک فرشتہ صفت پولیس آفیسر ظاہر کر دیا تھا۔

بہرحال کچھ دیر کی باتوں کے بعد میں وہاں سے واپس آگیا۔ ان دونوں کے اخلاق نے مجھ جیسے انسان کو بھی موم سا کر دیا تھا۔ میں نے سارہ کو اپنا موبائل نمبر دے دیا تھا کہ اگر کبھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے فون کر سکتی ہے۔

دوسرے دن دفتر میں میں نے نبی بخش کو کل کے ایڈونچر کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی خوش ہوا تھا۔ ''سر جی۔ یہ تو کل ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ اس لڑکی سے متاثر ہو گئے ہیں اور آپ کے ارادے کچھ اور ہیں۔''

''ہاں۔ نبی بخش۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''اس بار میں سنجیدہ ہو گیا ہوں.....''

''تو پھر قدم بڑھائیں صاحب۔'' اس نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ رشتہ وغیرہ بھیج دیں۔''

''دیکھو کیا ہوتا ہے؟'' میں نے کہا۔

دو تین دن کے بعد سارہ کا فون آگیا۔ وہ بہت پُرجوش ہو رہی تھی۔ ''بابا۔ آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''باتوں باتوں میں وہ آپ کے گھر کے حالات معلوم کر رہے تھے۔ یعنی کتنے لوگ ہیں۔ کس کے ساتھ رہتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔''

''سارہ۔ میں فی الحال تو اپنے ہی ساتھ رہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے اکیلا ہوں۔ والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ شادی کی نہیں ہے۔ یہ سمجھ لو اپنے محکمے سے شادی ہو گئی ہے میری۔ لیکن کیوں۔ تمہارے بابا کو میرے بارے میں یہ سب جاننے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟'' میں نے پوچھا۔

''اب یہ تو میں نہیں جانتی۔'' اس کے لہجے میں شوخی تھی۔ ''ان سے مل کر خود ہی پوچھ لیجئے گا۔''

میں سمجھ گیا تھا کہ سلسلہ کیا ہے لیکن جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ میری توقع کے برعکس ہو رہا تھا۔ مجھ جیسے انسان کے لیے پہلے تو ایک لڑکی کا مہربان ہونا پھر اس کے باپ کا التفات۔ یہ سب کس قسم کے اشارے تھے۔ مطلب بالکل واضح تھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

میں اس کے علاوہ اور کیا سمجھ سکتا تھا کہ قدرت سارہ کی شکل میں مجھ پر مہربان ہوتی جارہی تھی۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ ایک رات سارہ کے ابو نے مجھے کھانے پر بلا لیا۔ ایسا اہتمام میرے ساتھ پہلی بار ہی ہوا تھا ورنہ کون اپنی مرضی اور خوشی سے ہم جیسے پولیس آفیسر کو اس طرح مدعو کیا کرتا ہے۔

ان لوگوں نے بہت تکلف کیا تھا۔ میرے لیے کھانا خود سارہ نے بنایا تھا۔ بہت مزہ تھا اس کے ہاتھ میں۔ گویا یہ بھی ایک اشارہ ہی تھا کہ اگر وہ میرے گھر آگئی تو پھر مجھے باہر کھانا کھانے کی ضرورت نہیں ہوگی...اور ان سب مہربانیوں کا حاصل وہ گفتگو تھی جو کھانے کے بعد اس کے والد نے چائے کے دوران کی۔ اس دوران سارہ وہاں موجود نہیں تھی۔

''دیکھو میاں۔'' اس کے والد نے بات کا آغاز کیا۔

''اس دنیا میں میرا سارہ کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ اس کی والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں نے ماں بن کر اس کی پرورش کی ہے۔ میرے خواب تو کچھ اور تھے لیکن اس کی ضد کچھ اور ہے۔ معاف کرنا۔ میں سب کچھ صاف صاف بتا رہا ہوں اور اس کی ضد کیا ہے۔ اس کا اندازہ تمہیں ہو گیا ہوگا۔''

وہ کچھ دیر کو خاموش ہو گئے۔ جیسے بات کرنے کا مواد سوچ رہے ہوں۔ میں بھی سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔

''تو بیٹا۔ میرا خیال ہے کہ تم نے میرا اشارہ سمجھ لیا ہوگا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنے کسی بڑے کو ہمارے یہاں بھیج دو تاکہ بات بڑھائی جا سکے۔''

آخر وہی بات ہوگئی جس کا مجھے اندازہ تھا اور میں نے جس کے خواب دیکھے تھے، جو میری خواہش تھی۔ میں نے ان سے کہا۔ ''محترم۔ بدقسمتی سے میرے قریب کا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ ایک دور کے عزیز ہیں۔ اگر کہیں تو میں انہیں بھیج دوں۔''

''چلو ان ہی کو بھیج دو۔''

بظاہر تو میری اس کہانی میں ابھی تک کوئی ایسا موڑ نہیں آیا تھا۔ جو چونکا دینے والا ہو۔ ایک سیدھی سادی کہانی ہے جو ایک ٹریک پر چلی جارہی تھی۔ ایک بے رحم قسم کا پولیس آفیسر ہے جس نے زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا اور اس لڑکی نے بھی پسند کا جواب پسند سے دیا پھر اس لڑکی کے باپ سے ملاقات ہوئی اور شادی کی بات ہوگئی۔ بس اب تک کی یہی کہانی ہے لیکن اس کہانی کا چونکا دینے والا موڑ شادی کے بعد آتا ہے۔

صرف چھ مہینے لگے تھے اس پروسس کو۔ چھ مہینے کے اندر ہی سارہ سے میری شادی ہوگئی تھی۔ ایک بات اور بھی ہے کہ میں نے خود کو تبدیل کرنا شروع کر دیا تھا۔

شادی کے بعد میری زندگی کا رخ ہی بدل گیا تھا۔ کہاں تو میرا ایسا مزاج کہ سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا تھا اور کہاں ایسی نرمی کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوا کرتی۔ میں نے ناجائز پیسے لینے بھی بند کر دیئے تھے۔ مزاج کی وہ سختی جانے کہاں گم ہوگئی تھی۔ میرا خاص بندہ نبی بخش بھی حیران ہوا کرتا تھا۔ ''سر جی کیا ہوگیا آپ کو۔ بھابی نے تو بالکل ہی دوسرا انسان بنا دیا ہے۔''

''ہاں۔ نبی بخش۔ اب جا کر پتا چلا ہے کہ سکون کیا ہوتا ہے۔ خدا کی قسم جنت اس دنیا ہی میں مل گئی ہے۔''

سارہ سے مجھے بے انتہا محبت تھی۔ اس کی ذرا سی بھی تکلیف مجھے پریشان کر دیتی۔ یہی حال سارہ کا تھا۔ میری ذرا سی بات کا خیال رکھا کرتی۔ میں جب ڈیوٹی پر جاتا تو میرے لیے لنچ باکس بھی ساتھ دے دیا کرتی۔ میں اس سے کہا کرتا۔ ''خدا کی بندی کیوں میری عادتیں خراب کر رہی ہو۔ میں سامنے والے ہوٹل سے کھانا منگوا لیتا ہوں۔''

''یہ اس وقت اچھا تھا جب میں اس گھر میں نہیں تھی۔ اب میں آگئی ہوں۔ میں یہ کیسے برداشت کر سکتی ہوں کہ آپ بیوی کے ہوتے ہوئے باہر کا کھانا کھائیں۔''

اب اس توجہ اور محبت کا کوئی جواب ہو سکتا ہے؟ کوئی نہیں۔ میرے ساتھی بھی میری قسمت پر رشک کیا کرتے تھے۔ ''یار تمہیں تو بھابی نے سنوار کر رکھ دیا ہے۔''

''ہاں یار۔ میں سنا کرتا تھا کہ اچھی بیوی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہوتی لیکن اب پتا چلا ہے کہ اس بات میں کتنی سچائی ہے۔''

شادی کو ایک سال گزر گیا۔ ہم دونوں نے ابھی تک بچوں کی پلاننگ نہیں کی تھی۔ یہ ہم دونوں کا خیال تھا کہ جب تک جی بھر کر دو چار سال آرام اور تفریح کے گزار لیں اس کے بعد بچے بھی آجائیں گے۔

ہم جس گھر میں رہتے تھے۔ اس میں چار کمرے تھے۔ تین کمرے ہمارے استعمال میں تھے۔ ایک کمرے کو ہم نے اسٹور بنا رکھا تھا جس میں دنیا بھر کی الم غلم چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ اس اسٹور روم کی ایک کھڑکی بھی تھی جو باہر کی طرف کھلتی تھی۔ ایک ملحقہ باتھ روم بھی تھا، صاف ستھرا۔ یہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اہتمام ہم نے کسی مہمان کے لیے کر رکھا تھا۔ ممکن تھا کہ کوئی آ کر رہنے لگتا لیکن جب کوئی نہیں آیا تو پھر ہم نے اس کمرے کو اسٹور بنا لیا تھا۔

ایک شام جب میں اپنی ڈیوٹی سے واپس آیا تو سارہ بہت خوش اور پُرجوش دکھائی دے رہی تھی۔

میں یہ بتانا بھول گیا ہوں کہ ایک سال کے دوران اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ چونکہ وہ گھر اس کے والد ہی کا تھا۔ سارہ کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا اسی لیے وہ گھر بیچ دیا گیا... اور اس کے پیسے سارہ کے اکاؤنٹ میں جمع ہو گئے تھے۔

''سنیں'' سارہ نے مجھے بتایا۔ ''حشمت ماموں ہمارے یہاں آ رہے ہیں۔''

''کون حشمت ماموں؟''

''کہنے کو وہ دور کے ماموں ہیں لیکن انہوں نے بے پناہ محبت دی ہے۔ بچپن میں اس طرح میرا ساتھ دیا ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔''

''چلو یہ تو اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن ایک بات اور ہے جو بتاتے ہوئے جھجک ہو رہی ہے۔''

''ارے ایسی بھی کیا بات ہے۔''

''وہ کم از کم ایک ہفتہ رکنے کے لیے آ رہے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''ارے اس میں ایسی کون سی بات ہو گئی۔ یہ تو خوشی کی بات ہے کہ پہلی بار ہمارے یہاں کوئی مہمان آ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور جہاں تک رہنے کا تعلق ہے تو ہم وہ اسٹور روم صاف کرا لیں گے۔ بہترین کمرا ہے۔ انہیں وہاں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

میں سارہ کے ماموں کے آنے کی خبر سن کر اس لیے خوش تھا کہ سارہ خوش تھی۔

ایک دوپہر سارہ نے کہا۔ ''چلیں میرے ساتھ مل کر کمرا صاف کروا لیں۔''

میں اس کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔ بہت کچھ اوٹ پٹانگ چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ سارہ کے ساتھ مل کر کام کرتے ہوئے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اگر چاہتا تو کسی ملازم کو بھی بلوا سکتا تھا۔ تھانے فون کر دیتا تو تھانے والے درجنوں کو بھیج دیتے لیکن سارہ کے ساتھ مل کر کام کرنے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ اس نے اپنے دوپٹے سے اپنی کمر کو کس کر باندھ رکھا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے۔

''آپ جب تک واش روم دیکھ لیں۔ میں جھاڑو لے کر آتی ہوں۔''

وہ جھاڑو لینے چلی گئی۔ میں جب واش روم سے باہر آیا تو وہ کمرے میں نہیں تھی۔ میں کچھ دیر تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ نہیں آئی تو میں خود اس کو دیکھنے کمرے سے باہر جانے لگا لیکن کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا۔

میں نے آواز لگائی۔ ''سارہ سارہ۔ دروازہ بند ہے۔ دروازہ کھولو۔''

کوئی آواز نہیں۔ میں نے دوبارہ آواز دی۔ سناٹا۔

میں نے دروازے پر زور آزمائی شروع کر دی لیکن وہ دروازہ بہت مضبوط تھا۔ کسی بھی حال میں اس کا کھلنا یا ٹوٹنا محال تھا پھر سارہ کی آواز آئی۔ ''کیا بات ہے۔ کیوں شور کر رہے ہو؟''

''سارہ دروازہ کھولو۔'' میں اندر سے چیخا۔ ''یہ کیا مذاق ہے۔ کھولو دروازہ۔ کس نے بند کیا ہے؟''

''میں نے بند کیا ہے۔'' سارہ کی آواز آئی۔ ''اور اس لیے بند نہیں کیا کہ اسے کھول دوں۔ یہ اسی طرح بند رہے گا اور تمہیں اب اسی کمرے میں رہنا ہے۔''

اس کی یہ بات سن کر میرا تو دماغ ہی گھوم گیا تھا۔ ''سارہ کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟ یہ کیا کر رہی ہو۔ جلدی کھولو۔''

اس کے بعد بالکل خاموشی۔ شاید وہ دروازے کے پاس سے ہٹ گئی تھی۔ میں دروازہ پیٹتا رہا لیکن کوئی آواز نہیں۔ میں ایک طرف بیٹھ کر صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ جو کچھ بھی تھا وہ حیرت ناک ہی ہو سکتا تھا۔

وہ ایسا کیوں کر رہی تھی وہ تو میری بیوی تھی۔ میں نے اس سے محبت کی تھی۔ ہم نے ایک ساتھ بہت اچھے دن گزارے تھے۔ بلکہ گزار رہے تھے۔ ان دنوں کے درمیان کبھی بھی ایسا اظہار نہیں ہوا تھا کہ وہ اس قسم کی کوئی حرکت کرے گی۔ یہ کسی قسم کی شرارت بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ شرارت کی بھی کوئی حد ہوا کرتی ہے اور وہ بھی ایسا بے رحمانہ سلوک۔

میں نے دو تین بار دروازے کے پاس جا کر اسے مزید آوازیں دیں لیکن جب کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا۔ مجھے اس کمرے سے باہر نکلنا تھا۔

کس طرح۔ دروازہ بہت مضبوط تھا۔ وہ کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا تھا۔ کھڑکی بھی ایسی نہیں تھی کہ اسے توڑا جا سکے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اور نہ وہ باہر کی [illegible] میں کھلتی تھی جس کے دونوں طرف [illegible] تھے۔

اب یہ [illegible] فون کرکے کسی کو اپنی مدد کے لیے بلالوں۔ [illegible] بندے کو یا اپنے کسی دوست کو۔

پھر اس وقت میری جھنجلاہٹ کی کوئی حد نہیں رہی جب مجھے اپنا موبائل فون بھی نہیں ملا۔ وہ تو میری اس قمیص کی جیب میں تھا جو میں اتار کر بیڈروم میں چھوڑ آیا تھا۔ اب میں بالکل بے بس ہو چکا تھا۔

ایک طریقہ تو یہ تھا کہ شور کیا جائے لیکن اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ایک تو میرا گھر جس علاقے میں تھا وہاں گھر ایک دوسرے سے فاصلے پر بنے ہوئے تھے اور دوسری بات یہ تھی کہ میرے گھر کی بناوٹ ایسی تھی کہ شور کی آواز باہر جا ہی نہیں سکتی تھی۔ گویا سارہ نے جو پلاننگ کی تھی وہ بہت سوچ سمجھ کر کی تھی۔

میں دوبارہ بستر پر جا کر بیٹھ گیا۔ سوچتے سوچتے دماغ کی رگیں پھٹنے لگی تھیں۔

بہت دیر بعد وہ کمرے کی کھڑکی کے باہر نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس میں چائے کا ایک گلاس، کچھ بسکٹ اور ایک گلاس میں پانی تھا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ دونوں پیپر گلاس تھے۔ جن کو ڈسپوزایبل گلاس کہتے ہیں۔

”یہ لو چائے پی لو۔“ اس نے کہا۔

”سارہ کیا ہو گیا ہے تم کو؟“ میں نے غصے سے پوچھا۔

”پہلے چائے پی لو پھر بتاؤں گی۔“ اس نے کہا۔ ”اور ہاں۔ اب تمہارے لیے اسی قسم کے گلاس اور پلیٹ آیا کریں گے۔ میں نہیں چاہتی کہ شیشے کی کوئی چیز اندر آئے۔ ایسا نہ ہو کہ تم مایوس ہو کر خودکشی ہی کرلو اور ہاں۔ شاید تم نے واش روم میں جا کر نہیں دیکھا۔ اس میں بھی تمہیں کوئی شیشہ نہیں ملے گا۔“

اس کی باتوں سے ظاہر ہو گیا تھا کہ اس کے ارادے بہت خطرناک ہیں۔ اس نے کچھ سوچ لیا ہے۔ پوری پلاننگ کے ساتھ ایسی حرکت کر رہی ہے لیکن کیوں۔ اس سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ میں نے اس لمحے سوچا کہ اس وقت اس پر غصہ کرنے یا اس کو گالیاں دینے کا موقع نہیں ہے۔ بلکہ اس سے نرمی سے بات کی جائے۔

”سارہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ میں نے کہا۔ ”تم جانتی

کیرالا (Kerala)

ساحل مالا بار پر، جنوب مغربی بھارت کی ایک ریاست 1956ء میں ریاست ٹراونکور کوچین کی نئی حد بندی کے بعد وجود میں آئی۔ زرعی پیداوار میں کافی ربر، چائے اور کالی مرچ قابلِ ذکر ہیں۔ لوگوں کی مادری زبان ملیالم ہے۔ تعلیم کا تناسب بھارت کی تمام ریاستوں سے زیادہ ہے۔ ٹریونڈرم ریاست کا صدر مقام ہے۔ تین ہزار سال قبل مسیح بابل اور مصر وغیرہ سے کیرالا کے تجارتی تعلقات تھے، البتہ اس کی باقاعدہ تاریخ کی ابتدا پہلی صدی عیسوی سے ہوئی جب سینٹ تھامس چین اور دوسرے مشرقی ممالک کے دورے پر نکلے۔ انہوں نے یہاں سات گرجے تعمیر کرائے جن کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ اس دور میں کیرالا کئی حصوں میں منقسم تھا۔ ہر حصے پر الگ الگ راجے اور سردار مقتدر تھے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں یہاں ولندیزی آئے۔ انہوں نے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا یعنی ٹراونکور، کوچین اور زاموربن (جو بعد میں مالا بار کے نام سے موسوم ہوا) 1948ء تک یہ تقسیم قائم رہی اس کے بعد ٹراونکور اور کوچین کو ملا دیا گیا اور ٹراونکور کوچین ریاست قائم ہوئی۔ یکم نومبر 1956ء کو پہلی بار کیرالا کی الگ سیاسی حیثیت قائم ہوئی۔ یہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ مسیحیوں اور مسلمانوں کی بھی خاصی آبادی ہے۔ اسلام یہاں آٹھویں صدی میں ان عربوں کے توسط سے پھیلا جو تجارت کے غرض سے یہاں آتے تھے۔ رقبہ: 15,000 مربع میل یا 38900 مربع کلومیٹر۔

مرسلہ: زاہد شیخ، لاہور

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

ہو کہ جب میں اپنے آفس نہیں پہنچوں گا تو سب کتنے پریشان ہوں گے اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ کس طرح میری تلاش شروع ہو جائے گی۔''

''سب جانتی ہوں میں، میں نے تمہارے دفتر فون کر کے بتا دیا ہے کہ تم اچانک شہر سے باہر چلے گئے ہو اور کم از کم پندرہ دنوں کا بول کر گئے ہو۔ اب پندرہ دنوں کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ چلو یہ چائے تو لے لو۔ مجھے اپنے لیے کھانا بھی بنانا ہے اور ہاں تمہارے لیے میں سلائیس لے آئی ہوں۔ اب تم صرف سلائیس ہی کھایا کرو گے اور کچھ نہیں ملے گا۔ کبھی کبھی اس پر بٹر بھی لگا دیا کروں گی۔''

کاش اس وقت میں کمرے سے باہر ہوتا یا وہ میرے قریب ہوتی تو میں اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ اب معاملہ میری برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ ''یہ بتا آخر تو یہ سب کیوں کر رہی ہے؟''

''ہاں۔ اب تم اپنی اصلیت پر آئے ہو۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''اب میں بتا دوں گی کہ میں یہ سب کیوں کر رہی ہوں لیکن ابھی نہیں۔ تین چار دنوں کے بعد۔ یہ لو میں نے ٹرے کھڑکی پر رکھ دی ہے۔ چائے ٹھنڈی تو ہو گئی ہے لیکن اب میں دوبارہ گرم نہیں کروں گی۔''

وہ ٹرے رکھ کر چلی گئی۔

کیا تھا یہ سب۔ اگر کوئی خواب تھا تو اس خواب کا مقصد کیا تھا۔ سارہ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی تھی۔ میں نے تو اسے کبھی تکلیف نہیں دی۔ ہمیشہ خیال ہی رکھا تھا پھر کیا ہوا تھا اس کو۔

وہ رات بہت کرب کی تھی۔ بستر پر کروٹیں بدلتے گزری تھی۔ باہر کمرے سے ٹی وی چلنے کی آوازیں آتی رہی تھیں یعنی وہ کم بخت مجھے قید کر کے آرام سے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اسے میری کوئی پروا ہی نہیں تھی۔

اس نے اپنے کہنے کے مطابق رات کو کھڑکی کے راستے میرے لیے سلائیس دے دیئے تھے اور وہ بھی پیپر پلیٹ میں۔

میں نے غصے سے پوچھا۔ ''سارہ۔ کیا تو نہیں جانتی کہ میں کون ہوں اور باہر آ کر تیرا کیا حشر کر سکتا ہوں۔''

''اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم کیا کر سکتے ہو اسی لیے میں نے تمہارے باہر آنے کے سارے امکانات ہی ختم کر دیئے ہیں۔''

''لیکن کیوں۔ تو ایسا میرے ساتھ کیوں کر رہی ہے؟''

''یہ ایک کہانی ہے ڈی ایس پی صاحب۔ لیکن ابھی نہیں بتاؤں گی۔'' اس نے کہا۔ ''دو چار دن اور اسی طرح گزار لو پھر سب کچھ بتا دوں گی۔''

میں نے اسے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ وہ گالیاں کھا کر ہنستی رہی تھی۔ اس کی ہنسی میں بلا کا زہر بھرا ہوا تھا۔

اس وقت اس کا سارا حسن غارت ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ ایک چڑیل کی طرح سامنے کھڑی تھی جس نے مجھے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ میں اسے برا بھلا کہتا رہا لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ چلی گئی اور میں نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔

وہ اپنے وعدے کے مطابق میرے لیے صرف سلائیس لاتی رہی۔ ایک دن اور گزر گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس طرح مجھے باہر نہیں نکالے گی۔ اس نے جو سوچ لیا ہے اس پر عمل کر کے رہے گی اور کیا سوچا ہے کیوں سوچا ہے یہ میں نہیں جانتا تھا۔

دو دنوں کے بعد میری حالت خراب ہونے لگی۔ کمزور ہونے لگا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کھانے میں صرف سلائیس دیئے جا رہے تھے اور وہ بھی گنتی کے۔ ایک دوپہر کو اس نے مجھے جو کھانے کو دیا اس کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔

باقاعدہ روٹیاں تھیں اور ان کے ساتھ سالن بھی تھا۔ نہ جانے کیوں مہربان ہوئی تھی۔ اس کی وجہ بعد میں پتا چلی جب میں کھانا کھا کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے کوئی ایسی دوا کھلا دی تھی جس نے مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔

میں اپنے آپ کو واش روم کے دروازے کے باہر دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ مجھے یاد نہیں تھا کہ میں کس طرح یہاں پہنچا ہوں۔ بہت دیر تک میں سوچتا ہی رہا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اتنا یاد آ رہا تھا کہ میں نے کھانا کھایا تھا اس کے بعد کیا ہوا تھا۔ یہ مجھے اندازہ نہیں تھا۔

بہر حال کسی نہ کسی طرح خود کو گھسیٹتا ہوا بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ اس وقت رات ہو گئی تھی۔ خدا جانے میں کب تک بے ہوش رہا ہوں گا پھر جب کھڑکی کے باہر سارہ کی زہریلی ہنسی کی آواز سنائی دی تو میں تیزی سے بستر سے اترا لیکن چکرا کر گر پڑا۔ اتنی کمزوری ہو گئی تھی۔ اس حال میں دیکھ کر وہ ہنستی رہی پھر زہریلی آواز میں بولی۔ ''میرے سرتاج۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کیوں کمزور ہوتے جا رہے ہو، اور واش روم کے باہر کیوں پڑے ہوئے تھے؟''

''کمینی بتا۔ میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔ کیا نقصان کیا ہے تیرا؟''

''سن لے کہ تو نے میرا کیا نقصان کیا ہے؟'' اس نے

Waqar Azeem
Pakistanipoint

کہا۔ ”تو نے میری ساری خوشیاں غارت کر دی ہیں۔ تو نے میری محبت مجھ سے چھین لی ہے۔ تو نے میرے سارے خوابوں کو اپنی بربریت کا شکار بنا لیا ہے۔ میرے سپنے چور کر دیے ہیں تو نے؟

”تو جو کچھ بھی کہہ رہی ہے وہ میری سمجھ میں نہیں آرہا۔“ میں نے کہا۔

”لے سن لے کہ میں تیرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”یاد کر اب سے دو سال پہلے تو نے ایک موٹر سائیکل سوار نوجوان کو اس غلطی پر پکڑا تھا کہ وہ تیری گاڑی سے ٹکرا گیا تھا۔ تو نے اسے ماں بہن کی گالیاں دی تھیں۔ وہ ایک غیرت مند نوجوان تھا۔ اس سے یہ سب برداشت نہیں ہوا اس نے جواب دیا تو تیرے اشارے پر تیرے بندے اسے اٹھا کر تھانے لے گئے۔ تو نے اس پر دنیا بھر کے الزامات عائد کر دیئے۔ تو نے اسے دہشت گرد قرار دے دیا اور تھانے سے باہر لے جا کر جعلی پولیس مقابلے میں اسے مار دیا تھا۔ یاد ہے تجھے؟“

مجھے وہ نوجوان یاد آ گیا۔ اس کا نام شہاب تھا وہ تھانے میں آنے کے بعد بھی حق و صداقت وغیرہ کی باتیں کر رہا تھا۔ لیکچر دینے لگا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس نے میرے بینک اکاؤنٹ میں اضافے سے انکار کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد میری نگاہ میں اس کے زندہ رہنے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا اور وہ مار دیا گیا تھا۔ یہ کام بھی نبی بخش ہی نے میرے کہنے پر کیا تھا۔

”تمہارا کیا تعلق تھا اس سے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ محبوب تھا میرا۔“ سارہ نے بتایا۔ ”ہم دونوں کی خوشیاں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو اپنا سہارا سمجھ لیا تھا۔ ایک ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھے تھے اور اس کے بارے میں، میں نے کسی کو بھی نہیں بتایا تھا۔ میرے ابو بھی نہیں جانتے تھے کسی کو نہیں معلوم تھا۔ میں اس کو ابو سے ملوانے لے جا رہی تھی کہ یہ حادثہ ہو گیا۔ مر گیا وہ۔ میری محبت مر گئی۔ مجھے پتا چل گیا کہ اس کو اس طرح مارنے والا کون ہے۔ ایک بے رحم انسان، ایک ظالم، ایک خونخوار۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں شیشہ پینے لگی تھی۔ نہیں بلکہ میں ایک پلاننگ بنا کر شیشہ ہوٹل گئی تھی۔ جہاں تم نے چھاپہ مارا تھا۔ اور میری توقع کے مطابق مجھ کو تمہارے سامنے پیش کر دیا گیا اور میں تمہیں متاثر کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ تم نے کبھی تو سوچا ہوتا کہ مجھ جیسی لڑکی تم جیسے درندہ صفت انسان سے

کیا آپ
لبوب مقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

WaqarAzeem
Pakistanipoint.com

شادی کے لیے بے تاب کیوں ہو رہی ہے لیکن میں نے تو تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی اسی لیے تمہیں کچھ محسوس نہیں ہوا۔ اس کے بعد کی کہانی تمہارے سامنے ہے۔''

''تو پھر یہ شادی وغیرہ؟''

''میری طرف سے یہ سب ڈراما تھا ظالم انسان۔'' وہ دہاڑنے لگی۔ ''تو نہیں جانتا کہ میں نے کس طرح تیرا ساتھ برداشت کیا ہے۔ اپنے آپ پر کتنا ظلم برداشت کیا ہے۔ جس رات میں تیرے ساتھ ہوئی تھی۔ اس کے دوسرے دن میں دن بھر روتی رہتی تھی۔ اپنے محبوب کی روح سے معافی مانگتی تھی کہ میں نے اس کے قاتل کو اپنا لیا ہے۔ جب تو مجھے چھوتا تھا تو تیرے جسم سے خون کی بدبو آنے لگتی تھی۔ شہاب کے خون کی بدبو، اور بھی نہ جانے کتنے شہاب تیری درندگی کی بھینٹ چڑھ گئے ہوں گے۔ ان سبھوں کا خون تیری آستین پر ہے۔ ذرا اپنے آپ کو دیکھ۔ سوچ کہ تو نے کیا کر دیا ہے۔ محبتیں چھین لیں۔''

''سارہ۔ تیرا وہ محبوب ایک کرمنل تھا۔''

''جھوٹ بولتا ہے تو۔'' وہ چیخنے لگی۔ ''وہ کرمنل نہیں تھا۔ ارے وہ تو اس ملک کی اُمید تھا۔ وہ ایک سائنس دان بننے جا رہا تھا۔ ایک ذہین نوجوان۔ ایک محبِ وطن شہری، اور تو نے اس بے گناہ کو خاک و خون میں ملا دیا۔ صرف اس لیے تاکہ تیری دھاک بندھ جائے۔ تجھے ایک بہادر اور فرض شناس پولیس آفیسر سمجھا جائے۔ اسی لیے نا؟ تیرے نام کے ڈنکے بجیں، اور تیری رشوت کے دام بڑھتے جائیں۔ بتا اپنے ایمان سے بتا۔ اگر ایمان نام کی کوئی چیز تیرے پاس ہے تو۔ کیا وہ ایک کرمنل تھا۔ کیا وہ دہشت گرد تھا؟''

اس نے رونا شروع کر دیا۔ میں خاموش تھا۔ وہ جو بھی کہہ رہی تھی اس میں سچائی تھی۔ شہاب ایک اچھا نوجوان تھا۔ میں نے اپنی جھوٹی انا اور شہرت کے لیے اس کو پولیس مقابلے میں مار دیا تھا۔

''سارہ۔'' میں کچھ دیر بعد بولا۔ ''چلو مان لیا کہ میں نے غلطی کی لیکن میں اب تمہارا شوہر ہوں۔ جو ہوا اسے بھول جاؤ۔''

''نہیں۔ تمہارا جرم اس قابل نہیں ہے کہ اسے بھول جاؤں۔ صرف شہاب کا معاملہ تو نہیں ہوگا۔ تم نے نہ جانے کتنوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہوگا۔ کتنی ماؤں سے ان کے سہارے چھین لیے ہوں گے۔ کتنے محبت کرنے والوں کو جدا کر دیا ہوگا۔''

''اب کیا ہو سکتا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔ اب صرف ایک کام ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ تم مجھے طلاق دو۔'' اس نے کہا۔ ''تمہارے ساتھ رہنے کا اب کوئی جواز نہیں ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ تم اپنی سزا برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

''سزا تو تم نے دے ہی دی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب کون سی سزا دو گی؟''

''اب قانون سزا دے گا۔'' اس نے بتایا۔ ''تمہارا محکمہ سزا دے گا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں نے بس یوں ہی تمہارے ساتھ یہ سب کچھ کیا ہوگا۔ نہیں۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ جس محکمے سے تمہارا تعلق ہے اس میں صرف تم جیسے لوگ نہیں ہیں بلکہ فرض شناس، مخلص اور انسان نواز لوگ بھی ہیں۔ جیسے تمہارے ڈی آئی جی صاحب۔ ارشد چیمہ۔''

''اب یہ ارشد چیمہ بیچ میں کہاں سے آ گئے؟''

''اس لیے کہ وہ اس وقت دوسرے کمرے میں موجود ہیں۔'' اس نے انکشاف کیا۔ ''اور تمہاری ساری گفتگو ریکارڈ ہو چکی ہے۔''

اس نے اپنی بات ختم کی تھی کہ دوسرے کمرے سے چیمہ صاحب نمودار ہو گئے۔ وہ اکیلے نہیں تھے۔ ان کے ساتھ پولیس کے اور کئی اعلیٰ عہدے دار بھی تھے۔ سب انتہائی طیش کے عالم میں تھے۔

چیمہ صاحب نے سارہ کے پاس آ کر اس کے شانے پر تھپکی دی۔ ''بیٹی تم نے جو کچھ کیا ہے اس پر مجھے فخر ہے۔ کاش۔ ہمارے معاشرے میں تم جیسی عورتیں ہوں تو کوئی بھی شخص اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اب یہ تمہیں طلاق دے گا۔ اور اس کے ساتھ جس قسم کی کارروائی ہوگی وہ الگ ہوگی۔''

سارہ روتی رہی۔

مجھے باقاعدہ گرفتار کر لیا گیا۔ میں اب کسی قابل ہی نہیں رہا تھا۔ چیمہ صاحب کے سامنے مجھے سارہ کو طلاق دینی پڑی تھی۔ اس کے بعد میرے ساتھ محکمانہ کارروائی ہوئی۔ الزام ثابت ہو چکا تھا۔ مجھے عدالت نے ایک لمبی سزا سنا دی اور اب میں ایک تنہا کوٹھری میں بیٹھ کر اپنی کہانی لکھ رہا ہوں۔

اس کہانی کو لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ عورت کو کمزور نہ سمجھا جائے۔ وہ جب اپنی محبت اور اپنے حق کے لیے جنگ کرنے پر آمادہ ہو جائے تو پھر مجھ جیسا انسان بھی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

++

WaqarAzeem
Pakistanipoint

بڑا آدمی

محترم مدیر
السلام علیکم!
اس وقت میں عمر کے اس حصے میں ہوں جہاں پہنچ کر انسان عاقبت کی فکر کچھ زیادہ ہی کرنے لگتا ہے۔ میں بھی اسی فکر میں مبتلا ہوں میں ایسا کوئی بھی واقعہ بیان نہیں کروں گا جو جھوٹ ہو۔ ابتدا سے انتہا تک میں نے سچ لکھا ہے۔ فوزان ایک زندہ حقیقت ہے۔ ایسا عجیب انسان میں نے نہیں دیکھا اسی لیے اسے بڑا آدمی کہتا ہوں۔

ہمایوں
(کراچی)

اس سے میری پہلی ملاقات پچاس سال قبل پرانی نمائش کے آس پاس ہوئی تھی۔ میں ایک اہم اور ضروری کام سے پیدل جمشید روڈ جا رہا تھا۔ جیب میں ایک پھوٹی کوڑی تک نہ تھی اور وقت بڑا ہی نازک تھا۔ خلیل صاحب نے ایک ہزار روپے قرض دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ معمولی رقم نہ تھی۔ ایک روپے میں چار سیر آٹا مل جاتا تھا اس حساب سے آج کی گرانی کو مدِنظر رکھ کر سوچیں ایک ہزار کتنی بڑی رقم تھی۔ وہ اتنی آسانی سے رقم دے رہے تھے اس لیے میں تیز تیز چل رہا تھا تاکہ بروقت پہنچ جاؤں۔ اگر میں وقت پر نہ پہنچتا تو خلیل صاحب اپنے کاروباری دورے پر بیرونِ ملک چلے جاتے اور میں ہاتھ ملتا رہ جاتا۔

اپنی دھن میں مست میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ یکدم وہ سامنے آ گیا۔ ''بابو جی! ذرا ایک بات سنیے۔''

''کیا ہے؟'' میں نے انتہائی درشت اور کرخت لہجے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

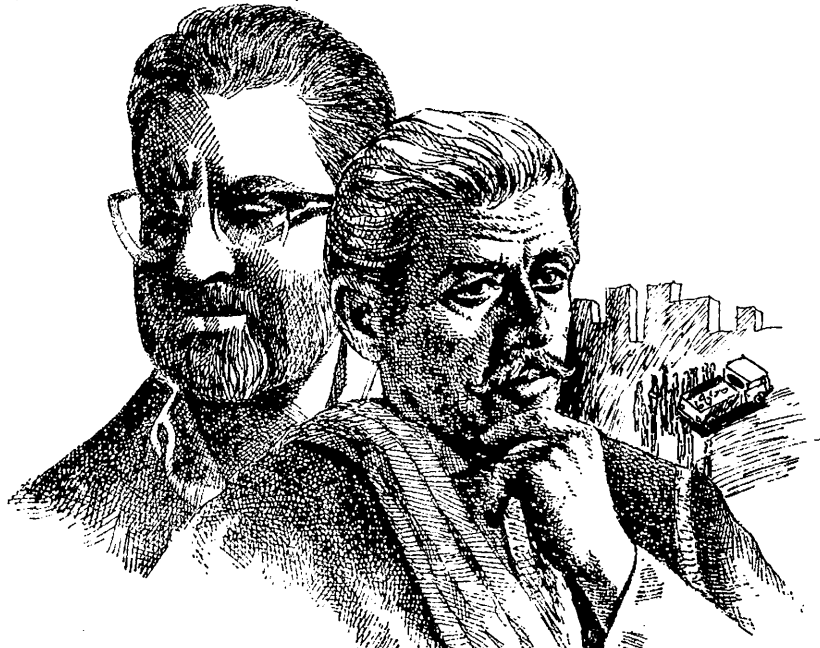

میں پوچھا۔ میں جانتا تھا کہ اب یہ کوئی دکھ بھری کہانی سنائے گا اور رقم کے لیے ہاتھ پھیلا دے گا۔ کم بخت، اس قدر نازک موقع پر میرا راستہ کاٹ رہا تھا۔ میرے بدن میں نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ”یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کالی بلی نے راہ کھوٹی کر دی ہو۔“ میں نے سوچا۔

”بابو جی! میں نے سنا تھا کہ کراچی بہت بڑا شہر ہے اور یہاں ایک ایسی چیز بھی ہوتی ہے جس کو فٹ پاتھ کہتے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ فٹ پاتھ میں کہاں اور کیسے دیکھ سکتا ہوں؟“ اس نے بڑی معصومیت سے سوال کیا اور بے ساختہ میرے حلق سے ایک قہقہہ ابل پڑا۔

”یا خدا! کیا دنیا میں اس قدر احمق اور بدھو لوگ بھی پائے جاتے ہیں؟“ وہ گاؤدی لڑکا فٹ پاتھ پر ہی کھڑا تھا اور فٹ پاتھ کا پتا پوچھ رہا تھا۔

میں نے استہزائیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا اور طنز بھرے لہجے میں کہا۔ ”میاں صاحب زادے! اس وقت تم جہاں کھڑے ہو، یہی فٹ پاتھ ہے۔“

”ارے نہیں؟ یہ تو زمین ہے۔ یہ فٹ پاتھ نہیں ہے۔“ وہ یوں اچھل پڑا گویا کسی بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ یقیناً اس کے ذہن میں فٹ پاتھ کا کوئی اور تصور تھا گویا اس کا خواب اچانک ہی چکنا چور ہو گیا ہو۔ ”جناب! کیوں مذاق کرتے ہیں۔ میں گاؤں کا ان پڑھ گنوار ہی لیکن آپ مجھے اتنا بھی بے وقوف نہ بنائیں۔“ اس کے لہجے میں خفگی تھی۔

”دیکھو! لڑکے میں اس وقت ذرا جلدی میں ہوں۔ تم کسی اور سے جا کر اپنے سوال کا جواب حاصل کر لو۔“ یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔ اس نے میرا پیچھا نہ چھوڑا اور میرے ساتھ ساتھ فدویانہ انداز میں چلتا رہا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ یہ تو میرے ساتھ چپک کر ہی رہ گیا ہے تو میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔ ”اگر تم چاہو تو میرے ساتھ وہاں تک چلو جہاں میں جا رہا ہوں۔ اس کے بعد میں تمہیں سب کچھ اچھی طرح سمجھا دوں گا اور فٹ پاتھ کی سیر بھی کرا دوں گا۔“

وہ ہنسی خوشی راضی ہو گیا۔ ”ہاں ہاں، چلیے! مجھے تو کوئی کام نہیں ہے۔ آپ کے ساتھ باتیں کرنے میں مجھے مزہ آ رہا ہے۔“

خلیل صاحب بے چینی سے اپنے بنگلے کے باہر ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے سو سو کے دس نوٹ میرے ہاتھ پر رکھے اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گویا اگر مجھے ایک دو منٹ دیر ہو جاتی تو فاختہ اڑ چکی ہوتی۔

ہماری واپسی بس کے ذریعے ہوئی کیونکہ اب میری جیب بھاری ہو چکی تھی۔ پرانے گولی مار کے اپنے ایک کمرے کی بوسیدہ کھولی میں پہنچنے کے بعد میں نے لڑکے کا تعارف حاصل کیا۔ ”ہاں تو بیٹے! اب بتاؤ۔ تمہارا نام کیا ہے، کہاں سے آئے ہو اور کراچی آنے کا مقصد کیا ہے؟“

میرے سوالوں کی بوچھاڑ سے وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ چند لمحے خاموش رہا اور پھر یوں گویا ہوا۔ ”میرا نام فوزان محسن ہے۔ ایمن آباد کا رہنے والا ہوں۔ یہ چھوٹا سا سرسبز اور شاداب گاؤں لیاقت پور کو خان بیلا سے ملانے والی سڑک کے درمیان واقع ہے۔ میں نے پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی ہے لیکن دو سال قبل میرے والد کا انتقال ہو گیا تو یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ گزشتہ دنوں میری والدہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ میرا کوئی بھائی بہن نہیں۔ میں دنیا میں اکیلا ہوں۔“

وہ اپنی سرائیکی زبان میں ٹوٹی پھوٹی اردو ملا کر بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ وہ بار بار خاموش ہو جاتا اور تھوک نگل کر اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کی کوشش کرتا۔ میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی کا جذبہ جاگ اٹھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسے اپنے ہی پاس رکھوں گا۔ یہ معصوم اور نادان لڑکا اپنی پُرسکون دنیا کو چھوڑ کر کراچی کی مسموم اور زہر آلود فضا میں نہ جانے کیا کیا خواب سجائے آ گیا ہے۔ اگر کسی بدمعاش کے ہتھے چڑھ گیا تو نہ جانے اس کا کیا حشر ہو۔ میری تنہائی بھی دور ہو جائے گی اور خوب گزرے گی جو مل جائیں گے دیوانے دو۔

میں ہوٹل سے جا کر کھانا لے آیا۔ ہم دونوں نے ساتھ کھایا اور پھر میں نے فوزان سے کہا کہ وہ اب آرام کر لے۔ باقی باتیں رات میں کریں گے۔ رات کا کھانا کھا کر جب ہم بستر پر لیٹے تو میں نے بات چیت کا سلسلہ پھر سے جوڑ دیا۔ ”اچھا اب یہ بتاؤ کہ کراچی کیوں آئے ہو اور اب کیا ارادہ ہے؟“

”والدین کے انتقال کے بعد گاؤں میں میری زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ میرا ایک رشتے کا ماموں نہ جانے کب سے میرے گھر پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ ماں کے انتقال کے ایک ہفتے بعد ہی اس نے مجھے چار ہزار روپے دیے اور مکان کے کاغذات پر زبردستی دستخط کروا لیے۔ میں نے کراچی کے بارے میں بہت کچھ سنا ہوا تھا کہ یہ بہت بڑا شہر ہے اور یہاں کوئی بے روزگار نہیں رہ سکتا۔ میں نے گاؤں میں کسی کو نہیں

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

بتایا کہ میں کہاں جا رہا ہوں رات کو سفر شروع کیا اور کراچی پہنچ گیا۔ میرے پاس سامان بھی کوئی نہیں ہے۔ ایک دو جوڑے کپڑے خرید لوں گا اور رہنے کا ٹھکانا بھی ڈھونڈ ہی لوں گا۔ میرے پاس کافی روپے ہیں۔'' اس نے اپنی قمیص کی اندرونی جیب پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''اگر میں کہوں کہ تم میرے ساتھ ہی رہو تو کیا تمہیں کوئی اعتراض ہوگا؟ میں تم سے کوئی رقم بھی نہیں لوں گا۔ تمہارے پاس جو رقم ہے اس سے تم اپنی تعلیم مکمل کرو۔'' میں نے اسے پیشکش کی۔

اس نے میری جانب احسان مند نگاہوں سے دیکھا اور اثبات میں گردن ہلا دی۔ ''میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔''

میں نے پیار بھری مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا اور میرا سینہ فخر و غرور کے جذبات سے پھول گیا۔ میں ایک معصوم کی زندگی بنانے جا رہا تھا۔ آج سے یہ میرا بھائی ہے۔ میں نے سوچا اور پھر شرارتی انداز میں پوچھا۔ ''وہ فٹ پاتھ والی بات تو رہ ہی گئی۔ کیا تم صرف فٹ پاتھ دیکھنے کراچی آئے ہو؟''

اس کے چہرے پر خفت سی چھا گئی۔ ''میں سمجھ رہا تھا کہ یہ بھی سمندر جیسی کوئی چیز ہوگی اسی لیے میرے دل میں تجسس تھا کہ دیکھوں تو بھلا فٹ پاتھ کیا ہوتا ہے۔'' اس نے سادگی سے کہا۔

دوسری صبح اٹھتے ہی میں نے اپنا واحد سفاری سوٹ سنبھالا اور تیار ہو کر باہر جانے کی تیاری کرنے لگا تاکہ کوئی کام دھندا تلاش کروں کہ اچانک مجھے ایک جیب ذرا زیادہ بھاری بھاری نظر آئی۔ الٹ پلٹ کر دیکھا تو ایک کپڑے میں لپٹے ہوئے کرنسی نوٹ وہاں موجود تھے۔ ''یہ کہاں سے آ گئے؟'' اتنے بہت سے نوٹ دیکھ کر میری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ یہ ساڑھے تین ہزار روپے تھے لیکن فوراً ہی میری خوش فہمی دور ہو گئی۔ میں سمجھ گیا کہ روپے فوزان نے میری جیب میں ڈالے ہیں لیکن کیوں؟

''یہ روپے تمہارے ہیں۔ تم نے میری جیب میں کیوں رکھے؟ انہیں اپنے ہی پاس رہنے دو۔'' میرا دل شرم سے کٹا جا رہا تھا۔ آخر اس نے کیا سمجھ کر یہ روپے میرے حوالے کر دیئے؟

میں نے اس کی جانب خشمناک نگاہوں سے دیکھا تو ہکلا ہکلا کر بولنے لگا۔ ''وہ جی بس یونہی..... آپ کی پریشانی..... دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے میرا سگا بھائی مصیبت میں مبتلا ہے..... پتا نہیں کیوں..... آپ مجھے..... اپنے اپنے سے لگنے لگے ہیں۔'' فوزان نے اٹک اٹک کر اپنا مافی الضمیر بیان کر دیا۔

میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میری قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ میرے ذہن پر گویا سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر تک میری یہ حالت رہی۔ جب ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو میں نے دیکھا کہ میرا محسن میری جانب بڑی عاجزی سے دیکھ رہا تھا۔ گویا کہہ رہا ہو کہ میرا یہ حقیر نذرانہ قبول کر لیجیے ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔

میرے دل اور دماغ میں ایک کشمکش جاری تھی۔ گردش حالات نے مجھے جکڑ کر کچھ اس قدر بے بس کر دیا تھا کہ میں چاروناچار یہ رقم رکھ لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس موقع پر مجھے ایک دانشور کا قول یاد آیا۔ ''اگر تمہاری سوچ مثبت ہے اور وقتی طور پر کسی کا دست نگر ہونا پڑتا ہے تو ایسے موقع پر اپنی خودداری اور عزت نفس کو بالائے طاق رکھ دو۔ ایسا نہ ہو کہ وقت نکل جائے اور پھر تم ساری عمر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہو۔'' میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہی وہ آخری موقع ہے جب میں اپنا مستقبل تعمیر کر سکتا ہوں اور میں نے یہ غیبی امداد قبول کر لی۔ ''تم اچھی طرح سوچ لو۔ ایک ہفتہ تک تمہاری امانت میرے پاس اسی طرح محفوظ رہے گی۔ اسی دوران تم جب چاہو، اپنی رقم واپس لے سکتے ہو۔'' میں نے فوزان سے صاف صاف کہا۔ ''اگر تمہاری مرضی ہوگی تو پھر ہم دونوں مل کر فیصلہ کریں گے کہ اس کو کس مصرف میں لایا جائے۔''

اس نے گردن ہلا دی۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ میں نے فوزان کے مشورے سے قریب کی ایک مارکیٹ میں ایک دکان کرائے پر لے لی اور بچوں کے کھلونے فروخت کرنے کا کاروبار شروع کر دیا۔ ہماری محنت رنگ لائی اور جلد ہی ہماری قسمت چمک اٹھی۔ کاروبار میں جان پڑ گئی اور وہ روز بروز ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی چلی گئی۔ جلد ہی ہم اس دکان کے مالک بن گئے۔

فوزان بڑا محنتی اور ذہین لڑکا تھا۔ جلد ہی اس نے میٹرک پاس کر لیا لیکن اس کے قرض کا بوجھ میری روح کو کھن کی طرح چاٹ رہا تھا۔ اگرچہ اس کی تعلیم اور دیگر ضروریات پر اچھی خاصی رقم صرف ہوئی تھی لیکن میں پوری رقم کو اپنے آپ پر قرض سمجھتا تھا اور یہ رقم مجھے واپس کرنی تھی مگر دوسری طرف فوزان کے طرف کی دادنہ دینا بھی ناانصافی ہوگی۔ اس نے نہ ہی کبھی حساب کتاب مانگا اور نہ مجھے احساس دلایا کہ میں اس کا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

مقروض ہوں۔ بڑے لوگوں کا ظرف بھی اعلیٰ ہوتا ہے۔

لیکن پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ میٹرک کے بعد فوزان نے اپنی تعلیم کا سلسلہ یکدم منقطع کر دیا۔ میری ہزار کوششوں کے باوجود وہ آگے پڑھنے پر راضی نہ ہوا۔ مجبوراً میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ شاید اب اسے میری سرپرستی کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے دنیا میں رہنے اور اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا گر جان لیا تھا۔

ہمارے حالات بدلتے چلے گئے اور ہم مالی طور پر بھی ترقی کرتے رہے لیکن پرانے گولی مار کا کرائے والا کمرا ہم نے نہ چھوڑا۔ وہ کمرا بدترین حالات میں بھی ہماری پناہ گاہ بنا رہا اور آج بھی ہم اس کو عزیز ترین دوست کی طرح سینے سے چمٹائے بیٹھے تھے۔ میرا اور فوزان کا دنیا میں کوئی رشتہ دار نہ تھا، لہٰذا ایک کمرا ہم دونوں کی ضروریات کے لیے کافی تھا۔

اب فوزان کی توجہ دکان کی طرف سے کم ہوتی جا رہی تھی۔ کافی رات گئے گھر آتا۔ میں نے کئی بار اس سے پوچھا کہ کہاں غائب رہتے ہو لیکن اس نے صاف طور پر کچھ نہیں بتایا۔ بس ٹال مٹول کر دیتا۔ میں نے بھی تنگ آ کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ چند دنوں بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ اس نے کسی فلاحی ادارے میں شمولیت اختیار کر لی ہے اور اپنا بیشتر وقت ادارے کے کام میں صرف کرتا ہے۔

ہمارے درمیان ایک سرد جنگ جاری تھی۔ اس ادارے سے میں بالکل بھی متفق نہ تھا اور فوزان اس پر جان نچھاور کر رہا تھا۔ چند ماہ اور گزر گئے۔ میں نے ساڑھے تین ہزار کی رقم جمع کر کے ایک دن فوزان کے سامنے رکھ دی۔ ”یہ رقم تمہاری امانت تھی۔ اسے اٹھا لو اور اپنا کوئی اور بندوبست کر لو۔“ میں نے بڑے دکھی دل سے کرب انگیز لہجے میں کہا۔

اس نے اشک بار نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور گلوگیر لہجے میں کہنے لگا۔ ”بھائی جان! میں نے وہ رقم اپنے بڑے بھائی اور عزیز دوست کو دی تھی۔ بھائیوں میں تو حساب کتاب نہیں ہوتا۔“

”ہاں! لیکن اب میں تمہارا دوست نہیں رہا۔ تم نے اپنی دنیا الگ کر لی ہے تو پھر ہمیں جدا ہو ہی جانا چاہیے۔“ میں نے اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے کہا۔

وہ ہکا بکا ہو کر میری شکل دیکھنے لگا۔ چند لمحوں بعد وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔ ایک دن گزرا، دو دن گزرے اور پھر نہ جانے کتنے دن گزر گئے۔ میں اس کا انتظار ہی کرتا رہ گیا۔ میں ایسا تو نہیں چاہتا تھا مگر زبان سے نکلا ہوا تیر کبھی واپس نہیں آتا۔

ایک دن اس کا کوئی ساتھی مجھے ایک خط دے گیا۔ فوزان نے لکھا تھا۔ ”بھائی جان! آپ تو بڑے ہی ظالم نکلے۔ میں آپ سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا اور آج بھی میرا دل آپ کی چاہت میں بے قرار ہے۔ میرے دل میں آپ کی جو قدر و منزلت ہے، وہ کبھی کم نہ ہو گی۔ آپ نے مجھ پر جو احسان کیا، اس کا صلہ آپ کو ضرور ملے گا۔ یہاں نہیں تو وہاں سہی۔ بہرحال، اب میں جس ادارے سے وابستہ ہوں، اس کو چھوڑنا بھی میرے لیے ناممکن ہے۔ اپنی اپنی سوچ ہے۔ میرے خیال میں اس ادارے سے آپ کی نفرت بے جا ہے۔ آپ بھی اس میں ڈوب کر دیکھیے۔“

میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی لیکن صبر کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ فوزان کے بارے میں مجھے ادھر اُدھر سے اطلاعات ملتی رہیں۔ اب وہ رفتہ رفتہ اپنے ادارے کی ایک اہم اور سرگرم شخصیت بنتا جا رہا تھا۔ میں نے گولی مار والا کمرا چھوڑ دیا اور ناظم آباد میں ایک چھوٹا سا مکان خرید لیا۔ دو سال بعد میں نے شادی بھی کر لی۔

ایک رات کا ذکر ہے۔ میں اپنی بیوی کے ہمراہ ایک عزیز کی شادی میں شرکت کے بعد واپس آ رہا تھا کہ ہمارا گزر ایک ایسے علاقے سے ہوا جہاں غریبوں کی آبادی تھی اور ہر طرف جھگیاں ہی جھگیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ رات کے بارہ بج رہے تھے اور ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ اچانک میری نظر اندھیرے میں ایک طرف جا پڑی۔ وہاں ایک پک اپ کھڑی تھی جس میں کئی پیکٹ رکھے ہوئے تھے۔ وین کے پاس ایک لمبا تڑنگا باریش شخص کھڑا تھا۔ اس کے آس پاس غریب عورتوں اور بچوں کا ایک ہجوم موجود تھا۔ ہر عورت اپنی مجبوری اور ضرورت کی داستان بیان کر رہی تھی اور وہ شخص پیکٹ اٹھا اٹھا کر ان کے درمیان تقسیم کر رہا تھا۔ یہ شخص کوئی اور نہیں بلکہ فوزان تھا اور پھر میں نے بہت سوچ سمجھ کر اس ادارے میں شمولیت اختیار کر لی جہاں فوزان کام کر رہا تھا۔

میں بے حد خوش ہوں۔ اس اقدام نے میری زندگی کی قدریں بدل دیں اور میں نے جان لیا کہ دوسروں کو سکھ دینے میں جو خوشی ملتی ہے، وہ کہیں اور نہیں مل سکتی۔ اب فوزان بھی میری زندگی میں دوبارہ آ چکا ہے اور ہم دونوں مل جل کر انسانیت کی خدمت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں اس جہاں میں
ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا

✦✦

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

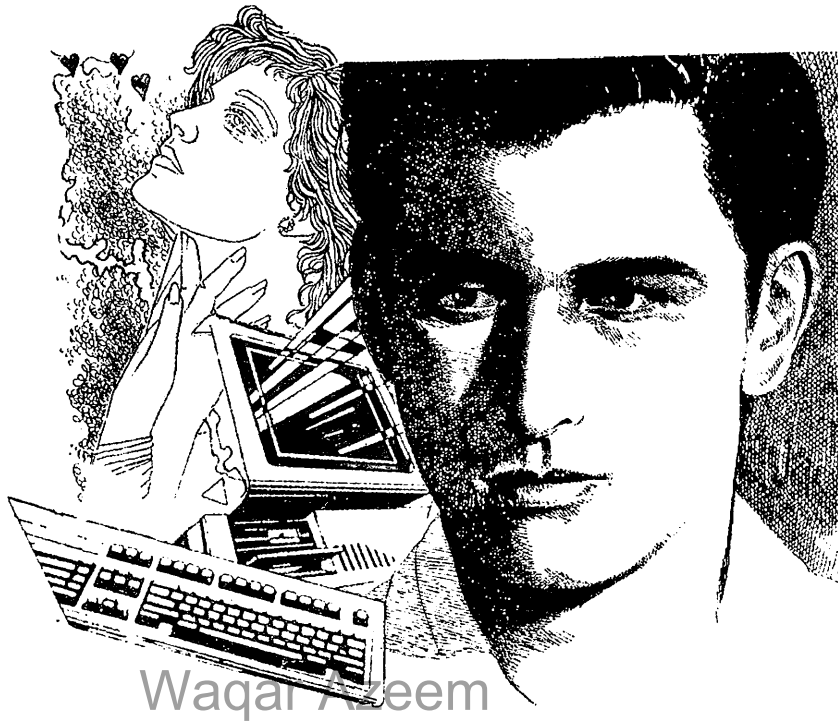

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

انوکھا بیمار

محترم ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم!

ارسال کردہ سچ بیانی میرے ایک دوست کی ہے۔ میں نے اس دوست کا نام اور مقام بدل دیا ہے کیونکہ وہ ایک نامور آرٹسٹ ہے لوگ اسے پہچانتے ہیں اور وہ زندگی کا سفر مکمل کرکے منوں مٹی تلے جاسویا ہے۔ کہیں وہ بدنام نہ ہوجائے اسی خیال سے نام بدل دیا ہے۔

فیصل

(لاہور)

وہ بہت عجیب آدمی تھا۔

عجیب تو میں کہہ رہا ہوں لیکن وہ کچھ مختلف ضرور تھا۔ میں ایک لڑکی کو دیکھنے میں محو تھا کہ کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے چونکا دیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک مہذب نوجوان تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر تیس بتیس سے زیادہ نہیں تھی۔ بہت سلیقے کا لباس... اور ہونٹوں پر ایک دوستانہ مسکراہٹ۔

اس کے انداز نے مجھے چونکا دیا تھا کیونکہ میں جس لڑکی کو دیکھ رہا تھا وہ بہت اچھی لڑکی تھی۔ میں اس کو دیکھنے میں اتنا محو ہو گیا تھا کہ آس پاس کی خبر ہی نہیں رہی تھی۔ صرف میں ہی نہیں بلکہ اسٹاپ پر کھڑے دوسرے بھی اس کی طرف اسی طرح دیکھ رہے تھے... اور وہ سب سے بے خبر اپنی بس کے انتظار میں کھڑی تھی۔

''جی فرمائیں۔'' میں نے جھلا کر پوچھا۔ مجھے وہ اجنبی کبھی اچھے نہیں لگتے جو خوامخواہ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور وہ بھی شانے پر ہاتھ رکھ کر۔

''مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔'' اس نے کہا۔

''معاف کیجیے گا۔ یہ ہے تو غیر مہذب سی بات لیکن اس وقت یہ بات بہت مناسب ہے۔''

''بھائی اگر آپ کسی چندے وغیرہ کے چکر میں ہیں تو وہ میں نہیں دے سکوں گا۔''

''میں آپ سے کچھ لینے نہیں بلکہ کچھ دینے آیا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''آپ مجھے بس دو منٹ دیں۔ وہ سامنے والی بینچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ کی بس آئے تو چلے جائیے گا۔'' اس نے بینچ کی طرف اشارہ کیا۔

اتنی دیر میں اس لڑکی کی بس آ گئی اور وہ اس میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔ بہت کوفت ہوئی تھی اس بے وقوف آدمی نے میرا وقت برباد کروا دیا تھا۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ میں اس کی باتیں سن لوں۔ میں اس کے ساتھ بینچ تک آ گیا۔

''جی فرمائیں۔'' میں نے بیٹھنے کے بعد پوچھا۔

''کیا وہ لڑکی آپ کو اتنی ہی پسند آئی تھی کہ اس میں کھو کر رہ گئے تھے؟'' اس نے سوال کیا۔

میں ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ''مسٹر آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔ کسی کے معاملات میں دخل دینے کا آپ کو کوئی حق نہیں ہے۔''

''اوہو۔ ناراض ہو گئے وہ مسکرا دیا۔'' ایک بات بتا دوں۔ جو معاملہ اس قسم کا ہوتا ہے نا۔ وہ انفرادی نہیں اجتماعی ہوتا ہے'' اس نے کہا۔ ''آپ اس لڑکی کو دیکھ رہے تھے اور اس وقت ہماری پوری تہذیب کی بنیادیں لرز رہی تھیں۔''

اب میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بات سن کر احساس ہوا کہ وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے۔ اس کی اس بات میں گہرائی تھی۔

''میں اس قسم کے جذباتی حادثے سے گزر چکا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اسی لیے بقول شاعر، جب پیار میں دو دل ملتے ہیں تو میں سوچتا ہوں کہ ان کا بھی یہی انجام نہ ہو۔ ان کا بھی جنوں ناکام نہ ہو۔''

یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ شعری ذوق بھی رکھتا ہے۔ اسی لیے اس نے شعر کا حوالہ دیا تھا۔ وہ اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا۔ ''جناب، اس چکر میں بہت دکھ اٹھایا ہے میں نے.....''

لگتا ہے اب مجھے آپ سے دوستی کرنی پڑے گی،'' میں نے کہا، میرا نام فیصل ہے۔''

اور میں انور ہوں۔ اس نے کہا، ''انور کریم۔''

ہم نے مصافحہ کیا۔ پھر ہم ایک ہوٹل میں آ کر بیٹھ گئے۔ پہلی ملاقات ہی میں ہم نے ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان لیا تھا۔

وہ ایک مقامی فرم میں کام کرتا تھا۔ اس نے ادب میں ماسٹر کر رکھا تھا۔ بہت دنوں تک لیکچرر شپ کی کوشش کرتا رہا۔ جب نہیں ملی تو فرم میں جاب کر لی۔ وہ ایک مصور بھی تھا۔ اسکیچز بناتا تھا۔

اس کی رہائش بھی قریب کے علاقے میں تھی۔ اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس کے گھر والے لاہور میں تھے۔ وہ کراچی قسمت آزمائی کے لیے آیا ہوا تھا۔

اس کی پوری کہانی بعد میں پتا چلی تھی۔

آہستہ آہستہ۔ جب میرا اس سے اچھا خاصا دوستانہ ہو گیا تو اس نے بتایا تھا۔ میں اس کی کہانی اسی کی زبانی سنا رہا ہوں۔

''میں اپنی آنکھوں میں خواب لے کر کراچی آیا تھا۔ میں نے پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹر کیا ہے۔ شاعری اور ادب وغیرہ سے ہمیشہ سے دلچسپی رہی ہے۔ گھر والوں کا یہ کہنا تھا کہ میں پنجاب ہی میں کوشش کروں لیکن مجھے کراچی آنا تھا... اسی لیے کراچی آ گیا۔ یہاں کچھ رشتے دار بھی تھے۔ کچھ دنوں تک ان ہی کے یہاں رہا پھر جب جاب مل گئی تو میں نے اپنا کرائے کا فلیٹ لے لیا اور ان کا شکریہ ادا کر کے الگ ہو گیا۔''

وہ اس طرح سوچنے لگا جیسے گزرے واقعات کو یک جا کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر اس نے کہا۔ ''میں بس ہی کے ذریعے سفر کیا کرتا کہ ایک دن بس اسٹاپ پر ایک لڑکی دکھائی دے گئی۔ اس کو دیکھ کر میرے اندر کا شاعر اور ادیب جاگ اٹھا تھا ورنہ اب تک کی پوری زندگی میں ایسا کچھ ہوا

Waqar Azeem
Pakistanipoint

ہی نہیں تھا کہ میں کسی کو اپنے خوابوں اور خیالوں میں بسا سکتا۔ اس لڑکی نے اندر سے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔''

''وہ یقیناً خوبصورت ہی ہوگی۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں اس کے برعکس وہ ایک بدصورت لڑکی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''کیا؟''

''ہاں۔ ہے نا ایک عجیب سی بات۔ بدصورت سے مراد یہ ہے کہ وہ ہرگز ایسی نہیں تھی کہ کوئی اس کی طرف توجہ دیتا۔ بس اسٹاپ پر اور لوگ بھی کھڑے تھے لیکن سب کی توجہ ایک اور لڑکی کی طرف تھی جو بہت خوبصورت تھی۔ بہت اسٹائلش۔ سب اس کو دیکھ رہے تھے۔ اس کے اردگرد اس طرح چکر لگا رہے تھے جیسے طواف کر رہے ہوں۔ اور وہ خوبصورت لڑکی ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ جیسے اس نے اسٹاپ فتح کر لیا ہو۔ اس وقت میں نے اس بدصورت لڑکی کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جس قسم کی حسرت تھی وہ میں بتا نہیں سکتا۔ یہ ایک نیچرل سی بات ہے۔ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ وہ احساسِ کمتری کا شکار تھی۔ کوئی تو ہو جو اس کی طرف ایک نظر اٹھا کر دیکھ لے۔ کوئی تو ہو جو اس کو بھی سراہے لیکن کوئی نہیں تھا۔ سب اس خوبصورت لڑکی کی طرف متوجہ تھے۔ اس وقت میرے اندر کا انسان اس پر افسوس کرنے لگا۔ شاعر ہوں نا۔ اور ہم لوگ اسی طرح کے پاگل ہوتے ہیں لیکن میں اس سے یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ اے لڑکی میں تجھے دیکھ رہا ہوں۔ میں تیرے اندر کے انسان کے دکھ کو محسوس کر رہا ہوں۔ تو فکر مت کر۔ زندگی کے سفر میں تجھے کوئی نہ کوئی ہم سفر مل ہی جائے گا۔ اب یہ باتیں میں کس طرح کہہ سکتا تھا۔''

لہٰذا میں نے اس پر اپنی نگاہ مرکوز کر دی۔ اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا تھا پھر توجہ دوسری طرف کر لی۔

اس خوبصورت لڑکی کی بس آ گئی وہ چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد اسٹاپ جیسے ویران ہو کر رہ گیا تھا۔

اس خوبصورت لڑکی کے اردگرد منڈلانے والوں کو اپنی اپنی بس یاد آنے لگی۔ سب چلے گئے۔

کچھ دیر بعد ذرا سی دیر کے لیے اسٹاپ اکیلا رہ گیا تھا۔ صرف میں تھا اور وہ لڑکی تھی۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اس لڑکی کے بہت پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

اس وقت وہ لڑکی کچھ پریشان سی دکھائی دی۔ یا شاید وہ الجھن میں پڑ گئی تھی کہ میں نے اس میں ایسی کون سی بات دیکھ لی ہے کہ اس کو دیکھے جا رہا ہوں۔ اس لڑکی نے ایک دو بار میری طرف دیکھا پھر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

خدا جانے مجھے کیا جنون ہو گیا تھا کہ میں اس کے آس پاس ہی منڈلانے لگا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی میرے پاگل پن کو بھانپ کر دل ہی دل میں مسکرا رہی ہوگی۔ بہر حال اس کی بس آئی اور وہ چلی گئی لیکن میں یہ ٹھان چکا تھا کہ میں اس سے دوستی کر کے رہوں گا۔

''انور صاحب۔ اس جنون کی کوئی تو وجہ ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔ صرف ایک وجہ تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ خیال آ گیا تھا کہ یہ لڑکی اپنی صورت کی وجہ سے زندگی سے ہار ماننے لگی ہے۔ اور شدید قسم کی احساسِ کمتری کا شکار ہے۔ میں اس کو اس احساس سے نکالنا چاہتا تھا۔''

''برا نہ مانیں۔ کیا آپ نے اس کا ٹھیکا لے رکھا تھا؟''

''اب یہاں سے ایک نئی کہانی شروع ہوتی ہے دوست۔'' اس نے کہا۔ اس وقت وہ بہت افسردہ ہو رہا تھا۔ ''یہ کہانی میری بہن کی ہے سگی بہن کی۔ وہ بھی ایک عام شکل وصورت کی لڑکی تھی۔۔۔۔ اور جب اس کی شادی ہو گئی تو سسرال والوں کی باتیں برداشت نہیں کر سکی۔ فیصل صاحب میری بہن نے خودکشی کر لی تھی۔''

''کیا؟''

''جی ہاں۔ میری بہن نے خودکشی کر لی تھی۔ جس سے مجھے بہت پیار تھا۔ اس کا دکھ میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے صرف اس لیے اپنی جان دے دی کہ سسرال والوں نے اس کا جینا حرام کر دیا تھا۔ خدایا کیا یہ دنیا صرف اچھی صورت والوں کے لیے بنائی گئی ہے؟ کیا کم صورت والوں کو جینے کا کوئی حق نہیں ہے؟ کیا انہیں مر جانا چاہیے؟ اگر ایسا ہی ہے تو پھر انہیں پیدا کیوں کیا جاتا ہے؟'' اس کی آواز میں بے پناہ دکھ تھا۔ ''اس کے بعد میں نے اپنے طور پر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ایسی صورت کی لڑکیوں کو اس احساس سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔ آپ اس کو میرا پاگل پن بھی کہہ سکتے ہیں۔ پوری دنیا میں نہ جانے کتنی ہوں گی۔ میں کس کس کو بچاتا رہوں گا لیکن ممکن حد تک تو کوشش

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کر ہی سکتا تھا نا۔''

''ہاں۔ یہ تو ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ پھر اس سے ملاقات ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں..... پھر اس سے دوستی ہوگئی۔'' اس نے بتایا ''میں نے یہ دیکھ لیا کہ وہ روزانہ اسی اسٹاپ پر آیا کرتی ہے... اور شاید کسی دفتر میں کام کرتی ہے۔ کہتے ہیں نا کہ مسلسل پانی گرتا رہے تو پتھر میں بھی سوراخ ہو جاتا ہے۔ وہ لڑکی بھی آہستہ آہستہ میرے قریب آتی چلی گئی۔ پہلے تو اس کا خیال تھا کہ میں اس سے مذاق کر رہا ہوں۔ بھلا ایسوں سے کون دوستی کرنا پسند کرے گا لیکن جب اسے میرے خلوص کا یقین آیا تو بہت متاثر ہوگئی۔ مختصر یہ کہ ہم نے دوستی کر لی۔ فیصل صاحب۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ میں نے اس کے اندر کی عورت کو دیکھا ہے۔ وہ بہت صاف ستھری اور پاکیزہ ہے۔ بہت حوصلہ ہے اس کا۔ اس ماحول میں زندہ ہے۔ جب ہر نگاہ مذاق اڑانے والی ہوتی ہے۔''

''مجھے یہ سب سن کر بہت اچھا لگا۔'' میں نے کہا۔ ''اب ایک بات یہ بتاؤ کہ تم نے مجھے اس لڑکی کو دیکھنے سے کیوں منع کیا تھا؟''

''صرف اس لیے کہ یہ بتا سکوں کہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ صورت اچھی ہو تو دل بھی اچھا ہو۔ اس کے علاوہ تم مجھے ایک مہذب انسان معلوم ہوئے۔ میں نے سوچا کہ تمہیں یہ احساس دلا دوں کہ اگر زندگی کا ساتھی کسی کو بنانا ہی ہے تو کسی ایسی کو تلاش کرو۔ جس کو کوئی لفٹ نہ دیتا ہو۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔''

''میرے دوست میں کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''سکون مل جائے گا تمہیں۔'' اس نے کہا۔

انور کریم سے میں بہت متاثر ہوا تھا۔ اگر وہ جیسا کہہ رہا تھا سچ تھا تو اس نے ایک بڑا کام کیا تھا۔

وہ ایک بڑا آدمی تھا۔

''یہ بتاؤ۔ اس لڑکی کے سلسلے میں اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کو اپنانے کی کوشش کروں گا۔'' اس نے کہا ''اگر یہ نہ بھی ہو سکا تو بھی کم از کم اتنا تو ضرور کر جاؤں گا کہ وہ زمانے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔''

اس کے بعد کئی دنوں تک اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اتنا ضرور ہوا تھا کہ فون پر اس سے بات ہوتی رہتی تھی۔

ایک شام وہ مجھے ایک مارکیٹ میں مل گیا۔

وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی... اور یہ وہی لڑکی ہو سکتی تھی۔ انتہائی کم صورت کی۔ جبکہ وہ خود بہت ہینڈسم نوجوان تھا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اور ان دونوں کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے دونوں شاید ایک دوسرے ہی کے لیے بنے ہوں۔ بے ساختہ میرے دل سے انور کے لیے دعا نکلی تھی۔

میں ان دونوں کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا لیکن اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس نے مجھے آواز دی..... ارے فیصل بھائی..... میں رک گیا۔

وہ اس لڑکی کو لے کر میرے پاس آ گیا۔ ''فیصل بھائی۔ یہ روزینہ ہیں۔'' اس نے تعارف کروایا۔ ''میں نے انہی کا ذکر کیا تھا۔''

''خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' میں نے رسمی سا جملہ ادا کیا۔

''چلو یار کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' انور نے کہا۔ ''اچھا ہوا تم مل گئے۔ اتفاق سے آج روزینہ کی برتھ ڈے ہے۔ میں ان کو ٹریٹ دینے جا رہا تھا اب تم مل گئے ہو اور بھی اچھا رہے گا۔''

میں نے اس لڑکی کو مبارکباد دی۔ وہ بے چاری واقعی احساسِ کمتری کا شکار تھی۔ انور اس کے ساتھ بہت اچھا کر رہا تھا۔ ایسی قربانی ہر ایک کے بس کا روگ نہیں ہوتی۔

ہم ایک ہوٹل میں آ کر بیٹھ گئے۔

ہمارے درمیان باتیں ہوتی رہیں۔ پتا چلا کہ وہ لڑکی اچھی خاصی ذہین لڑکی تھی۔ اس کی باتوں نے اس کی بد صورتی کو حسن میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس کا شاعری کا ذوق اچھا تھا۔ اس کی باتوں میں مزاح کی بھی چاشنی تھی۔ یعنی وہ ہر لحاظ سے ایک اچھی لڑکی تھی۔ انور کا فیصلہ اس کے بارے میں بہت اچھا تھا۔

میں ان دونوں کو باتوں میں مصروف چھوڑ کر ان سے اجازت لے کر واپس آ گیا۔ ایک اطمینان ہوا تھا کہ اس لڑکی کو انور جیسا دردمند دل رکھنے والا ساتھی ملنے والا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ بہت دنوں تک انور سے ملاقات نہیں ہوئی، میں خود کچھ مصروف رہا تھا۔ انور کا فون بھی نہیں آیا تھا۔ بہت دنوں کے بعد انور کا فون آیا۔ اس نے مجھے ایک عجیب اطلاع دی۔ ''فیصل آج شام کو آرٹس کونسل میں آ سکتے ہو؟''

Waqar Azeem
Pakistanipoint

''خیریت؟ وہاں کیوں بلا رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ہنس پڑا۔ ''یار میری بنائی ہوئی تصویروں کی نمائش ہو رہی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''تمہاری بنائی ہوئی تصویریں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں یار۔ میں نے تم کو بتایا تھا نا کہ میں آرٹسٹ بھی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں پینٹنگ بھی کرتا ہوں لیکن پچھلے دنوں بہت عرصے کے بعد میں نے پینٹنگ کی ہے۔''

''تم نے تو مجھے حیران کر دیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''بتایا تو تھا لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ تمہاری تصویروں کی نمائش بھی ہو سکتی ہے۔''

''تم آ تو جانا۔ پھر تم کو سب بتاؤں گا۔'' اس نے کہا۔

''ضرور آؤں گا۔'' میں نے وعدہ کر لیا۔

میں شام کو آرٹس کونسل پہنچ گیا۔ لیکن اندر جانے سے پہلے ہی گیٹ پر روزینہ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ گیٹ پر کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ میرے پاس آ گئی۔ ''میں کب سے سوچ رہی تھی کہ اس نمائش میں آپ کو تو ضرور آنا چاہیے۔'' اس نے کہا۔

''ظاہر ہے میرے دوست نے تصویریں بنائی ہیں، ان کو دیکھنا بہت ضروری تھا۔'' میں ہنس کر بولا۔

''ہاں ضرور جائیں۔ میرا تماشا دیکھنے کے لیے۔'' اس نے ایک عجیب سے انداز سے کہا۔

''میں نہیں سمجھا۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''آپ پہلے جا کر دیکھیں تو سہی۔''

''اور آپ؟''

''میں یہیں کھڑی ہوں۔'' اس نے کہا۔

میں اس کو وہیں چھوڑ کر اندر آ گیا۔ نمائش کا اہتمام ہال میں کیا گیا تھا۔ بڑے سلیقے سے تصویریں ڈسپلے کی گئی تھیں۔ اس دن اندازہ ہوا کہ انور بہت اچھا آرٹسٹ ہے۔ اس نے ایک ہی چہرے کو پینٹ کیا تھا۔ کئی روپ میں اور وہ چہرہ روزینہ کا تھا۔ اس نے روزینہ کی بدصورتی کو نشانہ بنایا تھا۔

میرے خدا۔ یہ کتنی بے رحم مصوری تھی۔

کئی روپ تھے۔ روزینہ آئینے کے سامنے۔ روزینہ سلائی کرتے ہوئے، روزینہ ٹی وی لاؤنج میں۔ دوستوں کے ساتھ ساحل پر۔ پارک میں۔ اس نے کمال کر دیا تھا۔ لیکن یہ کیسا کمال تھا۔ اس نے ایک لڑکی کی شکل وصورت کا مذاق اڑایا تھا۔

وہ بے چاری اسی لیے کہہ رہی تھی کہ جائیں میرا تماشا دیکھ آئیں، انور نے اسے تماشا ہی بنا دیا تھا۔ اگر یہ مذاق تھا تو کتنا بھیانک مذاق تھا کسی لڑکی کے ساتھ۔ ایسا مذاق شاید ہی کسی نے کیا ہو۔

میں نے دیکھا، انور ایک طرف کچھ لوگوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ میں اس کے پاس پہنچ گیا۔

اس نے شاید میرے چہرے سے اندازہ کر لیا تھا کہ میں اس سے ناراض ہوں۔ اسی لیے اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''کیوں بھائی۔ کیسی لگی تصویریں؟'' اس نے پوچھا۔

''بہت ہی گھٹیا۔'' میں نے کہا۔ ''تم مصور نہیں قصاب ہو۔ تم نے اس بے چاری کی بدصورتی کا مذاق اڑایا ہے۔ صرف اس لیے کہ تم ایک آرٹسٹ کے طور پر مشہور ہو جاؤ۔''

''فیصلہ کرنا میرا کام نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تم اس نمائش کے بعد مجھ سے ملو۔ میں تمہیں کچھ سمجھانا چاہتا ہوں۔''

''مجھے کچھ نہیں سمجھنا۔ تم نے کسی کا دل توڑ کر اچھا نہیں کیا۔ خدا کرے تمہاری یہ بات پسند نہیں آئے گی۔''

وہ مجھے آواز دیتا رہا لیکن میں ہال سے باہر آ گیا۔

روزینہ گیٹ ہی پر کھڑی تھی۔

''دیکھ لیا میرا تماشا۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔ دیکھ لیا۔ اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کہوں؟''

''آپ کیا کہیں گے؟'' اس کے لہجے میں بے پناہ اداسی تھی۔ ''میں نہیں جانتی تھی کہ وہ شخص میرے پاس اس لیے آیا ہے کہ میرا اچھی طرح جائزہ لے سکے۔ تاکہ میرا مذاق اڑانے میں آسانی ہو۔''

''تم جو بھی کہو۔ وہ ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم کچھ دیر میرے ساتھ بیٹھ سکتی ہو؟''

''کیا فائدہ ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔ ''آپ کے پاس کوئی اور ہنر ہوگا۔ وہ آپ مجھ پر آزمائیں گے۔''

''ہر آدمی اتنا گھٹیا نہیں ہوتا روزینہ۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تم مجھے کچھ وقت دے سکو تو بہتر ہوگا۔''

''چلیں.....'' اس نے کچھ سوچ کر گردن ہلا دی۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

آرٹس کونسل کے پاس ہی ایک ہوٹل تھا۔ میں اس کو وہیں لے آیا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ میں اس کو حوصلہ دوں۔ اس کو اس وقت تسلی کی ضرورت تھی۔ انور کی اس حرکت نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

ہم ایک ہوٹل میں آکر بیٹھ گئے۔ وہ انکار کرتی رہی۔ لیکن میں نے اس کے لیے کچھ چیزیں منگوالی تھیں۔

''فیصل صاحب، آخر ایسا کیوں ہوا ہے میرے ساتھ۔ میں نے تو اس آدمی پر بھروسا کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ایک مصور ہے اور میری ایک تصویر بنانا چاہتا ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں تھا... اسی لیے میں اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے ایک تصویر بنائی اور اسی کو بنیاد بنا کر میری درجنوں تصویریں بنا لیں... اور ہر تصویر میں مجھے اتنا بد صورت ظاہر کیا ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔ آخر کیوں؟ میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ کیا خدا نے مجھے اس لیے بنایا تھا کہ میرا اس طرح مذاق اڑایا جائے۔ کیا میرا اس دنیا کی خوبصورتی پر کوئی حق نہیں ہے۔ کیا میں اسی لیے ہوں؟'' وہ رونے لگی تھی۔

میں اس طرح ذہنی الجھن کا شکار تھا کہ اس کو اس وقت دلاسہ بھی نہیں دے سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ چلی گئی۔ میں نے یہ طے کرلیا کہ میں اب انور جیسے آدمی سے کبھی نہیں ملوں گا۔

لیکن ہوا یہ کہ ایک دن خود اس کا فون آگیا۔ میں نے کال ریسیو کرلی تھی۔

''میرے دوست۔ تم یقیناً مجھ سے خفا ہوگے؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا فائدہ تم جیسے آدمی سے خفا ہونے کا؟'' میں نے کہا۔ ''تم تو اپنی فنکاری دکھاتے رہو۔ تمہیں کسی کے احساسات کا کیا پتا؟''

''اوہ.....'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''چلو تم مجھ سے مل تو لو۔ تم کو سب بتادوں گا۔'' اس نے کہا۔

ایسے آدمی سے ملنے کو دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن اس نے بہت ضد کی تو میں اس سے ملنے کو تیار ہوگیا۔ ہماری ملاقات ایک ہوٹل میں ہوئی تھی۔

''تم ناراض تو ہوگے کہ میں کیسا آدمی ہوں کہ میں نے ایک ایسی لڑکی کی توہین کی جس نے مجھ پر بھروسا کیا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''دیکھو۔ انور صاحب۔ یہ تمہارا آپس کا معاملہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم اس کی توہین کرو یا نہ کرو... میں کون ہوتا ہوں، لیکن مجھے دکھ ضرور ہوا تھا۔''

''اب اصل بات سن لو۔ روزینہ بہت اچھی لڑکی ہے لیکن وہ اچھی لڑکی میرا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھی۔ میری بات سنتے رہو۔ میں ایک باکمال آرٹسٹ ہوں۔ اس کا اندازہ تمہیں ہو گیا ہوگا لیکن اس سے پہلے کبھی میری پذیرائی نہیں ہوسکی تھی... کیونکہ میں نے خوبصورتی کو پینٹ کیا تھا... اور یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ لیونارڈو داونچی سے لے کر گگول تک خوبصورتی کو پینٹ کرتے چلے آئے ہیں۔ بات تو جب ہے کہ کوئی نیا راستہ نکالا جائے۔ تو میں نے ایک دن فیصلہ کیا کہ میں بدصورتی کو پینٹ کروں گا... اور اسے امر کردوں گا۔''

''اور تم نے اس بے چاری کو پینٹ کرکے امر کردیا۔'' میں طنز سے بولا۔

''ہاں۔ میں نے اسے امر کردیا ہے... ورنہ کون اس کو جانتا تھا۔ اب تو میں اس کو پریس کانفرنس میں بھی سامنے لانے والا ہوں۔''

''تم ایسا نہیں کرو گے۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''یہ تمہاری کمینگی ہوگی۔''

''ایک بات تو بتاؤ کہ تم اس کی اتنی حمایت کیوں کررہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''اس لیے کہ وہ ایک انسان ہے... اور میں انسان کی توہین برداشت نہیں کرسکتا۔''

''اچھا اچھا۔ ناراض نہ ہو۔ میں ایسا نہیں کروں گا لیکن جو ہو چکا۔ وہ تو ہوگیا نا۔ اب اگر اس سے تمہاری ملاقات ہو تو میرا پیغام پہنچا دینا۔ وہ میرا فون ریسیو نہیں کررہی۔ بہت ناراض معلوم ہوتی ہے۔''

وہ واقعی ایک عجیب آدمی تھا۔ وہ اپنے اس عمل کو بہت سرسری سا لے رہا تھا۔ جیسے کوئی خاص بات ہی نہ ہو جبکہ میں جانتا تھا کہ اس بے چاری کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔

اور کئی دن گزر گئے۔ میں نے اس سے ملنے یا اس کو فون کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ایسے کمینے انسان سے کیا رابطہ رکھا جاتا۔ ایک دن اس نے مجھے فون کیا۔ اس کی آواز بہت کمزور محسوس ہورہی تھی۔ وہ مجھے اپنے فلیٹ بلا رہا تھا۔

''میرے پاس فرصت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''پلیز کچھ دیر کے لیے آجاؤ۔ میں بہت بیمار ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں تمہیں کچھ دکھانے والا بھی ہوں۔''

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

''لیکن میں نے تمہارا فلیٹ نہیں دیکھا۔'' میں نے بہانہ کرنا چاہا۔

''یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ میں تمہیں ایڈریس سمجھا دیتا ہوں۔''

پھر اس نے اپنا پتا سمجھا دیا۔ اتنے دنوں کی دوستی کے باوجود میں پہلی بار اس کے فلیٹ میں گیا تھا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ تو واقعی ایک بڑا آرٹسٹ ہے۔ وہ بیمار تھا۔ نقاہت اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔ جیسے برسوں بستر پر پڑا رہا ہو۔

اس نے مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا تھا۔ بلکہ میرا ہاتھ تھام کر اپنے کمرے میں ہی لے گیا تھا۔ اس کے کمرے میں بھی اس کی بنائی ہوئی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ہر تصویر منفرد تھی لیکن جس تصویر نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ وہ ایک معصوم سی خوبصورت لڑکی کی تصویر تھی۔ وہ لڑکی فرش پر گری ہوئی تھی۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اذیت اور تکلیف اس کے چہرے پر منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا۔ جیسے وہ رحم کی درخواست کر رہی ہو۔ میں اس تصویر میں محو ہو کر رہ گیا تھا۔

''تم بیٹھو۔'' اس نے کہا۔ ''میں تمہارے لیے چائے لے کر آتا ہوں، میں نے بھی نہیں پی ہے۔'' وہ کمرے سے چلا گیا۔ میں اس لڑکی کی تصویر دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس کی آواز نے چونکا دیا۔

میرے دوست' وہ چائے لے آیا تھا۔ ''کیسی لگی تصویر؟'' اس نے پوچھا۔

''لاجواب۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''لیکن اس تصویر کو دیکھ کر دکھ بھی ہو رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ بے چاری بہت تکلیف میں ہو۔''

''ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو... اس کا سر ذرا زیادہ پھٹ گیا تھا۔'' اس نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''فیصل۔ یہ کوئی خیالی تصویر نہیں ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''نیلما نام ہے اس لڑکی کا۔ اب خدا جانے کہاں ہو گی۔ سنا ہے اس کی شادی بھی ہو گئی ہے۔'' اس کی آواز کھوئی ہوئی تھی۔

''اور تمہاری یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔'' میں نے کہا۔

''فیصل یہ میری پہلی محبت تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''تم آرام سے بیٹھ جاؤ پھر میں تم کو اپنے بارے میں بتاتا ہوں، پلیز..... میری بات سن لو۔ میں بہت کرب میں ہوں۔''

میں اس کے کہنے پر اسی کمرے میں بیٹھ گیا۔ اس تصویر سے نظر نہیں ہٹ رہی تھی... پھر اس نے اپنے بارے میں بتانا شروع کیا... اور اس دن پتا چلا کہ انسان کے کتنے روپ ہوا کرتے ہیں۔ وہ کس کس بھید میں ہوتا ہے۔

''میں ایک عام سے گھرانے میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی سے میں دوسروں سے مختلف تھا۔ لڑکے کھیل کود میں حصہ لیتے جبکہ میں رنگوں سے کھیلتا رہتا۔ تصویریں بناتا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ کتابیں پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ نویں جماعت میں تھا کہ شاعری کرنے لگا تھا۔ میرے ذہن میں یہ بات سما گئی تھی کہ مجھے اوروں سے الگ ہونا ہے۔ اپنے خاندان سے الگ۔ اپنے پورے محلے سے الگ۔ اپنے شہر سے الگ۔ مجھے بہت مشہور ہونا ہے۔ اسی دھن میں لگا رہتا تھا۔

اسی دوران نیلما میری زندگی میں داخل ہوئی۔ وہ پگلی مجھ سے بہت متاثر تھی۔ بہت محبت کرنے لگی تھی۔ اسے میری ذہانت کا اندازہ تھا۔ وہ کہا کرتی کہ میں ایک دن بہت بڑا آدمی بنوں گا۔ اس وقت تک میں نے اسکیچز شروع نہیں کیے تھے۔ میں نے پہلا اسکیچ اسی کا بنایا تھا۔ وہ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ اس دوران ادب سے بھی میرا واسطہ رہا۔ شاعری بھی چلتی رہی... اور میں کالج میں پہنچ گیا۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ ابھی تو مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ میں نے اپنا سفر شروع کہاں کیا ہے پھر نہ جانے کہاں سے یہ خیال ذہن میں آیا کہ کیوں نہ مصوری میں کوئی ایسا کام کیا جائے جو دنیا کو حیران کر کے رکھ دے۔ اور یہیں سے وہ کہانی شروع ہوتی ہے جس کو تم کوئی بھی نام دے سکتے ہو۔ میں نے اذیت اور کرب کو پینٹ کرنا شروع کر دیا۔ میں نے پہلا تجربہ ایک لڑکے پر کیا تھا۔ وہ میرے ہی محلے کا تھا۔ غریب گھر کا بچہ۔ میں نے اس کو تحفے دینے شروع کر دیئے۔ کبھی چاکلیٹ دلا دیا۔ کبھی اس کے لیے کوئی کھلونا خرید دیا۔ اس طرح وہ مجھ سے مانوس ہو گیا۔ ایک دن جب گھر میں کوئی نہیں تھا... تو میں اسے اپنے گھر لے آیا۔ میں نے سامان تیار رکھا تھا۔ اس کو میں نے اس بات پر راضی کر لیا کہ میں اس پر تھوڑی سی سختی کروں گا۔ اس کے بدلے سو روپے دوں گا۔ اس کے لیے سو روپے بہت تھے۔ وہ بیچارہ مان گیا۔ میں

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اس کو گھر لے آیا... اور اس پر تشدد کرنا شروع کر دیا۔''

''کمینے انسان۔ تم نے اس بچے پر جنسی تشدد کیا ہوگا۔'' میں غصے سے بولا۔

''نہیں فیصل بھائی۔ میں ایسا نہیں ہوں۔ میں نے اس کو صرف مارا تھا... اور جب اس نے رونا شروع کیا تو اس کی تصویریں اتاریں... تاکہ بعد میں پینٹ کر سکوں۔ اس کا آنسوؤں والا چہرہ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ وہ رو رہا تھا... اور میں اس کی تصویریں اتار رہا تھا، پھر میں نے اس کو دلاسہ دیا۔ چپ کروایا۔ سو روپوں کے علاوہ اور روپے دیئے کہ وہ کسی کو بتائے نہیں۔ اس کے بعد اس کو جانے کی اجازت دے دی۔ میرے دوست۔ میں نے ان تصویروں کو جب شہر لا کر جاننے والوں کو دکھایا تو سب نے بہت تعریف کی۔ سب کا یہ کہنا کہ میں نے مصوری میں نئی راہ تلاش کی ہے۔ میں اذیت کو انتہائی خوبی سے پینٹ کر سکتا ہوں..... اور اس کے بعد میرا یہ وتیرہ ہو گیا۔''

''اور تم نے یہ کمینہ پن اس لڑکی نیلما کے ساتھ بھی کیا۔''

''ہاں۔'' وہ جیسے کچھ کھو سا گیا تھا۔ اس کی آواز میں لذت کی کیفیت تھی۔ جیسے ابھی تک یہ سوچ کر لطف لے رہا ہو۔ ''ہاں۔ میں نے اسے بلا کر اس کا سر پھاڑ دیا۔ اور جب وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی تو اس کی تصویریں اتاریں... اور بعد میں ان کو پینٹ کر لیا..... پھر یہ ہوا کہ وہ لڑکی مجھ سے ہمیشہ کے لیے ناراض ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی کو بتا دے گی۔ کم از کم گھر والوں کو پھر وہ مجھے پولیس کے حوالے کر دیں گے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ اب خدا جانے کہاں ہے۔''

''تم ایک کمینے انسان ثابت ہوئے ہو۔'' میں نے کہا۔

لیکن وہ تو جیسے ایک سرشاری کی کیفیت میں تھا۔ وہ بولے جا رہا تھا۔ ''تم دیکھ لینا ایک دن میں دنیا کا سب سے انوکھا آرٹسٹ کہلاؤں گا۔ سب سے انوکھا۔''

''لعنت ہو تم پر۔ میں نے کہا، میں جا رہا ہوں۔''

''کہاں جا رہے ہو فیصل بھائی؟'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''ابھی تو میں نے پوری کہانی نہیں سنائی۔''

''اب سننے کو کیا رہ گیا ہے۔''

''فیصل بھائی۔ تم اس بات پر حیران ہو گے کہ میں نے روزینہ پر تشدد کیوں نہیں کیا۔ اس کا کرب پینٹ کیوں نہیں کیا۔ اس کو اذیت کیوں نہیں دی۔ تو ایسا نہیں ہے۔ میں نے اس کی بدصورتی کو پینٹ کر کے اس کو اذیت دے دی ہے۔ اگر تمہاری اس سے ملاقات ہو تو اس کے چہرے کو دیکھنا۔ کتنا کرب ہوگا اس کے چہرے پر۔''

''لعنت ہو تم پر۔ تم انسان نہیں درندے ہو۔'' میں نے کہا۔ مجھے اس وقت روزینہ کا درد اور کرب میں ڈوبا ہوا چہرہ یاد آ گیا تھا۔

''کچھ اور سن لو'' اس نے کہا ''دیکھو۔ میں انسانی چہرے کی اذیت اور کرب کا مصور ہوں۔ میں نے اس سلسلے میں بچے کو پینٹ کیا ہے۔ لڑکی کو پینٹ کیا ہے لیکن ابھی تک کسی مرد کو پینٹ کرنے کا موقع نہیں ملا ہے۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''ہاں فیصل بھائی۔ میں اب کسی مرد کو پینٹ کروں گا۔'' اس نے کہا۔ ''اور وہ مرد تم ہو گے۔''

''کیا پاگل ہو گئے ہو؟'' میں بھڑک اٹھا۔ ''تم نے مجھے کیا کمزور سمجھ رکھا ہے کہ تم اپنی مرضی سے مجھ پر تشدد کر لو گے۔''

''پلیز میری بات مان لو۔'' اس نے کہا۔ ''تم یقین کرو کہ میں تم پر زیادہ سختی نہیں کروں گا۔'' اس نے کہا۔ ''بس ہلکا سا تشدد، اور جہاں تک تمہاری مرضی کا سوال ہے تو وہ ہو چکا ہے۔ تم نے ابھی جو چائے پی ہے۔ میں نے اس میں نیند کی گولیاں ملا دی ہیں۔ کچھ دیر میں تم بے خود ہو جاؤ گے پھر میں تم پر تشدد شروع کروں گا۔ پلیز میرے دوست۔ میرا تجربہ مکمل ہونے دو۔ تمہارا احسان ہوگا۔''

عجیب پاگل آدمی تھا۔ اس وقت احساس ہوا کہ واقعی میرا سر چکرانا شروع ہو گیا تھا۔ یعنی اس نے غلط بیانی نہیں کی تھی۔ میں نے اٹھ کر جانا چاہا تو اس نے مجھے پکڑ لیا تھا۔ اگر اس وقت میں کمزوری دکھلاتا تو نہ جانے وہ پاگل آدمی میرے ساتھ کیا کرتا۔ میں نے اس کو پوری قوت سے ایک طرف جھٹک دیا۔ وہ ایک طرف جا گرا۔ اور میں اس کے فلیٹ سے نکل گیا۔ یہ اور بات ہے کہ میں زیادہ دور تک نہیں جا سکا تھا۔ مجھے چکر آنے لگا تھا۔ بہت شدید قسم کا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ میں کس طرح رکشا لے کر گھر آیا تھا۔

میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ میں اس خطرناک انسان سے پھر نہیں ملوں گا۔ وہ جنونی تھا۔ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ بہت

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

دن گزر گئے۔ نہ تو اس نے کوئی رابطہ کیا اور نہ ہی میں نے کوئی کوشش کی لیکن اس کہانی کا انجام بہت مختلف سامنے آیا تھا۔

ایک دن میں اپنے فلیٹ ہی میں تھا کہ گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو انور دروازے پر کھڑا تھا، اور وہ اکیلا نہیں تھا... بلکہ روزینہ بھی اس کے ساتھ تھی۔

میں ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

''کیا بات ہے۔ اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو؟'' انور نے پوچھا۔

''کیوں کیا مجھے حیران نہیں ہونا چاہیے؟'' میں نے پوچھا۔

''تم یہ سن کر شاید حیرت سے بیہوش ہی ہو جاؤ کہ ہم دونوں اگلے مہینے شادی کر رہے ہیں۔'' انور نے بتایا۔

''کیا؟'' میں یہ سن کر واقعی بے ہوش ہی ہو گیا تھا۔

''فیصل بھائی۔ میں بتاتی ہوں کہ یہ سب کیا ہے۔'' روزینہ نے کہا۔

ہم اندر کر بیٹھ گئے۔ میری حیرت ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ دونوں بہت خوش اور مطمئن دکھائی دے رہے تھے۔

''فیصل۔ میں روزینہ کا مشکور ہوں۔'' انور نے کہا ''اس نے مجھے نئی زندگی دی ہے... ورنہ میں تباہ ہو جاتا۔''

''لیکن یہ سب کیا ہے؟''

''فیصل بھائی۔'' روزینہ نے کہا۔ ''انور نے جس طرح میری شکل صورت کا مذاق اڑایا تھا، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں ہمیشہ کے لیے ان سے ناراض ہو جاتی۔ دوبارہ ان سے ملنے کا تصور بھی نہیں کرتی لیکن ہوا یہ کہ ایک دن مجھے ایک روشنی مل گئی اور اس روشنی نے مجھے راہ دکھا دی۔ وہ روشنی یہ تھی کہ مجھے ایک سیمینار میں شرکت کا موقع ملا تھا۔ وہ سیمینار پاکستان سائیکولوجیکل ایسوسی ایشن کی طرف سے تھا۔ اس کا موضوع اذیت پسندی تھا۔ اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ کچھ لوگوں کے مزاج میں اذیت پسندی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں مشہور لوگوں کی مثالیں دی گئیں... اور کہا گیا کہ یہ ایک مرض ہے اور اس کو sadism کہتے ہیں۔ ویسے تو یہ جنسی کج روی ہے۔ ایسے لوگ دوسروں پر تشدد کر کے لطف حاصل کرتے ہیں... اور جب کوئی اور نہ ملے تو اپنے آپ پر ظلم کرنے لگتے ہیں۔''

''یہ دیکھو'' انور نے اپنی آستین الٹ دی۔ اس کے بازو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ جگہ جگہ بلیڈ کے نشانات تھے۔ ''دیکھ رہے ہو۔ یہ میں نے کئی بار خود کو اس طرح زخمی کیا ہے صرف لذت حاصل کرنے کے لیے۔''

''اور یہ مریض بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک صرف تشدد کرتے ہیں... اور دوسرے جنسی برائی بھی کرتے ہیں۔ یہ سب مجھے اس سیمینار میں معلوم ہوا تھا۔ تو احساس ہوا کہ انور دوسروں کو تکلیف دے کو جو خوشی محسوس کرتا ہے اس کی یہی وجہ ہے۔''

''میں ایک بار پھر روزینہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔'' انور نے کہا۔ ''اس نے میری اس کمزوری کو سنجیدگی سے لیا، اور ضد کر کے مجھے ڈاکٹر برہان کے پاس لے گئی۔ جو اس ملک کے بہت بڑے سائی کرائٹسٹ ہیں۔ انہوں نے میرا علاج شروع کیا۔ کئی طرح کا علاج ہوا ہے میرا۔''

''وہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

"psychoanalysis, hypnosis behavior therapy وغیرہ۔ اس کے علاوہ کچھ دوائیں بھی دی گئیں، اور اب میں تقریباً بہتر ہو چکا ہوں۔'' انور نے بتایا، اور اس کے بعد روزینہ شرما کر بولی۔

''انور نے مجھے شادی کی پیشکش کر دی۔''

''ظاہر ہے جس نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے۔ اس کو میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟''

''میرے خدا۔ کیا عجیب کہانی ہے تم دونوں کی۔'' میں نے کہا۔

''میرے دوست۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ کوئی ہماری اس کہانی کو لکھ دے۔'' انور نے کہا۔ ''تاکہ لوگوں کو پتا چلے کہ ہر تشدد کے پیچھے کوئی نہ کوئی نفسیاتی جواز ہوا کرتا ہے۔''

وہ دونوں خوشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ شادی ہو چکی ہے۔ انور کا ٹریٹمنٹ اب بھی چل رہا ہے لیکن ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ وہ بہت تیزی سے دماغی طور پر صحت مند ہو رہا ہے۔

++

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

تہی دست

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
یہ روداد جو بالکل فلمی سی لگتی ہے مجھے ایک سہیلی نے سنائی تھی۔ اس کی دوست نگہت کراچی میں رہتی ہے۔ اس کا یہ واقعہ ہے۔ لوگ سچ کہتے ہیں کہ فلموں میں جو کچھ دکھایا جاتا ہے وہ انسانی زندگی سے اخذ کردہ ہوتا ہے۔ نگہت کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ فلمی انداز کا ہے لیکن واقعات بالکل سچے ہیں۔
عالیہ بٹ
(لاہور)

نگہت کو دفتر کے کسی نہ کسی کام سے باہر بھیجا جاتا تھا۔ اس دن بھی وہ دفتر کے ایک ضروری کام سے نکلی تھی جو اہم نوعیت کا تھا۔ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن پہنچنا تھا دفتری کام نمٹا کر وہ صبح دس بجے نکلی تھی۔ واپس ایک بجے پہنچی تو اس وقت سارے دفتر میں نہ صرف زبردست سنسنی پھیلی ہوئی تھی بلکہ خوف و ہراس بھی تھا۔ پورا عملہ ٹولیوں کی صورت میں اِدھر اُدھر کھڑا کھسر پھسر کر رہا تھا۔

ہوا یہ تھا کہ دفتر کے کیشیئر ارشد کمال جو معمر شخص تھے بارہ بجے دو لاکھ ساٹھ ہزار کی رقم بینک میں جمع کرانے کے لیے نکلے تھے کہ کسی نے انہیں لوٹنے کی کوشش کی۔ وہ پارکنگ لاٹ کی طرف جا رہے تھے جو دفتر کی عمارت سے چند گز کے فاصلے پر تھا، یہ شاہراہ جو درمیان میں تھی مصروف ترین تھی لیکن اس وقت ٹریفک سڑک پر بہت کم تھا۔ یہاں صرف دو بلند و بالا عمارتیں تھیں۔ وہ پارکنگ کے پاس پہنچے تو ایک بدمعاش جو پارکنگ میں جہاں دفتر کی گاڑیاں کھڑی کی جاتی ہیں وہاں گاڑیوں کے عقب میں چھپا ہوا تھا اس نے تیزی سے نکل کے ان کا راستہ روکا تھا۔ کھلا ہوا چاقو اس کے ہاتھ میں تھا، اس نے چاقو ان کے سینے پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے بریف کیس چھین لیا۔ اس لمحے ان پر خوف سے سکتہ چھا گیا۔ وہ نہ تو شور مچا سکے اور نہ ہی انہوں نے مزاحمت کی اس لیے چاقو دیکھ کے ان کی جان نکلی جا رہی تھی۔ ڈاکو کے بھاگنے پر انہیں ہوش آیا تو ان کے چیخنے چلّانے پر کچھ لوگوں نے اس کا تعاقب کیا تو وہ بریف کیس پھینک کے بھاگ نکلا۔ شاید اس لیے کہ بریف کیس بھاری تھا۔ وہ اسے اٹھا کے بھاگنے سے قاصر تھا۔ ارشد کمال بریف کیس اور دو ایک آدمیوں کے ساتھ دفتر پہنچے تو ان کا خوف و دہشت سے برا حال تھا۔ کتنی ہی دیر تک ان کے حواس قابو میں نہیں آئے تھے۔

وہ کوئی پانچ برسوں سے بینک میں دفتر کی رقم جمع کرانے جا رہے تھے۔ آج تک ان کے ساتھ ایسا کوئی واقع پیش نہیں آیا تھا۔ شہر میں آئے دن اس قسم کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں ان کے ساتھ پہلی بار یہ واقعہ پیش آیا تھا اس لیے وہ کچھ زیادہ ہی ڈر گئے تھے۔ دوسرے دن انہوں نے رقم بینک لے جانے سے انکار کیا تو ان کا تبادلہ برانچ آفس میں کر کے نگہت کو کیشیئر بنا دیا گیا۔ اس نے بی کام کیا ہوا تھا۔ اس کا تعلق لاہور سے تھا۔ وہ کسی وجہ سے لاہور سے کراچی آ کر ملازمت کر رہی تھی۔ وہ نہ صرف بہت تجربہ کار، با صلاحیت بلکہ ذہین لڑکی بھی تھی۔

طے یہ ہوا کہ روزانہ نگہت کے ساتھ کوئی لڑکی رقم بینک لے جایا کرے گی۔ لڑکی ہونے کی وجہ سے کسی کو شک بھی نہیں ہوگا کہ اتنی بڑی رقم وہ لے جا رہی ہے۔ البتہ اس کام کے لیے دفتر کی گاڑی استعمال نہیں کی جائے گی۔ جب لڑکیاں ایم ڈی کے کمرے سے نکل کر اپنی اپنی میزوں پر آئیں تو نسرین جسے دفتر میں کام کرتے ہوئے صرف تین مہینے ہوئے تھے وہ اس سے سرگوشی میں بولی۔

''نگہت! تم نے بڑی بھاری اور خطرناک ذمّے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

داری قبول کی ہے۔ تمہارے ساتھ بھی ارشد ملال صاحب جیسا واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ کیا تم نے یہ بھی سوچا؟''

''جو بھی واقعہ پیش آنا ہے آنے دو۔'' نگہت نے سرگوشی میں جواب دیا۔

''تم کیا جیمز بانڈ بن رہی ہو؟''

''نہیں...... میرا کیا جاتا ہے۔ اس میں سراسر نقصان کمپنی کا ہی ہوگا۔ یہ عہدہ اور ذمّے داری ایم ڈی اور منیجر نے سونپی ہے۔ میں نے تو اپنی طرف سے کوئی پیشکش نہیں کی...... نہ ہی میں نے بھولے سے بھی سوچا کہ مجھے اس کا اہل اور قابل سمجھا جائے گا۔''

''تم نے اتنی بڑی ذمّے داری قبول کرنے سے انکار کیوں نہیں کیا۔'' نسرین بولی ''تم نے دانستہ بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ میرے خیال میں تم نے اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔''

''نہیں میرا فیصلہ صحیح ہے وہ اس لیے کہ تنخواہ میں توقع سے کہیں زیادہ اضافہ ہوا ہے۔'' نگہت نے بتایا ''اب تمہی بتاؤ کہ میں اسے کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟''

''تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔ ہمیں معاشی حالات کے آگے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔'' نسرین نے ایک سرد آہ بھری۔ ''ہماری ضرورت اور مجبوریاں بھی تو بہت ہیں۔ مہنگائی کمر تو ڑ رہی ہے۔'' پھر اس نے موضوع بدل کر پوچھا۔ ''پرسوں افروز بتا رہی تھی کہ تمہاری خالہ نے تمہاری شادی کی بات چیت چلائی ہے۔ اس کا کیا بنا؟''

''چل رہی تھی لیکن اب ختم سمجھو۔'' نگہت نے افسردگی سے جواب دیا۔ ''لڑکے والوں اور لڑکے نے بھی مجھے پسند کرلیا تھا......''

''پھر کیا ہوا......؟'' نسرین نے دریافت کیا۔ ''جب لڑکے نے پسند کرلیا تو بات آگے کیوں نہیں بڑھی؟''

''اس لیے کہ میرے پاس بھاری جہیز جو نہیں ہے۔'' وہ بولی ''آج کل شادی لڑکی سے نہیں بلکہ جہیز سے کی جاتی ہے اسی لیے تو ایک لڑکی کی شادی کے لیے لاکھوں کی رقم درکار ہوتی ہے۔''

نسرین افسردگی سے بولی۔ ''مجھے دیکھ لو۔ ہر مہینے رشتہ لگانے والی ایک نہ ایک رشتہ لے کر آجاتی ہے۔ ابو کے پاس صرف چالیس پچاس ہزار روپے ہیں اس لیے بات چیت ٹوٹ جاتی ہے کہ یہ رقم لڑکے کو جوڑے کے لیے دینے میں

Waqar Azeem
...point.com

بھی ناکافی ہے۔'' دونوں نے افسردگی سے سر جھکا لیا اور کام میں مشغول ہوگئیں۔

چوتھے پانچویں دن کی بات ہے شام کے وقت نگہت دفتر سے نکلی تو آسمان پر گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی وقت برس سکتے ہیں۔ موسلا دھار بارش کا خطرہ تھا، جو بس اسٹاپ اس کے دفتر کے سامنے تھا وہاں سے اس کے روٹ کی بس نہیں جاتی تھی۔ یہاں سے بس میں سوار ہونے کی صورت میں اسے دو بسیں تبدیل کرنا پڑتی تھیں، اس کا بس اسٹاپ دفتر سے دو فرلانگ کی دوری پر تھا۔ وہ وہاں تک پیدل ہی جاتی تھی۔ اس وقت تمام دفاتر چھوٹ چکے تھے۔ چھتری ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ آگے سے بھری ہوئی آتی تھی اور بس اسٹاپ پر ایک سواری بھی نہیں اترتی تھی، وہ سب آگے جانے والی سواریاں ہوتی تھیں۔

اس نے چند قدموں کی مسافت طے کی تھی کہ اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کا تعاقب کررہا ہے، اس نے غیر محسوس انداز سے مڑ کر دیکھا تو اس کا خیال درست ثابت ہوا۔ اس سے چند قدم پیچھے ایک شخص جو قلمی ہیرو کی طرح دراز قد، وجیہ اور سحر انگیز شخصیت کا مالک تھا اس کے عقب میں چلا آرہا تھا۔ اس کا اندازہ یوں درست ثابت ہوا تھا کہ اس شخص کی نگاہیں صرف اس کے سراپا پر جمی ہوئی تھیں۔ جب کہ اور لڑکیاں، عورتیں بھی گزر رہی تھیں۔ صرف وہ ہی ایک لڑکی نہ تھی۔ اس شخص نے اسے اپنی طرف دیکھتا پایا تو اپنی نظریں پھیر لیں۔ یہ کوئی نئی اور عجیب بات نہ تھی۔ سر راہ نوجوان لڑکے لڑکیوں عورتوں کو حریصانہ نظروں سے گھورتے ہی ہیں... پھر بھی اس نے چند لمحوں کے بعد اپنی غلط فہمی دور کرنے کی غرض سے پلٹ کر دیکھا تو اس نے اپنے آپ کو اس شخص کی نگاہوں کے شکنجے میں پایا۔ جب نگہت نے صرف اپنے آپ کو اس کی توجہ کا مرکز پایا تو اس کے سارے بدن میں سنسنی دوڑ گئی تھی اور دل دھڑکنے لگا تھا۔ اسے اس بات پر سخت حیرت ہورہی تھی کہ اس سڑک پر اور بھی حسین اور نوجوان لڑکیاں چل رہی تھیں۔ ان کی بے حجابی متوجہ کرنے والی تھی جبکہ وہ ایک عام سی سانولے رنگ کی لڑکی تھی اور اس کا لباس کھلا اور تنگ بھی نہ تھا جو بے حجاب کردے، وہ مردوں کی نگاہوں اور توجہ کا مرکز بن جائے۔

ابھی وہ بس اسٹاپ سے کچھ ہی فاصلے پر تھی کہ اچانک بادلوں نے اپنا دامن وا کردیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ اس نے جلدی سے پرس سر پر رکھ کر اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید قریب میں کوئی ریسٹورنٹ یا سائبان ہو۔ قریب میں کوئی ریسٹورنٹ تو نہ تھا البتہ سو ڈیڑھ سو قدم پر کے ایف سی تھا۔ وہاں پہنچتے پہنچتے پوری طرح بھیگ جاتی، کپڑے بدن سے چپک کر اس کی حالت فطری بنا دیتے، وہ جائے پناہ ڈھونڈ ہی رہی تھی کہ کسی نے اس پر چھتری کھول دی۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ یہ تو وہی شخص تھا جو اس کے تعاقب میں آرہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے گھبرائی، اس نے سوچا کہ وہ چھتری کے نیچے سے نکل جائے مگر بھیگ جانے اور عریاں ہوجانے کے خیال سے رک گئی۔ اس نے نوجوان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اطراف کا جائزہ لیا تاکہ کوئی سواری نظر آجائے۔ دور تک کسی رکشا ٹیکسی کا نشان نہ تھا۔ یکا یک بارش نے طوفانی صورت اختیار کرلی اور تیز ہوا کے جھکڑ چلنے لگے۔ یہ دیکھ کر وہ پریشان ہوگئی، نوجوان بھی اس کی پریشانی کو بھانپ گیا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ موسلا دھار بارش ہے جو فوری طور پر رکنے والی نہیں۔'' وہ اس کے قریب ہوکر بولا۔

''آیئے، سامنے کے ایف سی ہے اس میں چل کر بیٹھتے ہیں، جب بارش تھم جائے گی آپ چلی جایئے گا۔''

نگہت کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ جاگتے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ اس کے کانوں میں ستار کے دلکش سُر بج رہے تھے۔ یہ جیسے سات سر تھے۔ ہر سر قوس قزح کا رنگ تھا۔ وہ اس سحر کی اسیر بنی اس کے ساتھ چل پڑی۔ نوجوان کے ایک ہاتھ میں چھتری تھی اور وہ اس سے قریب ہوکر چل رہا تھا۔ رہ رہ کر دونوں کے بدن مس ہورہے تھے... مگر اس نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ گو نوجوان کے قرب اور لمس نے اس کے سارے بدن میں خون کی گردش تیز کردی تھی۔

وہ خواہش کے باوجود کے ایف سی کبھی نہیں گئی تھی۔ وہ اس شاہ خرچی کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ اس کی تنخواہ کیا تھی اور پھر اس تنخواہ میں بھی اسے پھونک پھونک کر خرچ کرنا پڑتا تھا۔ اسے ہر ماہ اپنی نصف تنخواہ ماں کو بھیجنا پڑتی تھی جو لاہور میں اس کے ماموں کے ساتھ رہتی تھی۔ سات ہزار کی رقم اس ڈربے کے کرائے میں نکل جاتے تھے جسے اس کی مالکن فلیٹ کہتی تھی۔ باقی رقم سے اسے اپنا گزارہ کرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی ایک خالہ اس کے گھر کے قریب ہی رہتی تھی۔ وہ بیوہ تھی، وہ اسے بھی ہر ماہ دو ہزار روپے دیتی تھی جو اوور ٹائم سے ملتے تھے اس لیے بھی کہ وہ اس

WaqarAzeem
Pakistanipoint.com

کے ہاں چھٹی کا سارا دن گزارتی تھی۔

جب بھی دفتر سے چھٹی کے وقت وہ بس اسٹاپ کی طرف جاتی تھی تو اسے کے ایف سی کے سامنے سے ہی گزرنا پڑتا تھا۔ اس کے شیشوں میں سے اسے ہمیشہ رش نظر آتا لیکن آج تو بارش کی وجہ سے ایسا کھچا کھچ بھر گیا تھا کہ تل دھرنے کی جگہ تک نظر نہیں آرہی تھی۔ اتفاق سے ایک کونے والی میز جس کے گرد صرف دو کرسیاں تھیں خالی ہوئیں تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے اس میز کی طرف بڑھ گیا کہ کہیں کوئی اور نہ آبیٹھے۔ ریسٹورنٹ کے ہال میں بیٹھے ہوئے لڑکے لڑکیاں، عورتیں اور مرد بارش کا پورا لطف اٹھا رہے تھے۔ چکن برگر، چکن کی دوسری ڈشیں، کولڈ ڈرنکس، اسپیشل سلاد اور چائے کافی بھی چل رہی تھی۔ گاہکوں کی دبی دبی ہنسی، سرگوشیاں اور قہقہے بھی گونج رہے تھے۔

وہ شخص اسے بٹھانے کے بعد اس کے اور اپنے لیے برگر، چکن ونگز اور کافی لے آیا، سیلف سروس تھی۔ اس کے اندازے کے مطابق بل دو ہزار سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہوسکتا تھا۔ وہ یہ سب دیکھ کر سٹ پٹا گئی اور کہے بغیر نہ رہ سکی، ”اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے نہ تو کچھ کھانا ہے اور نہ بھوک لگی ہے، جو آپ اتنا کچھ اٹھا لائے۔“

وہ نگہت کی بات سن کر بے اختیار مسکرا دیا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”مجھ ناچیز کی طرف سے ایک انجانے دوست کے لیے شام کا ناشتا اور کافی ...... تاکہ شام اور بارش کا لطف دوبالا ہوسکے۔“

”مگر مسٹر......!“ وہ سر کو جھٹکا دے کر بولی اور اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا، کیوں کہ دوپٹا شانے سے پھسلنے لگا تھا وہ اسے درست کرنے لگی۔

”میرا نام کامران ہے۔“ وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے نپے تلے لہجے میں بولا جو بڑا متاثر کن تھا۔ ”دیکھیے آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں فلرٹ کررہا ہوں، میں بارش کی وجہ سے آپ کو پریشان دیکھ کر آپ کی مدد کے لیے آگے بڑھا تھا ورنہ بارش میں بھیگ کر آپ بے حجاب ہوجاتیں۔ ہم چاہیں تو دوست بن سکتے ہیں...... ورنہ یہاں سے اٹھ کر ایک دوسرے کو فراموش کردیں گے۔“

نگہت کا دل انوکھے خیالات سے دھڑکنے لگا۔ آج تک کسی مرد نے اس سے اس انداز سے گفتگو نہیں کی تھی کیوں کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی اس جیسی معمولی شکل صورت کی لڑکی کو دوستی کی پیشکش کرسکتا ہے۔ اسے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ کیوں کہ وہ روز آئینہ دیکھتی تھی اسی لیے وہ اس وقت خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کررہی تھی۔ ”میں ایک معمولی سی لڑکی ہوں...... اور آپ ایک صاحب حیثیت آدمی ہیں۔“ نگہت نے سنجیدگی سے کہا۔ ”پھر......“

”میں کوئی امیر کبیر آدمی نہیں ہوں۔“ کامران نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اس بات کا آپ نے اندازہ کیسے کرلیا؟“

”اگر آپ کوئی امیر آدمی نہیں ہیں تو اتنے بڑے ریسٹورنٹ میں مجھے کس لیے لے آئے؟“ وہ بڑی سادگی سے بولی۔

”اوہ...... یہ بات ہے۔“ کامران کے لبوں پر ایک دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔ اصل بات یہ ہے کہ میرا ایک بچپن کا دوست ظفر دو برس کے لیے کینیڈا ملازمت کے لیے گیا ہوا ہے وہ اپنا فلیٹ مجھے رہائش کے لیے دے گیا ہے جو کلفٹن میں ہے۔ چونکہ یہ فلیٹ مفت رہائش کے لیے ملا ہے تو کرایہ کی بچت ہوگئی۔ اس لیے میں ذرا ہاتھ کھول کر خرچ کرتا ہوں۔“

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

”میرا نام نگہت چوہدری ہے۔“ اس نے اپنا تعارف کرایا، میں ایک تعمیراتی کمپنی میں کیشیئر ہوں اور فیڈرل بی ایریا میں رہتی ہوں۔“ اس کے سامنے ٹرے میں برگر، چکن ونگز اور بروسٹ رکھا ہوا تھا جسے دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آرہا تھا۔ یوں بھی اس ریسٹورنٹ میں قدم رکھتے وقت اس کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ وہ کے ایف سی میں کھانے کے جو خواب دیکھتی تھی وہ آج پورا ہوگیا تھا۔ ناشتے کے دوران ان میں جو اجنبیت تھی وہ دور ہوتی چلی گئی۔ وہ دونوں اس دوران ایک دوسرے کو اپنے بارے میں بتاتے رہے تھے۔ نگہت نے اسے اپنی بیمار ماں کے بارے میں بتایا۔ کامران نے اسے بتایا کہ اس کے والدین کا انتقال ہوچکا ہے، بھائی بہن کوئی ہے نہیں، وہ ایک نجی فرم میں ملازمت کرتا ہے۔ وہ چونکہ سیلز مین بھی ہے اس لیے اسے تنخواہ کے علاوہ کمیشن بھی خاصا اچھا مل جاتا ہے جو کہ پچیس تیس ہزار کے لگ بھگ بن جاتے ہیں۔

بارش پورے دو گھنٹے تک مسلسل ہوتی رہی تھی، اس دوران وہ آپس میں بے تکلف ہوچکے تھے۔ نگہت نے محسوس کیا کہ کامران نے اسے پسند کرلیا ہے۔

جب وہ گھر پہنچی تو اس پر محبت کا نشہ پرانی شراب کی

طرح طاری تھا۔

اس نے سنگار میز کے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو ہر طرح اور ہر زاویے سے ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے پہلے کبھی بھی اپنے آپ کو اس انداز سے نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت بھی جب بجلی چلی جاتی تھی، گرمی اور حبس سے برا حال ہو جاتا تھا تو وہ نیم بے لباس ہو کر لیٹی ہوتی۔ لیکن آج بات کچھ اور ہی تھی اس نے محسوس کیا کہ اس کے بدن میں دلکشی ہے جو مرد کو دیوانہ بنا سکتی ہے۔ اس کی سانولی رنگت میں نمک اور جذب ہے۔

اگلے روز وہ دفتر پہنچی تو اسے بس کی وجہ سے دس منٹ تاخیر ہو چکی تھی، اس لیے کہ رات وہ دیر سے سوئی تھی کیونکہ خود کو کامران کے ساتھ محسوس کر کے ان جانے راستے پر بھٹکتی رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا رہا تھا کہ کامران اس کے کانوں میں محبت کا رس گھول رہا ہے۔ ''ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ ہم زندگی کے ساتھی بن جائیں گے۔''

صبح آفس کے لیے نکلی تو سارا راستہ کامران کے خیالوں ہی میں کھوئی رہی تھی، دفتر پہنچی تو اس وقت بھی کامران اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ اسے اس بات کا بالکل خیال نہیں تھا کہ اس کے ذمے آج ایک اہم کام ہے۔ اس نے رقم وصولی کے کمرے میں افروزہ کو دیکھا جو کمپنی کے گاہکوں سے اقساط وصول کر رہی تھی پھر اسے یک لخت خیال آیا کہ اسے بینک رقم لے کر جانا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے منیجر صدیقی صاحب نے اسے اور غزالہ کو کمرے میں بلا کر تجوری میں سے کل کی وصول شدہ رقم نکالی جو تین لاکھ تھی۔ دو لاکھ نوّے ہزار روپے پانچ سو اور ہزار کے نوٹوں میں تھے۔ چھوٹے نوٹ بینک میں جمع نہیں کیے جاتے تھے کیونکہ دفتر کے اخراجات اور مزدوروں کو یومیہ اُجرت دینے کے لیے رکھ لیے جاتے تھے۔

نگہت نے ایک موٹے خاکستری کاغذ کے بڑے لفافے میں جس پر کمپنی کا نام چھپا ہوا تھا اس میں نوٹوں کی گڈیاں ایک ایک کر کے رکھ لیں۔ بڑی آسانی سے یہ لفافہ اس کے تھیلے نما پرس میں آ گیا۔ باہر سے لگتا بھی نہیں تھا کہ اس میں نوٹوں کی گڈیاں ہیں۔ صدیقی صاحب یہ دیکھ کر اور بھی خوش ہو گئے تھے انہوں نے اس سے کہا کہ اللہ کا نام لے کر روانہ ہو جاؤ۔

وہ ٹھیک بارہ بجے دھڑکتے دل سے دفتر سے نکلی تو نسرین، افروزہ اور غزالہ نے اسے الوداع کہا اور اس کی ڈھارس بندھائی۔ وہ بہ ظاہر بڑی نارمل اور پُرسکون سی دفتر سے نکل کر لفٹ کے پاس آئی مگر اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور ایک انجانا سا خوف دامن گیر تھا۔ کیوں کہ وہ اپنی زندگی میں کبھی اتنی بڑی رقم لے کر نہیں نکلی تھی۔ جس وقت وہ عمارت سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی اس کی طرف دیکھتی ہر آنکھ سے اسے خوف سا آ رہا تھا کہ یہ آنکھ اسے نہیں بلکہ تھیلے کو دیکھ رہی ہے، تاڑ رہی ہے، کہہ رہی ہے، تم لاکھوں کی رقم اس میں رکھ کر لے جا رہی ہو، تمہارا چہرہ بتا رہا ہے.....

وہ بڑی محتاط اور چوکنا تھی، اس نے پرس کندھے سے لٹکا رکھا تھا جسے ایک ہاتھ سے مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ بس اسٹاپ پر پہنچی تو پسینا پسینا ہو چکی تھی۔ کل کی بارش سے موسم خوشگوار ہونے کی بجائے گرم ہو گیا تھا اور حبس بھی ہو رہا تھا۔ وہ بس میں سوار ہو کر بینک کے سامنے اتری۔

اس نے بینک میں قدم رکھا تو جان میں جان آئی اور اس نے سکون کا سانس لیا۔ بینک ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ اس کی خنکی سے سارے بدن میں ایک عجیب سی فرحت کی لہر دوڑ گئی پھر اس نے بینک سے فون کر کے صدیقی صاحب کو اپنے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دی۔

جب وہ واپس دفتر پہنچی تو صدیقی صاحب بہت خوش تھے کہ وہ جیسے کوئی معرکہ سر کر کے آئی ہو۔ صدیقی صاحب کے خیال میں یہ تجربہ بہت کامیاب رہا تھا اور کوئی بدمعاش سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک لڑکی اپنے پرس میں اتنی بڑی رقم جمع کرانے لے جا سکتی ہے۔ اس کامیابی سے نگہت کا حوصلہ بھی بڑھ گیا تھا، اس نے لنچ میں نسرین سے بڑے غرور سے کہا تھا کہ وہ دس پندرہ لاکھ کی رقم بھی لے جا سکتی ہے، اس کی یہ بات سن کر نسرین معنی خیز انداز سے مسکرا دی تھی۔

شام میں جب دفتر کی چھٹی ہوئی اور وہ دفتر کی عمارت سے باہر آئی تو اس کی نظر کامران پر پڑی جو ایک طرف کھڑا بے چینی سے اس کی آمد کا منتظر تھا۔ اس نے کامران کی آنکھوں میں محبت کا والہانہ انداز دیکھا تو وہ کسی نئی نویلی دلہن کی طرح شرما گئی۔ اگر تنہائی ہوتی اور کامران اس کے ہونٹوں پر مہر ثبت کر دیتا تو شاید تعرض نہ کرتی۔ کامران نے ایک انگریزی فلم ٹائی ٹینک کی دو ٹکٹیں بک کروا رکھی تھیں جس کی دوبارہ نمائش ایک عرصے کے بعد پھر ہو رہی تھی۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

وہ دونوں [illegible] وقت ہو رہا تھا۔ وہ انگریزی فلم [illegible] تھی [illegible] اس فلم کی بہت تعریف سنی ہوئی تھی [illegible] چلی آئی تھی۔ اب اس قدر رش نہیں رہا تھا۔ [illegible] ہال کی بیشتر قطاریں اور سیٹیں خالی پڑی تھیں۔ وہ [illegible] پچھلی نشست پر براجمان ہوگئے۔ فلم میں ایک بے حد جذباتی اور رومانی منظر آیا، کامران نے اس کے ہاتھ کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھا تو اس کی نس نس میں ایک لطیف اور انوکھی لہر دوڑ گئی اس نے بھی کامران کا ہاتھ تھام لیا۔ جب وہ دونوں سینما ہال سے نکلے تو ان کی محبت بھری کہانی کا آغاز ہو چکا تھا۔ کامران نے ایک قریبی باربی کیو میں لے جا کر نہ صرف چکن تکے کھلائے بلکہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے محبت بھری باتوں کا رس بھی انڈیلا اور اس کے حسن و جمال کی تعریفیں بھی کیں۔

رات جب وہ سونے کے لیے بستر پر دراز ہوئی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ کامران کی محبت کے سحر کی وہ اسیر ہوگئی ہے۔ اس کی زندگی میں کامران پہلا مرد تھا جو ایک بہار کے جھونکے کی طرح آیا تھا۔ وہ ساری رات ایک پل کے لیے بھی سو نہ سکی تھی۔ کیوں کہ وہ کامران کا قرب اور لمس اپنے وجود پر محسوس کرتی رہی تھی۔ وہ سوچتی بھی رہی تھی کہ کیا اس کی زندگی کا ساتھی کامران بن جائے گا......؟

چار دن اور بیت گئے۔ نگہت رقم جمع کرانے کے لیے بینک برابر جاتی رہی تھی۔ اسے کوئی حادثہ اور مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ اس کا حوصلہ اور اعتماد بڑھنے لگا تھا۔ ان چار دنوں میں اس کی ملاقات کامران سے کئی مرتبہ ہوئی تھی۔ وہ فلم دیکھنے کی بجائے سیر و تفریح کرتے رہے تھے۔ جہاں کوئی جگہ تنہائی کی مل جاتی تو کامران فائدہ اٹھانے میں لمحہ بھر کے لیے بھی پس و پیش نہیں کرتا۔

جمعہ والے دن مل کر ہفتہ والے روز فلم اور ڈنر کا پروگرام بنایا۔ پھر فلم دکھانے کے بعد اسے لے جا کر وہ فلیٹ دکھایا جو اس کے دوست کا تھا۔ فلیٹ دیکھ کر وہ سحر زدہ سی ہوگئی۔ کامران نے کچھ دیر بعد اس سے دریافت کیا۔

''ہاں تو جانِ من......! تم مجھے اپنی خالہ سے ملوانے کب لے جاؤ گی؟''

''تم میری خالہ سے کس لیے ملنا چاہتے ہو؟'' نگہت نے انجان بن کر پوچھا۔ اس کا دل مارے خوشی کے دھڑکنے لگا تھا۔

''اسی لیے کہ ان سے تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے

مقناطیس

جزیرہ کریٹ کے کوہ ایڈا میں ایک چرواہا رہتا تھا۔ یہ چرواہا مختلف میدانی علاقوں میں اپنی بھیڑ بکریاں چرایا کرتا تھا۔ ایک دن چرواہے نے ایک پہاڑی کا رخ کیا۔ اس کے ساتھ ایک آنکڑا تھا جس کی مدد سے وہ اونچے درختوں سے اپنے مویشیوں کے لیے پتے توڑتا تھا، دن بھر بکریوں کو چرانے کے بعد وہ سورج کی گرمی سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے پہاڑ میں غار ڈھونڈنے نکلا۔ آخر کار اسے ایک کشادہ غار نظر آ گیا اور وہ اس غار میں داخل ہوا۔ اپنا سامان ایک طرف رکھ کر آرام کی خاطر سستانے لگا کہ اچانک ایک آواز کے ساتھ اس کا آنکڑا چھت کے ساتھ چپک گیا، وہ بہت گھبرایا۔ پھر اس نے آنکڑے کو چھت سے علیحدہ کر دیا اور نیچے رکھ دیا لیکن آنکڑا دوبارہ چھت سے جا چپکا۔ وہ آنکڑے کو چھت سے علیحدہ کرتا اور وہ چھت سے پھر چپک جاتا۔ وہ سمجھ گیا کہ غار کی چھت کے پتھروں میں ایسی خصوصیت ہے جو لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ انہی پتھروں کو وہ مقناطیس کا نام دیا گیا گویا ''مقناطیس'' ایک چرواہے نے دریافت کیا۔

اقتباس: معلومات ایجادات

مرسلہ: عامر شہزاد، موضع دوسیرہ، ضلع جھنگ

آسکر فلم ایوارڈ

سال 1926ء مقام ہالی ووڈ، امریکا

اکیڈمی آف موشن پکچرز اینڈ آرٹس کے زیر اہتمام پہلی مرتبہ فلم کے مختلف شعبوں میں بہترین کارکردگی دکھانے والوں کو ایوارڈ اور انعامات دینے کی تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت اکیڈمی کی چیف ایگزیکٹو (CEO) آفیسر مارگریٹ بیریکس کر رہی تھی۔ انعامات کا ٹرافی بکس جب کھول کر پہلی ٹرافی جو انسان نما ہے نکالی گئی تو اسے دیکھتے ہی مارگریٹ بولی ''او۔ یہ تو بالکل میرے چچا آسکر جیسا ہے۔'' سو اسی وقت ٹرافی کا نام آسکر رکھ دیا گیا۔ جبکہ چچا آسکر کا فلم کے کسی بھی شعبہ سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا اور نہ ہی پہلے ٹرافی کا کوئی نام تھا۔

مرسلہ: محمد اجمل خاں، کینٹن، مشی گن، امریکا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

مانگ لوں۔" کامران نے اس کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے جواب دیا اور اس کا ہاتھ اپنے سینے پر دل کی جگہ رکھ لیا۔ "میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ اب میں تمہارے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتا۔ معلوم نہیں تم نے مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے۔ ساری رات تمہارے خواب دیکھتا رہتا ہوں پھر بھی اس دل ناتواں کو قرار نہیں آتا ہے۔"

"میرے ڈربے نما کمرے کے در و دیوار بھی مجھے کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔" وہ بھی جذباتی ہو کر دل کی بات زبان پر لے آئی تھی۔ "تمہارا خیال مجھے بھی ساری ساری رات سونے نہیں دیتا۔ میں انگاروں پر لوٹتی رہتی ہوں۔ آئندہ اتوار کو میرے ساتھ چل کر خالہ سے مل لینا، میں بس اسٹاپ پر تمہیں مل جاؤں گی۔"

"میں یہ چاہتا ہوں کہ پہلے کیوں نہ کوئی فلیٹ کرائے پر لے لوں۔ پھر اس کے بعد تمہاری خالہ سے ملوں۔" کامران نے کہا۔

"کیا تم اپنے دوست جیسا فلیٹ کرائے پر لو گے؟" نگہت نے تجسس بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں......" کامران نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایسے فلیٹ کا کرایہ پچاس ہزار روپے سے کم نہیں بلکہ آج کل اور زیادہ ہے۔ اس میں تین بیڈ رومز، ڈائننگ، ڈرائنگ رومز، ٹی وی لاؤنج اور امریکن کچن ہے۔ میں کہاں، ایسا فلیٹ کرایہ پر لے سکتا ہوں۔ ہمارے لیے ایک دو کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ کافی ہے۔ میری ایک تجویز ہے۔ سچ پوچھو تو میں یہ چاہتا ہوں کہ کیوں نہ سنگاپور جا کر زندگی گزاروں، ہم دونوں وہاں جا کر ملازمت کر کے اچھی زندگی گزار سکتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ سنگاپور جتنا خوبصورت ہے وہاں کی زندگی بھی اتنی حسین، رنگین اور خواب ناک ہے۔"

"میں تمہارے ساتھ چل کر وہاں رہنے کے لیے تیار ہوں۔" وہ بولی۔ "میں نے سنگاپور کی بڑی تعریف سنی ہے۔"

"میری ہونے والی زوجہ محترمہ......! وہاں جا کر رہنے کے لیے کم از کم چار پانچ لاکھ کی رقم چاہیے۔" کامران نے شوخی سے کہا۔

"پانچ لاکھ......؟ کس لیے......؟" نگہت نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"اس لیے کہ ہوائی جہاز کے ٹکٹ کے لیے رقم چاہیے۔" کامران بتانے لگا۔ "چوں کہ ہمیں وہاں مستقل رہنا ہے اس لیے ملازمت ملنے تک کا عرصہ گزارنے کے لیے کیوں کہ نوکری فوراً نہیں مل جائے گی۔ اس کے لیے دو ایک مہینے دوڑ دھوپ جو کرنی ہوگی۔"

"ہم پانچ لاکھ روپے کہاں سے لائیں گے؟" نگہت کا چہرہ بجھ گیا، میرے پاس تو دو ایک ہزار روپے بھی نہیں ہیں۔"

"میں خود ہی سوچتا ہوں شاید کوئی راستہ نکل آئے۔"

رات جب وہ سونے کے لیے بستر پر دراز ہوئی تو سوچ رہی تھی کہ کامران کی محبت میں جو شدت اور جذباتیت ہے اسے ہر قیمت پر وہ پانا چاہتی ہے۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے گہری نیند میں غرق ہو گئی۔

جمعہ کے روز بھی وہ حسبِ معمول دفتر کی رقم جمع کرانے گئی تو اس کے اعصاب پر کامران اور سنگاپور کا خیال مسلط تھا۔ بس میں سوار ہوئی تو دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال کوندا، "فرض کرو جو رقم لے جا رہی ہوا گر یہ رقم ہاتھ لگ جائے تو؟ لیکن یہ رقم جو آج لے جا رہی تھی وہ تین لاکھ ستر ہزار تھی۔ کامران نے تو کہا تھا کہ کم از کم پانچ لاکھ ہو۔ اس سے کم رقم میں بات نہیں بنے گی۔ اس سے بھی بڑی رقم ہاتھ لگ سکتی ہے بشرطیکہ وہ کچھ دن اور انتظار کر لے۔ کیوں کہ اس کمپنی کا ایک بہت بڑا کمرشل اور رہائشی پروجیکٹ شروع ہونے والا ہے۔ پھر اس کی بکنگ شروع ہو جائے گی تو یومیہ سات سے دس لاکھ کی رقم جمع ہونے لگے گی۔ تو کیوں نہ بڑی رقم پر ہاتھ مارا جائے تاکہ بہ آسانی سنگاپور یاترا ہو سکے ہے۔ رقم اڑانے کا صرف ایک بار موقع ملے گا۔" کیوں نہ اونچا ہاتھ مارا جائے۔

"نگہت میری جان یہ تو چوری ہوئی۔" اس کے اندر کی نگہت بولی۔

اس کمپنی نے مجھے ان چار برسوں میں کیا دیا؟ اس کی کیا اسٹاف میں کسی کی بھی تنخواہ نہیں بڑھائی گئی۔ جب بھی بڑھانے کا مطالبہ کیا گیا کمپنی نے ایک سو ایک عذر پیش کر کے کہا کہ ملک اور کاروبار کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ افراطِ زر کی شرح میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے۔ سیمنٹ، لوہا اور لکڑی کے نرخ آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ حکومت ٹیکس میں اضافہ کرتی جا رہی ہے جس نے آمدنی کو بہت متاثر کیا ہے۔ کمپنی زبردست خسارے میں جا رہی ہے۔ کام کاج چلانے کے لیے بینکوں سے بھاری شرح سود پر قرض لیا جا رہا ہے لیکن اس کے باوجود وہ دیکھتی

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

آ رہی تھی کہ کمپنی کے مالکان [illegible] نئی نئی گاڑیاں خریدی جارہی ہیں۔ گرمیوں کی [illegible] گزارنے اندرونِ بیرونِ ملک جایا جارہا ہے [illegible] اگر وہ چوری کی مرتکب ہوتی ہے تو جائز ہے۔

ہفتے کی شام وہ کامران کے ساتھ ایک نئی انگریزی فلم دیکھنے چلی گئی۔ اس فلم میں ایسے کئی مناظر تھے جو رومانی، جذباتی اور بولڈ قسم کے تھے۔ یوں تو اس نے ہندوستانی فلمیں اپنی سہیلیوں کے ساتھ دیکھی تھیں اور جن کی نمائش اب پاکستان میں بھی ہونے لگی تھی ان میں بھی بولڈ مناظر کی بھرمار ہوتی تھی۔ عریانیت اب عام ہوتی جارہی تھی۔

ان دونوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا اور کامران نے اسے فلیٹ پر چلنے کے لیے کہا تو بے دھڑک چلی گئی تھی۔ اس لیے کہ رات رکنے اور کمپنی کی رقم اڑانے کا منصوبہ بنا سکے۔ جب اس نے سنگاپور کو گفتگو کا موضوع بنایا تو کامران نے بڑی بے پروائی سے کہا۔

”نہ تو نومن تیل ہوگا اور نہ رادھا ناچے گی...... نہ ہمارے پاس پانچ لاکھ ہوں گے اور نہ ہی ہم سنگاپور جاسکیں گے۔ لہٰذا تم اس کا خیال دل سے نکال دو، حسین خواب دیکھنا بند کردو۔“

”اگر تم ہمت اور حوصلہ کرو تو ہمارے پاس چھ سات لاکھ کی رقم آسکتی ہے۔“ نگہت نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”وہ کیسے......؟“ کامران نے اس کے چہرے کو نظروں کی گرفت میں لیتے ہوئے کہا۔

”وہ ایسے......“ نگت نے ہنس کر کہا اور اسے اپنا منصوبہ بتایا۔ ”یہ کیسا منصوبہ ہے...... ہے نا شاندار اور عجیب......“

”یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے جو تم سوچ رہی ہو؟“ کامران نے سنجیدگی سے کہا۔

”اتنا سیدھا سادا منصوبہ ہے۔ تم گھبرا کیوں رہے ہو؟“ نگہت نے طنزیہ کہا۔

”تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ اس میں کتنا خطرہ ہے؟“ کامران نے قدرے خشک لہجے میں کہا ”اگر میں پکڑا گیا تو جیل کی ہوا کھا رہا ہوں گا اور تم میرے لیے بے آب ماہی کی طرح تڑپ رہی ہوگی۔“

”منصوبہ ایسا مشکل بھی نہیں کہ جو تم پھنس جاؤ۔“ نگہت نے کہا۔ ”حیرت کی بات ہے کہ تم ایک مرد ہو کر ایسی بات کہہ رہے ہو؟“

”آخر تم اتنا بڑا خطرہ کس لیے مول لینا چاہتی ہو؟“ کامران نے حیرانی سے پوچھا۔

”ایک حسین اور خواب ناک زندگی گزارنے کے لیے۔“ نگہت نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کبھی اچھے اور خوش حالی کے دن نہیں دیکھے۔ غربت اور افلاس کی گود میں پلتی رہی ہوں۔ احساس محرومیاں مجھے ڈستی رہی ہیں اس لیے میں چاہتی ہوں سنگاپور میں رہ کر وہاں کے ماحول اور آسائشوں سے محظوظ ہوسکوں۔“

”تم کیا میں خود اس شہر اور یہاں کی زندگی سے بے زار ہوچکا ہوں۔ کاش! ایسا ہوسکتا جو تم چاہتی ہو۔“

نگہت نے اسے تفصیل سے اپنے منصوبے کے بارے میں بتایا کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔ کامران کو کلوروفارم میں بھیگا ہوا رومال ساتھ رکھنا تھا۔ نگہت نے اسے بتایا تھا کہ اس کا دفتر عمارت کی نویں منزل پر واقع ہے۔ وہ ٹھیک بارہ بجے اس لفٹ سے نیچے جاتی ہے جو صرف ڈائریکٹروں کے لیے مخصوص ہے۔ وہ آٹھویں منزل سے اس ہی لفٹ میں سوار ہوجائے۔ اس کو کلوروفارم والا رومال سونگھا کر بے ہوش کردے اس کے بے ہوش ہوتے ہی اس کے پرس سے نوٹوں والا لفافہ نکال کر پانچویں منزل پر اتر کے وہ عقبی حصے کی طرف چلا جائے۔ وہاں جو لفٹ ہوگی اس سے نیچے جاکر سیدھے گھر چلا جائے۔ پھر وہ شام کے وقت اس کے فلیٹ پہنچ جائے گی۔ یہ ایک سیدھا سادا اور آسان سا منصوبہ ہے جس پر ایک بچہ بھی عمل کرسکتا ہے۔ بدھ کے روز اس منصوبے پر بڑی خوش اسلوبی سے عمل کیا گیا تھا۔ کامران نے اسے کلوروفارم والا رومال سونگھا کر بے ہوش کردیا اور اس کے پرس سے رقم والا لفافہ نکال لیا جس میں سات لاکھ کی رقم تھی پھر وہ عقبی حصے کی طرف چلا گیا، اور اس حصے کی لفٹ سے نیچے آگیا اسے کسی نے آتے جاتے نہیں دیکھا تھا کیونکہ بہت سارے لوگ ان دفاتر میں آتے جاتے رہتے تھے جو اس عمارت میں واقع تھے۔

جب نگہت کو ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو صدیقی صاحب کے کمرے میں کوچ پر لیٹا ہوا پایا۔ کمرے میں صدیقی صاحب، جنرل منیجر کے علاوہ انسپکٹر اور ایک حوالدار بھی تھا۔ انسپکٹر نے اسے فضول سوالات سے ایک گھنٹے تک ہراساں کیا وہ اسے اور پریشان کرتا اگر سب انسپکٹر آکر یہ نہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

بتاتا کہ عقبی حصے کے لفٹ میں پانچویں منزل سے ایک دراز قد اور باریش آدمی کو ایک پھولے ہوئے لفافے کے ساتھ گراؤنڈ فلور پر جاتے دیکھا گیا تھا۔ نگہت خوش تھی کہ اس کا منصوبہ کامیاب رہا۔ اسے یہ سب کچھ سہانے خواب کی طرح لگا تھا۔

جب وہ صدیقی صاحب کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تو صدیقی صاحب نے اس کا پرس اس کی طرف بڑھا دیا جب وہ اپنے کیبن میں پہنچی تو نسرین اپنی میز پر موجود نہیں تھی۔ وہ ڈائریکٹر خٹک صاحب کے کمرے میں شاید کوئی فائل لے کر گئی ہوئی تھی۔ نگہت نے اپنے آپ کو کرسی پر گرا دیا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنی اس کامیابی پر وہ دیوانہ وار رقص کرے۔ قہقہے لگائے، اسے اس لیے بھی بے انتہا خوشی ہو رہی تھی کہ اپنی کمپنی سے تنخواہ نہ بڑھانے کا انتقام اس نے بمعہ سود لے لیا تھا۔

دفتر کی چھٹی سے ذرا دیر قبل نسرین میک اپ کرنے پاؤڈر روم جاتی تھی۔ یہ اس کا اور دوسری عورتوں کا معمول تھا۔ جب وہ گئی تو اس نے برق رفتار سے اپنی میز کی دراز سے وہ لفافہ نکال کر اپنے پرس میں رکھ لیا جس میں سات لاکھ کی رقم تھی۔ کامران جو لفافہ اس سے لفٹ میں بے ہوش کر کے لے گیا تھا اس میں تہہ کیے ہوئے ردی اخبار تھے وہ چشم تصور میں کامران کا چہرہ دیکھ رہی تھی جو غصے سے لال بھبوکا ہو رہا تھا اور اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

اس نے گھر پہنچ کر لفافہ ایسی جگہ چھپا دیا تھا کہ اس کے سوا کوئی اور نکال نہیں سکتا تھا اور نہ ہی کسی کا خیال جا سکتا تھا۔ پھر وہ اپنے گھر سے سیدھی کامران کے فلیٹ پر پہنچی تو کامران مشتعل ہو رہا تھا، اسے دیکھتے ہی برس پڑا۔

''آخر مجھے بے وقوف بنانے اور یہ ڈراما رچانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس ڈرامے کے پیچھے نہ صرف وقت خراب ہوا بلکہ ہاتھ بھی کچھ نہ لگا۔'' اس نے غصے میں آ کر تہہ کیے اخبارات لفافے سے نکال کر فرش پر پھینکے۔

''ہاتھ کیوں نہیں لگا۔'' نگہت مسکرائی تو اس کی مسکراہٹ میں بڑی دل آویزی تھی۔ ''سات لاکھ روپے نقد ملے ہیں۔''

''کیا مطلب.....؟'' وہ حیرت سے اچھل پڑا، اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''مطلب یہ ہے کہ اصل لفافہ میں نے اپنی میز کی دراز میں رکھ کر اسے مقفل کر دیا تھا۔'' نگہت نے اٹھلا کر کہا۔

''تم نے ایسا کیوں اور کس لیے کیا تھا؟'' کامران کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ پلکیں جھپکا کر رہ گیا۔

''تمہیں خطرات سے بچانے کے لیے کیا تھا؟'' نگہت کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ ''میں نہیں چاہتی تھی کہ تم کسی مصیبت کا شکار ہو جاؤ۔''

''میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا؟'' اس نے نگہت کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لپیٹ لیا۔

''اگر تم کسی وجہ سے پکڑے جاتے تو بھی یہ رقم ہاتھ نہیں لگتی۔'' نگہت نے جواب دیا۔

''تم جتنی حسین ہو اتنی ہی ذہین اور تیز بھی ہو۔'' وہ نگہت کی ذہانت پر بھونچکا رہ گیا اور بازوؤں کا حصار تنگ کرتا ہوا بولا۔ ''ویسے تم اتنی حسین اور تیز دکھائی نہیں دیتیں۔ اور ہاں تم نے رقم تو اپنے پاس حفاظت سے رکھی ہے نا.....؟ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے اپنی کسی سہیلی کے پاس رکھوائی ہوئی ہو؟''

''نہیں..... کوئی ایسا ہے بھی نہیں کہ جس پر اعتماد کر سکوں..... اس لیے کہ میں نے اس رقم کو اپنے پاس حفاظت سے رکھی ہوئی ہے۔ کسی کے فرشتے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ بہرحال اب سنگاپور چلنے کی تیاری شروع کر دو۔''

''اگر دو ایک لاکھ کا اور بندوبست ہو جائے تو سونے پر سہاگا ہو جائے۔'' وہ اس کے چہرے پر جھکنے لگا۔

''تم فکرمند اور پریشان نہ ہو۔ دو کیا تین لاکھ روپے بھی ہو جائیں گے۔'' وہ فاتحانہ انداز سے مسکرائی۔

''تم رقم لے آؤ تاکہ میں اسے ڈالرز میں بدل لوں۔''

''صبر سے کام لو، رقم پوری ہو جائے تو ایک ساتھ بدل لینا۔''

''ٹھیک ہے۔'' کامران نے بے دلی سے کہا۔

دوسرے دن رقم لے جانے کی ذمے داری نسرین اور غزالہ کو سونپی گئی، صدیقی صاحب رقم کے ساتھ نگہت کے کیبن میں آئے تھے۔ ان تینوں نے مل کر رقم گنی جو دو لاکھ ساٹھ ہزار تھی۔ نسرین نے اپنے ہاتھوں سے نوٹوں کی گڈیاں ایک بڑے لفافے میں رکھیں اور اس کا منہ بند کر کے اس پر ٹیپ چپکا دیا اور اس لفافے کو شاپنگ بیگ میں رکھ لیا جو گہرے رنگ کا اور مضبوط تھا۔ باہر سے دیکھنے

WaqarAzeem
Pakistanipoint.com

سے پتا نہیں چلتا تھا [illegible] لیا ہے، ایسے شاپنگ بیگ عام طور پر خریداری، [illegible] اور کپڑے رکھنے کے لیے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ غزالہ اپنا پرس لانے اپنی میز پر چلی گئی اور نسرین میک اپ درست کرنے پاؤڈر روم، اسے ہر وقت اپنے میک اپ کا خیال رہتا تھا اور یہ اس کی کمزوری بھی تھی۔ وہ اسے کیبن میں اکیلا چھوڑ گئی تھی۔

غزالہ اور نسرین کو رقم بینک لے جانے کی ذمے داری سونپی گئی تو اسے یوں لگا جیسے اسے آسمان کی وسعتوں سے پستی میں پھینک دیا گیا ہو۔ اس نے اپنی بڑی سبکی اور اہانت محسوس کی۔ اس کا خیال تھا کہ اس واردات کے بعد کوئی اور طریقہ سوچا جائے گا۔ اس کا منصوبہ خاک میں نہ صرف مل کر رہ گیا تھا بلکہ اس کا خواب چکنا چور ہو کر اس کی کرچیاں دل میں چبھ گئی تھیں۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔

گیارہ تاریخ آنے میں ابھی چار دن باقی تھے ان دنوں میں اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ وہ گہرے صدمے سے نڈھال سوچ رہی تھی کہ اگر اس تاریخ تک مطلوبہ رقم حاصل نہ ہوئی تو اسے مزید ایک مہینا انتظار کرنا ہوگا۔ نسرین اپنا میک اپ درست کر کے آئی اور کیبن سے بیگ اٹھا کر باہر چلی گئی۔ غزالہ اس کے انتظار میں استقبالیہ میں کھڑی تھی۔ ہفتے کے روز تک وہ رات دن سے تدبیریں سوچتی چلی آرہی تھی۔ کامران کے ذہن میں بھی کوئی منصوبہ نہ آسکا تھا۔ وہ نسرین کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ چھین کر بھاگنے کا کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ ہفتہ کے روز نسرین رقم کو لفافے اور لفافہ اپنے پرس میں رکھ کر پاؤڈر روم چلی گئی۔ اچانک نگہت کے ذہن میں ایک تدبیر آئی تو وہ خوشی کے مارے اچھل پڑی۔ اس نے اپنی اس تدبیر کے بارے میں کامران کو بھی نہیں بتایا تھا اور نہ ہی ہوا لگنے دینا چاہتی تھی کیونکہ اسے سرپرائز دینا چاہتی تھی۔

پیر کے روز وہ اپنے کیبن میں تھی، اس دن تین سے پانچ لاکھ کی رقم بھی ہوسکتی تھی۔ وہ اس تدبیر سے اس قدر سرشار اور اس میں اتنی کھوئی ہوئی تھی کہ اس نے اپنے آپ کو کامران کے ساتھ سنگاپور میں سیاحت، سیر و تفریح اور ہنی مون مناتے محسوس کیا۔

اپنی تدبیر پر عمل کرنے کے خیال سے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ نسرین ڈائریکٹر خٹک کے کمرے میں فائل لے کر گئی ہوئی تھی۔ وہ اس ڈائریکٹر کی رنگین مزاجی جان چکی تھی۔ وہ نسرین کو کسی نہ کسی بہانے سے دیر تک روک لیتا تھا۔ اسے چائے بھی پلاتا تھا، نسرین حسین تھی اور اتنی جسمانی طور پر پُرکشش بھی تھی۔ اسے باتیں کرنے اور لبھانے کا فن آتا تھا اور اس میں خوب مہارت بھی رکھتی تھی۔ وہ جب بھی خٹک کے کمرے سے آتی تھی تو اس کا چہرہ، لباس ساری کہانی سنا دیتا تھا۔ وہ پاؤڈر روم ضرور جاتی تھی، نسرین کے واپس آنے تک وہ اپنے آپ پر قابو پا چکی تھی اور نارمل انداز سے اپنے کام میں مصروف تھی۔

ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے صدیقی صاحب اور غزالہ اس کے کیبن میں رقم لے کر داخل ہوئے۔ رقم چار لاکھ ساٹھ ہزار تھی۔ ان تینوں نے مل کر رقم گنی۔ پھر اس رقم کو تین لفافوں میں رکھا گیا۔ پانچ ہزار، ایک ایک ہزار اور پانچ پانچ سو نوٹوں کے لفافے بنائے گئے تھے۔ حسبِ معمول غزالہ کیبن سے نکلی تو نسرین بھی اس کے پیچھے پیچھے پاؤڈر روم میں چلی گئی تو وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھی۔ اس نے شاپنگ بیگ سے وہ بڑا سا لفافہ نکال لیا جس میں تینوں لفافے رکھے تھے پھر اسے الماری کے نیچے جو خلا تھی اس میں چھپا دیا تھا کہ اس

مہدی حسن خان 1934ء میں راجستھان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد استاد عظیم خان اور چچا استاد اسماعیل خان فنِ موسیقی کے اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ ایک دن مہدی حسن نے بھی اپنے والد کے سامنے گلوکاری کی کچھ جسارت کی تو بقول مہدی حسن، اس کے بعد انہیں ''قید'' کر لیا گیا۔ آپ کے والد راجوں مہاراجوں کے سامنے فنِ موسیقی کا مظاہرہ کرتے تھے تو مہدی حسن ساتھ ساتھ ہوتے۔ 1946ء میں مہدی حسن پاکستان آگئے۔ انہوں نے پہلی بار 1951ء میں فلم ''شکاری'' کے لیے گایا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق وہ اب تک 60 ہزار سے زیادہ گانے اور غزلیں گا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے 1965ء اور 1971ء کی جنگوں میں جو قومی نغمے گائے وہ آج بھی روزِ اوّل کی طرح پورے جوش و جذبے کے ساتھ سنے جاتے ہیں۔

مرسلہ: اشفاق منصور۔ حیدرآباد

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔ پھر اس نے میز کی دراز سے وہ پھولا ہوا لفافہ نکال کر شاپنگ بیگ میں رکھ دیا جو وہ اپنے پرس میں رکھ کر لائی تھی۔ نسرین کے پاؤڈر روم سے آ کر شاپنگ بیگ اٹھا کر لے جانے کے بعد تک اس کا دل سینے میں کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتا رہا تھا۔ اس نے اپنے اعصاب کو پرسکون بنانے کے لیے دو گلاس ٹھنڈا پانی غٹ غٹ پی لیا۔

نگہت نے یہ منصوبہ بناتے وقت تمام پہلوؤں پر سوچ لیا تھا۔ جاسوسی ناولوں نے اس کا ذہن مجرمانہ بنا دیا تھا۔ وہ یہ بات جانتی تھی کہ بینک پہنچ کر راز افشا ہونے پر اس پر کوئی آنچ نہیں آسکتی تھی۔ کیوں کہ غزالہ اور نسرین مورد الزام ٹھہرتیں اور ان کی کسی بات کا پولیس یقین نہیں کرتی۔ اگر اس سے بھی پوچھ گچھ کی جاتی اور اس کے پرس اور میز کی درازوں کی تلاشی لی جاتی تو ان کے ہاتھ کچھ نہیں لگتا۔ بالفرض محال وہاں سے لفافہ برآمد ہو بھی جاتا تو نسرین ہی پھنستی کیونکہ وہ الماری اس کی کرسی کی پشت پر تھی۔

بارہ بج کر بیس منٹ پر پھر ایک بار بھونچال سا آ گیا۔ بینک منیجر نے ٹیلی فون پر دفتر کو اطلاع دی تھی کہ ایک دراز قد اور باریش شخص نسرین کو بینک کے باہر ریوالور دکھا کر اس کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ چھین کر فرار ہو گیا ہے۔ یہ سب کچھ اس تیزی سے ہوا کہ بینک کا گارڈ اور راہ گیر کچھ بھی نہیں سکے۔ بینک منیجر نے صدیقی صاحب کو خود بلا لیا تھا۔

یہ خبر سنتے ہی نگہت کے اعصاب پر جو چٹان جیسا بوجھ تھا وہ ہٹ گیا اور وہ پھول کی طرح ہلکی ہو گئی۔ اس نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ نسرین کے ساتھ بھی ڈکیتی کا واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ وہ دل میں جتنی خوش تھی اتنی ہی حیران بھی ہو رہی تھی۔ آج اس اتفاق نے اس کی ایک بہت بڑی مشکل حل کر دی تھی۔ اب وہ بڑے اطمینان سے لفافہ اپنے پرس میں رکھ کر لے جا سکتی تھی۔ اسے کسی بات کا خوف و خدشہ نہیں رہا تھا۔

دفتر میں اس واقعہ سے ایک ہیجان خیز سنسنی پھیل گئی تھی۔ اس ڈکیت کے بارے میں قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ اس شخص کا جو حلیہ بتایا گیا اس سے بہت ملتا جلتا تھا جس نے نگہت کو رومال سونگھا کر بے ہوش کیا تھا اور نوٹوں کا لفافہ لے گیا تھا۔ فرق اگر کچھ تھا تو صرف اتنا کہ نسرین سے لفافہ چھیننے والے کی بڑی سی داڑھی تھی۔ نگہت کے دل کے کسی گوشے میں یہ خیال آیا کہ کہیں وہ کامران تو نہیں تھا۔

کہیں اس نے کسی منصوبے کے تحت نسرین کے ہاتھ سے لفافہ چھینا تھا لیکن اس کے خیال میں اس کا کامران ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ دن دہاڑے ایک گنجان علاقے میں ڈکیتی کی واردات نہیں کر سکتا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ نسرین کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ چھیننے والے شخص کی شکل کامران سے مشابہت رکھتی تھی۔

کوئی دو بجے نسرین اور غزالہ آئی تھیں، قانونی کارروائی کی وجہ سے انہیں زیادہ دیر تک بینک میں رکنا پڑا تھا۔ نسرین اتنی خوف زدہ نہیں تھی جتنی غزالہ ہو رہی تھی۔ وہ دونوں جلد ہی دفتر سے چھٹی لے کر چلی گئی تھیں۔ ان کا چھٹی لے کر چلے جانا نگہت کے حق میں زیادہ بہتر ہوا تھا۔ اس نے چھٹی کے وقت بڑے اطمینان سے رقم کا لفافہ الماری کے نیچے سے نکال کر اپنے پرس میں رکھ لیا۔

جب اس نے گھر پہنچ کر نوٹوں کی گڈیاں نکال کر دیکھیں تو اسے لگا کہ گڈیاں اسے مسکرا کر دیکھ رہی ہیں۔ یہ رقم نہیں سہانے خواب تھے۔ اب سنگاپور لب بام پر تھا۔ جہاں وہ تھی اس کی محبت تھی...... اس کا محبوب تھا اور اس کی مسرت سے بھرپور زندگی تھی۔ اس نے یہ سب کچھ صرف اور صرف کامران کو پانے کے لیے کیا تھا۔ وہ اپنے محبوب کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی تھی۔

جب وہ کامران کے فلیٹ پر پہنچی تو کامران موجود نہیں تھا۔ کامران نے اسے ایک ڈپلی کیٹ چابی دے رکھی تھی۔ کچھ دیر بعد کامران آیا تو وہ بہت پریشان تھا جب اس نے کامران سے اس کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا۔

”جب مصیبت آتی ہے تو چاروں طرف سے آتی ہے۔ ٹریولنگ ایجنسی خسارے کی وجہ سے بند کر دی گئی ہے اور اس کا دوست بھی کینیڈا سے ایک ہفتہ بعد آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی غیر ملکی بیوی بھی ہے۔ اس کے آنے سے دو دن پہلے فلیٹ خالی کر دینا ہوگا۔“

”اس میں اس قدر پریشان ہونے کی کیا بات ہے میری جان!“ وہ اس کے قریب ہونے لگی۔

کامران کا موڈ سخت آف تھا۔ وہ نہ تو بہکا اور نہ ہی اسے آغوش میں لے کر من مانیاں کیں، جیسا کہ وہ کیا کرتا تھا۔ وہ بگڑ کر بولا۔ ”تمہارے نزدیک کوئی پریشانی کی بات ہی نہیں۔ میں اب کہاں رہوں گا۔ چار پانچ دنوں میں فلیٹ کرائے پر کہاں ملے گا؟ پھر اس کے لیے ڈپازٹ کی رقم تیس چالیس ہزار روپے کہاں سے لاؤں گا..... گزر بسر

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کیسے ہوگا، یہاں [illegible] نکال دیا گیا ہے؟“

”اچھا [illegible] طرح سے اچھا ہی ہوا۔“ وہ اس کے گلے میں بانہیں حائل کرکے بولی۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔“ کامران نے برہمی سے کہا۔ ”مجھ پر مصیبت آن پڑی ہے اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔“

”چار پانچ دنوں کے بعد ہم دونوں سنگاپور میں ہوں گے۔“ نگہت اس کی طرف تیکھی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ”وہاں جا کر سب سے پہلے شادی کرکے ایک ہوجائیں گے اور ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔“

”لگتا ہے کہ تم پاگل ہوگئی ہو۔ پاکستانی کرنسی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ جب یہ کرنسی غیر ملکی کرنسی میں تبدیل کی جائے گی تو کوڑیوں کی طرح ہوگی اسی لیے میں نے تم سے کہا تھا کہ دو تین لاکھ اور ہو جائیں۔“ کامران تلخی سے بولا۔

”اب میرے پاس گیارہ بارہ لاکھ کی رقم موجود ہے۔“ وہ بولی۔ ”اب تو ہم سنگاپور جاسکتے ہیں نا؟“

”اتنی بڑی رقم تمہارے پاس کہاں سے آگئی؟“ کامران کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”کہیں تم مذاق تو نہیں کررہی ہو؟“

نگہت نے تفصیل سے سارا واقعہ مزے لے لے کر سنایا۔ ”اب تو تمہیں یقین آگیا؟“

”اوہ میری جان. تم نے تو کمال کردیا یہ عظیم کارنامہ انجام دے کر۔“ کامران نے جذباتی ہو کر کہا۔ ”ٹھیک ہے کل سے ہم سنگاپور جانے کی تیاری شروع کردیں گے۔ ہمیں سب سے پہلے اس رقم میں سے ہوائی جہاز کے ٹکٹ اور دیگر ضروریات کی چیزوں کی خریداری کے پیسے نکال کر باقی رقم کو ڈالر میں تبدیل کرانا ہوگا۔ تم ایسا کرو کہ کل شام کے وقت اپنا پاسپورٹ اور ساری رقم لے کر آجاؤ۔ میں دو ایک بروکر سے بات کرتا ہوں جو غیر ملکی کرنسی کا کام کرتے ہیں۔ وہ معقول ریٹ پر غیر ملکی کرنسی دیں گے۔“

نگہت رات دس بجے فلیٹ میں رہی تھی وہ دونوں سنگاپور جانے اور خریداری کا پروگرام ترتیب دیتے رہے تھے۔ اس کی ویران زندگی میں جیسے چپکے سے بہار آگئی تھی۔

گھر آکر اس نے سوچا ماں کو اس رقم میں سے تیس ہزار اور اپنی خالہ کو بیس ہزار دے دے گی۔ وہ سنگاپور جا کر ماں کو ہر ماہ دس ہزار بھیجتی رہے گی۔ جانے سے دو دن پہلے ہوائی جہاز سے صبح لاہور جا کر شام کی کو واپس آجائے گی۔ لاہور روانگی اور واپسی کے بارے میں کامران کو بھی نہیں بتائے گی۔ روانگی سے ایک دن پہلے وہ دفتر جا کر اپنا استعفیٰ پیش کردے گی اور اس کی وجہ یہ بتائے گی کہ لاہور میں اس کی شادی طے ہوگئی ہے۔

صبح وہ نیند سے بیدار ہوئی تو اس پر پرانی شراب کا سا نشہ طاری تھا، دفتر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد دفتر ٹیلی فون کیا تو پتا چلا کہ آج نسرین اور غزالہ بھی دفتر نہیں آئی ہیں۔ اس نے صدیقی صاحب کو فون کردیا اور کہا کہ لاہور سے اس کی ماں کا فون آیا ہے اس کی طبیعت خراب ہے۔ وہ لاہور جارہی ہے۔

اس نے ایک لاکھ پچاس ہزار کی رقم گھر میں چھپا کر رکھ دی، پھر باقی کی رقم پرس میں لے کر کامران کے فلیٹ پر پہنچی تو دن کا ایک بج رہا تھا۔ کامران فلیٹ میں نہیں تھا اس نے رقم کے لفافے کامران کی الماری میں رکھ دیے۔ اس نے کامران سے کہا تھا کہ وہ دفتر سے واپسی پر شام کو رقم لے کر آئے گی لیکن وہ اس لیے جلدی آگئی تھی کہ اس کا دل گھر پر نہیں لگ رہا تھا۔ کامران کے ساتھ رات جو اس نے جشن منایا تھا وہ اس جشن کی یاد تازہ کرنا چاہ رہی تھی۔

نگہت نے سوچا کہ کامران کے آنے تک اسے سو لینا چاہیے۔ اس خیال سے وہ بیڈروم میں آئی اور غیر ارادی طور پر کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکنے لگی نیچے کا منظر دیکھتے ہی اس پر بجلی سی آگری۔

اس نے نسرین کو دیکھا جو کامران کے ساتھ ٹیکسی سے اتر رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کا لہو منجمد ہو کر رہ گیا۔ دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ وہ اپنا پرس لے کر دوسرے روم میں تیزی سے گھس گئی۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ رقم کے لفافے الماری سے نکالتی۔ لمحہ لمحہ قیمتی تھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ اتنا کھلا رکھا تھا کہ اس میں ایک جھری سی بن گئی تھی۔ اس کمرے میں چوں کہ کھڑکیوں کے پردے کھنچے ہوئے تھے اس لیے اندھیرا سا ہو رہا تھا۔ وہ اندھیرے میں کھڑی تھی۔ باہر سے اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نگہت کا نہ صرف دماغ بلکہ پورا بدن سنسنا رہا تھا۔ نسرین اور کامران بیڈروم میں داخل ہو چکے تھے۔ انہوں نے پردے کھینچ کر روشنی کردی۔ لاؤنج میں گھپ اندھیرا تھا اور اس کی نس نس میں بجلی کی رو کی طرح سنسناہٹ دوڑ رہی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے؟ کیا ان کے سامنے چلی جائے؟

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

انہیں ذلیل کرے، آئینہ دکھادے؟

چوں کہ فلیٹ میں ایک گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا اس لیے ان دونوں کی گفتگو کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

کامران تمسخرانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''کلو اپنے آپ کو بہت حسین، بے حد ذہین سمجھتی ہے..... میں نے بھی اس کے حسن و شباب کی جھوٹی تعریفیں کرکے محبت کے جال میں ایسا پھانسا لیا ہے کہ وہ ساری زندگی یاد کرے گی..... کیوں؟ میرا منصوبہ کیسا رہا؟ وہ بری طرح پھنس گئی ہے۔ بالکل اس طرح جس طرح مکھی مکڑی کے جالے میں پھنس جاتی ہے۔''

''بے حد شاندار.....'' نسرین نے جواب دیا۔

''لیکن وہ حرافہ بھی کم نہیں ہے..... دیکھو تو سہی..... اس کمینی نے کس ہوشیاری سے دفتر میں لفافے تبدیل کردیے۔ تم نے اپنی جان پر کھیل کر میرے ہاتھ سے شاپنگ بیگ چھینا مگر ہاتھ کیا آیا؟ ردی اخبار اور مجھ پر شک کرنے لگے کہ میں نے تمہیں ڈبل کراس کیا ہے۔ اب تمہیں میری بات کا یقین آیا کہ یہ ساری کارستانی اس چڑیل کی تھی۔''

''اب میں بھی اسے ڈبل کراس کروں گا۔'' کامران نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''اس قدر اس کا عشق جذباتی ہے کہ وہ آسانی سے بے وقوف بن جائے گی۔''

''کیا اس کی مہربانی سے فائدہ اٹھاؤ گے اس سے بھی نکاح میں لوگے؟'' نسرین نے کہا۔

''کیا تم مجھے اتنا بدذوق سمجھتی ہو کہ تمہاری محبت کی قدر نہ کروں۔ نہیں..... میں تمہارے سوا کسی بھی لڑکی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ میں اپنی محبت کو میلا نہیں کروں گا۔''

''اچھا اب میں چلتی ہوں۔'' نسرین مستی بھرے لہجے میں بولی۔ ''کیونکہ تمہاری کالی کلوٹی محبوبہ نازل ہونے والی ہوگی۔''

''نہیں..... تم نہیں جاؤ گی اور نہ ہی میں تمہیں جانے دوں گا میرے دل کی رانی!'' وہ محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ''وہ شام چھ بجے رقم لے کر آئے گی۔ ابھی تو دو بھی نہیں بجے ہیں۔ ہمیں اس کامیابی پر نہ صرف جشن منانا بلکہ دبئی جانے کا پروگرام بھی بنانا ہے۔ ہم تین دن بعد یہاں سے چھو ہوجائیں گے۔''

تھوڑی دیر میں ایک دم سے ایسا سناٹا چھا گیا جیسے کوئی موجود ہے ہی نہیں۔ نگہت اس روم سے دبے پاؤں باہر کھلنے والے دوسرے دروازے سے نکلی۔ اسے اب ان لفافوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

جب وہ لفٹ سے نیچے جارہی تھی تو اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس کے خواب شیشے کی طرح چکنا چور ہوگئے تھے اور ان کی کرچیاں اس کے دل میں چبھ رہی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں کامران کو مخاطب کرکے کہہ رہی تھی۔ ''تم نے ایک عورت کا پیار تو دیکھا اور اب اس کا انتقام دیکھو..... تم نے مجھے فریب دے کر داغ لگایا۔ اب میں بھی تم پر اور تمہاری اس ناگن پر داغ لگاؤں گی۔ تم دونوں دبئی میں نہیں جیل میں ہوگے۔ وہیں ہنی مون مناؤ گے۔''

اس نے ایک پی سی او کے کیبن سے دو نمبروں پر فون کرکے کہا۔ ''کل جو صدر کے ایک بینک کے باہر ڈکیتی کی واردات ہوئی تھی اور ڈاکو ایک عورت کے ہاتھ سے سات لاکھ سے زائد رقم چھین کر بھاگا تھا وہ ڈریم لینڈ اپارٹمنٹس کے چھ سو دس نمبر اپارٹمنٹ میں موجود ہے۔ رقم الماری میں ہے۔ جلد سے جلد وہاں پہنچیں، کیوں کہ وہ اور اس کی بیوی دبئی فرار ہونے والے ہیں۔''

وہ دو نمبر تھے پولیس اسٹیشن اور تعمیراتی کمپنی کا۔ جہاں وہ ملازمت کرتی تھی۔ بولتے وقت اس نے ماؤتھ پیس پر رومال رکھ لیا تھا تاکہ آواز پہچانی نہ جاسکے۔

فون کرکے اس کے سینے میں انتقام کی بھڑکتی آگ سرد پڑ گئی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ انجان اور لاتعلق بنی رہے گی۔

اتفاق سے نگہت پر کوئی آنچ نہیں آئی اور آنے کا کوئی سوال بھی نہیں تھا۔

نگہت جب دوسرے کمرے کے دروازے سے فلیٹ سے باہر نکلی تو اس نے دانستہ وہ دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ اس کے ذہن نے فوری طور پر ایک منصوبہ ترتیب دے لیا تھا۔ فون سنتے ہی پولیس آندھی کی طرح پہنچ گئی تھی۔ جب پولیس پہنچی تو اس وقت وہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے نیاز حیوان بنے ہوئے تھے۔ ان کے کپڑے فرش پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ ان دونوں کو رنگے ہاتھوں گرفتار کرلیا گیا۔ رقم بھی برآمد ہوگئی تھی۔

اس نے یہ خبر اگلے روز کے اخبار میں پڑھی تھی۔ خبر پڑھ کر کافی دیر تک روتی رہی تھی پھر وہ ایک عزم سے اٹھی اور گھر میں رکھی ایک لاکھ پچاس ہزار کی خطیر رقم لے کر لاہور کے لیے نکل گئی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ کبھی کراچی نہیں آئے گی۔

++